درد کے فاصلے

(افسانے)

ساوتری گوسوامی

درد کے فاصلے

{ کہانیاں }

ساوتری گوسوامی

اسباق پبلی کیشنز پونے

اس کتاب کے ضمن میں

نام کتاب : درد کے فاصلے

موضوع : کہانیاں

مصنفہ : ساوتری گوسواری

صفحات : 288

قیمت : 200روپیئے

کمپوزنگ وڈزائننگ: ارقم کمپونی کیشنز ماٹرگاؤں خورد، موبائل نمبر 09767113554

طباعت : جے گنیش پریس پونے

زیراہتمام: اسباق پبلی کیشنز پونہ۔9822516338

تعداد : ۵۰۰

سن اشاعت: ۲۰۱۴ء

رابطہ : ASBAQUE PUBLICATIONS
SAIRAmanzil,230/B/102,
Viman darshan.Sanjay Park,
Lohgaon Road.Pune-411032.M.S.

پتہ : SAVITRI GOSWAMI
Unit 22,191 Walker Street
North Sydney, NSW
Australia 2060

انتساب

یہ میرا پہلا انتساب

میرے بچھڑے ساتھی کے نام

جو خوب جانتا تھا

یہ بندھن ٹوٹنے والا نہیں

کیوں کہ وہ تو مر کر بھی زندہ ہے

وہ ایک شخص جو میرا ہم سفر تھا

اپنوں نے کہا وہ سورج تھا

وہ گیا تو ساتھ ہمارا آسمان لے گیا

دوستوں نے کہا۔ وہ سمندر تھا

وہ ہمارے سارے دکھوں کا درماں تھا

وہ ایک شخص نہ جانے کیا کیا تھا

نام جس کا آنندلال گوسوامی تھا

جو کہتا تھا محبت زندگی ہے

اور خدمتِ خلق خدا کی بندگی ہے

☆☆☆

گفت باہمی

نذیر فتح پوری

میں کیا لکھوں دیدی کی ان کہانیوں کے بارے میں ۔ یہ کہانیاں خود اپنے بارے میں آپ کو بتائیں گی۔ آپ صدق دل سے ان کہانیوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا۔ یہ کہانیاں خود بولتی ہیں۔ ہر کردار بولتا ہے۔ ہر لفظ بولتا ہے۔ ماحول بولتا ہے۔ منظر بولتا ہے۔ حالات بولتے ہیں۔ یہ سچ ہے ساوتری گوسوامی جی کو بولنے والا قلم ملا ہے۔ حالات کی عکاسی کرنے والا قلم۔ منظر اور ماحول سے گفتگو کرنے والا قلم اور بولتے قلم کا ساتھ دینے والے الفاظ۔ یہ الفاظ جب منظروں میں ڈھلتے ہیں تو منظر بولنے لگتے ہیں۔ یہ الفاظ جب مکالمہ بن کر کرداروں کی گویائی کا حصہ بن جاتے ہیں تو کردار بولنے لگتے ہیں۔ اور پھر کہانیاں پڑھتے پڑھتے قاری کا دل بھی بولنے لگ جاتا ہے۔ ان کہانیوں کی تفہیم کے لئے کسی نقاد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ دیدی کے قلم کا اپنے قاری سے سیدھا تعلق ہے۔ یہ کہانیاں پڑھتے پڑھتے ہی آپ کے دل میں اترتی چلی جائیں گی اور آپ کہانی ختم کرنے کے بعد کرداروں کو اپنے ماحول اور معاشرے میں تلاش کریں گے۔ آپ سوچیں گے کہ کس کردار کو کہاں دیکھا ہے۔ یہ ماسٹر جی تو اپنے پڑوس کے اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر تو قریب کی بستی میں مریضوں کا علاج کرتا ہے۔ یہ وکیل تو اسی شہر کی عدالت میں پریکٹس کرتا ہے۔ یہ ٹھیکیدار، یہ مزدور، یہ گھروں میں جھاڑو پونچھا کرنے والی بائی یہ سب ہماری بستی کے رہنے والے ہیں۔ یہ شوہر یہ بیگم، ہمارے پڑوس والے مکان میں تو رہتے تھے۔ کچھ دن پہلے چلے گئے تھے۔ اب ساوتری گوسوامی کی کسی نہ کسی کہانی میں موجود ہیں۔ اتنے سچے اور فطری کرداروں کو اپنے دامن میں سمیٹے یہ کہانیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کہانی کار نے کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن کے ساتھ دنیا کا مشاہدہ کیا ہے۔ سماج اور معاشرے پر نظر ڈالی ہے۔ کرداروں کو دیکھا ہے اور پھر ایک کے بعد ایک ان کرداروں کو اپنی سوچ میں اتارا ہے۔ اور اس کے بعد ہی اپنی کہانیوں کے تانے بانے بنے ہیں۔

معاشرہ اور ماحول چاہے جتنا جدید ہو جائے لیکن کم از کم ہم ایشائی لوگ روایتوں سے اپنے آپ کو دور نہیں رکھ سکتے کیوں کہ دکھ جدید ہو یا قدیم اس کا یکساں اثر ہوتا ہے۔ زخم جدید ہو یا قدیم اس کو مرہم کی ضرورت ہر حال میں پڑے گی۔ رشتہ جدید ہو یا قدیم دودھ اور خون کا اثر اس پر ہر حال میں ہوگا، بے ہنگم اور گنجلگ تحریر بے فیض ہوتی ہے۔ درد کے فاصلے گھٹتے نہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ درد بھری تخلیق دل کو گداز بناتی ہے۔ روح کو بیدار کرتی ہے سوچ کو سنجیدگی عطا کرتی ہے۔ ساوتری گوسوامی کی زیر مطالعہ کہانیاں یہ تمام صفت اپنے اندر رکھتی ہیں۔

میں اگر نقاد ہوتا تو بہت خوبصورتی سے ان کہانیوں کا تجزیہ کر کے اپنی رائے کو مصدقہ بنا کر پیش کرتا۔ لیکن کسی تخلیق کے لیے تو مخلص قاری ہی نقاد ہوتا ہے۔ یہ کام آپ کا ہے۔ آپ ان کہانیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں اور سوچیں کہ ہندوستان سے اتنی دوری کے فاصلے پر رہنے کے باوجود ساوتری گوسوامی ہندوستانی معاشرہ اور

کرداروں سے کس درجہ قریب ہیں۔ اپنے دیش کے باشندوں کے دکھ درد کا ان کو کتنا احساس ہے۔ وہ آسٹریا جیسے ملک میں رہ کر ذہن کے اسکرین پر ہندوستانی سماج کا عکس دیکھتی رہتی ہیں۔ کسی قلم کار کے دل میں خلوص اور ایمانداری نہ ہوتو اس کا قلم اپنے لوگوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ کتاب اسباق پبلی کیشنز پونے کے تحت شائع ہو رہی ہے۔ یہ میرے لیے خوش بختی کی بات ہے۔ میں اپنے لیے اسے ایک مبارک قدم سمجھتا ہوں۔!!!

☆☆☆

NAZEER FATEHPURI
Post Box NO. Pune-411006
M.S. Mb.009822516338

محترمہ ساوتری گوسوامی اور میں

چشمہ فاروقی۔ دہلی۔ 9540261238

یہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ مجھے اپنی ماں جیسی آنٹی کے لئے چند الفاظ لکھنے کا موقعہ ملا اور سونے پر سہاگہ کہ محترم نذیر فتح پوری صاحب جیسے اعلی انسان کی سرپرستی میں ساوتری آنٹی کے فون سے معلوم ہوا کہ ان کی کتاب محترم جناب نذیر صاحب ترتیب دے رہے ہیں۔ آنٹی کی یہ خواہش ہے کہ ان کی بیٹی بھی اس میں شرکت کرے۔ ان کے بعد نذیر صاحب سے فون پر تفصیل سے بات چیت ہوئی جو کہ فاروقی صاحب مرحوم کے ذکر خیر سے بھرپور تھی۔

ساوتری آنٹی کا کافی سال پہلے عید الفطر والے دن فون آیا اور مجھے عید کی مبارکباد دی۔ ان کی خوبصورت شفقت بھری آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ اس کے بعد تو خطوط، فون اور افسانوں کا سلسلہ جاری ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔ ان کا افسانہ کندن پڑھ کر میں ان کی اسیر ہوتی چلی گئی۔

یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ان سے میری پہلی ملاقات ایک یادگار دن ۲۵ دسمبر یعنی کرسمس کے موقع پر ہوئی۔ اس درمیان وہ ہندوستان میں تھیں میں نے کہا میں آپ کے پاس آرہی ہوں۔ میں اپنے شریک سفر شہزاد فاروقی اور دو بچوں کے ساتھ ملنے پہنچی۔ ہمیں مل کر لگا کہ یہ پہلی ملاقات نہیں ہے ہم تو ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے برسوں سے جانتے ہیں۔ یہ ایک ادیب کا دوسرے ادیب سے ملن تھا۔ ان کے ساتھ ہی ہماری ملاقات ان کے خاندان کے دیگر افراد سے بھی ہوئی۔ ان کا خاندان ہندوستانی تہذیب کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ جہاں کسی مذہب میں کوئی بھید بھاؤ نظر نہیں آیا۔ سب مذہب کے لوگ گھر میں موجود اور سب کا انداز بے حد حسین۔ آنٹی کی بہن اور بہنوئی ڈاکٹر رائے سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ سب یادداشت میں محفوظ۔ اس دن آنٹی نے جس خوبصورتی سے کھڑے ہو کر خوش آمدید کہا اور یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم کہاں ہیں۔ کرسمس کا موقع تھا کیک تو کھانا ہی تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیک کھلایا۔ دونوں بچوں کو تحفے اور چاکلیٹ دیئے۔ میری بیٹی تنہا فاروقی ان کو نانی ہی بلاتی ہے۔ اور آنٹی اس کے لئے اون کی ٹوپی اور اسکارف اپنے ہاتھ سے بنا کر بھیجتی ہیں۔ اس خلوص کا متبادل میرے پاس دعاؤں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

ان کی ادبی زندگی کے بارے میں جو بھی لکھا جائے کم ہوگا۔ جس انسان نے ۶۵ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا ہو جب عمر میں پختگی آچکی ہوتی ہے تو بھلا کہاں کمی ہوگی، دیر سے لکھنے کے بعد ماشاءاللہ اتنا لکھا کے کمی نہیں ہوتی۔ جہاں لوگ ساری زندگی لگانے کے باوجود بھی قلم نہیں اٹھا پاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر پڑھ کر کبھی نہیں لگا کہ کسی نئے انسان کی تحریر پڑھ رہے ہوں۔

ان کے افسانے خاتون مشرق، روپ کی شوبھا اور گلابی کرن میں بہت مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اگر ہم زندگی کو قریب سے دیکھیں تو اکثر خواتین اس عمر کو پہنچ کر اپنی زندگی کو محدود کر لیتی ہیں اور خود کو گھر اور بچوں میں بانٹ لیتی ہیں۔ انھوں نے اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا۔

ساوتری آنٹی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اپنے افسانوں کی سی۔ ڈی تیار کرائی اور اس سے

ملنے والی رقم کو اندھے اور لاچار بچوں کی مدد میں لگانے کا فیصلہ کیا۔ واہ ایسے انسانوں کے لئے یہی کہوں گی کہ زور قلم کے ساتھ ساتھ صحت اور عمر میں اضافہ ہو۔ ایسی خواتین کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔

ان کے احساسات مجھے صرف پڑھنے کو نہیں ملے بلکہ ان کے ساتھ رہ کر دیکھنے کو ملے ہیں۔ ایک بار کا واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ ہندوستان آئیں تو مجھ سے ملنے چلی آئیں۔ جامع مسجد، مٹیا محل میں میرا دفتر واقع ہوا کرتا تھا۔ جامع مسجد سے مٹیا محل تک دونوں طرف کھانے کے ہوٹل ہی ہوٹل ہیں۔ جن کے باہر فقیر فقراء غریب نادار لوگ کھانے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر ان کا روم روم کانپ اٹھا۔ بولیں۔ چشمہ یہ میرا ہندوستان ہے جہاں آج بھی کشکول لئے مرد عورتیں ہاتھ پھیلائے ہوئے مانگ رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ایک طرف تو میں پریشان تھی کہ میری وجہ سے آنٹی کو یہ دیکھنا پڑا۔ دوسری جانب میں نے سوچا کہ ہندوستان کی یہ تصویر انھوں نے دیکھ لی ہے۔ اب قلم کے ذریعہ وہ اس تصویر کو لفظوں میں ضرور ڈھالیں گی۔ شاید کوئی راہ نکل آئے۔ میرے لبوں سے ان کے لئے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔

اس جدید دور میں جہاں عورتوں کو فیشن کا نام دے کر آزادی کی دہائی دے کر بھٹکایا جا رہا ہے۔ اور خواتین اس میں غرق ہو رہی ہیں وہیں محترمہ گوسوامی نے عورتوں کو غلط راہ نہیں بتائی ہے بلکہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں یہ چاہیئے کہ ان کے لکھے افسانے پڑھیں اور سہی راہ میں قدم رکھیں۔ ان کے افسانے جہاں ہم اردو میں پڑھ سکتے ہیں وہیں ہندی میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کے ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں بلکہ اس کا کردار آپ کو اپنے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔

ہندوستانی ماحول سے دور رہ کر آسٹریلیا سے اردو میں لکھنا آسان نہیں ہے۔ جہاں کا رہن سہن زبان ماحول سب کچھ الگ ہے۔ پھر بھی وہ معاشرے کی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ بھی بنا کچھ لئے ہوئے۔ ہم ہندوستانی ان کو سلام کرتے ہیں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

میں تو یہ سوچتی ہوں کہ ان کو بھارت رتن سے نوازا جانا چاہیئے۔ وہ ہمارے ہندوستان کا ایک رتن ہی تو ہیں۔ کیا ہم سب قلم کار مل کر ایسے لوگوں کا نام انعام کے حقداروں میں نہیں لگا سکتے۔

میری تمام تر دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد بڑھتی جائے۔ جو ہندوستانی تاریخ کے لئے ایک تحفہ بلکہ ذخیرہ ثابت ہونگے۔

ساتھ ہی میں نذیر فتح پوری صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کام کو کرنے کی ذمہ داری لی مجھے بھی وہ اپنی دعاؤں میں شریک رکھیں۔

شکریہ کے ساتھ

چشمہ فاروقی

25/3 جوگا بائی۔ جامعہ نگر

نیو دہلی 110025

☆☆☆

کچھ اپنے بارے میں

میں گیارہ سالوں سے آسٹریلیا میں رہ رہی ہوں۔ میری دونوں بیٹوں کی دوست مجھے "آنٹی" پکارتی ہیں اور دوستوں کے سارے بچے "نانی"۔ سو میں جگت نانی ہوں عمر میری ۸۱ سال ہے اور میں ہندوستانی ہوں۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ خدا نے مجھے جس مٹی سے گڑھا وہ ہندوستان کے قدیمی مندروں کے مشہور شہر متھرا کی ہے...... متھرا دہلی سے دور نہیں۔ نام میرا ساوتری گوسوامی ہے۔ ساوتری نام ہندوستان کی پراچین سبھیتا سے جڑا ہے۔ آپ نے ساوتری اور ستیہ وان کا قصہ تو ضرور سنا ہی ہوگا۔ آج بھی جب گھر میں نئی بہو آتی ہے تو سسرال کے بزرگ اسے آشیرواد دیتے سے کہتے ہیں۔ "ساوتری سمان رہو" یعنی یہ کہ سدا سہاگن رہو۔

ساوتری نام سے آپ سوچیں گے کہ میں ہندو ہوں۔ گھر میں سب مجھے صابرہ پکارتے ہیں۔ صابرہ نام مسلمان لڑکیوں کو دیا جاتا ہے۔ میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میرے پاپا کا نام ایس۔ ایس۔ بڈن تھا۔ (s s budden) جو ایک عیسائی پادری تھے۔ میرا نام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ میرے خاندان میں ذات پات کا بھید بھاؤ نہیں تھا اور ہم ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔

میرے والدین گوجرانوالہ کے سکھ پریواروں میں سے تھے۔ جو برسوں پہلے یوپی میں آکر بس گئے تھے۔ کب اور کیوں وہ عیسائی ہوئے مجھے کچھ خبر نہیں۔ آنکھ کھلی اور ہوش سنبھلے تو اپنے کو ایک بھرے پُرے خاندان میں پایا جہاں محبت اور احترام کی فضا میں ہم گیارہ بھائی بہن سکھ کی سانسیں لیتے تھے۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ سائیکل چلاتی۔ گھوڑے کی سواری کرتی۔ اور بندوق چلانا بھی سیکھتی تھی۔ نشانہ چوک جانے پر ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔ نہ کوئی غم تھا نہ کوئی فکر۔

کیونکہ میرے فادر ایک عیسائی راہب تھے در گذر یقیناً ان کا شعار تھا۔ مخلوق کو محبت کی نصیحت اور سبھوں کے ساتھ اپنائیت اور بہتری کے سلوک کا پیغام دینا انکا دینی فرض تھا۔ میرے گھر میں ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان دنوں کے لوگ کورٹ کچہری کرنا اپنی بے عزتی کرنا سمجھتے تھے۔ لوگوں کی بہت سی مشکلات اور مسائل میرے فادر ہی حل کر دیتے تھے۔ گرجے گھر کو سنبھالنا۔ پوری کلیسا کی نگہبانی کرنا، گرجے میں عبادت کرنا۔ گھر گھر جا کر مریضوں کے لئے دعا کرنے میں ہی ان کا سارا دن گزر جاتا تھا۔

میری ماں ایک ٹیچر اور ایک سوشل ورکر تھیں۔ وہ گھر میں غریب بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ لڑکیوں کو سلائی اور بنائی سکھاتی تھیں۔ گاؤں میں جاتی تھیں۔ گاؤں کی عورتوں کو بچے پالنے اور بچوں کو پڑھانے کا درس دیتی تھیں ان کا کہنا تھا ہر لڑکی کو قابل اور خود کفیل ہونا چاہیئے تا کہ وہ کبھی کسی کی محتاج نہ رہے۔ کیونکہ تعلیم ہی معاشی آزادی کا واحد ذریعہ ہے اس لئے ہر لڑکی کو پڑھانا نہایت ضروری ہے۔ ان دنوں اسکولوں کی کمی تھی۔ لڑکوں کو تعلیم میسر نہ ہوتی تھی۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہ تھا۔ لڑکیوں کی پڑھائی کے لئے پیسہ خرچ کرنا فضول خرچی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے میری ماں کو اپنی تینوں بیٹیوں کی تعلیم کی بے حد فکر تھی۔

مائیں تو سب ہی بہت پیاری اور قابل ہوتی ہیں۔لیکن میری ماں کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ وہ بے حد محنتی اور قابل عورت تھیں۔عورتوں کا حال برا تھا۔مگر ہندوستان میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔عام لوگ تعلیم کی اہمیت کو سمجھنے لگے تھے۔تعلیم یافتہ روشن خیال وطن پرست وطن سے غریبی اور جہالت مٹانے کی کوشش میں جٹے ہوئے تھے۔بڑے شہروں میں تو اسکول تھے اور نئے بن بھی رہے تھے۔مگر غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ مشنری اسکول کھل رہے تھے۔میرے والدین بچوں کو ان اسکولوں میں جگہ دلواتے تھے۔

بچپن کے وہ پیارے پیارے دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ایک کالی رات کے کسی منحوس پل میں سب کچھ بدل گیا۔میرا آسودہ اور قیمتی بچپن بکھر گیا اور سسک سسک کر دم توڑ گیا۔

میں ابھی گیارہ سال کی بھی نہ تھی کہ اچانک میری ماں چل بسیں۔بستر مرگ پر جب وہ آخری سانسیں لے رہی تھیں میرے فادر کو ہدایت دی کہ میری تینوں بیٹیوں کو لکھنؤ کے لال باغ انگلش میڈیم اسکول میں ضرور بھیجا جائے۔شاید اپنی ماں کی وجہ سے ہی آج میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔وہ کیا چاہتی تھیں وہ میں نہیں جانتی لیکن شاید میں وہ نہ بن سکی جو وہ چاہتی تھیں۔ماں کی ناگہانی موت کا میرے دل پر گہرا صدمہ ہوا۔اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنا بڑا صدمہ میں برداشت نہ کر سکی۔ایک ہنستی کھیلتی مسکراتی بچی یکا یک بوڑھی ہو گئی۔پھر نہ کبھی کوئی یاد آیا نہ کبھی کسی خوشی کا احساس ہوا،ماں اور ماں کی ممتا کے بغیر یہ دنیا بنجر سی لگنے لگی تھی۔خدا نے سب کچھ افراط سے دیا تھا مگر ہماری سب سے قیمتی شے لیکر ہمیں فقیروں سے بدتر بنا دیا تھا۔پھر نہ کبھی سائیکل چھوئی نہ بندوق اٹھائی اور نا ہی کبھی گھوڑے کے قریب گئی۔

زندگی تو معمول پر آنہ سکی مگر زندگی کے شب و روز گذرنے لگے۔آہستہ آہستہ ہم چھوٹے پانچوں بھائی بہن آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مشغول ہو گئے۔بننا تو مجھے بھی اپنی ماں کی طرح ٹیچر تھا مگر خدا کو وہ منظور نہ تھا۔ ملک کی تقسیم کے وقت میں نے سڑکوں پر قتل عام ہوتے دیکھا۔خون میں لت پت لاشیں دیکھیں۔زخمیوں کو مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے دیکھا۔مگر کوئی مددگار ہی نہ تھے۔اس سانحہ نے میرے اندر اذیت اور کرب کی ایسی ٹیسیں پیدا کر دیں کہ میں نے ٹیچر بننے کا خیال ملتوی کر کے نرسنگ ٹریننگ لے لی۔تیرہ سال دل و جان سے خلق خدا کی خدمت کی۔نوکری کیا چھوڑی میرا ناتا غریب مریضوں سے ٹوٹ گیا جس کا مجھے آج بھی غم ہے۔

میں یہ تو بتانا ہی بھول گئی کہ میں اپنی ماں کے ساتھ کئی دفعہ گاؤں گئی تھی۔وہاں کے غریبوں اور بیمار بچوں کو ننگا بھوکا دیکھ بہت دکھی ہوتی تھی۔میری سب سے بڑی بھابی ڈاکٹر تھیں۔ان کے ساتھ بھی میں کئی دفعہ گاؤں گئی تھی۔ہمارے بھائی کے گھر میں نیچے چھوٹا سا ہسپتال تھا اور بھابی اوپر رہتی تھیں۔جب بھی لکھنؤ کے ہاسٹل میں چھٹی ہوتی ہم بہنیں اپنی بھابی کے ساتھ ہی چھٹیاں گزارتی تھیں۔مریضوں کی آہ و پکار مجھے پریشان کر جاتی تھیں۔ سمجھ نہیں آتا تھا کس طرح ان کی مدد کروں۔

سنتے آئے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنائے جاتے ہیں۔جوڑے بنانے والے نے میرا نام ایک بنگالی ہندو برہمن کے ساتھ جوڑ کر مجھے الجھنوں میں ڈال دیا تھا۔میری شادی ڈاکٹر آنندلال گوسوامی سے ہوئی جو ۱۹۸۵ء میں انڈین ریلویز میں ڈائرکٹر جنرل ہیلتھ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

اس زمانے میں ایک بنگالی ہندو برہمن کی شادی ایک عیسائی پادری کی بیٹی کے ساتھ ہونا عام بات نہ تھی۔ مخالفتوں کا مقابلہ کرتے کرتے اور آٹھ سال کی لمبی کشمکش کے بعد آخر سب کو ماننا پڑا کہ محبت کی کوئی قوم نہیں ہوتی ۔ڈاکٹر گوسوامی بنگالی ہندو برہمن ۔میں عیسائی اور سماج کی منظوری کی مہر لگانے والے رجسٹرار صاحب مسلمان تھے۔ میری شادی دہلی میں ہوئی۔ ڈنر (constitetion club) میں ہوا۔ ڈسمبر ۶۔۱۹۶۰ء میں میری شادی ہوئی اور ۲۵ اپریل ۲۰۱۱ء کو اسی کلب میں مجھے ایوارڈ دیا گیا۔ میں تو جانا سکی میری بڑی بہن آلو نے جا کر ایوارڈ لیا تھا۔

۱۰ ڈسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی سسرال کلکتہ پہنچی ۔گھر کی چوکھٹ پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس روایتی خاندان میں میرا کبھی کوئی مقام ہوگا بھی یا نہیں ۔ایسے روایتی لوگوں کی دہلیز پر محبت شہید ہوتی ہے۔ محبت کرنے والوں کو یہ لوگ باغی سمجھتے ہیں اور باغی کی سزا صرف موت ہے۔ میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اندر لے جائی گئی۔ سب چھوٹوں نے میرے چرن چھوئے اور میری ساس نے آشیرواد دیتے ہوئے کہا۔ میں کیا کہوں؟ تم خود ہی ساوتری ہو۔ جس انداز سے سب نے میری طرف دیکھا مجھے یقین ہو گیا کہ اس خاندان میں میرا بھی ایک مقام ہے۔ میں اس خاندان کا حصہ ہوں ۔اور ،بہو ہونے کے ناطے آج میری ذمہ داریوں کا دور شروع ہو گیا ہے۔ میں نے من ہی من میں اپنے مالک سے دعا مانگی کہ وہ مجھے توفیق دے کہ اپنی ساری ذمہ داریاں پوری ہمت صداقت اور محبت کے ساتھ بہ خوبی انجام دے سکوں۔ میں سارا ماجرا دیکھ دیکھ حیران تھی۔ اس چھت کے نیچے نفرت، حقارت کا شائبہ تک نہ تھا۔

چار دن کے بعد واپسی ہونا تھی۔ مگر میں نے ڈاکٹر گوسوامی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میری ساس بہت بیمار تھیں اور گھر میں سوائے میرے اور کوئی عورت نہ تھی جو ان کی دیکھ بھال کرتی۔ میں سسرال میں رک تو گئی تھی مگر دل اندر سے گھبراتا ہی رہتا کہ نہ جانے کب پلڑا اپلٹ جائے۔ لیکن میری ساس اور دیور نے میرا بیحد خیال رکھا۔ ایک ماہ کے بعد میرے دیور کی شادی ہوئی۔ میں سارے کنبے سے ملی۔ سبھاش چندر بوس کی بیوی اور بیٹی دونوں میرے دیور کی شادی میں شرکت کرنے vienna سے آئی ہوئی تھیں ان کی مہمان نوازی کرنا میری ذمہ داری تھی۔ ہم لوگوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں اور بہت سی تصویریں بھی اتاریں۔

میں تھوڑی بہت بنگالی سمجھنے لگی تھی۔ ساس تھوڑی انگلش اور ہندی جانتی تھیں۔ ہنس کر کہتی تھیں کہ میں نے میرے بچوں کو انگریزی پڑھائی ہے۔ ہم سب کو پیار کی بولی آتی تھی جو سب سے آسان ہے۔ شاید اسی لئے ہم ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھ لیتے تھے ہم گھر میں کل تین افراد تھے۔ میں میری ساس اور میرے دیور لیکن دن بھر لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ماں کو ہر وقت میری فکر رہتی تھی۔ کہتی تھی۔ نئی جگہ، اپنوں سے میلوں دور۔ فرق بولی۔ فرق کھانا اور فرق رہن سہن۔ بھلا شادی کے بعد کونسی نئی بہو ایسے ماحول میں اکیلی رہتی ہے۔ دیور جی سے کہتی ساوتری کو باہر گھمانے لے جا۔ کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھلا دے۔ پتا نہیں اسے ہمارے گھر کا کھانا اچھا بھی لگتا ہے یا نہیں۔ نوکر سے کہتی۔ ساوتری کو مونیکا سنیما ہال میں چھوڑ آ۔ ہندی سنیما دیکھے گی تو اس کا دل بہل جائے گا۔

ایسی پیاری سی ماں کو چھوڑ کر میں ڈاکٹر گوسوامی کے ساتھ اپنے نئے سفر پر چل پڑی تھی۔ برہمن بدھوائیں اُن دنوں دن میں صرف ایکبار کھانا کھاتی تھیں اور وہ بھی برہمن کے ہاتھوں سے پکا ہوا۔ مجھ سے کہتیں تم برا مت ماننا میں تمہارے ہاتھوں کا چھوا صرف چاول نہیں کھا سکتی اور سب تو کھا لیتی ہوں۔ ہمارے پرانے رسم

ورواجوں نے ہمارے ذہنوں کو جکڑ رکھا ہے۔ بچپن سے سنتے آئے ہیں یہ کرو گے تو وہ ہوگا یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ مگر ہر رسم میں کوئی نہ کوئی بھید چھپا ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں ایسا کوئی رواج نہیں مگر میرے فادر کسی کے ہاتھ سے پانی بھی نہ پیتے تھے انہیں صفائی کا بڑا وہم تھا۔ سو بات ختم کر دی۔

ہم دونوں اس گھر ساتھ ساتھ جا رہے تھے جس میں رہنے کا خواب ہم نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ اب جب اس خواب کی تعبیر ہونے کو تھی تو میرے دل کا عجب حال ہو رہا تھا۔ کبھی خوشی سے جھوم اٹھتا تو کبھی گھبراہٹ کی ایک لہر اس خوشی کو مٹا ڈالتی۔ نیا گھر، نیا ماحول، آگے کیا ہوگا۔ میں ان ہی فکروں میں ڈوبی تھی کہ اچانک پٹاخوں کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے کہا لگتا ہے آس پاس کے گاؤں میں اور بھی شادیاں ہو رہی ہیں۔ وہ ہنس کر بولے ان گاؤں والوں کو تو صرف ایک ہی شادی کی خبر ملی ہے جو کئی دن پہلے دہلی میں ہوئی تھی۔ یہ پٹاخے تمہارے لئے ہیں۔ ریلوے اسٹاف کے لوگ ان پٹاخوں سے تمہارا سواگت کر رہے ہیں۔ تمہیں مبارکباد دے رہے ہیں۔

اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ ایک بڑی بھیڑ نے رنگ برنگی بہترین پھولوں کے گلدستوں اور ہاروں سے ہمارا استقبال کیا۔ پھول برستے رہے اور ہم دونوں ان کی دعاؤں کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

کوٹھی کے گیٹ پر ریل کے افسروں نے بھی پھولوں اور ہاروں سے استقبال کیا۔ منزل ملی تو روح سرشار تھی۔ دلدار کے ساتھ ٹھکانا ملا تو خوشی سے دل ٹھکانے نہیں رہا۔ یوں لگا پروردگار نے میری جھولی میں دنیا بھر کی دولت اور نعمتیں بھر دی ہوں۔ اس بے وفا دنیا میں ایک سچے مخلص ساتھی کا ساتھ ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ ایک عورت چاہ بھی کیا سکتی ہے۔

گھر میں ایک بھیڑ جما ہو گئی تھی۔ ہنس کر بولے ''سب سے مل چکو تو ذرا دیر کے لئے ہم سے بھی ملو'' بیمار بوڑھی ماں کو ہم کلکتہ چھوڑ آئے تھے مگر ہمارے دیور کو چین نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر کلکتے گئے اور ماں اور ان کی ایک پرانی سہیلی کو بھی ساتھ لے آئے۔ میں ماں کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ بیٹے کے نہیں بلکہ اپنے ہی گھر آئی ہے۔ میں نے کہا ماں دیکھئے میں نے آپ کا گھر سنوار کے رکھا ہے اور ساتھ ہی ان کے چرن چھوئے۔ انہوں نے مجھے پیار سے تھاما اور آشیرواد دی۔ مجھے یوں لگا برسوں بعد میری اپنی ماں لوٹ آئی ہیں۔

ماں کے مبارک قدم گھر میں پڑتے ہی برکتوں کی بارش ہونے لگی، میری بڑی بیٹی سمیتا آ گئی۔ ہسپتال میں سب نے دیکھ کر منھ بنایا۔ میں نے کہا بھئی میں لڑکی پا کر بہت خوش ہوں تم لوگ کیوں منھ سکوڑ رہے ہو۔ جواب ملا۔ کاش ہمارے ڈاکٹر صاحب کو بیٹا ہوتا۔ میڈم بیٹا بیٹا ہی ہوتا ہے۔ ماں نے سنا تو کہا ساوتری پہلی بیٹی لکشمی ہوتی ہے۔ نہ جانے کب ہمارے یہ جاہل لوگ بدلیں گے۔ مجھے خدا نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ جب مدھو پیدا ہوئی تب ماں نے کہا اب تمہارا پریوار پورا ہو گیا۔ چھوٹا پریوار سکھی پریوار۔

نہ معلوم چھوٹے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اگر وہ ماں کی تھالی چھو دے گا تو وہ کھانا بند کر دیں گی۔ جیسے ہی دن میں کھانا کھانے بیٹھتی تھیں وہ دوڑ کر انکے پاس پہنچ جاتا اور ہنس کر کہتا۔ ہاتھ لگا دوں۔ ماں مجھے پکارتیں۔ میں اسے ڈانٹتی تو کہتی بہت پیارا ہے۔ اسے کچھ نہ کہہ۔ اپنے باپ سے دس گنا زیادہ شریر ہے۔ بس دن ایسے ہی ہنسی خوشی سے گزر رہے تھے۔

اس فانی دنیا میں کسی شے کو ثبات نہیں۔ ہر چیز آنی جانی ہے۔ سوماں کے جانے کا دن بھی آ ہی گیا۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ڈاکٹر گوسوامی یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ انکی ماں انہیں چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جب میں نے انہیں دلاسا دیا تو بولے میں نے تو اپنی ماں کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔ تھینک یو ویری ویری مچ تم نے میری ماں کی سیوا بہو کی طرح نہیں ایک بیٹی کی طرح کی ہے۔ میں نے کہا۔ وہ میری بھی ماں تھیں۔ انہوں نے مجھے ماں کا پیار دیا۔

میری چاروں نندیں۔ دیور اور جیٹھ کھڑک پور آ گئے تھے۔ آخری وقت ماں نے کہا۔ ساوتری تم نے مجھے جینے کی شکتی دی۔ اب مجھے مرنے کی بھی شکتی دینا۔ میرا ہاتھ نہ چھوڑنا۔ گھر بھرا ہوا تھا مگر آخری وقت ماں کا ایک ہاتھ ڈاکٹر گوسوامی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ چلی گئیں۔ اور میرا ابھرا پرا گھر سونا کر گئیں۔

سب کا کہنا تھا وہ لکشمی تھیں۔ واقعی وہ قسمت کی دھنی تھیں۔ انکی خواہش کے مطابق انکے تینوں بیٹے انکی میت کلکتہ لے گئے۔ اور انکا انتم سنسکار گنگا دھارے ہی ہوا۔ انکی خواہش کے مطابق انکی استھیاں (راکھ) الہ آباد، بنارس، ہری دوار، رشی کیش، اور کلکتہ میں بہائی گئیں۔ ہر جگہ دان پن کیا گیا۔ غریبوں۔ بدھواؤں، یتیموں کو کپڑے بانٹے گئے۔ اور کھانا کھلایا گیا۔ خاندان کے پنڈت نے کہا آج کل کوئی اپنی ماں کے لئے اتنا خرچا نہیں کرتا۔ ڈاکٹر بولے جو بھی کیا کم ہی تھا۔ ماں کی مرضی پوری کرنا ہم چاروں بھائیوں کے بس میں نہ تھا۔ وہ تو پیدا ہی دینے کے لئے ہوئی تھیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں دیتے ہی دیکھا تھا۔

میرے بڑے جیٹھ mr ur goswami جو ان دنوں vienna میں رہتے تھے۔ نہ آ سکے تھے، دستور کے مطابق وہی ہمارے خاندان کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ ہر سال میرے گھر آ کر ٹھہرتے تھے۔ ان کا خط آیا۔ ساوتری میں بہت خوش تھا ماں تمہارے ساتھ تھیں۔ اور بہت آرام سے تھیں۔ تم ہمارے گھر کی محور ہو اور ہمارا پورا کا پورا خاندان تمہارے چاروں طرف چکر کاٹ رہا ہے۔ جب ڈاکٹر گوسوامی نے خط پڑھا تو بولے آخر تم جیت ہی گئیں۔

میں نے اپنے خدا کا شکر بجالایا کہ اس نے میرا مان رکھ لیا تھا۔ اور میں سرخرو ہو گئی تھی۔ بہوئیں ہمیشہ سسرال والوں کو الزام دیتی ہیں اور یہ بھول جاتی ہیں کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر بہوئیں اپنے فرائض خوشی خوشی ادا کریں تو گھر میں شانتی اور امن برقرار رہے گا۔ بزرگ چلے جاتے ہیں۔ انکے پیچھے انکی دی ہوئی دعائیں اور برکتیں ہی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ پیار اور خدمت کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔

بچوں کی پرورش، سوشل ورک اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں وقت گزرتا گیا۔ ہم سات سال اجمیر شریف میں رہے۔ درگاہ شریف گئے۔ وہاں پھولوں کی چادر چڑھائی اور ہم سب نے سر جھکائے۔ ڈاکٹر نے دونوں بچوں کے سر اپنے ہاتھوں سے جھکائے۔ یہ دیکھکر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کے دل میں ہر مذہب کے لئے احترام اور عزت ہے۔

ان دنوں کوئی خاص dress designer نہیں ہوتے تھے۔ میں اپنے ہاتھوں کا بنا لہنگا، کرتا اور چولی جے پور emporium لے گئی۔ وہاں کے i a s افسر کو پسند آ گئے ان کی dres designer بن گئی۔ غریب، ان پڑھ بدھوا لڑکیوں کو سلائی سکھائی اور ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ جب ڈاکٹر گوسوامی کا ٹرانسفر گورکھپور ہوا مجھے کام بند کرنا پڑا۔ ان لڑکیوں کو روتا دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ ایمپوریم کے انچارج بھی کام سے بہت

خوش تھے، آپ یہاں ہی رک جائیے۔ یہاں بچوں کی پڑھائی بھی بہت عمدہ ہے۔ مگر میں نہ رکی۔ ہندوستانی عورت تو اپنے شوہر کی چھاؤں تلے ہی تو پنپتی ہے، سو میں گورکھپور چلی گئی۔ وہاں میری زندگی کی دھارا ہی بدل گئی۔

گورکھپور میں قلم اٹھایا۔ ڈرامے لکھے۔ کسی کو جانتی نہ تھی۔ ڈرامے لے کر رکشا میں سوار ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئی۔ وہاں کے انچارج کو ڈرامے پسند آ گئے۔ بڑے فخر سے ڈاکٹر کو بتایا کہ چھ آنے کے رکشے نے میری ساری مشکل حل کر دی۔ وہ بولے رکشے والے بہت لاپروائی برتتے ہیں۔ روز حادثے ہو رہے ہیں۔ آگے نہ جانا، میں ان لوگوں کو گھر پر بلا لونگا۔ ڈرامے ریڈیو پر ریلے ہوتے تھے۔ پھر ایسی بیمار پڑی کہ قلم ہی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ صحت یاب ہونے میں کافی عرصہ لگا۔

ڈاکٹر کا تبادلہ کلکتہ ہو گیا۔ وہاں ڈاکٹر کا سارا کنبہ تھا۔ ان سب کے ساتھ خوب اچھا وقت گزرا۔ بچے کالج پہنچ گئے۔ سمیتا کی شادی ہو گئی۔ بیٹا روی شنکر رانچی چلا گیا۔ اور مدھو دہلی شری رام کالج ہوسٹل چلی گئی۔

آٹھ سال وہاں کاٹے اور ڈاکٹر director genral heaith india rly ہو کر دہلی چلے گئے۔ وہاں میرا پورا کنبہ تھا۔ اور وہاں سے ریٹائر ہو کر ڈاکٹر گوسوامی حیدر آباد گئے وہاں deccon medical college کے adviser رہے اور ہم دونوں پھر کلکتہ چلے گئے۔ حیدر آباد چھوڑنے کا مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ اشرف حفیظ الدین ڈاکٹر صاحب کو راکھی باندھتی تھی اور ہم سب پر جان چھڑکتی تھی۔ اپنوں کو چھوڑنے کا دکھ تو ہوتا ہی ہے۔

کلکتہ میں رشید خان اور نسیم سے ملی۔ ان دونوں سے ہم کھڑک پور میں ملے تھے۔ رشید اردو اور انگلش میں بہت عمدہ لکھتے تھے۔ بے حد ایماندار اور قابل پولس افسر تھے۔

directer inteligenc branch کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے انشار سالہ مجھے دیا سو اعجاز صاحب کا پتہ ملا۔ میں نے دوبارہ قلم اٹھایا۔ دو کہانیاں لکھ کر اعجاز صاحب کو بھیج دی۔ ۶۵ سال کی عمر سے لیکر آج تک لکھ رہی ہوں۔ اعجاز صاحب نے حوصلہ افزائی کی۔ آج تک ۶۰ افسانے لکھ چکی ہوں۔ جو ہندوستان کے ۱۶ رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ شکر خدا کا سراہے بھی گئے۔ مجھے دنیا کے کونے کونے سے بے شمار خط موصول ہوئے میں نے زیادہ ملک کی غریبی اور عورتوں کی بدحالی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جہالت اور غریبی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ملک میں تعلیم بڑھے گی تو جہالت خود بخود دور ہو جائے گی۔ جہالت کم ہوگی تو روزگار بڑھے گا۔ پھر غریبی کا گھٹنا لازمی ہے۔

۲۰۰۰ء میں ایک کتاب ''ساوتری گوسوامی کے افسانے'' جس میں ۱۱۴ افسانے ہیں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کتاب ۲۰۱۰ میں ہندی میں شائع ہوئی۔ یہ میری نہیں میرے افسانے چاہنے والوں کی خواہش تھی کہ کتاب ہندی میں چھاپی جائے کیونکہ انہیں اردو نہیں آتی۔

پاکستان کے مشہور رسالے ''منشور'' میں بھی میرا افسانہ ''نا سمجھ'' چھپ چکا ہے۔ پاکستان کے مشہور شاعر خالد شریف صاحب آسٹریلیا تشریف لائے تھے۔ میں نے ان کا استقبال کیا اور اپنا ایک افسانہ پڑھا۔ خدا کا شکر خالد صاحب کو اور سب ہی سننے والوں کو پسند آیا۔ خالد صاحب میرے دو افسانے اپنے

رسالے ''ماورا'' میں چھاپنے کے لئے پاکستان لے گئے تھے۔ وہ میری ایک کتاب بھی چھاپنے جا رہے ہیں۔

ف۔س اعجاز صاحب نے ستمبر ۲۰۰۳ کے ماہنامہ انشاء میں لکھا کہ کلکتہ کے حوالے سے ساوتری گوسوامی کا ذکر بہ حیثیت افسانہ نگار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مخلوق کو محبت کی نصیحت اور سبھوں کے ساتھ اپنائیت اور بہتری کے سلوک کا پیغام دینا ان کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ ان کی کہانیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ساوتری گوسوامی میں یہ خوبیاں موروثی ہیں۔

نفرت یا انتقام کا جذبہ ان سے کوسوں دور کھڑا معلوم ہوتا ہے۔ ترک اور تپاک کے لئے ساوتری گوسوامی کا جو نظریہ زندگی نے تیار کیا ہے اسکا انجام الم نہیں بلکہ مسرت ہے جدائی نہیں بلکہ وصال ہے۔ مایوسی نہیں بلکہ امید ہے۔''

ہندوستان میں میرے افسانے انشاء۔ باجی۔ فلمی ستارے۔ محفل صنم۔ گلہائے خنداں، بیسویں صدی، بتول۔ نور۔ گلابی کرن۔ خاتون مشرق۔ مستانہ جوگی۔ بزم سہارا۔ شاخیں۔ گواہ۔ آزاد ہند۔ اجالا، اسباق میں چھپ چکے ہیں اور آج بھی چھپ رہے ہیں۔

۲۰۰۷ میں مجھے کلکتہ جانا پڑا۔ وہاں اعجاز صاحب نے ایک اردو مجلس کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے ایک افسانہ پڑھا۔ سب نے بہت دلچسپی اور شوق سے سنا۔ میں کوئی جانی مانی قلم کار تو ہوں نہیں مگر دل سے نکلی سچی بات سامعین کو سننے اور محسوس کرنے پر سوچنے کو مجبور کر دیتی ہے کلکتہ سے اعجاز صاحب کا خط آیا کہ آپ نے جس انداز سے افسانہ پڑھا لوگوں میں افسانے سننے کا شوق بڑھ گیا ہے۔ آپ ہندوستان لوٹ آئیں اور افسانے پڑھیں۔ تب ہی خیال آیا کہ اندھوں۔ اپاہجوں اور غریبوں کے لئے سی ڈی اور اوڈیو کیسٹ بناؤں۔ ان مجبوروں کی رسائی نہ کسی لائبریری تک ہوتی ہے اور نا ہی کسی کے پاس اتنا وقت ہے جو ان کو پڑھ کر کچھ سنائے۔ میں ان کے دلوں پر دستک دینا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ میرے افسانے سنکر ان کے ذہنوں کو تفریح ملے۔ دلوں کو تازگی اور راحت نصیب ہو۔ ان کے اداس لبوں پر مسکراہٹ پھیلے اور میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے۔ جی ہاں۔ بس یہی تو میں چاہتی ہوں کہ وہ خوش ہو کر مسکرائیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔۔۔ مسکرائیں تو۔۔

کلکتہ میں جمعہ ۳ دسمبر ۲۰۱۰ ماہنامہ انشاء کی سہ روزہ سلور جبلی تقریبات کا آغاز۔ انشاء کے ۲۱ ویں خاص شمارہ۔ سلور جبلی۔ ٹیگور نمبر۔ کا اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے کیا۔ میں بھی وہاں بلائی گئی تھی۔ وہاں میری ملاقات گلزار صاحب اور پاکستان کے اور ہندوستان کے کئی نامور ادیبوں سے ہوئی۔ میں نے اور گلزار صاحب نے افسانے پڑھے۔

میں دہلی پہنچی اور c d بنانے کا کام بھی پورا کیا۔ ۶۰ کہانیوں کا c d تیار ہو رہا ہے اور بہت جلد آپ سب تک پہنچ جائے گا۔ اگر آپ کو افسانے سننے کا شوق ہے تو برائے مہربانی مجھ سے رابطہ کریں۔

اس سال ساحر کلچرل اکیڈمی کے لئے بارہ اعزازی ٹرسٹی چنے ہیں۔ کیول دھیر صاحب نے آسٹریلیا سے مجھے چنا ہے۔

دہلی میں ۲۵ april ۲۰۱۱ کو human weljar doundetion کی طرف سے مجھے ایوارڈ دیا گیا۔ میں تو آسٹریلیا سے جا نہ سکی میری بڑی بہن آلو نے میری طرف سے شرکت کی اور اوارڈ لیا۔ یہ پروگرام

۱۹۶۰-۶ duemler میں میری شادی کا ڈنر ہوا تھا coustitetion club delhi میں ہوا۔ اسی کلب میں
اگر ڈاکٹر گوسوامی صاحب ہوتے تو ہم دونوں ضرور اوارڈ لینے ساتھ ساتھ جاتے۔

دہلی میں shri shakti bhdura ji(m p) سے ملی۔ یہ وہ مہمان ہستی ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی اپنے وطن کی بہتری اور بہبودی کے لئے کام کیا ہے۔ آزادی کی جنگ میں ساڑھے تین سال جیل بھی کاٹی۔ انگریزوں کے ظلم وستم سہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ میرے گھر آئے اور مجھے انعام دیا۔ انھیں میرے افسانے پسند آئے۔ ایسے مہمان لوگوں کو کوئی کیا دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے افسانے ان کے حوالے کر دیئے۔ وہ میری دو کتابیں چھاپنے جا رہے ہیں۔

میرے خاندان میں کوئی اردو نہیں پڑھ سکتا۔ بیٹا روی شنکر غزلیں گاتا ہے۔ تینوں بچے سمیتا۔ ردی اور مدھو اردو سمجھتے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اپنے گھر کے افراد کی مدد کے بغیر تو کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ان سب کا تعاون ملا اور میں لکھتی چلی گئی۔ اسٹریلیا میں طرح طرح کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ پرتھ میں صرف ہم دو ہو ہندوستانی شخص اردو لکھتے ہیں۔ میں افسانے لکھتی ہوں اور مسٹر تنویر خان بہت عمدہ شاعری کرتے ہیں۔ جب بھی پاکستانی اردو کی محفل سجاتے ہیں ہم دونوں کو ضرور بلاتے ہیں۔ میں یہاں بھی اپنے افسانے پڑھتی ہوں۔ ہر اتوار کو کچھ ہندوستانی ملتے ہیں۔ ہم سب ملکر اردو شاعری کرتے ہیں۔ میں اپنے افسانے پڑھتی ہوں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ دیار غیر میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

یہاں کے lerning cester جاتی ہوں۔ عورتیں بیٹھ کر بنائی کرتی ہیں۔ میں وہاں جا کر عورتوں کو بنائی سکھاتی ہوں۔ انہیں ہندوستان کے بارے میں بتاتی ہوں۔ میں بھی چیرٹی کے لئے بنائی کرتی ہوں۔

میرا ملک غریبی میں جوجھ رہا ہے۔ ہوشیار بچے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپ جوان لوگ برسر روزگار ہیں۔ ہاتھ بڑھایئے۔ ایک غریب بچے کا ہاتھ تھام کر اسے غریبی اور مفلسی کی دلدل سے باہر کھینچ لایئے۔ آپ ایک پورے خاندان کو روشن کر دینگے۔

جی ہاں۔ آج کی نسل کے کاندھوں پر ذمے داریوں کا بھاری بوجھ ہے۔ آپ کو ہی آنے والی نسل کو بھی چراغ دکھانا ہے۔ آپ ہی انہیں جینا سکھائینگے۔ ہنسنا سکھائینگے دیری نہ کریں۔ اپنے وطن کو آگے بڑھانے میں آپ کا ساتھ ضروری ہے۔ ڈاکٹر گوسوامی صاحب ۲۰۰۹-۶ ستمبر کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ میرا ہمسفر۔ میرا ساتھی، میرا دوست بچھڑ گیا۔ ڈرتی ہوں کہیں قلم نہ مجھ سے بچھڑ جائے، مجھے آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ دعا کریں کہ خدا مجھے طاقت دے ہمت دے اور میں اپنا پیغام آپ تک پہنچاتی رہوں۔

یہ میرا پہلا سی ڈی میرے بچھڑے ساتھی کے نام ہے۔ جو خوب جانتا تھا یہ بندھن ٹوٹنے والا نہیں۔ وہ تو مر کر بھی زندہ ہے۔

وہ ایک شخص۔ جو میرا ہمسفر تھا۔

اپنوں نے کہا۔ وہ سورج تھا۔ وہ گیا تو ساتھ ہمارا آسمان لے گیا۔

دوستوں نے کہا وہ سمندر تھا۔ وہ ہمارے سارے دکھوں کا درماں تھا۔

وہ ایک شخص نہ جانے کیا کیا تھا۔
نام جسکا آنندلال گوسوامی تھا۔ جو کہتا تھا محبت زندگی ہے۔
''خدمتِ خلق'' خدا کی عبادت ہے۔
قیمتی لوگوں کو بھلانا اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ ان کی جدائیوں کے غم روح جھیلتی رہتی ہے۔ جب تک کہ انسان اپنی آخری منزل تک نہ پہنچ جائے۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ جہاں میرا ہمسفر اکیلے کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں سے ہم دونوں ساتھ ساتھ اپنے مالک کے پاس جائینگے جس نے ہمیں ملایا تھا
مجھے آپ سب کی دعاؤں کی بیحد ضرورت ہے۔ دعا کریں کہ خدا مجھے کوئی درد اور گہرا صدمہ نہ دے میرے ان ناتوان کمزور بدن میں اب کسی بھاری صدمے کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ جی ہاں غموں کا بوجھ سب سے بھاری ہوتا ہے۔ طاقتور سے طاقتور انسان کو چور چور کر کے زمین بوس کر دیتا ہے۔

ساوتری گوسوامی

☆☆☆

منزلیں

طارق خان کی وفات کے بعد انکے چھوٹے بھائی آفتاب خان نے قبیلے کی باگ ڈور سنبھالی ۔آفتاب خان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں پر انہوں نے طارق خان کے شیر خان کو ہی اپنا بڑا بیٹا سمجھا۔شیرو آفتاب کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔بلقیس بیگم نے بھی شیرو کی بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی تھی۔وہ اس بے ماں باپ کے بچے کی آنکھوں میں آنسوں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔شاید انہیں کے لاڈ اور پیار نے شیرو کو بیحد ضدی اور تند خو بنادیا تھا وہ بڑی امی سے اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے تھے۔وقت آگے بڑھتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ شیرو بھی بدلتے گئے۔

آفتاب خان اپنی ساری کوششوں اور کاوشوں کے باوجود بھی شیرو کو وہ نہ بنا سکے جو وہ چاہتے تھے۔لے دے کر شیرو خان اسکول سے کالج پہنچے۔کالج سے شکایتیں آئیں تو آفتاب خان گھبرائے۔بلقیس بیگم سے بولے کہ شیرو ہمارے بھائی جان کی واحد نشانی ہے وہ ہمارے بعد اس گھر اور قبیلے کا سردار ہوگا۔آپ اس کے ساتھ ذرا سختی سے پیش آئیں۔بیگم چونک پڑیں۔۔۔اب ایسا کیا کر دیا اس نے جو آپ اتنے بگڑ رہے ہیں۔وہ بولے ہم اس کی طرف سے فکر مند رہتے ہیں۔اگر بری صحبت میں پڑ گیا تو غضب ہو جائے گا۔

اپنے علاقے میں جو چھوٹے موٹے حادثے ہوتے تھے وہ ہمارے لوگ سنبھال لیتے تھے۔اب کچھ زیادہ ہی ضدی اور سرکش ہوتے جا رہے ہیں آپ کے دلارے۔شہر سے خبریں آتی رہتی ہیں۔بیگم کا وہی جواب ۔خبریں جھوٹی ہیں۔۔۔بیگم آپ تو اسے ہمیشہ بے قصور سمجھتی آئی ہیں۔خیر جو بھی ہے۔ہم تو مصروف آدمی ہیں، آپ حویلی میں رہتی ہیں۔اس پر خاص نظر رکھیئے۔ایسا کریں اس کے باہر جانے پر ذرا پابندی لگا دیں۔ہمیں دکھ تو یہ ہے کہ ہمارے بچے عمدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور شیرو پستی میں گرتا جا رہا ہے۔بیگم بڑے سنجیدہ لہجے میں بولیں آپ تو خواہ مخواہ فکر مند ہیں۔وہ ضدی ضرور ہے لیکن کوئی بے جا حرکت کبھی نہیں کرے گا۔اس نے بھی اس حویلی میں پرورش اور تربیت پائی ہے۔آپ باہر والوں کی باتوں کا یقین نہ کیا کریں۔ہمارا ہنستا بستا خاندان رشتے داروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔سو چنگاری لگا دی۔کیا ضرورت تھی اُسے یہ بتانے کی کہ وہ ہمارا بیٹا نہیں۔آپکا بھتیجا ہے۔۔۔ہوش تو اس نے ہماری گود میں سنبھالا ہے۔سگے بھائی کی اولاد غیر تو نہیں ہوتی۔ہمیں اپنی سگی ماں ہی سمجھتا تھا۔اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے اس کو یتیمی کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔جب سے حقیقت سے آگاہی ہوئی ہے بالکل ہی بدل گیا ہے۔احساس محرومی کا شکار ہو گیا ہے۔مانا وہ ہماری اولاد نہیں۔۔ہے تو آپ کا ہی خون۔۔گھر والوں کے لئے بھی وہ بالکل بیگانہ ہو گیا ہے۔

آفتاب خان بڑے افسردہ لہجے میں بولے۔بیگم بہکانے والوں کی کمی نہیں۔وہ بھٹک گیا ہے۔اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو انجام برا ہوگا۔اگر اس نے کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر ڈالی تو اس کی تباہی اس خاندان کو تباہ کر ڈالے گی۔۔آپ ہی کچھ کریں۔۔۔شوہر کی پریشانی دیکھ بیگم بھی پریشان ہو گئیں۔۔۔بولیں آپ فکر نہ کریں آج ہم شیرو سے بات کرینگے۔اسے سمجھائینگے۔وہ ہماری بات نہیں ٹالے گا۔

جب شیرو نے حویلی میں قدم رکھے تو آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اپنے کمرے میں بتی جلتی دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔۔۔ جانتا تھا حویلی میں ذرا گرم ہوائیں چل رہی ہیں۔ اور شاید آج ہی آتش فشاں پھٹ پڑے، کمرے میں بلقیس بیگم کو دیکھ کر تو اس کا سر ہی بھنا گیا۔۔ ایک لمحے کو رکا۔ بیگم کو بغور دیکھا اور فوراً منہ موڑ کر دوسرے کمرے کی جانب بڑھا۔ بیگم نے پکارا۔۔ ٹھہرو۔۔۔ وہ پلٹا۔۔ نہ تسلیم نہ آداب۔۔۔ سارے طور طریقے بالائے طاق رکھ دیئے ہیں۔۔ ہم بہت تھک گئے ہیں۔ ذرا گھڑی پر نظر ڈالیئے۔ یہ سونے کا وقت ہے۔ ہمیں نیند آ رہی ہے۔ ہم سونا چاہتے ہیں۔ بیگم کرختگی سے بولیں۔ اور ہم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔ ابھی۔ اسی وقت۔۔ اور تم کو ہماری بات سننا ہوگی۔ شیرو بڑی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔۔ آج نہیں۔۔ کل۔۔۔ سب کچھ کل سنیں گے۔ یہ وقت سونے کا ہے بحث کا نہیں۔ امی بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ بڑے ہی سخت لہجے میں سوال کیا۔ اور گھر لوٹنے کا وقت کونسا ہوتا ہے۔ گھر کے سب لوگ تمہارا انتظار کر کر کے سو گئے۔ صرف ہم دونوں کا کھانا میز پر رکھا ہے اور ملازم جاگ رہے ہیں۔ اگر ہمارا نہیں تو ان غریبوں کا تو کچھ خیال کیا کرو۔ وہ غصے میں بولے۔ یہ نوکر اور یہ گھر ہمارا بھی ہے۔ یہ قید خانہ تو نہیں پھر ہمارے آنے جانے پر کیوں نظر رکھی جاتی ہے۔ بیگم نے اپنے غصے پر قابو کرتے ہوئے کہا۔ شیرو۔ ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔ بیٹا یہ گھر اور اس میں رہنے والا ہر فرد تمہارا اپنا ہے۔ تمہارا سگا۔ تمہارا اپنا خون۔۔ ہر خاندان کے کچھ قاعدے ہوتے ہیں۔ جو گھر کے ہر فرد کو ماننے ضروری ہوتے ہیں۔ تم خاندان میں بڑے بیٹے ہو اس لئے تمہاری ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ اور تم اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں جاگیردار کچھ زیادہ ہی آزاد طبیعت ہوتے ہیں۔ لیکن ہم تمہیں اس آزادی کا بے جا استعمال ہرگز نہیں کرنے دینگے۔ جب تک تم حویلی واپس نہیں آجاتے ہمیں چین نہیں پڑتا۔ دل میں تمہاری جانب سے کھٹکا سا لگا رہتا ہے۔ شیرو۔ ایکدم بھڑک اٹھے۔ کھٹکا۔ وہ اس لئے کے آپ کو دنیا بھر کی ساری خامیاں ہمارے اندر ہی نظر آتی ہیں۔ اور وہ جو آپ کے دو بیٹے ہیں وہ آپ کی نظروں میں پارسا ہیں۔

غصہ کی شدت سے امی بیگم کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ایسی بدکلامی اور بدتمیزی شیرو نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کبھی ایسی دل چھیدنے والی باتیں نہیں کی تھیں۔ پھر سوچا یہ وقت غصے کا نہیں۔ پھر بھی آواز کو زیادہ دبا نہ سکی۔ شیرو، مانا ہم نے تمہیں جنم نہیں دیا لیکن تم کو سگی ماں کا پیار دیا۔ کبھی تمہیں ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ تم تو سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہماری ذرا سی تکلیف دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے۔ یہ تم۔ اچانک کیسے بدل گئے۔۔ غیروں کی باتوں میں آکر اپنوں کو غیر سمجھنے لگے۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ سنبھل کر چلو۔ اگر یہی رویہ رہا تو تمہارا حال جو ہوگا سو تو ہوگا ہی ساتھ میں پورا خاندان تباہ ہو جائے گا۔

بیگم کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی۔ دل غم سے بھر گیا۔ آواز تھرا گئی۔ وہ بولتے بولتے رک گئیں۔ اور آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہہ نکلے۔ شیرو بڑے آرام سے دیکھتے رہے۔ ان پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد زہر آمیز لہجے میں بولے۔ آپ تو یہی چاہتی ہیں ہمارا حشر نشر ہو اور آپ ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل کر ہمارا آدھا حصہ بھی اپنے دونوں بیٹوں کو دیں دے۔ خیر سے ہمارے چچا جان کے سامنے آپ کا بس نہیں چلتا۔ اب ہم بچے نہیں رہے۔ بڑے ہو گئے ہیں اور سب سمجھتے ہیں۔ بیگم کا دل چاہا شیرو کے گال پر ایک زوردار

طمانچہ رسید کریں پر ہاتھ اٹھا نہ سکیں۔ بڑے ہی غصے بھرے لہجے میں بولیں۔ تم کچھ نہیں سمجھتے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ باہر کے لوگ جنہیں تم اپنا ہمدرد دوست سمجھنے لگے ہو وہ جو کچھ برا بھلا تمہیں سمجھا دیتے وہی سب تمہارے دماغ میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اب ہمارے پیار اور ایمان پر بھی شک کرنے لگے ہو۔ جب یہ دوست تمہیں دغا دے کر تمہیں تنہا چھوڑ دینگے تب تم کو گھر والوں کی محبت کا احساس ہوگا۔ اپنوں کی قدر ہوگی۔ تب تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہم نے جیسے اپنے بچوں سے محبت کی ویسے ہی تم سے کی۔ اگر تم سوچتے ہو کہ تم بڑے ہو گئے ہو تو یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ خاندان تمہارا ہے اور تمہیں ہر قدم پر اپنے خاندان کی آن بان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے تمہاری اس حویلی کے کنگورے تک ہل جائیں۔ بہتر ہے جلدی سنبھل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو جب تمہیں ہوش آئے اور تمہارا سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھے تو بہت دیر ہو چکی ہو۔ پھر تمہارا ضمیر تمہیں جھنجھوڑ کر رکھ دے گا۔ اور زندگی پھر پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہو گے۔ یہ شراب نوشی چھوڑ دو۔ کہیں یہ تمہارا نیا نیا شوق ہم سب کو لے نہ ڈوبے۔ بیگم نے باہر جانے سے پہلے ایک بار پھر مڑ کر شیرو کو دیکھا اور بولیں۔ کل جب نشہ اتر جائے اور تم اپنے پورے ہوش وحواس میں ہو تو اپنی بڑی امی کی بات پر دھیان ضرور دینا۔ شیرو وہی صوفے پر ڈھے گئے۔ شیرو کو دیکھ امی رو پڑیں۔ ملازم کو شیرو کے کمرے میں جانے کا حکم دے کر بیگم اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ باقی رات روتے اور سوچتے کٹی۔ کس طرح اپنے اس بھٹکے بیٹے کو راہ راست پر لاؤں۔

پھر کچھ دن شیرو کمرے میں ہی رہے۔ فون کی گھنٹیاں متواتر بجتی رہیں۔ بیگم سوچ کر خوش تھی کہ ان کی دی ہوئی نصیحتوں کا کچھ تو اثر ہوا۔ شام کو آفتاب خان کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بیگم بیحد گھبرا گئیں۔ ان کی خاموشی سے اور بھی دہل گئیں۔ ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ آپ ہم سے ناراض ہیں کیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولے نہیں بیگم ناراض تو ہم اپنے آپ سے ہیں۔ بہت کوشش کے بعد بھی ہم شیرو کو انسان نہ بنا سکے۔ اب کیا ہو گیا۔ وہ مایوس ہو گئیں۔ کیا بتائیں۔ پچھلے ہفتے گاؤں کی کسی لڑکی کو اغوا کرنے میں ان کا ہاتھ تھا لڑکی تو مل گئی تھی۔ لیکن اس نے خودکشی کرلی۔ زہر کھا کر مر گئی۔ اپنے ہی گاؤں کی لڑکی تھی۔ روپیہ دے کر معاملہ سلجھایا۔ اب مار پیٹ دنگا فساد کا سلسلہ جاری ہے۔ بیگم نے سر تھام لیا۔ یہ لڑکی کا قصہ آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ وہ بولے کیا بتاتے۔ ہمیں بھی شرم آتی ہے اور آپ کو بھی دکھ ہوتا ہے۔ بیگم آہستگی سے بولیں، کئی دن سے شیرو حویلی سے باہر ہی نہیں نکلے پھر ان کا ان دنگے فسادوں سے کیا تعلق۔ مانا وہ تیز مزاج ہیں بہت جلد بھڑ جاتے ہیں لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ ایسی نیچ حرکت کبھی نہیں کریں گے۔ آپ اس معاملے کی تحقیقات اچھی طرح کرائیں۔ کسی کالج کے دشمن کی کرتوتیں ہونگی اور الزام شیرو پر دھر دیا ہوگا۔ ضرور کسی پرانی دشمنی کا سلسلہ ہوگا۔ آپ تو جانتے ہیں قبائل کسی نہ کسی طرح بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ آپ معلوم کریں شیرو کہاں جاتا ہے۔ کہاں ہوتا ہے۔ وہ بولے بیگم اس بات میں تھوڑی بہت صداقت تو ضرور ہوگی۔ ورنہ کس میں اتنی ہمت ہے جو ہمارے خاندان پر انگلی اٹھا سکے۔ اس کے کارناموں کی خبر ہمیں ملتی رہتی ہے۔ اور ہم کو ڈر یہ ہے کہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس پر اور خاندان پر کوئی بڑی آفت نہ آجائے۔ بیگم نے پھر انہیں دلاسا دیا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمیں لگتا ہے وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ آہستہ آہستہ بدل جائے گا۔ بیگم آپ کب تک اس کی حمایت کرتی رہیں گی۔ کب تک اس کی غلطیوں پر پردہ ڈالتی رہیں گی۔ وہ بڑے یقین سے بولیں جب تک وہ

راہ راست پر نہ آجائے۔ آپ بھول رہے ہیں وہ ہمارا بھی بیٹا ہے اگر بار بار اسکو ذلت کا سامنا کرنا پڑا تو ممکن ہے وہ ضد میں آ کر کچھ گڑبڑ کر ہی گزرے۔ اب بیگم اپنے شوہر کو کیسے بتائیں کے شیروان کی بھی کب سنتا ہے۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ۔ ان کے دل پر ہتھوڑے کی طرح پڑتا ہے۔ بڑی سخت تکلیف پہنچاتا ہے۔ لیکن ہم ماں ہیں اور ماں کا دل تو سمندر کی گہرائی سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ جس کی تہہ میں سارے غم چھپے رہتے ہیں۔

شام کو جب بیگم نے شیرو کے دروازے پر دستک دی وہ باہر جانے کو تیار کھڑے تھے۔ بیگم کو دیکھتے ہی بولے۔ اب ہم نے کیا کر دیا جو آپ یہاں۔۔ وہ فوراً بولی۔۔۔ وہ لڑکی۔۔ شیرو کو تو جیسے کرنٹ ہی لگ گیا ہو۔ بڑے ہی کڑوے لہجے میں بولے۔ ایک اور نئی تہمت ہمارے سر۔ اور آپ نے یقین بھی کر لیا۔ ہر سنگین جرم ہمارے ہی سر کیوں تھوپ دیا جاتا ہے۔ بیگم کا دکھ بھرا دل تڑپ اٹھا۔ ان سے سوال کیا۔۔ اب اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ ان کی آواز میں افسردگی تھی۔۔ کہیں نہیں۔۔۔ بس یوں ہی۔۔ آجائیں گے ہم۔۔ آپ فکر ہی نہ کریں یہ حویلی چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ آخر آدھی حویلی پر ہمارا حق ہے۔ شیرو باہر نکل گئے۔ بیگم کو اپنے پیروں میں عجب سی کمزوری محسوس ہوئی۔ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔۔۔ شیرو یہ تم کیا کر رہے ہو۔ صرف اس آدھی حویلی پر ہی نہیں تمہارا حق تو فردوس پر بھی تھا ہم فردوس تم کو دینا چاہتے تھے۔ لیکن ایک شرابی اور غیر ذمہ دار کے ہاتھوں میں ہم اپنی پھول سی بیٹی کیسے سونپ سکتے تھے۔ تم خود کو ہی سنبھال نہیں پا رہے ہو۔ فردوس کو کیا سنبھالتے۔ بیگم رو رہی تھیں آنسوؤں سے ان کا دامن بھیگ گیا تھا۔

یہ آج کیسی انہونی سی ہو رہی تھی۔ سلطانہ بیگم خود چل کر جمال شاہ کے کمرے میں گئی تھیں۔ امی کو دیکھ کر وہ چونکے ضرور تھے۔ فوراً ہی کھڑے ہو کر بڑے مودبانہ انداز میں امی کو سلام بجا لانے کے بعد بولے آپ نے کیوں تکلیف اٹھائی۔ فون کروا دیتیں۔ ہم خود آپکی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ امی کے ہاتھوں میں کاغذات دیکھکر پہلے تو گھبرائے پھر امی کے چہرے پر مسکراہٹیں دیکھ کر خود بھی مسکرا کر بولے ان دنوں ہم کچھ زیادہ ہی مصروف رہے، امی نے بڑے دلار سے کہا۔۔ جانتے ہیں۔۔ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنے کا وقت نہیں۔ آج یہی سوچ ہمیں یہاں لے آئی۔۔ خیر تو ہے۔۔ وہ گھبرائے۔۔ یہ کاغذات۔۔ بابا جانی۔۔ امی نے انگلی ہونٹوں پر رکھکر انہیں چپ رہنے کا حکم صادر کیا اور خود صوفے پر آرام سے براجمان ہو گئیں۔ گھبرائے سے، حیران سے جمال شاہ صوفے کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔

اب تمہاری کوئی ضد چلے گی نہ بہانہ۔ کیسا بہانہ اور کونسی ضد۔ ہم کچھ سمجھے نہیں۔ وہ سمجھ کر بھی انجان بن رہے تھے۔ آپ کا حکم ہی کافی ہے۔ آپ حکم کریں۔ امی تو یوں بھی اپنے ہونہار بیٹے پر واری واری جاتی تھیں۔ بیٹے کی باتیں سن کر بڑے مسرور لہجے میں بولیں۔ ہم نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ جمال شاہ کے پاؤں تلے زمین لرز گئی۔ شادی۔ ایسے آناً فاناً کیوں۔ کیا تمہاری اپنی کوئی پسند ہے۔۔ تمہاری مرضی معلوم کرنا ضروری تھا مگر۔ وہ فوراً بولے ہماری مرضی۔ پسند ہرگز نہیں۔ یہ حق ہم آپ سے ہرگز نہیں چھین سکتے۔ ہم جانتے ہیں ہر ماں کی طرح آپ نے بھی ہماری پیدائش کے دن سے ہی ہماری شادی کے سپنے بننے شروع کر دئے ہونگے۔ ہم اس لڑکی سے شادی کرینگے جو آپ کے دل کو بھا جائے گی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں ہماری امی کی پسند لاجواب ہے۔

امی بھرپور خوشی سے بولیں۔ ہمیں تم سے یہی امید تھی۔ یہ لڑکی ہم نے مذہبی جلسے میں دیکھی تھی۔ معصوم

سے نورانی چہرے کے ساتھ اس کی میٹھی میٹھی سی آواز ہمیں متاثر کرگئی۔ کالج میں پڑھتی ہے اور کالج کے میگزین کے لئے لکھتی بھی ہے۔ کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہے، سنا ہے بے حد شائستہ اطوار اور خوش اخلاق ہے، بہرحال ہم اس کے بارے میں ساری معلومات کر چکے ہیں۔ امی نے لڑکی کی خوبیوں کی فہرست سناتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی بیحد حسین ہے اور سب اونچے خاندان والوں کی نظریں اس پر جمی ہیں۔ ہم اسے کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتے۔ ہم نے تمہارے بابا جانی کو بھی مشورہ دیا تھا کہ منگنی جیسے غیر شرعی رشتہ جوڑنے کے بجائے سیدھا نکاح پڑھوا دیں تاکہ لڑکی ہماری امانت ہو جائے۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی رہا رسموں اور رواجوں کا معاملہ وہ تو زندگی بھر چلتے رہیں گے۔ جمال سن تو سب کچھ رہے تھے لیکن ان کے دل میں ایک طوفان سا امڈ رہا تھا جسے وہ بخوبی دبائے ہوئے تھے۔ ایسا ہے بیٹا! قبیلے کی لڑکیوں کی قسمتیں پل بھر میں بدل جاتی ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کیونکہ ہم نے زندگی میں بڑی بڑی انہونی ہوتے دیکھی ہے۔ تمہاری چھوٹی خالہ منگنی ٹوٹنے کے بعد جس عذاب سے گذری تھیں وہ ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔

باتوں کے دوران امی نے لفافہ کھولا۔ بولیں ہمارے معاشرے میں تصویریں ادل بدل کرنے کا رواج نہیں خاندان ہی میں شادی ہونے کا رواج ہے پھر بھلا تصویر کی کیا ضرورت۔ تم بضد تھے کہ لڑکی باہر کی ہونی چاہیئے امی نے تصویر میز پر رکھی اور جمال شاہ کے دل میں امڈتا طوفان یکا یک تھم گیا۔ ہم ماں ہیں تمہاری یہ ضد بھی مان لی۔ ہمیں صرف تمہاری خوشیاں پیاری ہیں۔ لڑکیاں تو کئی نظر میں آئیں لیکن یہ لڑکی ہماری نظروں میں سما گئی۔ امی کے پیچھے کھڑے جمال شاہ کی نظریں تصویر پر جمی رہ گئیں۔ امی کہہ رہی تھیں۔ یہ فردوس ہے آفتاب خان کی بڑی بیٹی۔۔ جمال تو تصویر میں ایسے گم تھے کہ امی نے جو کچھ کہا انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دیا امی نے پیچھے مڑ کر سوالیہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ مسکرائیں۔۔ پسند آئی۔۔ اگر نہیں۔۔ تو پسند کرلو کیونکہ یہ لڑکی ہمارے دل کو اتنی بھا گئی کہ ہم نے دیکھتے ہی اسے تمہارے لئے چن لیا۔

اب بھلا جمال امی کو کیسے بتاتے کہ فردوس ہی ان کی دلی آرزو تھی۔ اپنے شہزادے کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ امی کا دل نہال ہو گیا۔ جانتے ہو ہم نے جب رشتہ مانگا تو بلقیس بیگم کچھ لمحوں کے لئے چپ ہو گئیں پھر بیحد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں، ہماری بیٹی کو چاہ کر آپ نے ہماری توقیر بڑھا دی۔ کہاں آپ اتنے بڑے جاگیردار اور کہاں ہم معمولی سے۔۔ ان لوگوں کی سادگی بھی قابل داد ہے۔ اتنے بڑے لوگ اور غرور قطعی نہیں۔

بیحد خوبصورت صبح تھی وہ۔۔ فضا میں پھولوں کی مہک اور کمرے میں امی کی مہکتی باتوں کی گونج جمال شاہ کا دل چاہ رہا تھا امی اسی طرح بیٹھی بولتی رہیں اور وہ سنتے رہیں۔ امی بولیں۔ ہمیں حیرت ہو رہی ہے کہ پہلی مرتبہ تم نے کسی لڑکی کے بارے میں غور سے سنا تو۔ اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم چاہتے ہیں تم جلد از جلد فردوس کو بیاہ کر لے آؤ۔

ہمارے کان تمہارے بچوں کی کلکاریاں سننے کو ترس رہے ہیں۔ جمال جھینپ گئے۔ فوراً ہی بولے اگر آپ اجازت دیں تو اب ہم جائیں۔ یونیورسٹی میں آج ضروری میٹنگ ہے۔

جب سے فردوس نے جمال شاہ کے نام کی انگوٹھی پہنی تھی اس کے انگ انگ میں خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔ فردوس کے بھائی بہن بہت خوش تھے۔ ان کی پیاری بہنا کی شادی یونیورسٹی کے سب سے ذہین ترین پروفیسر کے ساتھ ان کے لئے باعث اعزاز تھا۔ آفتاب خان کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی اور اداسی تھی۔

بلقیس بیگم خوش تو تھیں لیکن اپنے شوہر سے آنکھیں ملانے کی تاب ان میں نہ تھیں ۔ بار بار آنکھیں جھپکا رہی تھیں ۔ جیسے کسی بڑی غلطی کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہوں ۔

جمال شاہ کا خیال دن بھر فردوس کے دل و دماغ پر حاوی رہا ۔ پھر خیالوں کی شام بڑی مشکل کی بیتی تھی اور پھر خواب اور خیالوں کی خوبصورت رات ۔ زندگی کی پہلی رات تھی کہ وہ آنکھ بند کرے اور نیند کوسوں دور بھاگ جائے ۔ نیند آتی بھی کیسے وہ تو ان کے تصور سے باتیں کرتی رہتی تھی ۔ سینے میں بیکل دل اور ترستی آنکھوں کو ان سے ملنے کی آس تھی ۔ پھر یہ خیال کہ اچانک وہ سامنے آگئے تو ان سے کچھ کہہ بھی پاؤنگی ۔ پتا نہیں اسوقت کا عالم کیا ہوگا ۔ کہیں خوشی سے مر تو نہ جاؤنگی ۔

پھر آگئی فردوس کی زندگی کی سب سے سہانی صبح ۔ نہ دل ٹھکانے تھا نہ دماغ ۔ دل بار بار کہہ رہا تھا ۔ اگر وہ اتفاقاً مل جائیں ۔ وہ رنگی سرخ گلاب کی دو خوبصورت کلیاں توڑیں اور گاڑی میں بیٹھ گئی ۔ یونیورسٹی کے احاطے میں اس کی شاندار موٹر رکی تو سب کی نگاہیں ان پر ٹکیں جو بتا رہی تھیں ۔ ہوشیار ۔۔ خبردار ۔۔ اس لڑکی کی طرف نظر بھی اٹھائی تو انجام برا ہوگا ۔ شاید آنکھیں پھوڑ ڈالی جائیں یا پھر گردن ہی اڑا دی جائے ۔

ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور گھبرائی سی فردوس نے پہلا قدم نیچے رکھا ، ادھر ادھر دیکھا ۔ ہمارا نام فردوس ہیں ۔ خود ہی آگے بڑھکر سامنے کھڑی لڑکی سے اپنا تعارف کرایا ۔ ہم فریدہ ہیں لڑکی نے مسکرا کر کہا ۔ ہائے اللہ ۔۔ یہ بے مثال حسن اور سادگی ۔ فردوس نے نظریں جھکا دیں ۔ دونوں ہنسیں ۔ فردوس بولی یہاں لڑکوں کو دیکھکر ہمیں عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی ہے ۔ فریدہ بولی ۔ کیوں بھئی ۔ گھبراہٹ کیسی ۔ یہ لڑکے بھی تمہاری طرح یہاں پڑھنے ہی آئے ہیں ۔ اب تو روز ان سے واسطہ پڑے گا ۔ پھر ان سے ڈرنا کیوں ۔ ہاں ۔ ان سے بچ کہ ضرور رہنا ۔ فردوس کی انگلی میں انگوٹھی دیکھ کر بولی ۔ کون ہے وہ خوش نصیب ۔ فردوس کا گلابی چہرہ لال ہو گیا ۔ دیکھا تو انہیں ہم نے بھی نہیں ۔ فردوس کو نروس ہوتے دیکھ کر فریدہ بولی ۔۔ یہ کہانی پھر سہی ۔ آج ہمیں بہت کام ہے ۔ سامنے سے بے حد دلکش پرسنالٹی کے مالک کو جاتے دیکھ کر رکی اور چپ نہ رہ سکی ۔ یہ جو سامنے سے جا رہے ہیں رئیس زادے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا فضول سی پروفیسری کیوں کرتے ہیں ۔ یہ نوکریاں تو ہم جیسے معمولی لوگوں کے لئے ہیں ۔ ویسے ہیں یہ یہاں کے سب سے قابل پروفیسر ۔ انہیں لڑکیوں سے سخت الرجی ہے جبکہ لڑکیاں ان سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں اور لہک لہک کر ان کی جانب بڑھتی ہیں ۔ نام ہے جمال شاہ اور ان کے بابا جانی سکندر شاہ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں ۔ اچھا ہم چلتے ہیں ۔

نام سنتے ہی فردوس کے دل کے گلستاں میں بہار آگئی ۔ ساری کلیاں یکلخت چٹکیں اور فردوس کی رگ رگ میں محبت کی خوشبو سرایت کر گئی ۔ اس نے نظر بھر کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا اور ساتھ ہی بڑی سرعت سے دوپٹہ اپنے پر ڈالا ۔ یہی تو وہ خیالی تصویر تھی جو اس کے دل و ذہن میں اتر آئی تھی ۔ فردوس کو فریدہ کے کہے الفاظ یاد آئے ۔ سنا ہے بہت ہینڈسم ہیں ۔ جب آپ انہیں دیکھیں گی تو دیکھتی ہی رہ جائینگی ۔ واقعی وہ سب کچھ بھول کر اس حسین ۔ سنجیدہ اور باوقار شہزادے کو بڑی خوشگوار حیرانی لئے دیکھتی ہی گئی جب تک وہ آنکھ سے اوجھل نہ ہو گئے ۔ فردوس کا دل جو دھڑکنا جانتا ہی نہ تھا آج اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا دوبھر ہو رہا تھا ۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں

کے ساتھ آگے بڑھی۔اس کا تو سارا جسم کانپ رہا تھا۔

دھیان میں تو بس وہی تھے۔نہ گھنٹی بجانے کا ہوش رہا نہ چوکیدار سے بات کی بس پردہ کھسکا کر کمرے میں داخل ہوگئی۔نظر اٹھائی تو ایکدم ٹھٹک کر رہ گئی۔قدم ٹھہر گئے۔سامنے جمال شاہ کو دیکھ کر آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔حقیقت ہے یا خواب۔انہیں دیکھکر سٹپٹا گئی۔ذرا ہوش سنبھلے تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔جمال شاہ نظریں جھکائے کچھ کاغذات دیکھنے میں غرق تھے۔پرفیوم کی مہک پھیلی تو انہوں نے سر اوپر اٹھایا۔وہ چونک کر کھڑے ہوگئے۔۔۔آپ۔۔۔یہاں۔۔۔بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔انہیں بولتے اور روبرو دیکھ کر فردوس کا دل بہک رہا تھا اب تو زبان نے بھی ساتھ نہ دیا۔دونوں کی حالت عجیب ہی تھی۔نہ جمال شاہ کو اپنا ہوش نہ فردوس کو اپنی خبر۔نظریں اٹھا ہی نہ سکی۔جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ۔بڑی مشکل سے بولی۔''ہم شاید غلط جگہ آ گئے ہیں۔اور ہاتھ بے ساختہ انگوٹھی پہ جا ٹکا۔اس انگوٹھی کو پہننے کے بعد ہی تو فردوس کے دل میں نئے انوکھے جذبوں نے جنم لیا تھا۔یہ انگوٹھی ہی تو اسے ایک نئے جہان میں کھینچ لائی تھی۔جہاں کی ہر بات نرالی تھی۔ہر ادا دلکش، ہر لمحہ رنگین، ایسے احساس تو پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی پر ہونٹ تھرک کر رہ گئے۔جمال شاہ بھی کون سے اپنے پورے ہوش وحواس میں تھے جو کچھ کہتے۔دونوں ہی مدہوشی کے عالم میں بس خاموش تھے اور جمال شاہ فردوس کو ایک ٹک گھورے جا رہے تھے۔فردوس نے نظریں اٹھائیں۔۔یکا یک دونوں کی نگاہوں میں محبت کے شعلے لپکے۔۔جمال شاہ کو محبت سے مسکراتے دیکھکر فردوس نے شرما کر پلکیں جھکا دیں۔وہی عالم تھا۔رنگ کھلتا جائے تھا۔جتنا کے اڑتا جائے تھا۔وہ فردوس کے اس شرمیلے حیا آمیز انداز پر نثار ہوگئے۔دل چاہا اس شرمائی سی گھبرائی سی لڑکی کو اپنی آنکھوں میں بسا لیں اور سب کی نظروں سے چھپا کر اپنی اس نرالی دنیا میں لے جائیں جہاں خوشیاں ہیں۔جہاں سب ان کے منتظر ہیں۔

کچھ ہوش سنبھلے تو جمال شاہ بولے اتنا مکمل اور پرکشش حسن اور اس پر یہ سادگی۔واقعی قابل تحسین ہے۔امی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ان جھکی جھکی شرمیلی آنکھوں کو ان لرزتے ہاتھوں کو ان تھرتھراتے لبوں کو اس شاخ جیسے حسین پیکر کو ہمارا اسلام پہنچے۔جواب میں فردوس کے ہونٹ تو ہل نہ سکے اس نے اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر آداب کیا اور فوراً ہی سرخ گلاب کی دونوں کلیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔انہوں نے دونوں کلیوں کے ساتھ فردوس کا ہاتھ تھام لیا۔بڑی کشش تھی اس لمس میں۔

دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔شرم وحیا میں ڈوبی نظریں پھر جھک گئیں جن کے خیالوں نے رات بھر جگایا تھا جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے دل بیکل تھا اب وہ سامنے تھے تو نظریں اٹھانے کی تاب ہی نہیں ہو رہی تھی۔دل الگ بے قابو تھا۔دھڑکے ہی جا رہا تھا۔جمال شاہ مبہوت کھڑے اس چندرما کے روپ کو دیکھتے ہی رہے۔

کچھ گھڑیاں خاموشی کی نذر ہوگئیں جمال اپنی بیحد گمبھیر اور خوبصورت آواز میں بولے۔ذرا نظریں تو اٹھائیں۔کافی دیر لگی گھنیری پلکیں اٹھنے میں۔مسکرا کر بولے۔منگنی مبارک ہو۔کیا تحفہ دیں آپ کو۔ہماری جھولی میں محبت کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔وہ بڑی دلکشی سے مسکرا کر بولے۔

محبت بڑے مقدر والوں کو ملتی ہے۔آپ کی محبت ہماری زندگی ہے، آج ہمیں دونوں جہاں مل گئے۔پھول فردوس کی طرف بڑھا کر سوال کیا۔یہ دو کیوں۔۔وہ بولی۔۔ایک ہماری طرف سے آپ کے لئے۔آج منہ دکھائی کا تحفہ آپ کو بھی تو ہمیں دینا ہے۔جمال شاہ نے دونوں پھولوں کو اپنے ہونٹوں اور اپنی آنکھوں سے لگایا اور فردوس نے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول تھام کر کہا۔یوں تو آپ کی امی نے ہمارے لئے بہت سے قیمتی تحفے بھیجے ہیں لیکن آپ کا دیا یہ تحفہ ہمارے لئے سب سے قیمتی ہے۔فردوس کی چمکتی آنکھوں میں خوشیاں جھلملاتی دیکھ جمال شاہ کے ہوش اڑے جارہے تھے۔یہ مسکرائی شرمائی سی معصوم لڑکی جمال شاہ کے دل وجگر سے اترتی روح میں تحلیل ہوگئی تھی۔اور فردوس سوچ رہی تھی میں کہاں آگئی اس پیار کے جہان میں۔جہاں آکر نہ دل اپنا رہا نہ جگر۔زندگی کی ہر سانس، ہر لمحہ جمال شاہ کے قدموں میں ڈال دیا۔

ماحول میں محبت گنگنانے لگی۔محبت اپنا ایک نیا سریلا راگ الاپنے لگی۔تب ہی جمال شاہ نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔۔آپ کی اپنی بھی تو کوئی پسند ہوگی۔۔ایک بات بتائیں۔کسی نے آپ کی رائے معلوم کرنے کی زحمت اٹھائی۔یا پھر۔۔ہم آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔کیا آپ مطمئن ہیں اور ہمارے ساتھ زندگی گذارنا پسند کرینگی۔آپ نے اس مختصر سی ملاقات میں اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔یہ ساری زندگی کا سوال ہے۔زندگی گزارنا بڑا مشکل معاملہ ہوتا ہے۔یہ پھولوں کی سیج نہیں۔سچ تو یہ ہے کہ زندگی کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ کافی دیر خاموشی چھائی۔نہ وہ کچھ بولے اور نہ فردوس نے سر اٹھایا۔آپ نے ہمارے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔وہ دھیمی آواز میں بولی۔اپنے پہلے سوال کا جواب تو آپ جانتے ہیں۔قبیلے کی لڑکیوں کو اپنی زندگیاں جینے کا حق کب ملتا ہے۔پھر وہ سنہرے خواب کیسے دیکھ سکتی ہیں۔ہماری جیسی خوش نصیب لڑکیاں قبیلے میں کم ہی ہیں جو دل سے چاہی جائیں اور پورے احترام کے ساتھ اپنائی جائیں۔

جمال شاہ سرشار ہوگئے۔خوشی سے بولے ہمیں آپ سے صرف اتنا کہنا ہے کہ خدا سے ہم نے صرف آپ کو ہی مانگا تھا۔آپ ہی ہمارا پیار۔ہماری تمنا اور ہمارا انتخاب ہیں۔ہماری روح کو بس آپ کی تلاش تھی۔فردوس بولی محبت کا رشتہ ہی دل وجان اور روح سے ہوتا ہے۔ہم آپ کی چاہت کے قابل تو نہ تھے۔ہمیں پسند کرکے آپ نے ہمارے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔آپ کے اقرار نے ہمیں معتبر کردیا۔سچی محبت کے لئے تو جان بھی قربان کردی جائے تو کم ہے۔اب یہ زندگی آپ کے نام۔فردوس کو اس نئے سفر میں اٹھایا یہ پہلا قدم بہت خوش گوار لگا۔یوں لگا راہ میں پھول ہی پھول ہیں اور منزل دور نہیں۔جمال شاہ کے روبرو کھڑے خاروں کا خیال ہی نہ آیا۔

فردوس کی زبانی اقرار محبت سن کر جمال شاہ نے بڑی شوخی سے سوال کیا۔کیا آپ ہمیں مبارکباد نہیں دینگی۔سنتے ہی فردوس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔مسکراہٹیں معدوم ہوگئیں۔یکلخت بڑی گھبرائی اور پریشان سی نظر آئی۔اس کے دل میں بہت سے خدشے سہارہے تھے دل کا حال بڑی افسردہ آواز میں سنایا۔منگنی کی اہمیت ہی کیا ہے۔ایک غیر شرعی رشتہ جو پل بھر میں توڑا بھی جاسکتا ہے۔آپ تو ان روایتوں سے واقف ہیں۔ہماری زندگی پر ہمارا حق نہیں۔قبیلے کی لڑکیاں کب اپنے لئے جیتی ہیں۔انہیں تو زندہ رکھا جاتا ہے۔کبھی بھائیوں کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لئے یا کبھی حویلیوں کے اونچے کنگوروں کی عزت وحشمت بچانے کے لئے۔نہ جانے کب قربانی کا

بکرا بنادی جائیں۔ کب گھر سے بے گھر کردی جائیں۔ کبھی بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ بولے آج تو ایسی مایوس کن باتیں نہ کریں۔ اب تو آپ ہمارے نام سے منسوب ہو چکی ہیں۔ آپ صرف ہماری ہیں۔ آپ ہماری منزل ہیں ہمیں ضرور ملیں گی۔ وہ بولی ہمارے اور آپ کے درمیان جو پیار کا رشتہ استوار ہو چکا ہے وہ بے شک کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ لیکن۔ منگنی حتمی رشتہ نہیں ہوتا۔ صرف نام سے منسوب ہو جانا ہی کافی نہیں۔ جمال شاہ گھبرا گئے۔ ہم نے اپنی امی سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ ہم کل ہی اپنی امی سے اس بارے میں بات کرینگے۔ کل۔۔ وہ بولی۔۔ کل اور آج کے چکر میں کتنے ہی دل ٹوٹ چکے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں تباہ ہو چکی ہیں صرف اسی فریب میں کہ کل ہے ہی کتنی دور۔ اور کل آیا تو کچھ بھی نہ رہا۔ سب کچھ بدل گیا۔ آج۔ آج ہے۔ اور یہ گھڑیاں جو ہم نے آپ کے ساتھ گذاریں بس یہی ہماری ہیں۔ کل کی کس کو خبر۔ آئے یا نہ آئے۔ وہ بولتی ہی گئی اور جمال شاہ بے خودی کے عالم میں اسے تکتے رہے۔

جمال شاہ نے اپنے ہاتھوں سے فردوس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کہا، محبت کرتی ہیں پھر یہ کیوں یقین نہیں کرتیں کہ محبت بہت طاقتور ہوتی ہے۔ انسان کو تقویت بخشتی ہے۔ ہماری محبت ہمیشہ آپ کی حفاظت کرے گی۔ ہمارا کل بھی بے حد خوبصورت ہوگا۔ اب ذرا مسکرا دیں۔ وہ مسکرائی تو بولے بری باتیں نہیں سوچتیں۔ ہماری امی منگنی کے بندھن کے بالکل خلاف تھیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ جاتے تو آج آپ یہاں نہ ہوتیں۔ فردوس نے سوال کیا۔ پھر ہم کہاں ہوتے۔ جمال شاہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ہماری باہوں میں۔ فردوس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا جو سرخ ہو چکا تھا۔ جمال شاہ کی محبت سے بھرپور لفظوں کی شیرینی فردوس کی رگ رگ میں ریشے ریشے میں سرایت کر گئی۔

بڑی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جس شخص کو لڑکیوں سے الرجی تھی اس نے بڑے ہی خاص انداز میں اپنی محبت کا اظہار کر کے فردوس کا دامن محبت کے مہکتے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ دیر کافی ہو چکی تھی۔ آفس کا خیال آتے ہی فردوس نے جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے دوسری ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ سوال کیا۔ اب آپ کب تشریف لائیں گی۔ فردوس نے ان کی جانب بغور دیکھ کر کہا "یہاں کبھی نہیں" اب آپ نکاح کے کنگن لیکر ہمارے گھر تشریف لائینگے۔ آج تو ہم بھولے سے ادھر آ گئے۔ جمال شاہ ہنسے۔ ایسی خوبصورت بھول کل کیوں نہیں۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ کل۔ معلوم نہیں ہمارا کل آئے بھی یا نہیں۔ ہمیں تو لمحہ کی خبر نہیں ہوتی آپ کل کی بات کر رہے ہیں۔ حویلیوں میں تو پلک جھپکتے ہی دنیا بدل جاتی ہے۔ حویلیوں میں کیا کیا ہوتا ہے ہمیں تو اس کی کانوں کان خبر بھی نہیں لگتی۔ ہر بات ہم لوگوں سے پوشیدہ ہی رکھی جاتی ہے۔ بس مرد جانتے ہیں۔ شیر خان ہمیشہ ہنگامہ مچائے رہتے ہیں۔ ہمارا دل تو ہمیشہ ہی دہلتا رہتا ہے۔ نہ جانے کب حویلی پر قیامت ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو ہمیں اپنی زندگی کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ لیکن اب۔۔ نہ جانے کیوں زندگی پیاری لگنے لگی ہے۔ جینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ اس لئے تو کہتے ہیں جلد از جلد ان فاصلوں کو مٹانے کی کوشش کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فاصلے اتنے بڑھا دیئے جائیں اور ہم آپ سے اتنی دور چلے جائیں کہ پھر کبھی دونوں مل ہی نہ پائیں آپ ہم سے وعدہ کریں۔ اگر ہمیں کچھ ہو جائے تو آپ اپنی زندگی کا سفر کسی اچھے سے ساتھی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اکیلے زندگی بسر نہیں ہوتی۔ جمال شاہ یہ سن کر سہم گئے۔

ان کے روئیں روئیں میں سنسنی سی ڈور گئی۔ جب جب ہماری یاد آئے پکار لینا۔ ہم آپ کے خوابوں میں حاضر ہو جائینگے۔ یہ سن کر فردوس پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جیسے واقعی وہ ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہو۔ اس نے خدا حافظ کہا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے رہے جیسے دونوں ہی ایک دوسرے کو اپنی اپنی آنکھوں میں سمو رہے ہوں۔۔۔ وہ آگے بڑھی۔۔۔ رکی۔۔۔ بولی۔۔۔ آپ ہمیں خدا حافظ نہیں کہینگے۔ جمال شاہ نے کہا۔ "خدا نگہبان" دم رخصت تک وہ اسے دیکھتے رہے اور فردوس بھی مڑ کر دیکھتی رہی۔ جمال شاہ کے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور بے سکونی پھیل گئی تھی۔ فردوس چلی گئی اور جمال شاہ کو خدشوں اور اندیشوں کے بھنور میں چھوڑ گئی۔

گھنٹی بجنے پر سارے خیال بکھر گئے۔ فراز خان انہیں دیکھ کر بولے۔ کیا معاملہ ہے۔ آپ کے تو ہوش گم حواس گم۔ بڑی گہری سوچوں میں ہو۔ آج پہلی بار تمہیں پریشان حال دیکھ رہے ہیں۔ کون سی دنیا میں کھوئے ہوئے ہو۔ جمال شاہ کچھ سنبھل چکے تھے۔ بولے ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ کون تھیں۔ چہرہ تو دیکھا نہیں۔ لگتا ہے یہ جاتے جاتے تمہارے دل کے ساتھ ہوش و حواس بھی چرا کر لے گئیں۔ ارے نہیں صاحب۔ آپ تشریف رکھیں۔ یہ اپنے داخلے کے سلسلے میں آئی تھیں اور بھولے سے ہمارے کمرے میں آگئیں۔ ہم کب کہہ رہے ہیں کہ تم نے انہیں بلایا۔ وہ بھولے سے آئیں اور تم کو ہی تم سے چرا کر لے گئیں۔ بالکل خالی خالی سے نظر آرہے ہو۔ جمال شاہ نے ہنس کر کہا۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ اب کام کی بات کریں۔

جمال شاہ اور فراز خان بچپن کے یار تھے۔ نہ جانے کیوں جمال شاہ انہیں سچ نہ بتا سکے کہ یہی وہ لڑکی ہے جو سوتے جاگتے ان کے خیالوں اور خوابوں پر چھائی رہتی ہے۔ کل ہی ہم دونوں کی منگنی ہوئی ہے۔

سلطان عالم کی بیگم کی وفات کے بعد ان کی چھوٹی بہن ثریا بانو نے ان کے تینوں بچوں کی پرورش کی تھی۔ بچوں اور حویلی کو ایسا سنبھالا کہ سلطان عالم دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ حج پر جانے سے پہلے ہی انہوں نے اپنے قبیلے کی تمام ذمے داریاں اپنے بڑے بیٹے خورشید عالم کے ہاتھوں میں سونپ دی تھیں۔ جاتے جاتے ثریا بانو کو خورشید عالم۔ ریحان عالم اور شاہین پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید بھی کی تھی۔ تینوں بچے ہونہار تھے۔ انہوں نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

سلطان عالم کو گئے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ ادھر خورشید عالم نے ہر بات پر ضد اور من مانی کرنی شروع کر دی۔ وہ کئی دن حویلی میں نظر نہیں آئے تو ثریا بانو خود حال معلوم کرنے ان کے کمرے میں گئیں۔ خورشید عالم تو بالکل ہی بدلے بدلے سے نظر آئے۔ چہرے پر افسردگی پھیلی کچھ پریشان حال تھے۔ ثریا بانو نے پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ جس لڑکی کو تم نے دیکھا ہی نہیں اس کے لئے کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے ہو۔ وہ بولے پھوپھو جتنا ان کے بارے میں سنتے ہیں اتنا ہی ان کو حاصل کرنے کی تمنا دل میں بڑھتی جاتی ہے۔ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے اور ہماری یہ کثیر دولت کب کام آئے گی۔ ایک بار آپ وہاں پیغام بھیج کر تو دیکھیں۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی ساری دولت لٹانے کو تیار ہیں۔ سنتے ہی پھوپھو غصے سے تلملا اٹھیں۔ غرا کر بولیں خورشید عالم پہلی بات تو یہ کہ دولت تمہاری نہیں تمہارے ابو کی ہے۔ ابھی ہمارے بھائی جان زندہ ہیں۔ ایک لڑکی کی خاطر جس دولت کو

لٹانے کی سوچ رہے ہو اسی دولت سے تمہاری پہچان ہے۔ عزت اور شان ہے۔ مانا کہ لڑکیاں تمہارے راستے میں دل بچھاتی ہیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ جس لڑکی کو تم چاہو وہ بھی تم پر نثار ہو جائے۔ محبت مقدر سے ملتی ہے دولت سے خریدی نہیں جاتی۔ وہ سر جھکائے سنتے رہے۔ پھوپھو کی نصیحت آمیز باتوں کا ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ بولے ہم اپنے دل سے مجبور ہیں۔ وہ پھر سختی سے بولیں۔ سمجھاؤ اپنے اس نادان اور مجبور دل کو۔ محبت دو طرفہ ہو تو پروان چڑھتی ہے۔ ورنہ۔۔انجام۔۔اس لڑکی کا خیال اپنے دل و ذہن سے نکال دو۔ بھائی جان کی عدم موجودگی میں تمہارے اوپر دوگنی ذمے داریاں ہیں۔ یہ وقت تمہیں عشق کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لڑکی سے جسے تم نے دیکھا نہ بھالا۔ اسے اس عشق کی خبر نہیں اور تم ہو کہ دل میں اس کی تمنا لئے راتوں تارے گنتے ہو۔ یہ کیسا عشق ہے بھائی۔ اپنی وضع کا سب سے نرالا۔ وہ بولے پھوپھو جانی خوبیوں سے لبالب اس حسینہ کے ایک ہم ہی پرستار نہیں۔ کوئی ایسا دل نہیں جسے اس کی چاہت نہ ہو۔ ہمیں یہ ضد ہو گئی ہے کہ ہم اسے کسی نہ کسی طرح اپنا بنا کر رہینگے۔ بگاڑا بھی تو آپ ہی نے ہے ہمیں۔ ادھر کسی چیز کی فرمائش کی ادھر چیز حاضر۔ وہ برہمی سے بولیں۔ خورشید عالم یہ کوئی شئے نہیں ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ اگر تم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس کے دل کا قلعہ بھی فتح کر لوگے۔ سمجھاؤ اپنے اس بیمار دل کو جو ایک لڑکی کے حسن کے چرچے سن کر ہی مچل پڑا ہے۔ یہ نہ عشق ہے۔ نہ جنون۔ صرف تمہارا پاگل پن ہے۔ اور پاگل انسان کا کوئی علاج نہیں۔ وہ تو بے موت مارا جاتا ہے۔ دنیا اسے مار ڈالتی ہے۔ سنگ برسا برسا کر۔ تم پڑھے لکھے باشعور انسان ہو۔ دل سے نہیں دماغ سے کام لو۔ تم ایک زور آور قبیلے کے سردار کے بیٹے ہو۔ ایک وسیع جائداد کے مالک ہو۔ تمہیں اپنی حیثیت اور اپنے مقام کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کب تک ان فضول باتوں پر اپنا وقت ضائع کرتے رہو گے۔ خاندان میں تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں جو تم باہر کی لڑکی کی چاہت میں دیوانے ہو رہے ہو۔ خورشید عالم اپنی سوچوں میں گم تھے۔ بولے آپ کچھ کریں۔ صرف ایک بار کوشش تو کر کے دیکھیں۔ پھوپھو نے ان کو تسلی دی۔ اچھا بابا۔ کرینگے کچھ۔ کرنا ہی ہوگا۔ تمہاری خاطر۔ یہ تو بتاؤ وہ ہے کون۔ اس کا حسب نسب۔ نام۔ فون کی گھنٹی بجی اور باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

خورشید عالم فوراً کھڑے ہو گئے۔ یہ گاؤں والے خود چین سے جیتے ہیں اور نا ہی ہمیں جینے دیتے ہیں۔ جب سے ابو گئے ہیں کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں ہنگامہ برپا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آج دو قبیلوں کے گرہوں میں فساد شروع ہو گیا ہے۔ بڑا خون خرابہ ہو رہا ہے۔ ہمیں جانا ہوگا۔ پھوپھو فکر مند ہو گئیں۔ بولیں۔ خورشید تمہارے ابو آس پاس کے قبیلوں کے ساتھ جھگڑے فساد کے خلاف ہیں۔ تم بھی بہت عقلمندی سے سوچ سمجھ کر کام کرنا۔ کوئی غلط فیصلہ نہ کرنا۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھانا جس سے بعد میں تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑے اور پچھتانا پڑے۔ بھائی جان کی غیر حاضری میں کسی کے ساتھ ظلم و جبر۔ کوئی بے انصافی نہ ہونے پائے۔ معاملہ رفع دفع کر کے تم جلد لوٹنا۔ ہم۔ وہ بولتی ہی رہ گئیں اور خورشید عالم باہر نکل گئے۔

آفتاب خان کی حویلی کا حال!

حویلی میں شیرو کے لئے سب پریشان تھے۔ جب کئی دن کے بعد وہ لوٹے تو ان کے لڑکھڑاتے قدم۔

بکھرے بال۔ اندر دھنسی آنکھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر بلقیس بیگم بیحد گھبرا گئیں۔ انہوں نے سوالوں کی بوچھار کر دی لیکن شیرو نے ایک سوال کا بھی جواب نہ دیا۔ اسی وقت آفتاب خان کمرے میں داخل ہوئے۔ کرخت لہجے میں بولے۔ یہ کیا بتائینگے ان کا یہ حال کیوں اور کیسے ہوا۔ ہم بتاتے ہیں۔ وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ بیگم بولیں ذرا دھیرے بولیئے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بیگم یہ جو کر آئے ہیں اس کا چرچا سر عام ہو رہا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے مصیبتوں کے کالے گھنے بادلوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ نہ معلوم کب برس پڑیں۔ بیگم کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ شیرو سے مخاطب ہوئیں۔ کیا کر آئے ہو سچ سچ بول دو۔ شیرو نے ان سے نظریں ملا کر کہا ہر سنگین جرم کا الزام ہمارے سر کیوں تھوپ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم یتیم ہیں دنیا میں تنہا ہیں۔ جب جب ہمارے خلاف جھوٹی کہانیاں تراشی گئیں آپ سب نے یقین کر لیا۔ ایک دفعہ بھی نہ کہا کہ یہ جھوٹ ہے، ہمارا شیرو ایسا نہیں کر سکتا۔ کیا اسی کو ممتا کہتے ہیں۔ اپنے چچا جان کی طرف دیکھ کر بولے کیا واقعی آپ سوچتے ہیں کہ ہم کسی لڑکی کو اغوا کروا سکتے ہیں یا کسی کا خون کر سکتے ہیں۔ آفتاب خان بیحد پریشان تو تھے ہی غصے بھرے لہجے میں بولے۔ دو خون تو ہوئے ہیں۔ شیرو نے تفصیل بتانے کی کوشش کی کہ حادثہ محض اتفاقی تھا۔ آفتاب خان کی غضب ناک آواز نکلی۔ اتفاق۔ بربریت اور جارحیت کے حادثے اتفاقاً نہیں ہوتے۔ یہ پرانی دشمنی کا سلسلہ ہوتے ہیں۔ فساد تو قبائل کے دو گروہوں میں ہوا تھا اس میں کیوں ملوث ہو گئے۔ اگر تم وہاں تھے ہی نہیں تو تم ہی کیوں ملزم نامزد کیئے گئے۔ ایسا ہوا۔ شیرو نے پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو آفتاب خان بولے۔ اب تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہوگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ہمیں سوچنے دو۔ اب آگے جو بھی کرنا ہوگا ہم کرینگے۔ وہ لوگ بدلہ لینے پر تلے ہیں۔ تمہاری گھات میں بیٹھے ہیں۔ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ تم جانتے ہو قبائل جب تک بدلہ نہ لے لیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ تمہارے لئے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ جب تک ہم اس معاملے کو سلجھا نہ لیں تم حویلی کے باہر قدم نہیں رکھنا۔ کسی فون کا جواب نہیں دو گے تم۔ سنا تم نے۔

آفتاب خان کے جانے کے بعد بیگم کچھ دیر بغیر کچھ کہے شیرو پر آنکھیں جمائے کھڑی رہیں۔ پھر سسک سسک کر بولیں۔ ہم آج تک تمہاری ہر غلطی پر پردہ ڈالتے رہے۔ معلوم نہیں اس دفعہ ہم کچھ کر سکیں گے کہ نہیں۔ یوں بھی انصاف کا ترازو تو مردوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری سنے گا بھی کون۔ شیرو کا چہرہ بے تاثر تھا۔ بولا۔ کونسی غلطیاں۔۔ ہم نے بار ہا ایک ہی بات کہی کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ گاؤں کی دو لڑکیوں کا ہی تو قتل ہوا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں کب شمار میں لائی جاتی ہیں۔ بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ شیرو زمانہ اب بدل رہا ہے۔ یہ گاؤں کی لڑکیاں بھی کسی کی بیٹیاں۔ کسی کی بہنیں ہیں۔ وہ ایکدم بھڑک اٹھے۔ ٹھیک ہے اگر آپ ہمیں مجرم سمجھتی ہیں تو کر دیں ہمیں پولس کے حوالے۔ ہمیں کسی سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ ہم سنگین سے سنگین سزا بھگتنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہمارے پاؤں میں پڑی بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں آپ کے اس اونچے حسب نسب کا حشر نشر کر دیں گی۔ جانتے ہیں قتل کا بدلہ صرف پھانسی ہے۔ ہمارے گلے میں پھانسی کا پھندا ہماری جان کے ساتھ آپ کے اعلیٰ خاندان کی عزت اور عظمت بھی لے جائے گا۔ دکھ اور غم کی شدت سے بیگم کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ دھیمی آواز میں بولیں۔ یہ صلہ دے رہے ہو ہماری محبت کا۔ تم اتنے خود غرض اور بے حس کیسے ہو گئے۔ تمہاری حرکتوں کی وجہ سے نہ صرف تمہارے

خاندان کا بلکہ پورے قبیلے کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے۔ شیرو کو اپنے دل کا غبار تو نکالنا ہی تھا۔ وہ کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا۔ یوں تو آپ ہمیں اپنا بیٹا کہتی ہیں۔ کبھی اپنے اس بیٹے کی بات کا بھی یقین کر لیا کریں۔ اس کام میں ہمارا ہاتھ بالکل نہیں ہے۔ جو ہوا اسے ہم کیسے روکتے کیونکہ جس وقت یہ حادثہ ہوا تو ہم تو نشے میں چور کسی کمرے میں پڑے تھے۔ کہاں ہمیں خود ہی نہیں معلوم۔

بیگم نے سینہ پیٹ لیا۔ تم سے ہم نے کہا تھا نا کہ شراب پینا چھوڑ دو پر تم نے ہماری بات نہ مانی۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہ حادثہ ہم سب کو کس مقام تک لے جائے گا۔ شاید اب بھی تم اس حادثے کی سنگینی کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ بے انتہا دولت اور بے جا آزادی نے تمہیں بیحد خود غرض اور بے حس بنا دیا ہے۔ اپنی ذمہ داریاں بھول کر سر بازار اپنا اور اپنے خاندان کا تماشہ بنا رہے ہو۔ افواہیں ہے کہ تم غریبوں پر بہت تشدد کرتے ہو۔ تم حاکم ہو اور ایک حاکم کو انصاف پسند اور رحم دل ہونا ضروری ہے۔ غریبوں کو ستانا ٹھیک نہیں۔ خدا دیکھتا ہے۔ ناخوش ہوتا ہے۔ غریبوں کے جھکنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ڈر گئے۔ بدلہ لینا وہ بھی جانتے ہیں۔ موقع ملتے ہی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ نہ جانے کب دغا دے جائیں۔ بغاوت پر اتر آئیں۔ اور تمہارے خلاف سازش شروع کر دیں۔ تو۔ جانتے ہو انجام کیا ہوگا۔ انہیں سمجھانا مشکل ہو جائے گا۔

شیرو ایک عجیب سی مسکراہٹ لئے ہوئے بولے۔ انصاف کا ذکر بے فائدہ ہے۔ ہمارے ساتھ کون سا انصاف ہو رہا ہے۔ آپ بے فکر رہیں باہر والوں کی دشمنی سے ہمارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب اپنے ہی سازش پر اتر آئیں پھر کیا کیا جائے۔ ہم نے تو کبھی سوچا نہ تھا کہ آپ جو ہم پر ہمیشہ اپنی ممتا نچھاور کرتی رہیں آپ ہی ہماری خوشیوں کی قاتل ہونگی۔ ہماری موت کا ساماں تو حویلی والوں نے ہی کر دیا۔ اگر ہمارے ابو زندہ ہوتے تو کیا ہمارے حقوق کی پامالی اتنی آسانی سے ہوتی۔ ہمیں اس طرح نظر انداز کیا جاتا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری زندگی کے سب سے بڑے اور سب سے اہم مسئلے میں ہمارے چچا جان نے بھی ہمارا ساتھ نہ دیا۔ سڑک کے پتھر کی طرح رد کر دیا۔ ہم بس اس سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں کہ کیا ہم اس خاندان کے ممبر ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر ہیں تو ہمارا مقام اور ہماری اہمیت کیا ہے۔ حقیقت میں۔ یہاں تو ہمارا کوئی بھی نہیں۔ اگر ہم آپ کو واقعی عزیز تھے تو پھر ہماری خواہش بھی آپ کو عزیز ہونی چاہیئے تھی۔ آپ نے اپنی تمام ممتا ہم پر نچھاور کر دی پر ہمارا حق ہمیں نہ دے سکیں۔ کیوں۔۔ کتنی آسانی سے قدیمی خاندانی روایتیں توڑ کر ہمارے ارمان کچل کر۔ ہمارے ارمانوں کے مقبرے پر کسی باہر والے کے ارمانوں کا محل تعمیر کر دیا۔ کون ظالم ہے۔ کون مظلوم اور کون قاتل۔ آپ خود فیصلہ کریں۔

حقیت بیانی اور وہ بھی شیرو کی زبانی سن کر بیگم کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ آج پہلی بار شیرو نے شکوہ کیا۔ پہلی بار اپنے دل کے درد کا حال سنایا تو بیگم کے دل میں بھی کرب کی ایک گہری لہر دوڑ گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنے انتخاب پر بہت نازاں تھیں لیکن اب اپنے کیئے پر شرمسار ہو رہی تھیں۔ بڑی رازداری سے کل ہی تو انہوں فردوس اور جمال شاہ کا رشتہ پکا کر دیا تھا۔ وہ حیران تھیں۔ کہ شیرو کو یہ خبر کیسے معلوم ہوئی۔ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح شیرو کو یقین دلائیں کہ جو کچھ بھی ہوا اس کے ذمہ دار وہی ہیں۔

دھیمی آواز میں بولیں۔ شیرو ایسا نہیں ہے کہ ہم تم سے کم محبت کرتے ہیں۔ ہم نے تم سے بار بار کہا۔ وہ

بولے بارہا آپ نے بہت کچھ کہا لیکن ایک بار آپ نے یقین سے نہ کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہماری حق تلفی نہیں ہو سکتی۔ایک بار بھی نہ سوچا کہ ہمارا کیا حال ہوگا۔ہم دنیا والوں کے سوال کے جواب کہاں سے لائینگے۔آپ کے سلوک نے تو ہمارے سارے احساسات۔محسوسات اور جذبات کا شیرازہ بکھیر دیا۔صرف ایک بار تو کہہ کر دیکھتیں۔شراب چھوڑنا تو بہت معمولی سی بات ہے آپ جان مانگتیں تو ہم دریغ نہ کرتے۔

جب ہماری امید کی ڈور ہی ٹوٹ گئی پھر ہم اس بنجر زندگی کا کیا کرتے۔خودکشی کرنا حرام ہے۔شراب کا سہارا لے کر ہم نے قسطوں میں مرنے کی ٹھان لی۔ایک نہ ایک دن تو ہم شراب کے نشے میں غرق ہو ہی جاتے۔سب یہ ہی کہتے، شرابی تھا۔فردوس کے قابل ہی نہ تھا۔نہ آپ پر کوئی الزام آتا نہ آپ کی آن پر آنچ آتی۔امی بیگم جو کچھ زبان سے نہ کہہ سکیں ان کے آنسو کہہ رہے تھے۔شیرو کی سرخ انگارہ آنکھوں میں دیکھنے کی تاب اب ان میں نہ تھی۔وہ اندر ہی اندر پچھتا رہی تھیں۔احساس ہو رہا تھا کہ ان کی ماضی کی غلطیوں کی وجہ سے ساری حویلی کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔انہوں نے کوثر اور شیرو کی شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔

خورشید عالم کی حویلی کا حال سنیئے۔

خورشید عالم کو گئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔پھوپھو کو خیالوں کا ایک سلسلہ بے چین کئے ہوئے تھا۔کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر دے۔طیش میں آ کر جوان خون کسی کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کر دے۔جب وہ لوٹے تو بہت خوش نظر آ رہے تھے۔پھوپھو نے دیکھتے ہی سوال کیا۔بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔کیا سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔وہ بولے واقعی آج ہم بہت خوش ہیں۔کیوں۔قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے پھوپھو بولیں۔جی ہاں اس سے بھی بڑھکر۔ہمیں گوہر مراد مل گیا ہے۔پھوپھو نے حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ کر پوچھا۔وہ کیسے۔تم نے ایسا کیا کر دیا۔کہ۔وہ بیچ میں ہی بول پڑے۔جب تقدیر انسان کا ساتھ دے تو اسے وہ سب مل جاتا ہے جس کی اسے خواہش ہوتی ہے۔ہوایوں کے پاس والے قبیلے والوں نے ہمارے گاؤں میں آ کر فساد شروع کیا۔ذرا سی چنگاری آگ بن کر بھڑک اٹھی۔بات بڑھتے بڑھتے مار دھاڑ تک پہنچ گئی۔اس ہنگامے میں ہمارے گاؤں کی دو لڑکیاں ہلاک ہو گئیں۔دونوں طرف کے کئی لوگ بھی زخمی ہو گئے۔تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ شیر خان کے حکم کی تعمیل کی گئی تھی۔یہ بھی کہا گیا کہ شیرو نے خود گولیاں چلائی تھیں۔ادھر تو آگ دہک رہی تھی سب شیر خان سے بدلہ لینے پر۔پھوپھو کے دل و دماغ میں شیر خان کا نام سنتے ہی بڑی ہلچل مچ گئی تھی۔بولیں تم نے اپنے لوگوں کو روکا کیوں نہیں۔وہ بولے ایک دو کو تو سمجھایا جا سکتا ہے جب اتنے لوگ خلاف ہو جائیں تو ان کی بات بھی سننا پڑتی ہے۔ہم نے روپیہ دے کر لڑکیوں کے ماں باپ کے منہ تو بند کر دئے۔لیکن جو لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ان کے ساتھی بولے کہ اگر ہم اس وقت خاموش رہ گئے تو یہ حملے اس طرح جاری رہینگے۔اور یہ خون ریزی کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوگا۔باقی لوگ بھی متفق ہو کر شیر خان سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔

ان کا مطالبہ تھا یا تو سورج طلوع ہونے سے پہلے تھانے میں رپورٹ درج کرائی جائے۔اگر معاملہ

اپنے تک ہی محدود رکھنا ہے اور شیر خان کی سلامتی چاہتے ہیں تو غنیمت میں فردوس بی بی دے دی جائیں۔ ہم نے آفتاب خان کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔ پھوپھی سن کر اپنے دل میں حیران ہو گئیں۔ دھیمی آواز میں بولیں گاؤں کی دو لڑکیوں کے بدلے تم چار کا مطالبہ کر سکتے ہو۔ فردوس کا ہی سودا کیوں کیا۔ یہ تو سراسر بے انصافی ہو گی۔۔ پھوپھی فردوس ہی وہ لڑکی ہیں جن کو حاصل کرنے کے لئے ہماری روح تڑپ رہی ہے۔ پھوپھو سن کر کانپ گئیں۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں بکھر گئیں۔ وہ بولیں تو فردوس کو حاصل کرنے کے لئے تم نے شیر خان کو اپنا ہدف بنالیا۔ اس پر جھوٹا الزام عائد کر دیا۔ انہوں نے پھوپھو کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا انسان اپنی خواہش کے سامنے خود غرض ہو ہی جاتا ہے۔ آپ ایسی حیران پریشان کیوں ہیں۔ آج یہ پہلی بار تو ایسا نہیں ہو رہا۔ یہ تو ہماری بہت ہی قدیمی روایت ہے۔ اگر آفتاب خان نے ہماری شرائط منظور نہ کیں تو قتل و غارت کا ایسا بازار گرم ہو گا کہ دونوں طرف ہی اماں نہ ملے گی۔ ثریا بانو نے ایک لمبی سانس لے کر کہا کاش آج تمہارے ابو یہاں ہوتے تو یہ ہرگز نہ ہوتا۔ جب سے تمہارے ابو گئے ہیں تمہارے قدم زمین پر ہی نہیں ٹکتے۔ اونچی اڑان اڑ رہے ہو۔ جتنے اونچے سے گرو گے اتنی ہی زیادہ چوٹ کھاؤ گے۔ یہ فیصلہ لینے سے پہلے ہم سے اور قبیلے کے بزرگوں سے صلاح و مشورہ ضرور کرنا چاہیئے تھا۔ خورشید عالم کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ان کی ہر ضد پوری کرنے والی پھوپھو آج ان کی اس فتح پر خوش نہ تھیں۔ وہ بولے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ ہماری اس فتح پر خوش نہیں ہیں۔ پھوپھو نے خورشید عالم کا چہرہ بغور دیکھ کر کہا۔۔ فتح۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تمہاری اس فتح پر خوش ہوں یا ایک لڑکی کی مجبوری پر آنسو بہائیں جس کے ساتھ بہت خوفناک زیادتی ہو رہی ہے۔ تمہارے ابو اس قدیمی روایت کے سخت خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔ اور تم نے پہلا قدم ہی اپنے فائدے کے لئے غلط راہ پر اٹھایا۔ انصاف واضح اور صاف ہونا چاہئے۔ سزا اصلی مجرم کو ملنا چاہیئے۔ ہماری مانو تو اپنا ارادہ بدل دو کیونکہ جو بھی تم کرنے جا رہے ہو وہ جائز نہیں ہیں خورشید عالم بولے ہم نے تو فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے۔ اس میں شیر خان کی بھی بھلائی ہے۔ ہمیں فردوس مل جائے گی اور شیر خان کورٹ کچہری کے چکروں سے بچ جائے گا۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ پھوپھو بولیں۔ اونچے نسب کی لڑکی ہے۔ دھیان رکھنا اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

ایک عجیب سا خوف ثریا بانو کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ شیر خان اور فردوس۔۔ کیا ہونے والا ہے۔ یادوں کے دریچے ایک کے بعد ایک کھلنے لگے۔ ماضی کی یادیں ذہن میں شور مچانے لگیں۔ طارق خان کا حسین چہرہ انہوں نے برسوں سے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا آج پھر آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ طارق خان کی چاہت تھیں اور طارق خان ان کی زندگی۔ طارق خان نے اپنی جوانی کے کئی خوبصورت لہلہاتے سال ثریا بانو کی محبت پر قربان کر دئے لیکن بات بن کر ہی نہ دی۔ کیونکہ خاندان میں پردے کا رواج تھا۔ سو پہلا سوال تو یہ اٹھتا کہ دونوں کی ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی۔ ثریا بانو اپنی محبت کا افسانہ بنانا نہیں چاہتی تھیں۔ بزرگوں کے فیصلے کے خلاف جانے والی لڑکیوں کی ہوش اڑانے دینے والی داستانیں بھی سن چکی تھیں۔ لڑکی کو زہر دے کر مارا جا سکتا تھا۔ کال کوٹھری میں بند کر کے اسے پاگل قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر لڑکے اور لڑکی نے ضد میں آ کر اپنی من مانی کی تو دونوں طرف خون کی ندیاں بہائی جا سکتی تھیں۔ لیکن دو پیار کرنے والے دلوں کا ملاپ ہرگز ممکن نہ تھا۔ سال پر سال بیت

گئے۔ کتنے ہی موسم بدلے۔ لیکن ان دونوں کی محبت کے بیچ میں کونپلیں نہ پھوٹ سکیں۔ طارق خان کی شادی مہر افروز سے زبردستی کردی گئی۔ ثریا بانو نے تا عمر شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا۔

طارق خان اور مہر افروز کی شادی کو دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ دونوں ہی شیر خان کو اکیلا چھوڑ کر چل بسے تھے۔ ثریا بانو کے مقدر میں تو ازل ہی سے تنہائیوں کا دکھ لکھا تھا۔ انہیں معلوم ہوا تو اس غم کو بھی خاموشی سے جھیل لیا۔ ان کے دل کا راز کوئی نہ جان سکا۔ ساری زندگی بیوگی کے چولے میں کاٹ دی۔ اسی اثناء میں ایک اور آفت آن پڑی۔ سلطان عالم کی بیگم کسی حادثے کا شکار ہوگئیں۔ ثریا بیگم نے اپنے بڑے بھائی جان کے تینوں بچوں کو سینے سے لگالیا۔ اب دن تو حویلی اور بچوں کی دیکھ بھال میں گذر جاتا۔ تنہا راتیں بڑی مشکل سے کٹتیں۔ آج خورشید عالم نے ان کے زخموں کو بری طرح کرید ڈالا تھا۔ ہر لمحہ یوں لگتا تھا کہ طارق خان سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں۔ ثریا کسی طرح میرے خاندان کی عزت کو بچالو۔ لیکن ایک بے بس عورت کر بھی کیا سکتی تھی۔ سوائے دعا کے۔ غم کی شدت سے وہ بالکل بے جان ہوگئی تھیں۔ سلطان بھائی جان کی یاد بڑی شدت سے آرہی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو آج طارق خان کے بیٹے کے ساتھ بے انصافی نہ ہوتی۔ صبح ریحان عالم اور شاہین نے دیکھتے ہی کہا۔ پھوپھو آپ کو کیا ہوگیا۔ برسوں کی بیمار لگ رہی ہیں۔ ریحان نے ڈاکٹر بلانے کی کوشش کی۔ پھوپھو نے منع کردیا۔ ہم ٹھیک ہیں۔ تم دونوں جلدی کرو۔ کالج میں دیر ہورہی ہے۔ اور من میں سوچنے لگی ہمارے درد کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں۔

آیئے آفتاب خان کی حویلی کا حال معلوم کریں۔

جب سے یہ خبر ملی تھی کہ شیر خان کی جان خطرے میں ہے حویلی پر ایک عجیب دہشت ناک ماحول چھا گیا تھا۔ آفتاب خان کوشش کررہے تھے بغیر کسی تکرار و غصے کے یہ مسئلہ حل ہوجائے تو بہتر ہوگا۔ لوگوں کا آنا جانا لگا تھا۔ معاملہ پیچیدہ ہوتا جارہا تھا۔ بات خون بہا تک پہنچی تو آفتاب خان بہت بے چین ہوگئے۔ خبر یہی تھی کہ یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ جب بیگم آفتاب خان کے کمرے میں گئیں تو ان کی بے قراری دیکھ کر فوراً سمجھ گئیں کہ کیس ہاتھوں سے باہر ہوتا جارہا ہے۔ ہم بڑے بحران سے گزر رہے ہیں۔ ہم قبیلے والے اپنی روایتوں اور اصولوں کے پابند ہیں۔ پولیس کا سہارا لینا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اپنے معاملے خود نمٹاتے ہیں۔ صلح تو وہ لوگ بھی چاہتے ہیں پر اپنی ضد پر تلے ہیں۔ کیسی ضد کیا چاہتے ہیں بیگم نے رو کر پوچھا۔ یہی کہ صبح ہونے سے پہلے پولس میں رپورٹ درج کرائی جائے ورنہ وہ لوگ۔ اگر شیرو کی سلامتی چاہتے ہے تو۔ تو کیا بیگم نے گھبرا کر سوال کیا۔ آفتاب خان خاموش ہوگئے۔ آپ رک کیوں گئے۔ غنیمت میں فردوس چاہتے ہیں۔ بیگم کی چیخ نکل گئی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میری بچی کا کیا قصور ہے۔ بیگم ہماری طرف سے فیصلہ تبدیل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ یہ معاملہ کس طرح سلجھے۔ ہم انہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں۔ بیگم تڑپ رہی تھیں۔ آپ کچھ کریئے۔ یہ ناگن جیسی کالی سیاہ رات بھی دھیرے دھیرے رینگتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہمارا قبیلہ کمزور تو نہیں۔ ہم انہیں بآسانی زیر کرسکتے ہیں۔ انہیں تہس نہس کرسکتے ہیں۔ پھر خوف کی کیا بات ہے۔ لیکن بیگم یہ خون بہا کا معاملہ ہے۔ ابھی تو دونوں طرف سے مذاکرات چل رہے ہیں۔ بیگم ابھی تو ایک ہی لڑکی کا سوال ہے اگر پولس تک معاملہ پہنچا اور شیرو پر انگلی اٹھائی گئی پھر

ہماری دونوں لڑکیوں کو کون اپنائے گا۔ اپنی بیٹی کی رہائی کے لئے جنگ کا مطلب اور قتل وغارت ۔۔ اور کتنی جانیں گنوانی ہونگی ۔ مارنے اور مرنے کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ دولت تو آنے جانے والی چیز ہے۔شاید وہ ہماری بات مان ہی لیں۔ خان کی باتوں نے بیگم کو سر اٹھانے کے لائق بھی نہیں رکھا۔ انہیں اپنی رگوں میں بہتا لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ بالکل بے جان اور بے دم ہوکر وہیں بیٹھی روتی رہیں۔

بیگم یہ ہمارے لئے امتحان کی گھڑی ہے۔ سوچ لیجئے ۔ اگر وہ نہ راضی ہوئے تو ہم دونوں کو نہیں بچا پائینگے ۔ ایک طرف شیرو ہے اور دوسری طرف فردوس ۔ ہمارے لئے تو جیسا شیرو ویسی فردوس ۔۔ فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بیگم کراہ اٹھیں ۔ ہمارے اوپر بڑا عذاب نازل ہوا ہے۔ ہم تو ہمیشہ ہی آپ کے ساتھ ہیں۔ اس برے وقت میں آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

اور پھر وہی دھماکہ خیز خوفناک خبر۔ گواہوں کی بات اتنی مظبوط تھی کہ آفتاب خان خاموش ہو گئے ۔ بیگم تقدیر کے وار سے کوئی نہیں بچ نہیں سکتا، آفتاب خان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ہم نے ہار تسلیم کرلی ہے۔ فردوس کو جانا ہی ہوگا۔ آفتاب خان جیسے مضبوط انسان کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جو اپنی بیٹیوں کا ذرا سا دکھ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے نہ معلوم کس طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے ۔ صدمہ کی شدت سے اس چٹان نما انسان کو لگتا تھا سینہ ہی پھٹ جائے گا لیکن صبر اور ہمت کا مظاہرہ کرر ہے تھے ۔ اندر حویلی میں یہ سنسنی خبر پھیلی تو سب کے ہوش اڑ گئے ۔ ایک طوفان برپا ہوگیا۔ سارے حویلی والے سینہ پیٹ پیٹ کررو رہے تھے۔ اندر فردوس ماں کے سینے سے لپٹی سسک سسک کہ کہہ رہی تھی ۔ امی بیحد غرور تھا ہمیں قبیلے کے سردار کی بیٹی ہونے کا۔ کس قدر غلط سوچ تھی کہ ہمارے ابو ہماری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے ۔ ہماری خوشیوں کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیشہ تو یہی یقین دلایا گیا تھا کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارے ابو جو سب کے لئے سائباں ہیں آج اپنی ہی بیٹی کو اپنے لئے سائباں کرر ہے ہیں۔ امی ہمارے ابو۔ اپنی ہی بیٹی کو کیوں تحفظ نہیں دے سکتے ۔ ہمیں غیروں کے حوالے کر کے ہماری موت کا فرمان جاری کرر ہے ہیں۔ امی ہم کسی اور کی مرضی کی زندگی ہرگز نہیں جی سکتے ۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی اسے اردگرد کا ہوش ہی نہ تھا۔ دونوں بہنیں چیخ رہی تھیں ۔ زارزار رو رہی تھیں ۔ بھائی خاموش کھڑے تھے۔ بس فردوس کو تاکے جار ہے تھے ۔ اور دونوں کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے ۔ فردوس لرز رہی تھی۔ امی سے لپٹی گڑگڑا رہی تھی ۔ امی ہم تو ساری دنیا سے بے خبر تھے۔ آپ کے فیصلے نے ہماری دنیا بدل دی تھی۔ اور آج یہ دوسرا فیصلہ کیوں۔ امی ہم نے منگنی کے رشتے کو ہی سب کچھ مان لیا ہے۔ ہم اس فیصلے کو قطعی برداشت نہیں کرینگے۔ فردوس کی کرب وسوز سے بھری آواز سب کے دلوں کو چیر دے رہی تھی ۔ سب اللہ کو پکار ر ہے تھے۔

آخر وہ قیامت کی گھڑی آ ہی گئی ۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ اب اور سوچنے کا وقت نہیں ۔ لڑکی کو بلایئے ۔ امی کوئی اپنی بیٹی کو اس طرح وداع کرتا ہے۔ امی وعدہ کریئے ہم جب واپس آئینگے آپ ہمیں دلہن سجا کر وداع کریں گی ۔ ہم جلد ہی واپس آئیں گے ۔ آپ ہمیں نہ بچا سکے ۔ آپ دیکھنا ہم اپنی بگڑی ہوئی تقدیر خود سنواریں گے ۔ کمرے میں ابو داخل ہوئے بے اختیار سب کی نظریں اس سمت اٹھیں ۔ فردوس امی کی گود میں سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی روتے روتے بیدم ہوگئی تھی لیکن بولے ہی جارہی تھی ۔ ابو کا زرد چہرہ اور جھکا سر دیکھ کر وہ حیرانی اور پریشانی سے

انہیں دیکھتی رہی۔۔آؤ بیٹی۔۔جو سارے قبیلے کا فیصلہ سناتے تھے آج اپنی بیٹی کی قسمت کا فیصلہ سناتے وقت ان کا دل لرز رہا تھا۔آؤ۔۔وہ لوگ جلدی کر رہے ہیں۔امی ہمارے ابو ہی ہمیں ہماری موت کا حکم دے رہے ہیں وہ سسک اٹھیں تھیں۔دونوں بھائی ابو کے پاس کھڑے تھے۔شاید ایسی مصیبتوں کے وقت ہی مردوں کو بڑی ہمت سے کام لینا ہوتا ہے اسی لئے تو دونوں بھائی اور ابو ٹل کر دینی دئے تھے۔امی ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ایسی کالی بھیانک رات میں اتنے خوفناک اور ہیبت ناک راستے پر ہم ان انجانے لوگوں کے ساتھ ابو کیسے جائیں گے۔امی نے دھیمے سے کہا میری جان اللہ تمہارے ساتھ ہے۔جو بھی ہو خاموشی سے سہہ لینا۔اس نے ماں کو زور سے پکڑ لیا۔دونوں بہنوں نے آکر فردوس کو جکڑ لیا۔بھائی آگے بڑھے۔امی کا دل چاہا اسی طرح اپنی لاڈلی کو اپنے بازوؤں میں جکڑے رہیں اور کبھی نہ چھوڑیں۔

ابو کی آواز پھر آئی۔بیٹی ہمارے مقدر میں یہی لکھا تھا۔مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکا ہے۔ابو ہم آپ سب کے بناء کیسے جی پائیں گے۔بیٹا ہم کیسے زندہ رہے گے تمہارے بغیر۔ابو ہم یہ ظلم سہہ نہ پائیں گے۔میری بچی تمہارے ابو مجبور ہیں۔ابو کی پر سوز آواز سن کر وہ اور بھی ڈر گئی تھی۔ابو ساکت وجامد کھڑے اپنی لاڈلی۔اپنے دل کے ٹکڑے کو بکھرتے دیکھ رہے تھے۔دونوں بھائیوں کا سہارا لے کر وہ اپنا شکستہ وجود گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ایک ہولناک چیخ کے ساتھ وہ اپنے بھائیوں کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔اماں اور بہنوں کی چیخیں گونجیں۔امی پورے زور سے چیخیں۔ہائے۔میری بچی بے ہوش ہو گئی۔ابو نے کہا۔ٹھیک ہی ہوا۔اسے اسی حالت میں وداع کرنا بہتر ہے۔دونوں بھائیوں نے فردوس کو موٹر کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔فردوس کا سر زرینہ کی گود میں تھا۔ابو سر جھکائے زرینہ سے بولے۔سنبھال کر لے جانا۔میری بچی کا خیال رکھنا۔اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔سارے مرد سر جھکائے کھڑے رہ گئے۔اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔جب گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو شدت غم سے سب رو پڑے۔ابو کراہ رہے تھے۔سب اپنے مالک کو ٹوٹتے اور کراہتے دیکھ کر اور بھی رونے لگے تھے۔بہت دیر تک سب وہی کھڑے رہے۔سڑک پر خاک اڑتی رہی۔اور پھر سب آہستہ آہستہ سے پلٹے۔حویلی کے اندر باہر کہرام مچ گیا تھا۔

ماحول تو ویران تھا ہی شیرو کے دل میں بھی بڑی ویرانی سی تھی۔امی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔اس پر اب پچھتا رہا تھا نادم تھا۔بیگم کی باتوں نے اسے بیحد پریشان کر دیا تھا۔دماغ اندیشوں سے بھرا تھا۔آفتاب خان کی وسیع عریض حویلی میں یوں بھی ایک کونے کی خبر دوسرے کونے تک پہنچنا ناممکن تھا اور آج تو ان کا حکم تھا جب تک فردوس چلی نہ جائے شیرو کو اس بات کی بھنک تک نہیں لگنی چاہیئے۔وہ ہر معاملے سے بے خبر تھا لیکن انکا دل بہت ہی بیقرار تھا۔بے چینی کے عالم میں وہ امی بیگم کے کمرے کی طرف گئے۔وہاں تو ماتم منایا جا رہا تھا۔ہر فرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔وہاں سب ہی موجود تھے۔بس ایک وہ ہی نہیں تھی جس کی تلاش میں شیرو کی نظریں ہمیشہ بیقرار رہتی تھیں۔چچا جان کی سرخ آنکھیں گیلی تھیں۔اور بیٹھے بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔امی بیگم کی آواز پر وہ چونکے تھے۔ہم سب تو حویلی میں محفوظ ہیں میری بچی کہاں ہوگی۔میری نازک سی معصوم بچی پر کیا بیت رہی ہوگی۔معلوم نہیں فردوس ہوش میں بھی آئی ہوگی یا نہیں۔

فردوس کا نام سنتے ہی شیرو نے پیروں تلے دھرتی اس شدت سے گھومتی محسوس کی کہ ایسا لگا حویلی کے

کنگورے چھت سمیت زمین پر آگرے ہوں۔ سورج کالا ہو گیا ہو۔ چاروں طرف گھور اندھیرا چھا گیا ہو۔ شیر خان گرجے۔ ہماری حویلی پر سے قیامت گزر گئی اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ان کی سرخ آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ چہرہ غم وغصے سے تمتما اٹھا۔ چچا جان آپ نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ چچا نے شیرو کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا ضبط کی آخری سطح پر پہنچ کر ہم نے یہ فیصلہ قبول کر لیا۔ ہم سب نے یہ دکھ کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا۔ ہم جانتے تھے فردوس کا اس طرح گھر سے جانا تم برداشت نہ کر پاتے۔ یہ تمہارے ضبط کا بھی کڑا امتحان ہے۔ بس اب صبر کرنے کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں۔ شیر خان بے تحاشا چیخا۔ ہماری عزت اور عظمت پر ڈاکہ ڈالنے والے اپنے دشمن کو ہم خاک میں ملا دیں گے۔ اگر وہ ہمیں مجرم سمجھتے ہیں تو ہم سنگین سے سنگین سزا جھیلنے کو تیار ہیں لیکن فردوس کو واپس لانا ہی ہوگا۔ ہم اس جارحیت کا منہ توڑ جواب ضرور دیں گے۔ یکلخت ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

آفتاب خان بولے ہم قبائل کو اپنی رسموں کے تحت جینا پڑتا ہے۔ اب تم اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤ گے۔ کہاں پاؤ گے اسے۔ اگر وہ مل بھی گئی تو نہ جانے اسے کس حال میں پاؤ گے۔ یہاں بھی اب اسے کون جینے دے گا۔ سب مل کر اتنا رلائیں گے کہ وہ جیتے جی مر جائے گی۔ بہتر ہے اس کے ساتھ جو بھی ہونا ہے وہیں ہو۔۔ اچھا۔۔ یا برا۔ شیر خان سر پکڑ کر امی بیگم کے قدموں میں بیٹھ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ امی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ انسان کے ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شیرو سسک کر بولے۔ آپ لوگوں نے فردوس کو بے سائبان کر کے ہمیں کتنی کٹھن سزا دی ہے۔ اس سے بہتر ہوتا اس گھڑی کے آنے سے پہلے ہمیں موت آجاتی۔ اب یہ سانسیں ہمارے لئے بوجھ بن گئی ہیں۔ کب تک ہم ان کی دی ہوئی زندگی کا بوجھ اٹھائے یہ سانسیں گنتے رہیں گے۔ نہ جانے اسکو کن کن اذیتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب ہمیں کبھی بھی چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔

آفتاب خان نے شیرو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔ گردش حالات ہی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ کس کو معلوم تھا ایسا ہوگا۔ اب اس کی زندگی اور مشکل نہ بناؤ۔ بس دعا مانگو کہ وہ جہاں بھی رہے خیریت سے رہے۔ حویلی میں سب ہی بیحد رنجیدہ اور غمگین تھے۔ سب ہی سوگ میں ڈوبے تھے۔ لیکن شیرو جو ہمیشہ ظاہر میں سب سے لاپروا اور بے حس معلوم پڑتا تھا آج سب سے زیادہ پریشان تھا۔

فردوس کا سفر سنیئے۔

فردوس کا یہ بھیانک سفر بیہوشی کے عالم میں طے ہو رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ جب ذرا ہوش آیا اور آنکھیں کھولیں تو زرینہ کا مایوس چہرہ اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ زرینہ نے فوراً ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تب فردوس کو ہوش آیا کہ وہ سارے سہاروں سے دستبردار ہو چکی ہے۔ وہ غیروں کے ساتھ ہے۔ اور اسے کچھ بولنے کی آزادی نہیں ہے۔ زندگی کے ساتھ اس کے سارے سلسلے ٹوٹ چکے ہیں۔ اپنے لوگوں سے رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ خوف اور نقاہت کی شدت سے وہ پھر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

پھر آنکھ کھلی تو فردوس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔ پاس زرینہ بیٹھی تھی۔ ذرا اور ہوش سنبھلے تو فردوس نے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی۔ زرینہ اسے دلاسہ دے رہی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا تھا۔ وہ آہٹ سنتے ہی اپنے خیالوں سے چونکی تھی۔ ہم خورشید عالم ہیں۔ اندر آتے ہی اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ آپ تعارف کی محتاج نہیں۔ کون ہے جو آپ کو نہیں جانتا۔ اس ملاقات کے ہم بہت مشتاق تھے اور بڑی بے قراری سے ہر لمحہ اس گھڑی کا انتظار کیا تھا۔ آپ کو دیکھا تو نہیں صرف آپ کے بارے میں سنا۔ اور اتنا سنا کہ دل آپ سے ملنے کے لئے بیقرار ہو اٹھا۔ بنا دیکھے بھالے۔ بنا سوچے سمجھے آپ سے محبت کر بیٹھے۔ آپ کی چاہت میں ہم اپنا آپ ہی بھول بیٹھے۔ آج تک صرف آپ کا خیال ہماری زندگی تھا۔ ہمارا دل اور آنکھیں تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ کبھی بار سوچا آپ کے ابو کو پیغام بھیجیں پر دل نے گواہی نہیں دی۔ ہارنا ہم جانتے نہیں۔ اور انکار سننے کے ہم عادی نہیں۔ آپ کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے کیا کیا نہیں کیا۔ آسمان زمین ایک کردی۔ شکر اللہ کا آج ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ آپ کی یہاں موجودگی ہماری جیت اور خوش نصیبی ہی کا ثبوت ہے۔ ہماری پھوپھو کہتی ہیں محبت وہی کامیاب ہوتی ہے۔ جو دو طرفہ ہو۔ بھئی ہم تو آپ پر سو جان سے فدا ہیں۔ یوں تو آپ پر اور آپ کی محبت پر بس ہمارا اختیار ہے۔ کل نکاح کے بعد آپ کو بھی خود بخود ہم سے پیار ہو جائے گا۔ شوہر تو ہوتے ہی ہیں بیوی کی محبت کے حقدار۔ حسن میں بہت کشش ہوتی ہے۔ بس وہی کشش ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ آپ کو ایک نظر بھر دیکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن یہ خواہش بھی ہم کل نکاح کے بعد ہی پوری کریں گے۔ وہ بھی منہ دکھائی کا تحفہ دینے کے بعد۔ بولیے کیا تحفہ چاہتی ہیں۔ ہمارے بس میں ہوتا تو آسمان سے چاند تارے توڑ کر آپ کے دامن میں ڈال دیتے۔ ہمارے پاس آپ کو دینے کے لئے بچا ہی کیا ہے۔ دل تو پہلے ہی آپ کی نذر کر چکے ہیں۔ یہ جان آپ کے حوالے ہے۔ اور اس دنیا میں ہر وہ چیز جس پر ہمارا حق ہے وہ آپ کی ہے۔ آپ کو تو اپنے مقدر پر ناز ہونا چاہیئے۔

فردوس جو بیحد افسردگی میں گھری۔ گھبرائی بیحد خوفزدہ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی یہ باتیں سن کر اور زیادہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس کا دل چاہا زور سے کہہ دے اگر سچ مچ مجھے اتنا چاہتے ہو تو مجھ پر رحم و کرم کرو مجھے آزادی دے دو۔ کیونکہ آزادی سے زیادہ قیمتی تحفہ میرے لئے اور کچھ نہیں۔ اگر وہ نہ دے سکو تو مجھے موت دے دو۔

اس طرح والہانہ انداز میں اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنے کے بعد خورشید عالم جواب کے منتظر تھے۔ فردوس کی خاموشی نے انہیں از حد برہم کر دیا۔ بولے مانا حسن مغرور اور ضدی ہوتا ہے۔ آج معاملہ حسن اور عشق کا ہے۔ آپ ہماری ہیں اور جتنی جلدی آپ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں آپ کے لئے بہتر ہوگا۔ ہمارا یہ پاگل دل آپ پر مرمٹا ہے۔ ہم آپ کو اپنی شریک حیات۔ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔ آپ کو خاموش دیکھ کر ہم حیران ہیں۔ آپ کچھ تو بولیئے۔ فردوس نے جنبش بھی نہ کی تو ان کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ آپ بھول رہی ہیں کہ اب آپ ہماری دسترس میں ہیں اور آپ کی قسمت کا فیصلہ بھی ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ تاوان میں آئی ہوئی لڑکی کی نہ اپنی کوئی خوشی اور نا ہی مرضی ہوتی ہے۔ اتنا غرور اچھا نہیں۔ ہم آپ کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے دل کے ہاتھوں کچھ اس طور سے بے بس ہو گئے ہیں کہ اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ اور یہ ہمارا دل آپ کو بے انتہا چاہتا ہے۔ سنا ہے آپ کی آنکھیں بے حد حسین ہیں۔ کل ہم ان خوبصورت آنکھوں میں محبت کا اقرار دیکھنا

چاہتے ہیں۔ یقین کریئے ہم آپ کو یہاں رسوا کرنے نہیں لائے۔ آپ کی پذیرائی کے لئے کنیزیں موجود ہیں۔ اب آپ آرام فرمائیں۔ باقی باتیں کل نکاح کے بعد ہونگی۔ وہ دھم دھم کرتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

فردوس پر کیا گزری اس کا حال سنیئے۔

فردوس نے تو اپنے دل میں کچھ اور ہی ٹھان لی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو پہلے ہی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اب خورشید عالم کی وحشیانہ باتوں کا زہر اس کی رگوں میں پھیل چکا تھا۔ فردوس نے زرینہ سے کہا۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم نے تمہیں کنیز کم اپنی سہیلی زیادہ سمجھا۔ یہ وقت ہمارے لئے سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ اپنوں سے دور۔ ایک غیر مرد کی تحویل میں ہیں ہم۔ لیکن ہم ہاریں گے نہیں۔ منگنی ہوتے ہی ہم نے جمال شاہ کے ساتھ دل سے لے کر جان تک کا سودا کرلیا تھا۔ ہمیں خورشید عالم کا فیصلہ منظور نہیں۔ تم ہمارا سندیسہ ان کو دینا۔ کہنا کہ ہمارے دل کو بڑی تسکین ہے کہ ہم نہ رہیں گے مگر ہمارا نام ان کے نام سے ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ وصال منزل نہیں۔ سچی محبت پالینا ہی منزل ہے چاہے وہ گھڑی بھر کے لئے ہو۔ زرینہ کو اپنا آپا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ فردوس کی حالت دیکھ کر بولی۔ ایسے نہ بولیئے۔ نہیں زرینہ ہمیں بولنے دو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔ وہ بولتی رہی اور زرینہ سنتی رہی اور روتی رہی۔

امی ابو اور گھر کے سب لوگوں سے کہنا کہ ہمارے جانے کا غم نہ کریں کیونکہ اب ہمیں زندگی کی تمنا بالکل نہیں رہی۔ آج ہمیں موت پیاری لگ رہی ہے کیونکہ موت ہی برے وقت میں کام آتی ہے۔ ہماری نجات کی منزل کا راستہ۔ صرف موت ہے صرف موت، ہمیں رسوائی اور خواری سے بچاسکتی ہے۔ ہمیں سارے دکھوں سے رہائی دلواسکتی ہے۔ کہنا شیرو بے گناہ ہے۔ جب موت اور زندگی کا حساب اللہ کے ہاتھوں میں ہے تو پھر ہماری موت کا ذمہ دار کوئی انسان کیسے ہوسکتا ہے۔ ابو سے کہنا اپنی بیٹی کا آخری کہا ضرور پورا کریں۔ چار قبیلے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں چاروں قبیلوں میں امن اور شانتی رہے۔ آپ سب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ آپسی دشمنی۔ حسد۔ جلن۔ کدورتیں۔ نفرتیں سب ہمارے ساتھ ہی دفن کردیں۔ تاکہ کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے۔ کوئی لڑکی ہماری طرح بے گھر نہ ہو۔ آج ہم نے غم کی انتہا دیکھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہماری موت سب کے لئے عبرت انگیز حادثہ بن جائے۔ ابو سے کہنا سب کو معاف کردیں۔ ہم نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ جو بھی گنہگار ہے اسے سزا اور جزا کے دن خدا کو جواب دینا ہوگا۔

فردوس کا سر زرینہ کی گود میں تھا۔ غم اور وحشت کی وجہ سے فردوس کو اپنا دم رکتا محسوس ہو رہا تھا پر بولے جارہی تھی۔ آج ہم بہت تنہا ہیں۔ اپنوں سے کتنی دور۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم ہیں کہاں۔ ہمارا اسلام سب کو دینا اور کہنا یہ سلام آخری ہے۔ اب ہم کسی سے مل نہ سکیں گے۔ زرینہ اتنا اندھیرا ہے۔ میرے مولا۔ میرے رب یا تو طور سے کوئی آواز آئے۔ یا مجھے موت دے دے۔ زرینہ ہماری ساری بلائیں ختم ہوئیں۔ بس ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔ زرینہ زرینہ۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک گہری سانس لی۔ شاید وہی آخری سانسیں تھیں۔ زرینہ خوف سے لرز رہی تھی۔ اس نے بازو پکڑ کر ہلایا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ دل کی دھڑکنیں بند ہو چکیں تھیں۔

زرینہ کے دل پر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہ زور سے چیخی تھی۔ کئی ملازمائیں دوڑی آئی تھیں۔ ڈاکٹر بلائی گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا صدمہ کی شدت سے ایسا زبردست شاک لگا کہ حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ کوئی بہت بھاری غم لے گیا انہیں۔ ڈاکٹر کی نظر انگوٹھی پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ ارے یہ تو کسی کی منگیتر تھیں۔ زرینہ سے سوال کئے اس نے زبان کھول کر نہ دی۔ وہ تو صدمہ اور حیرت سے ہلکان تھی۔ زرینہ نے فردوس کا چہرہ دیکھا۔ اب اس چہرے پر نہ غم تھا نہ دکھ کا کوئی نشان۔ بس سکون ہی سکون تھا۔ موت نے اس کی مالکن کو ہر غم سے آزاد کر دیا تھا۔

جمال شاہ کا حال سنیے۔

فردوس کی باتوں نے جمال شاہ کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ بند آنکھوں میں بھی اس کا مڑ مڑ کر دیکھنا نظر آ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔ خبر اتنی سنسنی خیز تھی کہ سنتے ہی ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ انہیں یوں لگا کہ روزِ قیامت آ گیا ہے اور ساری کائنات فنا ہوگئی ہے۔ آسمان و زمین پر کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ بے تحاشہ آنسو گر رہے تھے۔ نظر اٹھائی تو سامنے اپنے والدین کو کھڑا دیکھ کر آنسو پونچھ ڈالے۔ امی رو رہی تھیں۔ فردوس کو وہ کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتی تھی اور اچانک یہ کیا ہوگیا تھا۔ امی ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ وہ ہماری منگیتر ہیں۔ حالانکہ سکندر شاہ کو بیٹے کے غم اور پریشانیوں کا پورا اندازہ تھا لیکن وہ بولے۔ ہم بے بس ہیں۔ یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے۔ یہ مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا نہیں۔ وہ صرف تمہاری منگیتر ہی تھیں منکوحہ تو نہیں۔ دنیا کی نظروں میں تم دونوں کے درمیان کوئی شرعی رشتہ نہیں تھا۔ ابو بیٹے کو رنجیدہ دیکھ کر خود بھی پریشان ہوگئے تھے۔ لیکن بیٹے کو سمجھانا فرض تھا۔ دنیا میں غم تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ زندگی ہے ہی دھوپ چھاؤں کا میلہ۔ مردوں کو ہر غم خاموشی سے سہنا پڑتا ہے۔ اس طرح پہلے ہی غم پر بکھر جاؤ گے تو زندگی میں آنے والی اور بے انتہا مصیبتوں کا سامنا کیسے کرو گے۔ قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ہر دکھ کو خاموشی سے سہنا سیکھو۔ منگنی کوئی حتمی رشتہ نہیں ہوتا۔ ابو کو کیا معلوم تھا دونوں کے درمیان دل و جان کا معاملہ ہے۔ وہ نہ ملی تو کچھ نہ رہے گا۔ اس دنیا کی رعنائیاں۔ رنگینیاں اور خوشیاں سب ان کے ہی دم سے تو ہیں۔

خورشید عالم کی واپسی

ادھر سلطان عالم کی حویلی پر ایسا مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا کہ پھوپھو کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ وہ بڑی بیقراری سے خورشید عالم کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ طارق خان آپ بے فکر رہے ہم فردوس کو دنیا کی ساری خوشیاں دیں گے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ آپکی بیٹی کو ہم اپنی بہو نہیں بیٹی بنا کر اس گھر میں رکھیں گے۔ جیسے طارق خان ان کے سامنے ہی بیٹھے ہوں۔ بار بار یہ کہہ کر دل کو تسلی دے رہی تھیں۔

انہیں سوچوں میں ڈوبی وہ خورشید عالم کے کمرے کی طرف چل دیں اندر خورشید عالم پلنگ پر دراز چھت تاک رہے تھے۔ وہ ایسے محوِ خیال تھے کہ انہیں پھوپھو کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ تم کب لوٹے۔؟ پھوپھو کی آواز پر چونکے بھی نہیں۔ جواب تو دیا نہیں پھوپھو سے سوال کیا ''کیا آپ نہیں جانتیں کل کیا ہوا۔'' ہاں ہم سب

جانتے ہیں۔ یہی کہ تم مالک ہو جو چاہو سو کر سکتے ہو۔ پھوپھو کے اندر بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کہاں ہے۔ پسند نہیں آئی یا اس کے حسن میں کمی پائی۔ پھوپھو ناراض تھیں۔ اور ناراضگی کا اظہار کر رہی تھیں۔

پھوپھو سوچتے تو ہم بھی یہی تھے کہ مالک ہیں کبھی کوئی شکست ہمیں دے سکتا۔ لیکن یہ بازی ہم جیت کر بھی ہار گئے۔ پھوپھو نے تلخی بھرے لہجے میں کہا صاف صاف کہو کیا ہوا۔ اور یہ آنکھوں میں آنسو کیوں۔ ہم نے مردوں کو کبھی روتے نہیں دیکھا۔ پھوپھو موت سے کون جیت پایا ہے۔ ہم نے فردوس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہیں کیا جب مل گئی تو موت نے اسے ہم سے چھین لیا۔ پھوپھو سن کر سر سے پیر تک ہل گئیں۔ ان کے اندر یکلخت بھیانک سناٹا چھا گیا۔ بڑی آزردہ اور فکر مند لہجے میں سوال کیا۔ سچ سچ بتاؤ اس کمرے میں کیا ہوا۔ تم نے فردوس کے ساتھ کوئی سنگدلانہ برتاؤ تو نہیں کیا۔ اس کی نعش کا کیا کیا۔

پھوپھو جس کو پانے کیلئے ہم نے کتنے منصوبے بنائے تھے۔ کیا ہم اس کے ساتھ برا برتاؤ کر سکتے تھے۔ یقین کریں ہم نے تو ان کا چہرہ تک نہیں دیکھا اور نہ کسی اور مرد کو دیکھنے دیا۔ ان کی نعش ان کے ابو کے گھر بھیج دی۔ تم نے کیوں ہمیں اس ماجرے سے بے خبر رکھا۔ اور قبیلے کے دانا بزرگوں سے بھی مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھوپھو یہ امر نادانستگی میں ہوا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ بات ایسے بگڑ جائے گی۔ جھوٹ مت بولو پھوپھو نے کڑی آواز میں کہا ۔فردوس کو حاصل کرنے کے لئے تم نے شیر خان کے خلاف منصوبے بنائے۔ اپنے ابو کی غیر حاضری میں تم نے ان کی دولت اور طاقت کا غلط استعمال کیا۔ ضرور گواہوں کو تمہاری حمایت ملی ہوگی تب ہی تو سب نے شیر خان کے خلاف گواہی دی۔ ایسی تباہی تو کسی پر نہ آئی ہوگی جو آفتاب خاندان پر آئی تمہاری محبت کا جنون ہم سب پر بھی بھاری پڑے گا۔ تم آفتاب خان کے غصے سے واقف نہیں ہو۔ تمہارے لہو میں یہ زہر کیسے اتر آیا۔ وہ سر پیٹ رہی تھیں۔

ہاں پھوپھو ہماری چاہت فردوس کی موت کا سبب بن گئی۔ ہم قاتل ہیں۔ ہم نے فردوس کا قتل کیا ہے پھوپھو یہ باتیں سن کر بہت خوفزدہ ہوگئیں۔ کسی نے سن لیا تو۔ زور سے بولیں۔ کیا بک رہے ہو۔ موت اور زندگی تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر انسان کا زور نہیں موت کا وقت معین ہے۔ جب اور جہاں آنی ہوتی ہے تب ہی آتی ہے۔ تم کہتے ہو اسے انگلی بھی نہیں لگائی پھر تم اس کی موت کے ذمہ دار کیسے ہو گئے۔ اپنے دل و دماغ سے اس بات کو نکال دو۔ پھوپھو اتنی دہشت زدہ تھیں کہ اب آگے کیا ہوگا۔ بولیں ہم تمہارے ابو کو واپس بلائیں گے۔ حالات اچھے نظر نہیں آرہے۔

فردوس کی میت حویلی پہنچی۔

میت دیکھ کر سب لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ سب دکھ کی شدت سے چیخ پڑے۔ آفتاب خان جنہیں بڑے سے بڑے حادثے ہلا نہ سکے تھے آج بیٹی کی میت دیکھ کر کراہ اٹھے تھے۔ اپنی بدنصیبی پر رو رہے تھے۔ بھائی دھاڑے مار مار کر رو رہے تھے۔ حویلی میں ماں، بہنوں کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہ ہولناک خبر آناً فاناً قرب و جوار میں پھیل گئی۔ حویلی کے باہر گاؤں کے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ بڑا ماتم۔ نوحہ شروع ہو گیا۔ دلدوز چیخوں اور آہ و نالوں کی آوازیں فضا میں گونجتی آسمان تک پہنچیں۔ آسمان رو پڑا۔ ہر سو گھور اندھیرا ہی اندھیرا سا تھا۔ ساری کائنات پر جیسے مردنی چھا گئی ہو۔ ہر شاخ ساکت۔ ہر پتہ خاموش۔ ہر پھول مرجھایا جیسا۔ اس دردانگیز اور الم ناک واقعہ نے سب

کو تڑپا دیا تھا۔

فردوس کو ساکت وصامت پڑا دیکھ شیر خان کا سارا بدن تھرتھرا اٹھا۔ انہیں یوں لگا وہ خود لب گور کھڑے ہیں۔ چہرے پر بکھرا دکھ کہہ رہا تھا کہ اس فولاد نما انسان کا رواں رواں آنسو بہار ہا ہے۔ وہ ایک ٹک میت کو دیکھتے ہی رہے۔

ماں کا کلیجہ پھٹا ہی جاتا تھا۔ بار بار زرینہ سے سوال کر رہی تھی۔ کسی نے میری بیٹی سے رذالت بھری بات تو نہیں کی۔ سچ بتاؤ کیا کیا ظلم ڈھائے۔ جو وہ یوں خاموش ہوگئی۔ زرینہ خود خوف اور صدمہ کی شدت سے مسلسل کانپ رہی تھی۔ پھر بھی لرزتی آواز میں امی کو یقین دلا رہی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس ناگہانی موت نے انہیں سارے غموں اور دکھوں سے نجات دلا دی۔ زرینہ نے اس ہولناک منظر کی تفصیل سنائی تا کہ کسی طرح ماں کے دل کو صبر تو آئے۔ سب کو کچھ چین تو ملے اور ان کے اندر انتقام کا دہکتا الاؤ ذرا سا تو سرد پڑے۔

امی بیگم نے زرینہ کے آخری لفظ نہ سنے۔ ان کے دل میں بڑی شدت کا درد اٹھا تھا۔ ایک پل کو تو انہیں یوں لگا تھا کہ سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ درد سہہ نہ سکیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحبہ انہیں سنبھال رہی تھیں۔ کوئی بہنوں کو دلاسہ دے رہی تھیں۔ لیکن یہ درد کم ہونے والا تھا ہی نہیں۔

پھر وہی سب کچھ ہوا جو فردوس چاہتی تھی۔ انہیں دلہن کی طرح سجایا گیا۔ سورج ڈھلنے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ جو سب کی چہیتی تھی۔ اسے وداع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ بڑا ہی لرزہ خیز منظر تھا۔ شیر خان دکھ کی شدت سے پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ جب میت کاندھے پر رکھ کر اٹھائی تو بلکتے دل نے اندر ہی اندر فردوس سے سوال کیا۔ ایسا کیوں کیا تم نے۔ زندہ رہتیں۔ کہیں بھی رہتیں۔ ملنے کی آس تو رہتی۔ ہمیں زندگی بخش کر خود نے خاموشی سے موت کو گلے لگا لیا۔ آنسو بہت روکے۔ ٹپ ٹپ بہتے ہی چلے گئے۔

جمال شاہ کی اذیت بھری نگاہ اس پھولوں سے سجی دلہن پر ٹکی کی ٹکی رہ گئی۔ غم اتنا بڑھ گیا کہ انہیں اپنا آپا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میت اٹھائی گئی وہ مرے مرے قدموں سے جنازے کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ زرینہ نے ہی تو ان کو بتایا تھا کہ ان کی آخری خواہش یہی تھی کہ جیسے دولہا دلہن کی ڈولی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ بھی ہمارے جنازے کے ساتھ آخری سفر پر ہمارے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ دل میں انگارہ جل رہا تھا۔ لیکن کسی نے ان کے دل سے اٹھتا دھواں نہیں دیکھا۔ کوئی ان کے اندر کی بے چینی نہ سمجھ سکا سوائے زرینہ کے۔ جس نے فردوس کا آخری پیام ان تک پہنچایا تھا۔ جب انہوں نے میت کو کاندھا دیا تو جمال شاہ ایسے لرزے کہ ہاتھ پاؤں سب لرز اٹھے وہ خون کے آنسو اندر ہی اندر پیتے رہے۔ دل روتا رہا اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہیں اس دلہن کو اس کی آخری منزل تک پہنچانا تھا۔ قبرستان آ گیا تھا۔ جنازہ اتارا جا رہا تھا۔ تب جمال شاہ کو ہوش آیا کہ جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ دل نے فردوس کو پکارا۔ ایک بار تو سوچا ہوتا کہ آپ کے بناء اس کڑی دھوپ میں ہمارا لمبا سفر زندگی کیسے کٹے گا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے فردوس کے ساتھ ہی اپنے سارے خواب سارے ارمانوں کو بھی پردخاک کر دیا۔ رنج والم میں ڈوبے بھاری بھاری قدموں سے سب گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ شیرو کے اندر ایک محشر برپا ہو چکا تھا۔ ان کو قبرستان سے گھر تک کا راستہ طے کرنا دشوار ہو گیا۔ حویلی کے در و دیوار کو سوگواری میں ڈوبا دیکھ

ان کی اندر جانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ تو پہلے ہی ایک عذاب جھیل رہے تھے۔ اور اب یہ ناقابل برداشت غم۔ تم ہمیں اپنی زندگی سے زیادہ پیاری تھیں۔ اس حویلی کی اس خاندان کی اور ہماری زندگی کی رونق تھیں۔ تمہارے وجود سے ہی حویلی میں ایک نور پھیلا رہتا تھا۔ آج ہم سب اس چراغ کو مٹی تلے رکھ آئے ہیں۔ تم نہیں۔ تو کچھ بھی نہیں۔ یہاں زندگی کا نام ونشان نظر نہیں آرہا۔ اس گھور اندھیرے میں اداسیاں۔ محرومیاں۔ ویرانیاں۔ غم وکرب ہے اور بلائیں ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم اس ویرانے میں گھٹ کر مر جائیں گے۔ کوئی اپنوں سے بھی اتنا خفا ہو کر اتنی دور جا بستا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ انہیں نہیں معلوم وہ کب تک فردوس کا نام لے کر روتے اور کراہتے رہے۔

شب کرب وبلا آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ اس حادثے نے سب کے ہوش گنوائے تھے۔ حویلی پر بڑی بھاری خاموشی طاری تھی۔ سبھی ابوامی کے اردگرد بیٹھے اپنے اپنے غم کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کافی وقفہ کے بعد شیرو اندر گئے۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ ہم تمہارے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ اکیلے کہاں تھے۔ آفتاب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے شیر خان بولے ہم اکیلے کہاں تھے غموں اداسیوں اور پچھتاوے کا ایک بڑا ہجوم ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نے سب کا سکون غارت کر دیا۔ بس باہر بیٹھے یہی سوچ رہے تھے۔ فردوس نے ہمیں بچانے کی خاطر کتنی اذیت۔ ذلت اور رسوائی کا سامنا کیا ہوگا۔ یہ کہتے ہی وہ بری طرح رو پڑے تھے۔ ابو جو خود غم میں چور چور تھے بولے موت تو برحق ہے۔ سسکیوں کے درمیان شیرو بولے ہاں موت تو برحق ہے پر ایسی موت۔ فردوس کو اپنی جان دینی پڑی تا کہ ہم زندہ رہ سکیں۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپا نہ سکے۔ ان کی آنکھوں میں شرارے اتر آئے۔ اصلیت کا پتہ تو ہم لگا ہی لیں گے لیکن پہلے ہم خورشید عالم کا حساب چکتا کریں گے۔ بے قصور تھے ہم اور خورشید عالم نے سارے گناہ ہمارے نام لکھ کر ہماری زندگی عذاب بنادی۔ جو آدمی دوسروں کے لئے جان کا عذاب بن جائے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلے اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔ جس کا گھر چھوٹتا ہے وہی جانتا ہے داغ ہجرت کیا ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ آپ نے ہماری ایک نہ سنی اور اس درندے کا یقین کر لیا۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا اور فردوس گھر سے بے گھر کر دی گئیں۔ صرف ہماری جان بچانے کے لئے فردوس کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ خورشید عالم سے بدلہ لے کر ہی ہم فردوس پر جو مصیبتیں گزری ہیں اس کا قرضہ چکائیں گے۔

آفتاب خان نے پرسوز آواز میں کہا۔ ہمارے ہاتھوں میں پورے قبیلے والوں کی تقدیریں ہیں اور ہم اپنی ہی بیٹی کی تقدیر کا صحیح فیصلہ نہ کر سکے۔ بس یہ سوچ لو برا وقت آیا تھا۔ اس لئے قسمت ہی بگڑ گئی تھی۔ شیرو بولے۔ فردوس اپنے ساتھ حویلی والوں کی ساری خوشیاں لے گئیں اور ہمیں صدقہ میں یہ زندگی دے گئیں۔ یہ زندگی جو ہمارے لئے ایک بھاری بوجھ ہے۔ اس کوہ گراں کو ہم کیسے اٹھائیں گے۔ کیسے زندہ رہیں گے۔ ہماری خورشید عالم سے کبھی کوئی دشمنی تھی ہی نہیں۔ پھر کیوں ہمارے ہی خلاف بار بار سازشیں کرتا رہا۔ اور آخری میں یہ عذاب علیم۔ ہم ان کے قبیلے کو تہس نہس کر دیں گے۔ خورشید عالم کا ہم وہ برا حال کریں گے۔ وہ موت کو پکارے گا اور موت اس سے دور بھاگے گی۔ جب موت اس پر مہربان ہو جائے گی اور چیل کوے اس کا ماس کھا کر سیر ہو جائیں گے۔ ہم ان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ ان کی حویلی بھیج دیں گے۔ سنا ہے ان کی ایک بہن بھی ہے۔ اسے اغوا کر کے ہم اس گھر میں لائیں

گے۔اور اس کے سنگ وہ برتاؤ کریں گے کہ وہ خود ہی سر پٹک پٹک کر اپنی جان دے دیگی۔ ہماری فردوس نے بھی تو اپنی جان دے دی۔ ظلم تو اس نے ضرور کیا ہی ہوگا۔ آسانی کی موت تو ہم دونوں کو مرنے نہیں دینگے۔ خورشید خان نے شیر خان کے خون کو للکارا ہے اور ہم جب تک اس کے خون کی ایک ایک بوند مٹی میں نہ ملادیں چین کی سانس نہ لیں گے۔لیکن ہمیں آپ کی اجازت چاہیئے۔

آفتاب خان جیسے سخت انسان شیر خان کی باتیں سن کر سہم گئے۔ بولے تمہاری باتوں سے خون کی بو آرہی ہے۔اس طرح مارنے اور مرنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔تم بھول رہے ہو تاوان میں جانے والی لڑکیوں کے لئے جنگ نہیں لڑی جاتی۔ ہم تمہیں قتل وغارت کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے کیونکہ یہ انسانی تہذیب کے خلاف سنگین جرم ہے۔ کتنی اور مائیں تمہاری بڑی امی کی طرح بلکتی رہ جائیں گی۔اور کتنے نوجوانوں کا خون بہے گا اور آخر میں اس کا خمیازہ عورتیں اٹھائیں گی۔ بہتر یہی ہوگا یہ سب بھول جاؤ۔شیر خان بڑی غضبناک آواز میں بولے۔ ہماری حویلی پر سے قیامت گزر گئی اور ہم بھول جائیں۔فردوس نے جو ذلت اور اذیت سہی اسے بھول جائیں۔بھول جائیں کہ خورشید عالم نے ہماری حویلی پر سنگ برسائے ہیں۔ ہمارے خاندان کے ہر فرد کا سکون غارت کردیا ہے۔نہیں۔ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ہم خورشید عالم اور اس کے خاندان کو غارت کردیں گے۔تباہ وبرباد کردیں گے۔ اگر ہم یہ سب بھول گئے تو فردوس کا قرضہ کیسے اتاریں گے۔ وہ غم اور غصے میں چیخ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہوگئی تھیں اور چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

آفتاب خان نے ان کا چہرہ دیکھ کر کہا۔اور اگر ہم کہیں کہ یہ ہماری نہیں فردوس کی خواہش ہے۔ پھر۔شیرو بولے فردوس قبیلے کے اصولوں سے واقف تھیں۔اور سب جانتے ہیں قبیلے والوں کے اصول نہیں بدلتے۔آفتاب خان بولے، ہاں یہی ہم بھی سوچتے ہیں۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں کے خیالات بدل رہے ہیں۔وہ حالات سدھارنے کی کوشش کررہے ہیں۔اب ہمارے بھی بدلنے کا وقت آگیا ہے۔شیرو پھر اونچی آواز میں بولے۔تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ بغیر کسی حساب کتاب کے یہ مسئلہ طے ہوجائے۔آفتاب خان دھیمی آواز میں بولے۔ ہو نہیں جائے بلکہ ہوگیا ہے۔ہم فردوس کی موت کا بدلہ کسی سے نہیں لے سکتے۔یہ اس کی ہی آخری خواہش ہے۔اس نے خود ہی خورشید عالم کو معاف کردیا۔وہ چاہتی تھی کہ اس حادثے کے بعد چاروں قبیلوں میں امن وچین قائم ہو۔شیرو کبھی کبھی حالات تم جیسے بہادر آدمی کو بھی بے بس کرڈالتے ہیں۔جو کام ہمارے ہتھیار نہ کرسکے وہ کام ہماری بیٹی کرگئی۔ہم سب کو ظلم وبربیت کے راستے پر چلنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روک لگا گئی ہے۔اس نے کہا کہ جو جو بھی اس کیس میں ملوث ہے سب کو معاف کردیا جائے۔ کیونکہ زندگی دینے اور لینے والا صرف خدا ہے۔وہ اپنا مقدمہ خدا کے دربار میں پیش کرکے گئی ہے۔وہی تو سب سے بڑا منصف ہے۔انتقام لینا خدا ہی کا کام ہے بدلہ وہی دے گا۔

شیرو سر تھام کر امی کے پاس ہی بیٹھے رہے۔امی بیگم بولیں، بس اب ٹھنڈے دماغ سے سوچو کیا کروگے۔ فردوس کی آخری خواہش پوری کروگے یا پھر۔ بڑی امی وہ سر جھکا کے بولے حالانکہ کہ ہمارے ضبط کا کڑا امتحان ہوگا لیکن ہم آج عہد کرتے ہیں ہم وہی کریں گے جو فردوس چاہتی تھیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھاگئی۔وہاں موجود ہر فرد تڑپ

اٹھا۔ پھر کمرے میں آہیں سسکیاں گونجنے لگیں۔ شیرو کے اندر جو جذبہ انتقام کی آگ دہک رہی تھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

بیگم کو اپنا آپا سنبھالنے میں خاصا عرصہ لگا تھا۔ ماں تھیں۔ اپنے دکھ درد سینے میں دبا کر گھر میں سب کا خیال بھی رکھنا تھا۔ شیرو کے دل کی سوزش کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ سو بار بار ان کے کمرے میں جا کر انہیں تسلی دیتیں۔ ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن شیر خان کی حالت میں رتی بھر سدھار نہ آیا۔ شیر خان کے اندا ایک بار پھر تنہا ہو جانے کا احساس گھر کر گیا تھا۔ امی جب ان کے کمرے میں گئیں تو انکے چہرے پر اضطرابی اور اضطراری کے عکس پھیلے دیکھ کر کانپ گئیں۔ انہوں نے شیرو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا مگر وہ ہلے تک نہیں۔ بیگم نے ان کے شانوں کو پکڑ کر ہلایا اور بولیں۔ تم نے تو زندگی سے ہی منہ پھیر لیا ہے۔ ایسی چپ سادلی اور سب سے دور ہو گئے ہو۔ وہ بولے۔ ہم کیا کریں، ہمیں ایک پل چین وقرار نہیں۔ بیگم بولیں۔ فردوس کے جانے کا غم تو سب کو ہے۔ سب ہی اس دکھ کو کسی نہ کسی طرح جھیل رہے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے کاموں کی طرف بھی توجہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے لئے یہ حادثہ جانکاہ ثابت ہو رہا ہے۔ اندر ہی اندر گھلے جا رہے ہو۔ شیرو ہر انسان کو اپنے اپنے ذمے کے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ شیرو رندھی آواز میں بولے، سب سے بڑا عذاب تو ہماری جان کو پڑا ہے۔ ہماری ایک غلطی سے خاندان پر عذاب علیم ٹوٹ پڑا۔ فردوس کی زندگی سے زیادہ ہمیں کوئی چیز عزیز نہیں تھی۔ اس کے اس طرح جانے کے بعد ہمیں شبہ سا ہوتا ہے زندگی ہے بھی کہ نہیں۔ ہمارے اندر زندگی رہی اور نہ ہی جینے کی آرزو۔ آپ ہی بتائیں ہم زندہ رہیں بھی کیوں۔ کیسے اور کس کے لئے۔ بیگم کا درد اور بڑھ گیا۔ بولیں اکیلا پن انسان کو تھکا دیتا ہے۔ تم خود ہی اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے ہو۔ بار ہا تمہیں سچائی سے آگاہ کیا کہ تم بے قصور ہو مگر تم ابھی تک اپنے کو قصوروار سمجھتے ہو۔ اگر تم نے اپنے آپ پر قابو نہ پایا تو فردوس کی قربانی ضائع ہو جائے گی۔ تم ساری زندگی اس کی یاد میں گنو نہیں سکتے۔ اس کی یادوں کو روگ نہ بناؤ۔ اس طرح کمرے میں تنہا بیٹھ کر نوحہ نہ مناؤ۔ ہم اپنے خاندان کا سب سے خوبصورت پھول کھو چکے ہیں۔ اب دوسرا کھونے کی ہمت ہم میں نہیں ہے۔

شیرو بڑی افسردگی سے بولے، ہماری روح پر بڑا بوجھ ہے۔ آخر ہم ہیں تو انسان ہی۔ فردوس کی قربانی کیسے بھلا سکتے ہیں۔ نہ معلوم کیوں سارے جہاں کے غم خدا نے ہمارے نصیب میں ہی لکھ دیئے۔ یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا ہمارے بس کے باہر ہے۔

امی بولیں اپنے چچا جان اور ہماری طرف دیکھو کس طرح اس داغ جگر کو لے کر زندہ ہیں۔ ہمارے اوپر کیا کم عذاب ہے۔ ہمیں دیکھ کر اپنے اندر حوصلہ اور ہمت پیدا کرو۔ دل میں غموں کا انبار ہو پھر بھی انسان کو جینا تو پڑتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھانا بھی ضروری ہے۔ تمہارے چچا جان اندر سے ٹوٹنے کے باوجود بھی قبیلے کا کام سنبھال ہی رہے ہیں۔ اگر تم ذرا سا بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ گے تو انہیں بہت اچھا لگے گا۔ تم بھی مصروف رہو گے تو وقتی طور پر کچھ تو غم کم ہوگا ہی۔

شیرو جا کر بیگم کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر بولے۔ بڑی امی۔ ہم دکھوں کے بیاباں میں ایسے کھو گئے ہیں کہ ہمیں کوئی روشنی کی کرن نظر ہی نہیں آتی۔ اس اندھیرے بیاباں سے باہر نکلنے کا راستہ نظر ہی نہیں آتا۔ لمبے عرصے کے بعد شیرو کی زبان سے "بڑی امی" سنا تو بیگم کو ایسا لگا کہ کھویا بیٹا گھر واپس لوٹ آیا

ہو۔ بولیں بیٹا۔ اب تو تم کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس خاندان میں اور ہمارے دل میں تمہارا کیا مقام۔ اہمیت اور حیثیت ہے۔ کیا اب بھی تمہارے دل میں شک وشبہ باقی رہ گیا ہے کہ ہم سب تم سے کم محبت کرتے ہیں۔ اب تو یقین ہو گیا ہوگا کہ تمہاری بڑی امی نے تم کو اپنی اولاد سے زیادہ پیار کیا۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ ہم سے ہی بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ ہمیں تمہاری اور فردوس کی شادی بہت پہلے کر دینی چاہیئے تھی۔ ہم نے فردوس کو کھو دیا اب تم کو برباد نہیں ہونے دیں گے۔ ہم تمہیں راستہ دکھائیں گے۔

تم اپنے آپ کو مجرم سمجھنا چھوڑ دو۔ خبر ملی ہے کہ سلطان عالم حج سے لوٹ کر نہ آسکے۔ وہاں ہی دل کا دورہ پڑا اور چل بسے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے۔ وہ نیک انسان تھے۔ غریبوں کے ہمدرد۔ انصاف پسند۔ خورشید عالم بھی نہیں رہے۔ سنا ہے روایتی ٹونے ٹوٹکے جب کام نہ آئے تو بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کروایا پر سب ہی بیکار ثابت ہوا۔ انسان کے قدم بہک جائیں تو اسکو کسی طرح سہارا دیکر سنبھالا جا سکتا ہے۔ انسان کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے تو وہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔ پاگل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا کوئی علاج نہیں۔

آگ تو خورشید عالم نے ہمارے گھر میں لگائی تھی۔ لیکن گھر ان کا بھی جل کر خاک ہو گیا۔ ایک مہینے کے اندر نہ قبیلے کے سردار رہے اور نا ہی وارث۔ اتنی رسوائی کے بعد کون پوچھے گا خورشید عالم کی چھوٹی بہن کو۔ شیرو فوراً بولے اس قصے میں بہن کا کیا قصور۔ پھر وہی ہوگا۔ بھائی کے جرم کی سزا بہن کو دی جائے گی پھر ایک لڑکی کی زندگی تباہ کی جائے گی۔ کسی کو تو ان رواجوں کو روکنے کی پہل کرنا ہوگا۔ ہم کب تک لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔ شیرو کی باتیں سن کر امی بولیں۔ اگر کسی لڑکی پر ایسی مشکل کی گھڑی آئی تو ہم ہی پہل کریں گے۔ لڑکی کی عزت ضرور بچائیں گے۔ لیکن اس وقت ہمیں تمہاری فکر ہے۔ کیا ہمارے مقدر میں صرف تمہارا دکھ دیکھنا ہی لکھا ہے۔ ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ شیرو نے ٹوٹے لہجے میں جواب دیا۔ ہم تو خود ایک مسئلہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ معمولی چوٹ ہوتی تو سہہ لیتے لیکن یہ زخم بہت گہرا ہے۔ آپ ہی بتایئے ہم کب تک اس زندگی کا الزام لے کر جی سکتے ہیں۔ بیگم نے شیرو کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ جانتے ہیں ہم تمہارے لئے یہ مصیبت بیحد کڑی ہے لیکن اس کڑے اور کٹھن وقت کا مقابلہ ہمت اور حوصلے سے کرنا ہوگا۔ اتنا بڑا دکھ اکیلے سہارنا سہل نہیں۔ تمہیں ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو تم کو اس اندھیرے سے روشنی میں لا سکے۔ اور یہ کام کوثر ہی کر سکتی ہے اس میں کوثر کی رضامندی بھی شامل ہے۔ نہیں۔ ہم شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم تو ویران سے آدمی ہیں۔ اس ویرانے میں وہ کیا پائے گی۔ ہم آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتے مگر شادی نہیں، بڑی امی بولیں۔ شادی تو تمہیں کرنی ہی ہوگی۔ اس میں تمہاری اور پورے خاندان کی بہتری ہے۔ وہ تمہارے درد بانٹ لے گی۔ اور ہمیں پورا اعتبار ہے پھر کوئی کرن پھوٹے گی اور تمہارے اندر سے روشنی نکلے گی۔ اس حویلی میں تم دوبارہ خوشیاں لاؤ گے۔

شیرو سن کر حیران تھے۔ کل بڑی امی ہمیں فردوس کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ جسے دنیا کا سب سے بدتر انسان سمجھ کر رد کر دیا تھا آج اپنی دوسری بیٹی ہمارے سپرد کرنے کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ہمارے دل میں اب کسی کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ جس کے دل میں محبت جیسے نازک جذبے کی ذرا سی بھی رمق

باقی نہ رہی ہو وہ شادی کیسے کرسکتا ہے۔ کوثر کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہوگی۔ ظلم ہوگا۔ شیرو تم اپنے آپ کو بھی پہچان نہ سکے۔ تمہارے اندر محبت کا جذبہ ہی تو شدت سے ہے اس لئے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے۔ اور جس کے دل میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے اس میں صبر کا جذبہ بھی شدت سے ہوتا ہے۔ اب ہم تمہاری ایک نہیں چلنے دیں گے۔ شیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ کیا کرے۔ پورے ہوش بجا تو تھے نہیں۔ امی بولیں زندگی زندہ رہنے کا نام ہے اور محبت بغیر زندگی نہیں۔ محبت کرنا بہت ضروری ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ مرد ہو۔ مردوں کی طرح ہر غم اور ہر خوشی کا سامنا کرنا سیکھو۔ زندگی کا سفر تو جاری رہتا ہے۔ کاروان چلتا رہتا ہے۔ بس ساتھی بدلتے رہتے ہیں۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔

ٹھیک ہے، مگر ہماری ایک شرط ہے۔ ہماری اور رفیق کی شادی ایک دن ہوگی۔ یہیں اس حویلی میں۔ امی بیگم مسکرا کر بولیں۔ یہ کیسی عجیب شرط ہے۔ شادی کے لئے پہلے لڑکی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ شیرو بولے۔ ایک لڑکی ہے جسے رفیق چاہتے ہیں۔ نام ہم نہیں جانتے۔ آپ نام ان سے معلوم کرلیں۔ امی بولیں تو کیا وہ اپنی مرضی کی دلہن اس حویلی میں لانے کی سوچ رہے ہیں۔ بڑی امی کیوں کیا کسی کو چاہنا گناہ ہے۔ یہ تو ایک فطری جذبہ ہے۔ چاہنا اور چاہا جانا۔ خوش نصیب ہیں رفیق۔ وہ جس کو چاہتے ہیں وہ بھی ان سے محبت کرتی ہے۔ بڑے نصیبوں سے دو پیار کرنے والے ملتے ہیں۔ لڑکی کے ساتھ زندگی تو رفیق کو گزارنی ہے۔ اس لئے لڑکی بھی ان کی پسند کی ہونی چاہئے۔

امی لاجواب ہوگئیں۔ بولیں۔ چلو بھئی تم جیتے ہم ہارے۔ تم رفیق کے بڑے بھائی ہو۔ جو تم کہو گے وہی ہوگا۔

خورشید عالم کی بیقراری کا حال سنئے۔

خورشید عالم کے کمرے کی بتی رات بھر جلتی رہی اور وہ بیقراری کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ صبح پھوپھوان کا چہرہ دیکھ کر حیران تھیں۔ بولیں ہمیں تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ بگڑی بگڑی سی لگتی ہے۔ ہم ڈاکٹر سے تمہارا علاج کروائیں گے تاکہ تمہارے دماغ کو تھوڑا تو سکون ملے۔ بیٹا زندگی ہے تو جہاں ہے۔ اس حادثے نے تو تمہاری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ وہ ٹوٹے لہجے میں بولے۔ ”بدلنا تو تھا ہی“ کیونکہ اس حادثے کے ذمہ دار ہم ہیں۔ فردوس ہمیں اندر سے بالکل توڑ پھوڑ کر چلی گئیں۔ پھوپھو سن کر بھڑک اٹھیں۔ تم کب تک یہ دیوانوں جیسی باتیں کرتے رہو گے۔ تم جانتے ہو تمہاری زندگی ہمارے لئے بیحد قیمتی ہے۔ اس حادثے کو ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ اور تم تیار ہو کر ہمارے کمرے میں آؤ۔ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

فون کی گھنٹی دیر تک بجتی رہی۔ آخر خورشید عالم کو فون اٹھانا ہی پڑا۔ خورشید عالم جو بھیانک چال تم نے چلی اس کے نتائج پر ذرا سا غور تو کیا ہوتا۔ تم جیسا ہوشیار اور باشعور انسان دل کے ہاتھوں ایسا بے بس کیسے ہوگیا کہ یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارے ایک غلط فیصلے سے دوسروں پر کیا کیا قیامتیں گذر جائینگی۔ ایک بے گناہ پر تہمت لگائی۔ اور خوشحال خاندان کی خوشیاں چھین لیں۔ کتنی آسانی سے دو انسانوں کے ارمانوں کا خون کردیا اور ایک معصوم لڑکی کی جان لی۔ اب تم بھی چین سے جی نہ پاؤ گے۔ سن پاؤ گے اس شخص کا نام جس کے تم نے خنجر بھونکا ہے۔ وہ بدنصیب شخص تمہارا سب سے عزیز ترین دوست۔ جمال شاہ ہے۔ فردوس جمال شاہ کی منگیتر تھیں۔ اور ہاں اب یہ تو بتاؤ یہ سیلاب بلا کس حسینہ کے گھر جائے گا۔ وہ شخص زور سے ہنسا اور فون کٹ گیا۔ خورشید عالم بے ساختہ چیخ پڑے۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جمال شاہ سے فون پر بات کر رہے تھے۔ جمال ہمیں اسی وقت پتہ چلا کہ وہ تمہاری منگیتر تھیں۔تم جو ہمیں ہماری جان سے بھی زیادہ عزیز ہو تمہاری تباہی ہمارے ہاتھوں۔ جمال شاہ تمہاری دنیا اجاڑ کر ہم بھلا کیسے سکون سے جی پائیں گے۔ کاش ہم پہلے جانتے ہوتے۔ کاش کبھی تو تم نے ہم سے ان کا ذکر کیا ہوتا۔ یقین کرو غم کی شدت سے ہماری جان گھلی جارہی ہے۔ تمہیں زخمی کر کے ہمارا پورا وجود گھائل ہو گیا اور یہی ناسور ہمیں ہماری قبر تک لے جائے گا۔اگر تم نے ہمیں معاف نہیں کیا تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔ جمال شاہ تم خاموش کیوں ہو۔لوگ تو غیروں کو معاف کر دیتے ہیں ہم دونوں تو بچپن کے دوست ہیں۔ تمہیں ہماری اس دوستی کا واسطہ۔اپنے اس بد بخت دوست پر کرم کرو ہم اپنے کئے پر بیحد نادم اور شرمندہ ہیں۔ ہم ہار چکے ہیں۔ اس حادثے نے ہمیں بالکل پست کر دیا ہے۔ جمال شاہ میرے دوست صرف ایک دفعہ کہہ دو کہ تم نے ہمیں معاف کیا۔ بولو جمال شاہ۔ خدا کے واسطے کچھ تو بولو۔تمہارے منھ سے نکلے صرف دو لفظ ہماری تڑپتی روح کو سکون دے سکتے ہیں۔ خورشید عالم کے پاس اظہار افسوس کے لئے اور لفظ ہی نہ تھے۔ وہ سسک سسک کر رو پڑے۔ سسکیوں کے درمیان بولے۔ کاش ہم اپنے خون سے اس داغ کو دھو سکتے۔

کچھ وقفہ کے بعد جمال شاہ بولے۔ ہماری نظروں میں سب سے عظیم رشتہ دوستی کا ہے۔ پھر ہم تمہارا برا کیوں کر چاہ سکتے ہیں۔ دوست دوست ہوتا ہے اور ہم اپنی آخری سانس تک اس رشتے کو نہیں ٹوٹنے دیں گے۔ معاف کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ گناہوں کا حساب کتاب تو اوپر والے کے دربار میں ہوگا۔تم اللہ پاک سے معافی مانگو۔تمہاری بے چین روح کو قرار آجائے گا۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا دوسروں کا قرار لوٹنے والا خود بھی ہمیشہ بیقرار رہتا ہے۔

خورشید عالم یوں بھی اپنی لگائی آگ میں جل رہے تھے۔ جمال شاہ سے بات کرنے کے بعد ان کی بیقراری اور بڑھ گئی۔ جب پھوپھو اندر آئیں وہ بیٹھے اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہا رہے تھے۔انہیں مایوس دیکھ کر بولیں تم ابھی تک اسی بے وقوفانہ اور فضول سی سوچ میں گھرے بیٹھے ہو۔ دل سے اس بات کو مٹا دو۔ اس لڑکی کا غم کرنا چھوڑ دو۔ بیٹا انسان کی ہر چاہت تو پوری نہیں ہو جاتی۔ وہ بڑی آزردگی سے بولے ہم ان کی چاہت معطل نہیں کر سکتے۔ پھوپھو وحشت زدہ تو تھی ہی ان کی احمقانہ باتیں سن کر بیحد مایوس اور نا امید ہو گئیں۔ بولیں وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی پھر اس چاہت کا کیا فائدہ۔ وہ بولے اگر ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ وہ جمال شاہ کی منگیتر ہیں تو ان کا خیال بھی دل میں نہ لاتے۔ وہ جمال شاہ کی امانت تھیں۔ اچھا اب تو سارا قصہ ہی تمام ہو گیا اب بہتر یہی ہے تم اس قصے کو بھول جاؤ۔تم کمرے میں چپ بیٹھے یہ سب سوچتے رہتے ہو، دیکھو ساری حویلی بھی خاموش ہو گئی ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو اس کمرے میں اکیلے تمہیں برے برے خیالات گھیرے رہتے ہیں۔ خورشید بولے۔ نہیں۔ ہم باہر نہیں جائیں گے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی چرچا ہے۔ باہر سب ہمارا تمسخر اڑانے کو تیار کھڑے ہیں۔ آفتاب خان کے لوگ بھی تو انتقام لینے آسکتے ہیں۔ پھوپھو قبیلے کے سب لوگ ہم سے ڈرتے تھے۔ لیکن اس حادثے نے ہمیں اندر سے بالکل کمزور کر دیا ہے۔ ہم بالکل خالی ہو گئے ہیں اور اندر ہی اندر خود سے سہمے رہتے ہیں۔ آپ ہمیں اپنے آنچل میں چھپا لیں۔ ان کی آنکھوں سے خوف جھانکتا دیکھ پھوپھو ڈر گئیں۔ خورشید عالم کو اپنے بازوؤں میں تھام کر کہا

کس میں اتنی مجال ہے جو تمہارا مذاق اڑا سکے اور آفتاب خان کے لوگ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ تم بالکل خوف نہ کرو۔ ہم تمہارے پاس ہیں۔ تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔

جب سے خورشید عالم کا دماغی توازن بگڑا تھا پھوپھو چین سے بیٹھ نہ سکی تھیں۔ روایتی ٹونے ٹوٹکے کروائے۔ ڈاکٹر بلایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کوئی ایسا گہرا صدمہ ہے جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ بھاری مایوسی اور نا امیدی کی وجہ سے ان کی دماغی حالت بگڑ گئی ہے۔ علاج جاری رہا لیکن سب بے فائدہ رہا۔ آہستہ آہستہ حالت اتنی بگڑ گئی کہ بیٹھے آسمان تاکتے رہتے۔ ہر وقت خوفزدہ اور بیحد پریشان نظر آتے۔ شاہین اور ریحان عالم پاس بیٹھے سوالوں پر سوال کرتے پر وہ ایک کا جواب نہیں دیتے۔ پھوپھو پاس بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتیں۔ سوچتی رہتیں انہیں پرورش اور تربیت دینے کی ہماری ساری محنت اکارت ہوگئی۔ زندگی بھر کی محنت ایک پل میں محبت کا جنون اڑا کر لے گیا۔ پھر ڈاکٹر کو نکال دیا۔ بولے ڈاکٹر آپ کے پاس ہمارا علاج نہیں۔ ہمیں اپنی جان عزیز نہیں رہی۔ ہم پل پل مر رہے ہیں۔ ہمیں زندگی نہیں موت چاہیئے۔

پھوپھو کا دماغی کھنچاؤ شدید ترین درجے کو پہنچ چکا تھا۔ اسی رات بڑے بھائی سلطان عالم کی موت کی خبر آئی۔ افضل نے بتایا کہ بڑے مالک کو دل کا زبردست دورہ پڑا اور ہسپتال جانے کا بھی وقت نہ ملا۔ اس وحشت ناک خبر نے پوری حویلی اور قبیلے میں کھلبلی مچادی۔ سب طرف ماتم منایا جا رہا تھا۔ خورشید عالم کو جب یہ دردناک خبر دی تو وہ چھت تاکتے رہے۔ شاید ایسا وقت آگیا تھا کہ وہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔

حویلی پر یوں بھی آفت آئی ہوئی تھی۔ بھائی کی ناگہانی موت نے ثریا بانو کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ جوانی سے لے کر آج تک بس جدائی کے غم ہی تو سہتی آئی تھیں۔ اب بھائی جان کی جدائی کا غم نا قابل برداشت ثابت ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے تھے۔ پہلے سے ہی خوفزدہ تھیں اب دل اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ نہ جانے آگے کیا ہوگا۔ قسمت اور کیا کیا رنگ دکھائے گی۔ انہیں تو چاروں طرف خاک سی اڑتی نظر آرہی تھی۔ قبیلے کے سردار نہیں رہے تھے اور وارث کو اپنا ہوش نہ تھا۔ اسے نوکر سنبھال رہے تھے۔

سلطان عالم کی موت نے پوری حویلی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھوپھو کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بیحد غمزدہ تھیں لیکن شاہین اور ریحان عالم کی چیخوں اور آنسوؤں نے انہیں زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ وہ اکیلی کس کس کو سنبھالتیں اور کیا کیا سنبھالتیں۔ اتنی بڑی جائیداد۔ قبیلے کی دیکھ بھال۔ شاہین اور ریحان کی ذمہ داری۔ اور خورشید عالم کی بیماری۔ انہوں نے کٹھن سے کٹھن حالات سے نباہ کیا تھا لیکن بھائی جان کے بغیر اپنے کو بالکل کمزور اور اکیلا محسوس کر رہی تھیں۔ آخر خود پھوپھو نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور حویلی کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ کچھ دن اور بیتے۔ خورشید عالم اچانک ہی بول اٹھے۔ پھوپھو فردوس تو دنیا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب زمین پر ہمارے لئے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اب ہم بھی آسمان پر جائیں۔ پھوپھو کو لگا کہ کسی نے ان کا گلا دبا دیا ہو۔ بیٹا۔ اوپر جانے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں۔ خورشید عالم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد ہی وہ بہت کمزور ہو گئے اور ایک رات اس دنیا سے چلے گئے۔ حویلی تو یوں بھی ماتم میں ڈوبی تھی۔ خورشید عالم کی موت کے بعد تو حویلی میں

زندگی جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ پھوپھو شاہین اور ریحان کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ حویلی پر چھائی مایوسی اور اداسی دیکھ کر ثریا بانو پریشان ہو جاتیں۔ دیر سے ریحان اور شاہین ان کے پاس بیٹھے انہیں دلاسہ دے رہے تھے۔ وہ شاہین سے بولیں۔ تم جا کر آرام کرو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ بولی پھوپھو اتنی گہری خاموشی ہمیں سونے نہیں دیتی۔ ریحان بولے اتنا گہرا سناٹا ہے۔ بلا کی خاموشی ہے۔ پھوپھو بولیں۔ خاموشی اور سناٹا۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ بڑا شور وغل مچا ہوا ہے۔ چاروں طرف پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔ تمہاری اس خاموشی کا خاتمہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ تم دونوں کی شادیاں۔ ہم حویلی کو دوبارہ آباد کرنا چاہتے ہیں۔ شادی۔ نہیں نہیں دونوں نے ایک ساتھ انکار کیا۔ پھوپھو نے سمجھایا کہ شادی سے ہی خاندان زندہ رہ سکتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں۔ اور اب اس حویلی کا وارث بھی تو آنا ہے۔ ہاں اگر تم دونوں کی اپنی اپنی پسند ہو تو بتا دو۔ ہم خود ان کے گھر پیغام لے کر جائیں گے۔ قدرت نے ہماری جھولی میں جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں انہیں ہم بخوبی نبھانے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بتانا۔ اور ذرا جلدی۔ شاہین تمہاری طرف سے ہم بہت فکر مند رہتے ہیں۔

اس کے بعد شاہین اور ریحان پھوپھو سے دور دور رہنے لگے۔ حویلی پر ایسا بھیانک سناٹا چھایا کہ پھوپھو کبھی کبھی اپنی آواز سے ڈر جاتیں۔ بیٹھی سوچتی رہتیں کہ کوئی تو بات ہے جو دونوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ جب دونوں باہر جاتے تو پھوپھو ان کے کمروں کی تلاشی لیتیں۔ آخر انہوں نے سراغ نکال ہی لیا۔ شاہین کی ڈائری میں رفیق خان کا نام دیکھ کر چونک گئیں۔ نہ کوئی پیغام نہ کوئی شعر و شاعری۔ بس ایک ہی نام ہزاروں بار لکھا تھا۔ انہیں اپنے زمانے یاد آئے۔ جب وہ طارق خان کا نام اپنے دل کی تختی پر لکھتی اور مٹاتی تھیں۔ اتنی ہمت کہاں تھی کہ کسی کاغذ کے پرزے پر اس نام کو لکھتیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔ لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔ لڑکیوں میں ہمت پیدا ہو رہی ہے کہ اپنی محبت پانے کے لئے زبان کھول سکیں۔ لیکن۔ شاہین۔ یتیم بچی کس سے کہتی۔

پھوپھو ہماری ڈائری۔۔ آپ نے کہیں دیکھی تو نہیں۔ کیا کوئی خاص ڈائری تھی۔ ہاں۔ وہ ہمیں کسی نے دی تھی۔ بیٹا ہم تو تمہارے کمرے میں کبھی نہیں جاتے تم کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔ ہاں۔ سنو۔ کل ہم کو ایک پرانی سہیلی سے ملنے جانا ہے۔ سوچتے ہیں تمہارے کالج میں چھٹی ہے تم کو بھی ساتھ لے جائیں۔ شاید چار پانچ دن لگ جائیں گے۔ ریحان عالم کے ہاتھوں حویلی کی ذمے داریاں سونپ وہ دونوں سفر کے لئے روانہ ہو گئیں۔

سفر لمبا تھا۔ بار بار شاہین سوالی نظروں سے پھوپھو کی طرف دیکھتی لیکن وہ خاموش اپنے ہی خیالوں میں گم رہیں۔ آفتاب خان کی حویلی پر قیامت خیز ہولنا کی پھیلی دیکھ کر ثریا بانو کے دل میں درد کی زبردست ٹیس اٹھی تھی جوان کے رونئیں رونئیں میں پھیل گئی تھی۔ خدایا۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ خورشید عالم یہ کیا کر گئے تم۔ کتنے لوگوں کے خواب بکھر گئے۔ کتنے لوگوں کے خوشگوار احساسات راکھ کر گئے۔ کاش تم نے ہمارا کہا سنا ہوتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان کے کانپتے وجود کو شاہین نے تھام کر بیحد گھبرائی آواز میں کہا۔ پھوپھو یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ ہم کہاں آ گئے ہیں۔ پھوپھو شاہین کو کیسے بتاتیں کہ تیس سال پہلے انہوں نے بھی ایک سندر سپنا دیکھا تھا۔ مگر ان کی پیار کی بستی بس نہ سکی۔ لیکن ہم تمہاری دنیا ضرور آباد کرینگے۔ پھوپھو کی خاموشی پر شاہین نے دوبارہ سوال کیا۔ تو انہوں نے ڈائری شاہین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ شاید یہ ملاقات ہمارے خاندانوں کے

لئے دائمی رفاقت کا سبب بن جائے۔ پھوپھو اب یہ کسی حال ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں موت منظور ہے پر ذلت اور رسوائی برداشت نہیں کریں گے اور نا ہی کسی کے سامنے آپ کو جھکنے دیں گے۔ شاہین نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تو پھوپھو نے کہا میری بچی تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ ہم جانتے ہیں۔ اگر انہیں ہمیں رسوا کرنا ہوتا تو کب کا کر چکے ہوتے۔ اور اس حویلی کی دہلیز پر سر جھکانا تو ہمارے لئے عبادت ہے تمہاری خوشیوں کی خاطر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ شاہین بنا سانس لئے بے یقینی کی کیفیت میں ثریا بانو کو دیکھتی رہ گئی۔ ثریا بانو دل کو ہاتھوں میں تھامے آگے بڑھیں۔ دستک نہیں دی۔ بس آگے بڑھتی چلی گئیں۔ آفتاب خان اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے چہرے سے غم آشکارا تھا۔ پھوپھو کے آنسو بہنے لگے۔ آفتاب خان انہیں دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ انہیں برسوں سال پہلے کے واقعات یاد آئے۔ وہی تو واحد گواہ تھے طارق خان اور ثریا بانو کی پہلی اور آخری ملاقات کے۔ انہوں نے اپنی محبت کا جہاں اجاڑ کر طارق خان کا ایک نیا جہاں آباد کیا تھا۔ اور خود ساری زندگی اپنے بڑے بھائی کی چوکھٹ پر گزار دی تھی۔ ثریا بانو نے سسکیوں کے درمیان گھرے غموں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آہ ایک نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ ہم اپنی جان دے کر بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ آنا تو ہمیں بہت پہلے چاہیئے تھا آپ سے معافی مانگنے لیکن ایسی مجبوریاں ہمارے سامنے آتی چلی گئیں جن کا مداوہ ہم نہ کر سکے۔ دل ماتم کرتا رہا اور ہمیں آہ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ بس مصیبتوں میں گھرے رہے۔ ہمارے دکھ بے حساب ہیں ان کا حساب کیا دیں۔ آپ تو سب حالات سے واقف ہیں۔

ہماری عقل حیراں کہ بنا دیکھے بغیر ملے کس طرح انسان کسی کو اتنی شدت سے چاہ سکتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کی چاہت میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ خورشید عالم پاگل ہو گئے تھے۔ سب کچھ بھول گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پاگل آدمی کب کسی کی سنتا ہے۔ بہت سمجھایا لیکن ہماری ساری کوششیں ناکام رہیں۔ جب ہمیں حقیقت کا پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ فردوس یہ حویلی چھوڑ چکی تھیں۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ وہ کسی لڑکی کو چاہتے تھے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لڑکی فردوس تھیں۔ اگر ہمیں ذرا سی بھنک پڑ جاتی تو آج نا یہ حویلی ماتم میں ڈوبی ہوتی اور نا ہی ہماری حویلی دکھ کا ساگر بنی ہوتی۔ ایک آدمی بگڑ جائے تو کتنی بربادی پھیلاتا ہے۔ جس خاندان کی خوشیاں اور سلامتی ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھیں اور جن کے لئے ساری زندگی ہم نے خدا سے صرف خوشیاں ہی خوشیاں مانگیں جب برا وقت آیا ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔

جو لوگ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں انہیں تو معاف کرنا ہی ہوتا ہے۔ خورشید عالم کو اپنے جرم کی سزا اسی دنیا میں مل گئی۔ ان کے کمرے کا قبر جیسا ماحول ہو گیا تھا۔ بیس دن کے اندر دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ فردوس کی جگہ تو کوئی نہیں بھر سکتا۔ آج ہم اپنے دل کا ٹکڑا آپ کی دہلیز پر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کریں۔ چاہیں تو سزا دیں۔ یا۔

اسی وقت بیگم۔ شیر خان اور رفیق خان کمرے میں داخل ہوئے۔ آفتاب خان کہہ رہے تھے خورشید عالم کو فردوس نے ہی معاف کر دیا تھا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس بچی کو سزا دینے والے۔ اسی وقت شاہین نے نظریں اٹھائیں۔ رفیق خان نے بڑی سنجیدہ مگر دھیمی سی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شاہین کو دیکھا تھا تب ہی آفتاب خان کی نظریں رفیق خان کے چہرے پر ٹک گئیں۔ رفیق خان خاموش تھے مگر ان کے چہرے کی بدلتی رنگت اور آنکھوں میں اتری چمک دل کے راز بیان کر رہی تھی شاہین نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

بیگم آپ انہیں نہیں جانتیں۔ آپ سلطان عالم کی چھوٹی بہن اور خورشید عالم کی پھوپھو ہیں۔ یہ بچی خورشید عالم کی چھوٹی بہن ہیں۔ یہ سنتے ہی شیر خان نے بڑے غور سے اپنی بڑی امی کی طرف دیکھا۔ آفتاب خان بولے۔ یہ یہاں لائی گئی ہیں تاکہ ہم ان کے بھائی کے جرم کی سزا انہیں دیں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ اس سے پہلے پھوپھو کچھ کہتیں رفیق خان بولے۔ یہ ان کے ساتھ سراسر ظلم ہوگا۔ تم چپ رہو ہم تمہاری امی کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں آفتاب خان بولے۔ بیگم نے بڑی سنجیدہ آواز میں کہا ہم اپنی روایتیں بھول نہیں سکتے۔ قبیلے والے بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ سزا تو انہیں بھگتنی ہی پڑے گی۔ وہ بھی بہت سنگین۔ یعنی۔ عمر قید۔ کہو بیٹی منظور ہے تمہیں۔ بہت پیاری سی مسکان سب کے چہروں پر پھیل گئی تھی۔ بیگم آگے بڑھیں۔ پہلے ثریا بانو سے بڑے تپاک سے ملیں پھر شاہین کو سینے سے لگا کر بولیں۔ سزا قبول ہے۔ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔ اگر تم نہ آتیں تو رفیق ساری عمر تمہاری راہ دیکھتا رہتا مگر منھ سے نہ بولتا۔

آفتاب خان بولے۔ اچھے کام میں دیر نہیں کرتے۔ ابھی قاضی صاحب کو بلاؤ۔ رفیق خان کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن ابو۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ہم نے جو کہہ دیا سو کرو۔ آج بہت دنوں کے بعد خوشیاں خود چل کر ہمارے گھر آئی ہیں۔ یہ بچی ہماری سونی حویلی کو آباد کرنے آئی ہے۔ فردوس ہم سب کی دلاری تھی اس حویلی کے ہر فرد کی پیاری تھی۔ اس کی موجودگی کا احساس تو ہر دل میں زندہ رہے گا۔ اس کی آواز بھی حویلی میں گونجتی رہے گی۔ آخر کب تک حویلی پر سوگ کے بادل چھائے رہیں گے۔ رات کتنی بھی کالی سیاہ کیوں نہ ہو سویرا ہو ہی جاتا ہے۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ پھر ہم ایک نئے سویرے کی امید کیسے چھوڑ دیں۔ یہ بچی ہماری اندھیری حویلی میں اجالا بن کر آئی ہے۔

پھوپھو کی نظریں شیر خان کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ یہ صورت تو ان کے من میں بسی تھی۔ وہی شکل وصورت۔ وہی قد وہی انداز۔ وہ تو طارق خان پر تو تھے۔ آفتاب خان فوراً بولے۔ یہ ہمارے بھائی جان کے اکلوتے بیٹے شیر خان ہیں۔ شیر خان نے جھک کر ثریا بانو کو سلام کیا۔ اور ثریا بانو کے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔ دل تو چاہا ایک بار سینے سے لگا کر کہیں تم میرے بھی بیٹے ہو۔ زبان جنبش نہ کر سکی مگر آنکھوں سے ڈھلکتے آنسوؤں نے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

امی بیگم نہ جانے کتنے عرصے کے بعد مسکرائی تھیں۔ بولیں شیرو ہم نے تمہاری شرط پوری کر دی۔ بہت دنوں کے بعد حویلی میں زندگی مسکرائی تھی۔ اندر ایک گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ شاہین اور کوثر کو مہندی لگائی جا رہی تھی۔ پھولوں کی خوشبو سے حویلی مہک اٹھی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ میں محبت گنگنا رہی تھی۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

آفتاب خان نے ثریا بانو کے چہرے پر بے چینی پھیلی دیکھی تو فوراً انہیں دلاسا دینے پہنچے۔ آپ بہت تھک گئی ہیں۔ کچھ دن یہاں ٹھہر کر آرام کر لیں تو بہتر ہوگا۔ ثریا بانو نے اپنے دل کی بات سنائی۔ آپ تو جانتے ہے ہم اپنے خاندانی وقار سے نہیں کھیلتے۔ یہ بچی ہے تو ہمارا ہی خون۔ ہماری طرح ساری زندگی تنہا گزار دیتی۔ مٹ جاتی پر منھ نہ کھولتی۔ تنہائی کا درد سہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہم نے اس درد کے دریا کو اکیلے پار کیا ہے۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی انسان کب اکیلا ہوتا ہے۔ یادوں کے قافلے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ برسوں یادوں کی امانتیں لئے انسان نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے جب انسانی خواہشات کے آڑے مجبوریاں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ لڑکیاں تو ہمیشہ کی مجبوریوں میں گھری رہتی ہیں۔ اس لئے ہم سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر آپ

کے در پر آ گئے۔ ہماری بیٹی کو قبول کر کے آپ نے ہمارے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔ آفتاب خان مسکرا کے بولے اس حویلی پر ہم سے زیادہ حق آپ کا ہے۔ بڑے مہان ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی اور کی دنیا بسانے کے لئے اپنی دنیا لٹا دیں۔ ہمارے دل میں آپ کے لئے وہی عزت اور احترام ہے جو تیس سال پہلے تھا۔

تیس سال پہلے۔ ثریا بانو نے دہرایا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ ہاں ہم جانتے تھے۔ اس وقت کوئی ہمارے رشتے کو قبول نہیں کرتا لیکن ہم نے اس خاندان کو اس حویلی کو اپنا مان لیا تھا۔ آج اپنوں سے مل کر اور اس حویلی کی خوشبو سونگھ کر ان لمبے تیس سالوں کے کٹھن سفر کی تھکان دور ہو گئی۔ سارے ملال ختم ہو گئے۔ کیا بتائیں۔ اتنا بڑا خاندان تھا۔ ڈھیروں لوگوں کے درمیان رہتے تھے پر ہم اکیلے تھے۔ سب اپنی اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔ کسی کو بھی ہمارے سوختہ دل سے دھواں اٹھتا کبھی دکھائی ہی نہیں دیا۔ ہمارے لئے یہ بڑی دنیا ایک ویران گوشہ بن کر رہ گئی تھی۔ اور ہم اسی گوشے میں سانسیں لیتے رہے۔ پھر بھی جیتے رہے۔ آفتاب خان بولے آپ جیسے لوگ جن کے دلوں میں محبت کا جذبہ اتنی شدت سے ہو وہ ہر حال میں دوسروں کے لئے جیتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ بکھر گئے تو ہماری یہ دنیا بکھر جائے گی۔ ثریا بانو بولیں۔ لیکن ٹوٹے دل والے ہی زخم جدائی کا درد جانتے ہیں۔ آپ نے میری بچی کو اس عذاب سے بچا کر میرے اوپر بڑا کرم کیا ہے۔ آفتاب خان مسکرائے۔ اب چھوڑیں یہ باتیں۔ اب تو شاہین ہماری بیٹی ہے۔ آپ اس کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔

ثریا بانو بولیں ہم رک جاتے مگر ہماری حویلی سونی پڑی ہے۔ ریحان عالم ابھی سیاست سے واقف نہیں۔ ہمارا جانا بہت ضروری ہے۔ کہیں کوئی آفت نہ آن پڑے۔ آپ حکم کریں اگر ہم آپ کے کچھ کام آسکیں تو اپنی خوش قسمتی سمجھیں گے۔ آفتاب خان بڑی عاجزی سے بولے۔ شاہین بالکل اداس اور ناامید ہو چکی تھی۔ ایک یتیم بچی کو تھوڑا سا پیار تھوڑی سی توجہ ملے گی تو اس کی زندگی میں خوشیاں لوٹ آئینگی۔ اور ہمیں فخر ہوگا کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنا مانا تھا وہ واقعی ہمارے اپنے ہیں۔ یہ راز جو آپ نے برسوں اپنے دل میں دفن کر رکھا تھا اسے راز ہی رہنے دیں۔

دوسرے دن ثریا بانو کی رخصتی کے وقت حویلی کے سارے لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ آفتاب خان بولے، ہمارے علاقے میں پیسے کی کمی کی وجہ سے کئی شادیاں توڑ دی گئیں۔ اس لئے ہم نے اپنے علاقے میں حکم جاری کر دیا ہے کہ شادی میں کوئی لین دین نہیں چلے گا تاکہ کوئی لڑکی پیسے کی کمی کی وجہ سے ستائی نہ جائے۔ کوئی شادی روکی نہ جائے۔ انہوں نے زیورات کی تھیلی آگے کرتے ہوئے کہا۔ یہ زیورات۔ ثریا بانو ہنس دیں۔ پہلی غلطی تو ہمیشہ معاف کر دی جاتی ہے۔ زیورات تو لڑکیاں پہنتی ہیں اب اس عمر میں یہ ہمارے کس کام کے۔ وہ جانے کو آگے بڑھیں۔ سب کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ شاہین تو ایسے رو رہی تھی جیسے اپنی ماں سے جدا ہو رہی ہو۔ ثریا بانو کے آنسو بھی کب تھمنے والے تھے۔ مڑ مڑ کر دیکھتی رہیں۔ ابو شاہین سے بولے بیٹا ہم لوگ بہت آنسو بہا چکے ہیں اب ان آنسوؤں کو روک لو۔ تم اپنے ہی گھر میں ہو۔ اندر جاؤ۔ کوثر کو حکم دیا۔ انہیں اندر لے جاؤ۔ اور دیکھو یہ اور نہیں روئیں گی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اندر سے ہنسنے اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

جمال شاہ کی حویلی کا حال۔

فردوس کو اس کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر کے جب جمال شاہ اپنے کمرے میں پہنچے تو اس

آفت ناگہانی پر بری طرح رو پڑے۔ انہیں ان چند انمول لمحات کی یاد آئی جو فردوس کے ساتھ گزارے تھے۔ سوچ رہے تھے اگر ہم دونوں ملے نہ ہوتے۔ ایک دوسرے کے لئے انجان اور بیگانے ہوتے تو آپ کسی نہ کسی طرح اپنے مقدر سے سمجھوتہ کر ہی لیتے۔ محبت کی آگہی یوں قیامت نہ بنی ہوتی۔ ہم نے تو صرف ذرا سی محبت مانگی تھی آپ نے جان دے کر اپنی وفاؤں کا ثبوت دے دیا۔ آپ خود تو مٹی کے تلے وہاں خاموش ہیں جہاں ہم آپ سے کوئی سوال کر ہی نہیں سکتے۔ زرینہ کی زبانی سارا حال سننے کے بعد ہم نہ جی پائیں گے نہ مر پائیں گے۔

رات کی ہولناک تنہائی میں فردوس کی آنسو بہاتیں آنکھیں۔ تھرتھراتے لب اور وحشت سے لرزتا بدن آنکھوں میں آسمایا۔ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی۔ وہ کئی دن یونیورسٹی نہیں گئے۔ امی حیران تھیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ صرف منگنی ہی تو ہوئی تھی۔ بن دیکھے دونوں کے درمیان ایسا رشتہ استوار ہو گیا کہ جمال اپنے آپے سے بے خبر ہو گئے۔ امی ان کا حال دریافت کرنے پہنچی۔ بیٹے کو آنکھوں پر ہاتھ دھرے بے حس پڑے دیکھ کر بڑے شکستہ لہجے میں بولیں۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر ہمارے حواس اڑے جا رہے ہیں۔ خدا کے واسطے اپنے ہوش و حواس سنبھالو۔ جمال شاہ نے بڑی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے امی سے سوال کیا۔ آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں۔ اس سانحہ کو بھلانا آسان نہیں۔ بس یہ سوچ کہ فردوس پر کیا کیا ظلم ڈھائے گئے ہونگے۔ ان پر ایسی کیا بیتی جو انہوں نے موت کو گلے لگا لیا ہمیں ہر وقت بے چین کیے رہتا ہے۔

جانتے ہیں تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اپنی پسند کا بندھن ٹوٹ جائے تو دکھ ضرور ہوتا ہے۔ وہ فوراً بولے امی رشتہ ٹوٹنا الگ بات ہے۔ اگر رشتہ اس طرح ٹوٹے تو انسان کیا کرے۔ یہ نہ افسانہ تھا نہ عشق۔ ہماری زندگی کی حقیقت تھی۔ اس وفا اور قربانی کی دیوی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ بیٹے کی آہیں سن کر ماں کا دل ہل گیا۔ گھبرا کر بولیں۔ میرے بچے جسے پا نا سکو اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے۔ مردوں کو ہزار قسم کے مسئلے اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تم جیسے ہونہار جوانوں کو ایسی ہی ناہموار راہوں پر دیا سمجھ کر جلتے جانا ہوتا ہے۔ تمہیں دوسروں کو روشنی دکھانا ہے۔ انہیں زندگی کی کٹھن راہوں پر چلنا اور جینے کا سبق سکھانا ہے۔ اور یہاں تم پہلے ہی حادثے پر ہمت ہار گئے۔ منزلیں کئی ہیں۔ ہر اگلے موڑ پر نئی منزل۔ تمہیں زندگی میں بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ اور منزل یوں ہی آسانی سے تو نہیں مل جاتیں ہر منزل تک پہنچنے کے لئے صبر اور ہمت چاہیئے۔ امی کو کیا معلوم تھا ان کا بیٹا اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ بکھر گیا ہے۔ اب ان کی نہ کوئی منزل تھی۔ ہاں سامنے زندگی کا ایک طویل سفر ضرور تھا۔ جسے انہوں نے تنہا طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کئی دن اور بیت گئے مگر جمال شاہ کی حالت نہیں سدھری تو ابو نے انہیں بلا بھیجا۔ بیٹے کو پریشان دیکھ وہ بھی مایوس ہو گئے۔ بولے۔ اب بس کرو۔ جو اللہ کو منظور تھا۔ وہ ہو گیا۔ خدا کے کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور چھپی ہوتی ہے جسے ہم انسان سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارا حسب نسب نا ہی ہمیں زیادہ خوشیاں منانے کا وقت دیتا ہے اور نہ ہی رونے کا۔ ہمارے پاس اپنے دکھ سکھ منانے کا وقت ہی کہاں ہے۔ قبیلے والوں کے سارے دکھ۔ سارے مسئلے مسائل ہمارے اپنے ہیں۔ اب اس طرف دھیان دو۔ یونیورسٹی سے کئی فون آ چکے ہیں۔ اب نکلو اس ماحول سے باہر۔

امی بولیں اداسیاں اور محرومیاں انسان کو پست کر دیتی ہیں۔ غموں کو سہہ کر بھی انسان کو بار بار زندگی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔...... بس یہی زندگی کا دستور ہے۔...... تمہیں ایک ہمدرد ساتھی کی ضرورت ہے جو تمہیں اس اداس اور مایوس ماحول سے باہر نکال سکے...... ہم سوچتے ہیں تمہاری شادی کر دیں۔...... جمال شاہ نے امی کی طرف چونک کر دیکھا...... شادی۔...... امی شادی کرنا ضروری تو نہیں ہم شادی نہیں کریں گے۔...... کبھی نہیں۔ ...... ناحق کسی لڑکی کی زندگی کیوں تباہ کی جائے...... امی نے سوال کیا...... کیا تصورات کی دنیا میں انسان جی سکتا ہے اور تصور بھی اس کا جو اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔...... جمال شاہ بولے آپ پریشان نہ ہوں ہم زندہ رہیں گے...... آپ کے لئے۔...... سب کے لئے...... وہ امی کو کیسے بتاتے کہ صرف دل میں ہی نہیں فردوس کی محبت تو انکی رگوں میں بس گئی ہے۔...... اب انہیں بھلانے کی کوئی تدبیر کام نہیں آسکتی۔

شادی تو تمہیں کرنی ہی ہوگی۔ وہ بھی جلد از جلد۔ یہ ہمارا حکم ہے۔ یہ ابو کی آواز تھی لیکن اسی وقت جمال شاہ کو یاد آیا کہ فردوس نے بھی کہا تھا۔ زندگی اکیلے بسر نہیں ہوتی۔ "وہ بے بس سے ہو کر بولے" ہم نے آج تک آپ کا حکم نہیں ٹالا۔ ہماری بھی ایک شرط ہے۔ شادی ہم صرف کسی بے سہارا لڑکی کی زندگی سنوارنے کے لئے ہی کریں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ فی الحال آپ ہماری فکر چھوڑ کر کمال کی شادی کی فکر کریں۔ کمال رئیس اسد گل کی چھوٹی بیٹی ریشماں کو چاہتے ہیں۔ امی نے ماتھا پیٹ لیا۔ ہائے میرے اللہ۔ ابھی ایک آفت سے چھٹکارا نہیں ملا اور دوسری سامنے آکھڑی ہوئی۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔ اسد گل کی بیٹی۔ اسد گل کو منانا آسان کام نہیں۔ ہم نے کئی بار کوشش کی دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن پرانی دشمنیوں کے داغ آسانی سے نہیں مٹتے۔ ابو اگر آپ اجازت دیں تو ہم انہیں منانے جائیں۔ ہم پر جو گذری سو گذری۔ ہم کمال شاہ کے چہرے پر اداسی برداشت نہیں کر پائینگے۔ وہ ہی تو اس حویلی کی رونق ہیں جمال شاہ بولے۔ ٹھیک ہے تم بھی ایک بار کوشش کر کے دیکھ لو۔ شاید یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے۔ جمال شاہ بولے ہم جائیں گے۔ آگے اللہ مالک۔ کب ان تک رسائی ہو اور پھر کتنے مدارات کے بعد ان کا دل جیت پائیں گے۔

اسد گل کی حویلی پر بے رونقی پھیلی دیکھ کر جمال شاہ حیران تھے۔ اسد گل تخت پر براجمان حقہ گڑگڑاتے ہوئے کسی گہرے سوچ میں غرق تھے۔ چہرے پر فکروں اور الجھنوں کا جال بچھا تھا۔ جمال شاہ قریب پہنچے تب اسد گل نے ان کی طرف دیکھ کر ہی برہمی کی اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آج آپ کی فوج ساتھ نہیں آئی۔ کس مقصد سے آنا ہوا۔ جمال شاہ نے ان کی ناراضگی کو نظر انداز کیا اور جھک کر با احترام اور پُر خلوص انہیں سلام کیا۔ انہوں نے بھی سلام کا جواب دیا اور کچھ دیر مکمل خاموشی چھائی رہی۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم بیٹھ جائیں کیونکہ بات ذرا لمبی ہے۔ اسد گل جو ابھی تک حیرانی کے عالم میں تھے چونکے۔ ہاں۔ ہاں۔ آؤ۔ ہمارے قریب بیٹھو۔ جمال شاہ بولے اگر آپ ہماری گزارشات سنیں تو ہم کچھ عرض کریں۔ آج ہم تنہا آئے ہیں اور وہ بھی بنا کسی ہتھیار کے۔ کیونکہ جب تک ہم ان ہتھیاروں کا استعمال کرتے رہیں گے آپسی دشمنی کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔ آج ہم آپ کی دہلیز پر صلح اور محبت کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہم اپنی گذشتہ کوتاہیوں کے لئے معافی چاہتے ہیں اور اب سکون گرد و نواح کے مشتاق ہیں۔ اسد گل نے ان کا چہرہ پہلے تو تنقیدی اور پھر تعریفی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ یہ نفرتیں اور عداوتیں

ہمارے علاقوں کے امن و اماں اور سلامتی کو بہت ضرر پہنچاتی ہیں۔ ہم تو شروع سے ہی تشدد کے حامی نہیں ہیں۔ ہم انسان تو جانوروں سے بھی بدتر ہو گئے۔ جہاں دیکھو جدھر دیکھو انسان ہی انسان کا دشمن ہو گیا ہے۔ اور انسان ہی انسان کو چیر پھاڑ رہا ہے۔ آپسی محبت ہو گی تو ہمارے قبیلے بھی ترقی کریں گے۔ امن اور شانتی رہے گی تو ہم سب چین سے زندگیاں بسر کر سکتے ہیں۔ امن اور ترقی ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

جمال شاہ تو یہ ہی چاہتے تھے۔ بولے آپ کا یہ پیغام لے کر ہم ہر علاقے میں جائیں گے۔ اگر سب آپ کے خیالوں سے متفق ہو جائیں تو کم سے کم یہ چار قبیلے تو امن و چین سے رہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ اسد گل نے مسکراتے ہوئے کہا ضرور پہنچے گا۔ تمہارے ارادے نیک ہیں۔ مشکل تو ہو گی لیکن خدا کی مدد شامل حال رہے گی تو کامیاب ضرور ہو نگے۔ یہ تم نہیں تمہاری تعلیم بول رہی ہے۔ تم جیسے تعلیم یافتہ اور باشعور نوجوان ہی حالات کو بدل سکتے ہیں۔ اپنے اس ملک کو ترقی کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ اسد گل خاموش ہو گئے۔ کچھ وقفے کے بعد بولے۔ افسوس کچھ ایسے تعلیم یافتہ جاہل بھی ہیں جو درندوں سے کم نہیں پھر ایک لمبی خاموشی حائل ہو گئی۔ جمال شاہ نے ان کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کسی ناقابل بیان اذیت سے گذر رہے ہیں۔ شاید ہم آپ کے کچھ کام آسکیں۔ نہیں جمال شاہ ہماری مشکلات کا حل تمہارے پاس نہیں۔ نا جانے کیوں آج ہمیں تمہارا اس طرح یہاں آنا اور تم سے گفتگو کرنا اچھا لگا۔ آتے رہا کرو۔ ہمارا اپنا تو بیٹا ہے نہیں۔ جس گھر میں بیٹا نہیں ہوتا وہاں زندگی کی رمق نہیں ہوتی۔ تم آئے تو تھوڑی دیر کے لئے سہی اس سنسان اندھیری حویلی میں روشنی سی پھیل گئی۔

ہم بے اولاد نہیں ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں ہماری۔ بڑی بیٹی کی زندگی ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے ہاتھوں برباد ہو گئی۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں علم حاصل کرنے سے کیا فائدہ اگر انسان اس کا استعمال ہی نہ کرے۔ اس کی شادی کیا کی یوں سمجھو کہ ہماری حویلی پر تباہی لانے والی تیز آندھی چلی جو ہماری امیدوں اور خوشیوں کا تنکا تنکا اڑا کر لے گئی۔ سب کچھ چلا گیا۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔ یہاں۔ سوائے مایوسی اور اداسی کے۔ اپنے ہی لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں جمال شاہ۔ کیوں دھوکا دے جاتے ہیں۔

جمال شاہ تے انہیں تسلی دی۔ اتنی ناامیدی اچھی نہیں۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ جس گھر میں بیٹی نہیں اس میں رونق نہیں ہوتی۔ اسد گل جو کچھ سنبھل گئے تھے بولے۔ کہتے تو تم ٹھیک ہو مگر جب بیٹی کی قسمت روٹھ جاتی ہے تو اس کا دکھ برداشت کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے موت کا سامنا کرنا۔ بڑی شدت کی تکلیف ہوتی ہے جمال شاہ۔ تم نہیں سمجھو گے ایک باپ کے دل کا دکھ۔ اسد گل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد آنسو پونچھتے ہوئے بولے ہم نے قسم کھائی تھی کبھی کسی کے سامنے نہیں روئینگے لیکن جمال شاہ آج تمہاری توجہ اور قربت ملی تو ہم اپنے آپ پر قابو نہ کر پائے۔ خیر دکھ سکھ تو زندگی کے ساتھ ہیں ہم تو آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے اوپر آسمان سے سنگ برسے ہیں ایک دن اچانک اس کی رحمتوں کی بارش بھی ہو گی۔ انسان ہیں۔ امید چھوڑ دی تو پھر جینے کو بچے گا بھی کیا۔ اللہ کرم کرے۔ ہماری زندگی کا سفر تمام ہونے سے پہلے ہماری دونوں بیٹیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا دے تاکہ ہم بھی سکون سے مر سکیں۔ بس سوچتے رہتے ہیں کہ ہمارے بعد ان دونوں کا کیا بنے گا۔

چائے پیتے پیتے رک کر بولے۔ شہید گل ہمارے بھتیجے تھے۔ نیک۔ مخلص اور فرمانبردار تھے۔ بچپن میں ہی ان کی اور ریشماں کی منگنی ہوگئی تھی۔ ہم لوگ اپنے رسم ورواجوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہم خوش تھے بیٹی گھر میں رہے گی۔ ہمارے آنکھوں کے سامنے۔ اچانک ہی شہید گل نے لندن جانے کی ضد کی۔ بے حد ذہین تو تھے ہی ہم بھی انکار نہ کر سکے۔ سوچا پڑھائی سے دماغ کھلتا ہے۔ جتنا زیادہ پڑھیں گے اتنا ہی ترقی کریں گے۔ ہماری بیٹی سکھی رہے گی۔ پڑھ کر گھر واپس تو آنا ہی تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ ہم ادھر ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہیں آئے۔ شادی کا دن آیا تو فون پر شادی قرار پائی۔ ہمیں یقین تھا سگے بھائی کا بیٹا ہمارے ساتھ دھوکا دھڑی کبھی نہ کرے گا۔ ایک دن لوٹ آئے گا۔ جمال شاہ آج کل رشتوں کا احترام ہی دنیا سے اٹھ گیا۔ جو انسان وطن لوٹنے کی راہ بھول جائے اسے یہ کیسے یاد رہتا کہ ایک بیچاری لڑکی ہزاروں میل دور اپنی سرزمین پر اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ ہمارے اعتماد کو تو خاک میں ملا دیا ہے اس نے تو خاندان کا مان بھی نہ رکھا۔ اپنے ماں باپ کا بھی خیال نہ کیا۔ ہم سب یہاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اور وہ وہاں طلاق نامہ تیار کر رہے تھے جو ہمیں ایک ماہ کے بعد موصول ہوا۔ نکاح کے بعد نہ کوئی فون نہ کوئی خط۔ ہماری بیٹی کا برا حال ہو گیا تھا۔ دونوں بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے۔ ساتھ ساتھ بڑے ہوئے تھے۔ محبتیں بھلانا آسان تو نہیں ہوتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر ہم سب اپنی محبتیں لٹاتے رہے اسے محبتیں نبھانی نہیں آئیں۔ بڑا بے قدر انکلا۔ اس کے واپس نہ آنے کی وجہ سے سارا خاندان صدمہ میں ڈوب گیا تھا۔ ہم نے طلاق کی خبر پوشیدہ رکھی۔ کیسے برداشت کرتی ہماری بیٹی۔ پھر سنا کے انہوں نے لندن میں شادی کر لی تھی۔ اگر یہ سچ تھا تو انہوں نے ہماری بیٹی کی زندگی کے ساتھ یہ کھلواڑ کیوں کیا۔ کیوں اس کا دامن داغ داغ کر ڈالا۔ طلاق شدہ عورت ہمیشہ گنہگار سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد ہمیشہ بے قصور مانا جاتا ہے۔ پھر سنا وہ جرمنی چلے گئے۔ کس کا یقین کرتے۔ اتنی بڑی دنیا میں ہم انہیں کہاں ڈھونڈھنے جاتے۔ اولاد کا دکھ انسان کو مار ڈالتا ہے۔ اگر بیٹا مر جائے تو دل کو کسی نہ کسی طرح تسلی ہو ہی جاتی ہے۔ کہ اس کی دی ہوئی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ اگر ایسے لاپتہ ہو جائے تو دل وجان میں ایک آگ سی دہکتی رہتی ہے۔ ہمارے بھائی جان اور بھابھی بس اس ہی آگ میں بھسم ہو گئے۔ ہماری بیگم دل کی مریضہ تھیں۔ انہیں بھی سارا حال تفصیل سے نہیں بتا سکتے تھے۔ غم ہمیں بھی کم نہیں ہوا۔ آخر ہمارا خون تھا۔ سو یہ دکھ ہم اکیلے ہی جھیلتے رہے۔ طلاق نامہ ہاتھوں میں تھا اور ہم بے موت اسی وقت مر گئے تھے۔

افوائیں تو ہوا میں پرواز کرتی ہیں۔ آخر ریشماں کو پتہ چل ہی گیا۔ ہمارے گھر کا بچا کھچا سکون بھی غارت ہو گیا۔ ریشماں کا حال تو بگڑ ہی گیا تھا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا اس کی امی کی حالت ایسی بگڑی کہ زبردست دل کا دورا پڑا۔ وہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔

ہم اپنی بیٹی کو کیا سمجھائیں ہم تو اپنے آپ کو ہی نہیں سمجھا پا رہے ہیں کہ آخر شہید گل نے ایسا کیوں کیا۔ جرمنی کیوں چلے گئے۔ ہمارے اندر کی پریشانی اور بے سکونی ہمیں لحہ بھر کو بھی دم نہیں لینے دیتی۔ لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ تم نہیں سمجھو گے جمال شاہ۔

ایک طلاق شدہ عورت کو ہزاروں مسائل در پیش ہو سکتے ہیں۔ ہماری بیٹی شدت اذیت سے پاگل سی ہو

گئی تھی۔ بڑی مشکل سے صبا۔ صبا ہماری چھوٹی بیٹی ہے۔ ہم دونوں نے مل کر اسے سنبھالا۔ ہمت بندھائی اور دوبارہ کالج میں بھرتی کروادیا۔ وہ بھی اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن مطلقہ عورت کی عزت کہاں۔ چاہے وہ امیر کی بیٹی ہو یا کسی کنگال کی۔ دنیا والوں کے منہ تو ہم بند کر نہیں سکتے۔ آخر لڑکی نے روز روز کے طعنوں تشنوں سے بچنے کے لئے کالج ہی چھوڑ دیا۔ تب سے اس حویلی کی چار دیواروں میں مقید ہے۔ اس شادی کے بعد ہی ہمارا وقت بگڑتا چلا گیا۔ برباد ہو گئے ہم۔ سوچتے ہیں ہمارے حصے میں صرف کانٹے ہی کانٹے کیوں آئے۔ ایک لڑکے کی لاپروائی اور بے وفائی نے سارا خاندان تباہ کر دیا اور ہمیں کتنے عذابوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ بس یکا یک ایک بھونچال سا آیا اور ہماری حویلی کی نیو ہلا کر چلا گیا۔ ان کھنڈر دیواروں میں ہم تین انسان سسکتے رہ گئے ہیں۔

جمال شاہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے حال پر ترس کھا کر کوئی ہمدردی جتائے۔ نہیں چاہتے کہ کوئی ہماری دولت کے لالچ میں آکر ہماری بیٹیوں کو اپنائے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دونوں بیٹیوں کی شادی ایک ہی خاندان میں کریں گے۔ دو بھائیوں سے۔ تاکہ ایک چھت کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹ سکے۔ جمال شاہ اس بھاری بھرکم شخص کی اندرونی کیفیت سمجھ کر سہم سے گئے۔ غموں نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ جھکا دیا تھا اور اب انہیں سہارے کی ضرورت تھی۔ من میں سوچ رہے تھے۔ وہ لوگ کیوں دل میں اتر جاتے ہیں جن کے ستارے آپس میں نہیں ملتے۔ کیوں ایسا ہوتا ہے۔ ملن اور پھر ایسی جدائی۔ جان لیوا۔

جمال شاہ بولے انسان کچھ سوچتا ہے قسمت کچھ اور کہتی ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے اسے کون مٹا سکا ہے۔ خدا نے مرد اور عورت کو برابر درجہ دیا ہے۔ ہم انسانوں نے ہی عورتوں کا درجہ کم کر رکھا ہے۔ اسد گل بولے بیٹا یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ نہ کبھی پلٹا ہے نہ پلٹے گا۔ جمال شاہ مسکرائے۔ آپ نے ہمیں بیٹا کہا۔ بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کی۔ کیا آپ ہمیں اپنی فرزندگی میں قبول فرمائیں گے۔ اسد گل ایک دم چونک گئے۔ بڑی متحیر نظروں سے جمال شاہ کو دیکھ کر بولے۔ شاید تم نہیں جانتے کیا کہہ رہے ہو۔ کیوں ہماری بے بسی اور مجبوری کا مذاق اڑاتے ہو۔ طلاق شدہ لڑکی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ رئیس گل کو کسی طرح یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جمال شاہ اتنا بڑا فیصلہ منٹوں میں کرلیں گے اور وہ بھی اپنے والدین کی عدم موجودگی میں۔ جمال شاہ بولے آپ نے اپنوں سے دھوکا کھایا ہے اس لئے انسانوں پر سے بھروسہ اٹھ گیا ہے۔ اسد گل نے کہا۔ اتنے دکھ جھیلنے کے بعد ہمیں کوئی رشتہ کوئی جذبہ قابل اعتبار نہیں لگتا۔ کیا ہم تمہارا یقین کرلیں۔ یاد رکھنا ہمارے پرانے زخم بھرے نہیں ہیں۔ نئی چوٹ کھانے کی ہمت اور قوت ہم میں نہیں رہی ہے۔ سوچ لو۔۔ اچھی طرح سوچ لو۔۔ اتنا بڑا فیصلہ۔ جمال شاہ بولے فیصلہ تو فیصلہ ہوتا ہے۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ ہم نے آپ کو زبان دی ہے۔ زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ کمال شاہ ہمارے چھوٹے بھائی ہیں۔ کیا ہم کمال شاہ کا رشتہ آپ کی چھوٹی بیٹی کے ساتھ پکا سمجھیں۔ (اسد گل کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا) چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی...... جمال شاہ آج ہمیں یقین ہو گیا اس دنیا میں انسانیت باقی ہے۔ اگر انسانیت مر گئی تو دنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ بولے۔ یہ سچ ہے خدا کسی کو محروم نہیں کرتا اللہ نے ہماری دعائیں قبول کرلیں۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں بہنے دو انہیں۔ آج ہمارے سارے غم یہ خوشی کے آنسو دھو ڈالیں گے۔

انہوں نے جمال شاہ کو گلے لگا کر کہا۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔ کاش ہر ماں تم جیسے بیٹے کو جنم دے۔

جمال شاہ نے جانے کی اجازت مانگی۔ بولے آج سے آپ کا ہر غم۔ ہر فکر ہماری ہے۔ اب آئندہ آپ صرف زندگی کی باتیں کریں گے۔ جمال شاہ بڑا احسان کیا ہے تم نے اس بوڑھے باپ پر...... جلد ملنے کا وعدہ کر کے جمال شاہ چلے گئے۔

کالج کے باہر والی سڑک پر حسب معمول لڑکیوں کا گروہ باتوں میں محو تھا۔ ایک گاڑی زناٹے سے پاس سے نکلی تھی۔ لڑکیوں نے مڑ کر دیکھا سڑک پر کھڑا لڑکا خون میں لت پت زمین پر تڑپ رہا تھا۔ ماہ بانو تیزی سے دوڑ کر بچے کے پاس پہنچی تھیں۔ جھک کر بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسی وقت کسی اجنبی آواز پر چونک کر اوپر دیکھا...... میڈم...... یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔ ماہ بانو کو اس وقت ایسا لگا جیسے ساری دنیا صرف ان دونوں کو ہی دیکھ رہی ہے۔ نوجوان نے بچے کو اٹھایا۔ اور گاڑی فراٹے سے سڑک پر دوڑتی غائب ہو گئی تھی۔ ماہ بانو وہیں کھڑی خون سے بھیگی سڑک کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ کتنی سستی ہے زندگی ہمارے یہاں...... نہ جانے کون ہے کس کے جگر کا ٹکڑا ہوگا۔

پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ یہ لو۔ تم کیوں اداس ہو گئیں۔ یہاں تو آئے دن ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ کس کس کے لئے روؤ گی اور دوسروں کو بچانے کے چکر میں کسی دن خود نہ کسی گاڑی کے نیچے آ جانا۔ یہاں تو ہر بندہ آنکھیں میچ کر گاڑی چلاتا ہے۔ دوسری آواز آئی۔ ہائے کتنا ہینڈسم ہے۔ غضب کی پرسنالیٹی ہے بندے کی لباس اور چہرے سے تو کسی ریاست کا مالک لگتا ہے۔ کب سے جانتی ہو تم اس بندے کو۔ ماہ بانو کے دھیان میں ابھی تک بچے کی چیخ گونج رہی تھی۔ بولی ایک بچہ گھائل ہو گیا اور تم لوگوں کو مذاق چھوٹ رہا ہے۔ اوہو تم تو ناراض ہو گئیں بھئی وہ تمہیں دیکھ کر بڑی دلکشی سے مسکرایا تھا۔ جیسے دونوں کی برسوں پرانی آشنائی ہے۔ بند کرو یہ بکواس ...... ماہ بانو کو تو غصہ آ گیا۔ سب جھوٹ، ان حالات میں کوئی مسکرا نہیں سکتا۔ کوئی شریف بندہ ضرور تھا ورنہ اس طرح کسی غریب بچے کی مدد کیوں کرتا۔ بس چلا گیا۔ قصہ ختم۔ بھئی ان کی مسکراہٹ تو کہہ رہی تھی کہ قصہ اب شروع ہوا ہے۔ ابتداء عشق ہے...... زیبا بولی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا...... سب نے اپنے اپنے شوشے چھوڑے۔ ماہ بانو ان کی نوک جھوک میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ماہ بانو نے سکون کی سانس لی۔

(کون تھا...... یہی سوال ماہ بانو کو پریشان کرتا رہا) اپنے کمرے میں پہنچی...... بار بار دھیان اس کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہی اجنبی صورت آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ تب ہی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ میڈم...... دھڑکتا دل تھم سا گیا تھا۔ وہ تو پوری کی پوری سن پڑ گئی تھی...... سن رہی ہیں آپ...... کون ہیں آپ...... اتنی جلدی بھول گئیں۔ ہم آپ کو نہیں جانتے۔ آپ نے ہمارے گھر فون کرنے کی جرت کیسے کی...... دوستوں کے ساتھ ہی تو غم بانٹتے ہیں...... اس میں ہمت اور جرات کی کیا ضرورت...... آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا...... وہ کس لئے...... موت کے سامنے تو بہادر سے بہادر انسان تھرا جاتا ہے۔ نہ جانے اس چھوٹی سی جان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ جب وہ آخری سانسیں لے رہا تھا آپ کا ہاتھ اس کی پیشانی پر تھا۔ کم سے کم مرتے وقت وہ اکیلا نہیں تھا...... باپ شرابی ہے۔ ماں سوتیلی...... وہ بھکاری بچہ ہمارا دوست تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے...... وہاں موجود تو بہت لوگ تھے لیکن صرف

آپ دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی تھیں۔اس خودغرض زمانے میں کون کس کی مدد کرتا ہے۔بس یہی کہنا تھا۔فون کٹ گیا تھا...... ماہ بانو دیر تک اس انسان کے بارے میں سوچتی رہی جس کے اندر ہمدردی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔جس کا وہ نام تک نا جانتی تھی۔

دوسرے دن وہ کالج کے باہر کھڑی اپنی گاڑی کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔وہی شاندار گاڑی اس کے قریب آکر ایک پل کو رکی تھی۔وہ اسے دیکھ کر بڑی دلکشی سے مسکرایا تھا۔بانو نے اپنی گاڑی آتے دیکھی تو آہستہ آہستہ چل پڑی تھی۔گھر جاکر چہرہ آئینہ میں دیکھا جوابھی تک گلابی گلابی ہورہا تھا۔دل مسرور بھی تھا اور بیحد خوفزدہ بھی...... کیا ہوگیا ہے اس دل کو آج...... اس نے اپنے آپ سے سوال کیا...... شرما کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا...... شاید اسی کو محبت کہتے ہے۔دل ہواؤں میں بھٹکنے لگا تھا...... عجیب سی بے کلی تھی...... عجیب سی بیقراری تھی...... ٹھہر جاے نادان دل قبیلے کی لڑکیوں کے دلوں کو دھڑ کنے کی اجازت نہیں......

پھر روزانہ ماہ بانو کی نظریں اس اجنبی چہرے کو تلاش کرتی رہیں مگر وہ دکھائی ہی نہیں دیا...... دل میں امید بندھی تھی...... وہ بے حس نہیں۔آئے گا ضرور...... ہمارے دل کے ویران دریچوں میں خوشبو پھیلانے...... امی نے ماہ بانو کی شادی کا ذکر چھیڑا تو جمال شاہ نے ریحان عالم کا نام لیا۔ہم پورے خاندان سے واقف ہیں......

خورشید عالم کو آپ اچھی طرح جانتی پہچانتی ہیں۔ریحان عالم ان کے ہی چھوٹے بھائی ہیں۔ان کی ذات میں جتنی خوبیاں ہیں آج کل کے لڑکوں میں کہاں ہوتی ہیں۔ہم اپنی دوستی کے رشتے کو اور پختہ کرنا چاہتے ہیں۔خورشید عالم ہمارے بچپن کے دوست ہیں...... اس سے بہتر خاندان اور ریحان عالم سے بہتر لڑکا ہماری نظر میں نہیں...... دونوں بھائیوں کا دبئی میں بہت بڑا کاروبار بھی ہے۔بزنس کے سلسلے میں ریحان عالم دبئی گئے ہوئے ہیں۔ان کے ابو سلطان عالم حج کرنے گئے ہیں۔ابو اور امی دونوں کو رشتہ معقول لگا اور فوراً ہاں کہہ دی۔

ماہ بانو نے سنا تو پریشان ہوگئیں۔بولیں ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ہم اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائینگے۔جمال شاہ ہنس کر بولے...... ان لوگوں نے تم کو مانگا ہے۔اور جس کو اتنی منتوں اور سماجتوں کے بعد پایا جائے اسے سسرال میں نازوں سے رکھا جاتا ہے۔ایک دن تو ہر لڑکی کو اپنے گھر جانا پڑتا ہے۔وہ رو پڑی...... تو کیا بھائی جان یہ ہمارا گھر نہیں...... جمال شاہ نے چھوٹی بہن کو گلے لگالیا۔پہلے آنسو بند کرو...... دیکھو لڑکیاں گھر کے معاملے میں لڑکوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتی ہیں۔لڑکے اپنے سسرال کو اپنا گھر نہیں کہہ سکتے۔ہمارا تو یہی گھر ہے۔جبکہ لڑکیاں ماں باپ کے گھر پر پورا قبضہ جمائے رکھتی ہیں اور سسرال میں بھی رانی بنی سب پر حکم چلاتی ہیں۔ہم تمہیں رانی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ہنستی مسکراتی...... ریحان کی تصویر دیکھ لو۔پھر جو بھی تم فیصلہ کروگی ہمیں منظور ہوگا۔اب ہم چلتے ہیں۔تصویر دیکھتے ہی دل کی کلی کھل گئی تھی۔پیار کی دھن کانوں میں سنائی دی۔ساری تنہائیاں سارے غم دور ہوگئے تھے۔تصویر پر آنکھیں جمی تھیں بڑے سکون سے بولی تھی بھائی جان آپ کتنے اچھے ہیں۔پھر ساری دنیا الٹ پلٹ ہوگئی تھی۔جمال شاہ کا جہاں لہولہو ہوگیا تھا۔سلطان عالم مکہ شریف میں ہی رحلت فرما گئے تھے۔خورشید عالم بھی چل بسے تھے۔جس حویلی میں خوشیاں ڈول رہی تھیں اب ہر سو اداسی اور بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔سارے رشتے ٹوٹ گئے تھے۔سارے رابطے ختم ہوگئے تھے۔تعلقات کی ساری کڑیاں ٹوٹ گئی

تھیں۔ ماہ بانو کی امیدوں کے سارے دیئے بجھ گئے تھے۔
جمال شاہ جب اسد گل کی حویلی سے واپس لوٹے تو رات کافی ہو چکی تھی۔ امی کو آ کر سارا حال سنایا۔ امی ناک بھوں چڑھا کر بولیں جہاں تک کمال کی بات ہے وہ تو ہماری سمجھ میں آتی ہے...... تمہارے لئے لڑکیوں کا کال تو نہیں پڑ گیا جو طلاق شدہ لڑکی سے بیاہ کرنے کی حامی بھر آئے ہو۔ جمال شاہ نے ابو کی جانب دیکھ کر کہا ہم پہلے ہی آپ دونوں کو بتا چکے تھے کہ اگر شادی کریں گے تو کسی بے سہارا لڑکی سے۔ ہمیں اسد گل نے مجبور نہیں کیا۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کمال ہمارے چھوٹے بھائی ہیں۔ دراصل وہ اپنی دونوں بیٹیوں کا رشتہ ایک ہی خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے فوراً ہی ہاں کر دی۔
بس کسی طرح کمال کی شادی ہو جائے۔ ہمیں ان کی خوشیاں بہت عزیز ہیں۔ امی نے فوراً شادی روکنے کا بہانہ تراشا...... جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہے...... انہوں نے سب کی توجہ خاندان کے سب سے گمبھیر مسئلے کی طرف کرائی...... جمال شاہ بولے ان حالات میں ریحان عالم کی طرف سے تو کوئی خبر آنے سے رہی...... ہمیں وہاں جا کر بات کرنی ہوگی...... امی بولیں اب سلطان عالم کی حویلی کی طرف رخ کرنے کا خیال بھی دل سے نکال دو...... اس تعلق کو یہاں ہی ختم کرو...... اتنے بڑے حادثے کے بعد ہم کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے...... جمال شاہ نے گھبرا کر پوچھا کیسا خطرہ امی۔ تمہیں خطروں کا احساس ہی نہیں ہے۔ خورشید عالم کو لوگ دیوانہ اور پاگل کہتے ہیں۔ خاندان میں ایک پاگل ہو جائے تو سارا خاندان لوگوں کی نظر میں پاگل ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہم دیدہ و دانستہ اپنی بیٹی کو پاگلوں کے حوالے ہرگز نہیں کریں گے۔ اس پاگل خانے میں رہ کر وہ بھی پاگل ہو جائے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد جمال شاہ بولے یعنی یہ کہ آپ بڑے بھائی کے جرم کی سزا چھوٹے بھائی کو دینا چاہتی ہیں۔ امی بولیں نہ ہم کسی کو مجرم کہتے ہیں اور نا ہی کسی کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ ہم صرف اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں۔ کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے...... امی آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارا یقین کریں۔ ریحان عالم نہایت اچھے شخص ہیں۔ اور پھوپھو جانی کی تو بات سب سے الگ ہے۔ دو باتیں کرنے کے بعد ہی اپنی سی لگتی ہیں...... آپ کی بیٹی راج کرے گی وہاں۔ ہمارے معاشرے میں ایک بار منگنی ٹوٹ جائے پھر اتنے بڑے داغ کے ساتھ کوئی لڑکی کو قبول نہیں کرتا۔ امی بپھر کے بولی ابھی تو صرف بات ہوئی ہے۔ منگنی کی رسم نہیں ہوئی...... امی ہم نے انہیں زبان دی ہے اور ہم زبان نہیں پلٹ سکتے...... امی بولیں جمال ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ لڑکوں کی کمی نہیں۔ اب خاندان میں مشکل ہوگا لیکن تمہاری یونیورسٹی میں ایک سے ایک بڑے خاندان کا لڑکا ہوگا۔
جمال کو غصہ تو بہت آ رہا تھا پھر بھی ہنس کر بولے یونیورسٹی دولہے خرید و فروخت کرنے کا بازار نہیں۔ امی ہماری بات پر بھروسہ کیجئے...... خورشید عالم ہمارے محبوب ترین دوست تھے۔ لوگ ہماری دوستی کی مثال دیتے تھے۔ دوستی کی بنیادیں یقین پر ہوتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے اگر وہ جانتے ہوتے کہ فردوس ہماری منگیتر ہیں وہ خود کو تباہ کر لیتے مگر ہماری حسرتوں کا خون ہرگز نہ ہونے دیتے۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم سے زیادہ انہیں کون جانتا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی لڑکی سے آگے بڑھ کر بات تک نہ کی تھی۔ کسی لڑکی کو کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے فردوس کو کبھی نہ دیکھا اور نا ہی ان سے کبھی ملے تھے۔ خدا ہی جانے پھر کب اور کیسے فردوس کو چاہنے

لگے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا عشق کا بھوت ان کے سر پر کیسے سوار ہو گیا۔

برا وقت بتا کر نہیں آتا...... جب آتا ہے تو انسان اس برے وقت کے چکر سے کسی طرح باہر نہیں نکل پاتا۔ عقلمند سے عقلمند انسان اپنے ہوش وحواس گنوا بیٹھتا ہے اور برباد ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا تھا کہ فردوس ہماری منگیتر تھیں انہوں نے ہمیں فون کیا تھا۔ بے انتہا غمگین اور شرمندہ تھے۔ زار زار ہو رہے تھے۔ معافی مانگ رہے تھے۔ پاگل آدمی معافی نہیں مانگتا۔ کوئی مجرم اپنے آپ کو مجرم نہیں کہتا۔ انہوں نے خود تسلیم کر لیا تھا کہ وہ فردوس کی موت کے ذمہ دار ہیں جبکہ انہوں نے اس کو کوئی جسمانی اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ احساس حدف ملامت اور ندامت نے انہیں لیر لیر کر دیا تھا۔ دنیا انہیں پاگل کہے، ہم نہیں کہہ سکتے۔ امی بس موت کے آنے کا کچھ بہانا تو ہوتا ہی ہے۔ خورشید عالم اور فردوس کو ایسے ہی جانا تھا۔ دو دوست جو دل کے اتنے قریب ہوں ان کی جدائی...... اور وہ بھی ایسی اذیت ناک...... دونوں کو کھو دینے کا درد ایسا ہے کہ سہنا مشکل ہو رہا ہے...... مگر قسمتوں کی تعمیل ہونا تو ضرور تھا...... سو جو تقدیر میں لکھا تھا ہو گیا...... جمال شاہ آگے کچھ نہ بول سکے اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

سکندر شاہ جو ابھی تک خاموشی سے سب سن رہے تھے۔ بولے ہم جانتے ہے جمال شاہ کبھی کسی کی تعریف یوں ہی نہیں کرتے۔ آپ نے دیکھا تھا بیگم رشتہ ٹوٹنے پر جمال کی کیا حالت ہوئی تھی۔ مرد ہیں سنبھل جائیں گے۔ مگر آپ کی بیٹی...... یہ غم برداشت نہیں کر پائے گی...... اپنی بیٹی سے تو معلوم کریں۔ کہیں آپ منگنی توڑ دیں اور وہ غم کی کثرت سے تباہ ہو جائے۔ شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتا۔ تھوڑا سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ریحان کے دل ودماغ پر بھی بھائی کی عزت لٹ جانے کا بھاری بوجھ ہوگا۔ اس وقت انہیں محبت اور خلوص کی ضرورت ہے۔ جمال شاہ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ جمال شاہ کا وہاں جانا ضروری ہے۔ وہ خورشید عالم کے دوست تھے۔ ایسے برے وقت میں ہی تو سچے دوست کام آتے ہیں۔

یہ سوچ کر کہ ناشتہ ماہ بانو کے ساتھ کریں گے جمال شاہ بہن کے کمرے کی طرف چلے گئے...... انہوں نے دستک دی۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ اندر گئے...... بہن کو پلنگ پر بے سدھ پڑا دیکھ کر ہوش اڑ گئے...... فوراً ڈاکٹر کو بلایا...... دیکھا ماہ بانو کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں...... چہرہ زرد پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر بتایا بلڈ پریشر گر جانے کی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی ہے۔ یہ حالت کھانا نا کھانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے آئی۔ وی۔ سیلائن saline شروع کیا۔ انہیں کڑی نگاہ داشت کی ضرورت ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جمال شاہ یہ سن کر ڈر گئے۔

انجم سے بولے تمہاری آپی کی یہ حالت ہو گئی اور تمہیں خبر نہیں۔ بھرے پُرے گھر میں کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ انجم بھائی جان سے بولی، آپی دن بھر روتی ہیں۔ نہ کھاتی ہیں نہ سوتی ہیں۔ آپی نے کہا تھا اگر ہم نے امی سے کچھ کہا تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ہم ڈر گئے...... وہ فکرمند لہجے میں بولے...... اپنے چپ رہنے کا انجام دیکھ رہی ہو۔ اب ہمیں بتاؤ کیوں روتی ہیں تمہاری آپی...... انجم دھیمی آواز میں بولی۔ بہت خوفزدہ ہیں...... کہہ رہی تھیں خورشید عالم بھائی کی موت کے بعد دونوں خاندانوں میں تعلقات کی ساری کڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اگر ہمارا رشتہ ٹوٹا تو ہماری ڈولی کسی اور کی دہلیز پر ہرگز نہیں جائے گی۔ ہماری لاش اس دہلیز سے جائے گی۔ وہ بولے اتنا سب کچھ ہو گیا

اور تم نے نا امی کو بتایا اور نا ہی ہم سے آ کر کچھ کہا...... بدھولڑ کی...... یہ تو خیر ہوئی کہ آج ہم آ گئے ورنہ......

خطرے کے احساس سے ان کے بدن میں عجیب طرح کی سنسنی سی پھیل گئی تھی۔امی کے پاس جا کر روہانسے ہو کر بولے، امی ہم ایک اور بھاری غم برداشت نہیں کر پائیں گے۔ایک بار پھر ہمیں حویلی کے اوپر مصیبت کے بادل منڈلاتے نظر آ رہے ہیں۔امی گھبرا ئیں...... جمال بیٹے ہماری سانس رک جائے گی۔جلدی بولو کیا ہوا ہے۔ہمارا دل بیٹھا جا رہا ہے۔امی ہم ٹھیک وقت پر بانو کے کمرے میں نہ پہنچ جاتے تو نہ جانے آج کیا ہوتا۔ہمارے غم نے سبھوں کو رنجور کر دیا لیکن ایک لڑکی کی گھٹن کو کوئی نہ سمجھ سکا۔بانو کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی......وہ اکیلی اپنے دکھوں کو جھیلتی رہی۔امی اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو آپ کی بیٹی بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔کوئی اسے سمیٹ نہ پائے گا......ڈاکٹر آ گئی ہیں...... علاج شروع ہو گیا ہے۔ہم وہی جا رہے ہیں۔آپ آرام سے تیار ہو کر آئیں......

بانو کی حالت تھوڑی سدھری تھی جب جمال شاہ واپس آئے تھے۔وہ بہن کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے...... اپنے بھائی جان پر بھی بھروسہ نہیں رہا...... ہم محبت کے محافظ ہیں۔یہ خزانہ ہم کھو نہیں سکتے۔خورشید نہیں رہے۔رشتے تو باقی ہیں۔بہن سے بڑے رازدارانہ طریقے سے بولے۔ہماری گڑیا سی بہن دلہن بنے گی......اسی وقت روتی بلکتی امی کمرے میں داخل ہوئیں۔امی سے بولے......اللہ کا شکر ادا کریں کہ بانو اب ٹھیک ہیں...... کچھ دیر کے لئے ہم بھی ڈر گئے تھے......وہ بانو کو دیکھ کر مسکرائے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔سلطان عالم کی حویلی پر عجیب دہشت ناک سناٹا چھایا دیکھ کر جمال شاہ سہم گئے۔حویلی کے در و دیوار پر چھایا ہولناکی کا ماحول دیکھ کر وہ اپنے آنسو نہ روک سکے۔انہیں دیکھتے ہی ریحان عالم کے حواسوں پر بجلی گر گئی۔چہرے پر خوف طاری ہو گیا اور وحشت زدہ نظروں سے جمال شاہ کو دیکھ کر جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔جمال شاہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ بھی آہستہ سے آگے بڑھے۔جمال شاہ نے حسب عادت انہیں سینے سے لگایا تو ریحان عالم کی جان کو ذرا تسلی ملی۔خوف دور ہوا تو سینے میں دبا غم آنسو بن کر بہہ نکلا......دھیرے سے سوال کیا...... بھائی جان کیا آپ ہم سے ناراض تھے۔آئے کیوں نہیں......تم سے بھلا ہم کیسے ناراض ہو سکتے ہیں۔وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن پھوپھو کو آتا دیکھ ان کی سمت بڑھے۔پھوپھو وہیں صوفے پر بیٹھ کر بلک پڑیں۔ڈھیر سارے آنسو بہانے کے بعد بولیں۔کئی بار سوچا کہ کم سے کم فون پر ہی سہی تم سے معافی مانگ کر اپنے دل کا بوجھ کچھ تو ہلکا کر لیں۔مگر ہمت ہی نہیں ہوئی۔جمال نہایت شرمندگی اور افسوس بھرے لہجے میں بولے۔آپ ہماری بزرگ ہیں ایسا کہہ کر آپ ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں۔غلطی تو ہم سے ہوئی ہے۔ہمیں یہاں آنا چاہئے تھا۔ہم بھی مصیبتوں میں گھرے تھے۔دل رنج و غم سے معمور تھا...... جمال کی آواز میں بے انتہا کرب اور درد تھا۔

چچا جان کی بے وقت وفات کا ہمیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔یہ سوچ کر نہیں آئے کہ ہمارے یہاں آنے سے خورشید کی پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا۔پہلے فردوس کی موت اور پھر خورشید کا جانا......دونوں اس قدر تکلیف دہ انداز میں گئے کہ ہمیں برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔خورشید نے ہمیں فون پر سب کچھ بتا دیا تھا......اتنی محبت کرنے والے لوگ اپنا پیار بھی اپنے ساتھ ہی کیوں نہیں لے جاتے۔پھوپھو بڑی آزردگی سے بولیں۔ان کے ڈوبنے کے آثار ہمیں صاف نظر آ رہے تھے۔کیا معلوم تھا اپنے ساتھ اتنے لوگوں کو لے ڈوبے گے۔

ہمارے غموں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہمیں شدید ندامت ہے کہ خورشید عالم کے ہاتھوں تمہیں بے انتہا اذیت اور دکھ ملا۔ ہو سکے تو انہیں معاف کر دینا...... تم تو خورشید عالم کو ہم سے زیادہ جانتے ہو...... انہوں نے کبھی کوئی غلطی کی ہی نہیں تھی۔ یہ ایک دم ہی دماغ کیسے پلٹا۔ عشق کا بھوت ان کے سر پر کیسے سوار ہو گیا۔ اس سے زیادہ اذیت ناک بات ہمارے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ بیٹے کی زندگی ہمارے دوسرے بیٹے کے ہاتھوں اجڑ گئی۔ تمہیں اپنا بیٹا ہی سمجھا ہے۔ غم تو یہ ہے کہ ہم کچھ کر نہ سکے۔ بڑے بڑے دکھ ہمیں شکست نہ دے سکے۔ مگر جس پر ہمیں ناز تھا اس نے اپنی حرکتوں سے ہمیں ہلاک کر ڈالا...... جمال شاہ...... بھائی جان اور خورشید عالم کی جدائی...... فردوس کی موت اور تمہاری بربادی کا دکھ...... ان بربادیوں کا جتنا بھی سوگ منائیں کم ہے۔ اتنے دکھ خدا نے ہماری جھولی میں ایک ساتھ کیوں ڈال دیئے۔

پھوپھو کی آنکھوں میں اداسی ویرانی اور نا امیدی دیکھ کر جمال شاہ بولے...... پھوپھو جانی خورشید ہمارے سب سے زیادہ عزیز دوست تھے...... ہمیں قوی یقین ہے اگر انہیں ذرا سی بھنک بھی پڑ جاتی کہ فردوس ہماری منگیتر ہیں وہ خود کو مٹا ڈالتے ہمیں تکلیف نہ ہونے دیتے۔ ان کے لئے ہم اب بھی یہی کہیں گے کہ ساری عمر ریاض کرنے کے بعد بھی انسان ان جیسا نہیں بن سکتا۔ وہ فرشتہ نہیں تھے...... تھے تو آخر انسان ہی اور انسان ہی غلطیاں کرتے ہیں۔ آپ صرف یہ سوچ کر تسلی کر لیں کہ مصیبتوں کا ایک سیلاب آیا تھا جو سب کچھ تہس نہس کر گیا۔ پھوپھو بولیں دوستی کا پردہ ڈال کر تم خورشید کے گناہوں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ جمال شاہ بولے...... ماضی کو بھلانا ہی بہتر ہے۔ یہ کہتے کہتے جمال شاہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ پھوپھو نے دیکھا اور بولیں...... کیا تم بھلا پاؤ گے۔ یادیں نہ ہوں تو آنکھوں میں یوں پانی نہیں اترتا......

ہم نے ہمیشہ تمہیں اپنے خاندان کا ہی ممبر سمجھا۔ اس دفعہ بڑا لمبا انتظار کروایا...... تم نے...... یقین تو ہمیں تھا کہ ایک نہ ایک دن آؤ گے ضرور۔ ہمیں آج یوں لگ رہا ہے جیسے طوفان میں کنارا مل گیا ہو...... فردوس کی موت کے دن سے لے کر آج تک ہم اس جان لیوا دکھ سے نکل نہیں پائے۔ خورشید اپنے جرموں کا انتقام خود اپنے آپ سے لیتے رہے۔ تمہارا نام سنتے ہی عجیب سی وحشت ان پر چھا جاتی۔ گھنٹوں خاموش بیٹھے آنسو بہاتے رہتے تھے۔ تمہاری ذرا سی تکلیف گوارا نہ کر پاتے تھے۔ تمہیں یوں تباہ کر کے وہ کس طرح زندہ رہ سکتے تھے۔ جب حد سے زیادہ بیقراری اور اداسی ان پر چھا گئی تو ہم نے ڈاکٹر بلایا۔ ڈاکٹر نے کہا کوئی گہرا صدمہ ہے جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کے اندر زندگی کی چاہت مرتی گئی۔ مرنے کی آرزو کرنے لگے تھے۔ موت کی چاپ ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ ہم کچھ کر نہ سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب ختم ہو گیا...... اب ہم بہت تھک گئے ہیں۔ نا جانے کب زندگی کا سفر تمام ہو جائے...... جمال شاہ نے پھوپھو کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا آپ جیسے لوگ جو اپنی زندگی کی ہر گھڑی دوسروں کے نام لکھ دیتے ہیں۔ اپنا دکھ بھول کر دوسروں کو خوشیاں دیتے ہیں کبھی نہیں تھکتے۔ سب کچھ کبھی ختم نہیں ہوتا...... ایک انسان چلا جاتا ہے۔ اس کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہم نے اور خورشید نے مل کر عہد کیا تھا کہ ہماری دوستی سدا قائم رہے گی۔ اس دوستی کو رشتے کے بندھن میں باندھنے کا فیصلہ بھی کیا تھا...... خورشید عالم نہیں رہے۔ رشتے تو باقی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی خواہش تھی ریحان عالم کی شادی ہماری چھوٹی بہن ماہ بانو سے

کرائی جائے۔اور ہم آج بھی یہی چاہتے ہیں۔ ہمارے رشتے کبھی نہیں ٹوٹیں گے۔۔

پھوپھو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا......خورشید نے ہم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ پھر خود ہی بولیں وہ کیا ذکر کرتے انہیں تو اپنا ہی ہوش نہ رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ریحان کو تم جیسا بڑا بھائی ہے۔اس کے سر پر سدا تمہارا سایہ رہے گا......اس کو تمہارے پیار۔ توجہ اور قربت کی ضرورت ہے۔ ماہ بانو کو ہم اپنی بیٹی بنا کر لائیں گے۔ریحان عالم ہماری سنتے ہی نہیں تھے۔تم نے ہماری اجڑی حویلی سجادی۔

ریحان کے چہرے کا بدلتا رنگ بتا رہا تھا خیالوں کی محفل سج گئی ہے۔آنکھوں میں خوشیاں چمک رہی تھیں۔۔حویلی کا ماحول پل بھر میں بدل گیا تھا......خوشی سے پھوپھو کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

پھوپھو جانی ہم کوئی بھی اچھا کام کل پر نہیں چھوڑتے۔بارات آج ہی جائے گی......ہمارے ساتھ......اور حویلی میں دھوم مچ گئی تھی...... جانے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئی تھیں......

جمال شاہ کی حویلی میں بڑا جشن منایا جا رہا تھا......بہت دنوں کے بعد خوشیوں کا ایک سیلاب امڈ رہا تھا۔فردوس یہی تو تمہاری آخری خواہش تھی کہ چاروں قبیلے کے لوگوں میں میل محبت ہو......ہم نے سب کو محبت کے ریشمی دھاگوں سے ایسا باندھ دیا ہے کہ اب کبھی ایک دوسرے سے کوئی جدا نہ ہونگے۔ محبت کی شمع جو ہم نے جلائی ہے، کبھی بجھ نہ پائے گی۔

☆☆☆

جو بویا سو کاٹا

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔اپنی دھن کی پکی ...... بھلا امریکہ سے بھی کوئی واپس لوٹتا ہے۔وہ لوٹ آئی تھی......وہ بھی اچانک......آتے ہی میری گود میں سر رکھ کر بولی......اماں میں تو بس یہ جانتی ہوں۔سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا......وہاں کی مٹی میں محبت کی وہ مہک نہیں جو ہماری مٹی میں ہے......وہی خوشبو مجھے واپس کھینچ لائی۔پڑھائی ختم ہوتے ہی میں بھاگی......واپس اپنے گھر......میں نے کہا......تمہارے بناء گھر بہت سونا ہو گیا تھا......اب مجھے تمہاری شادی کی بھی فکر ہے......نہیں اماں وہ فوراً بولی...... پہلے نوکری پھر شادی......آج کل کے مردوں کا بھروسہ نہیں نہ جانے کب دغا دے جائیں......

کون نہیں جانتا یہ دنیا مقام فنا ہے۔جائے عبرت ہے۔یہ بھی سب جانتے ہیں کہ نہ ہم دنیا میں کچھ لائے ہیں اور نہ کچھ اس میں سے لے جاسکتے ہیں۔پھر بھی ہر انسان کے دل میں دولت کی چاہ ہے۔یہ چاہت جب ہوس بن کر انسان کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے تو وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر دولت بٹورنے میں جٹ جاتا ہے۔کبھی کبھی انسان اپنے اس عمل میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔دولت تو ہاتھ لگ جاتی ہے مگر دل کا قرار و سکون جاتا رہتا ہے۔ہر وقت سود و زیاں کا حساب کتاب کرنے والا اکثر انجانے میں خسارے کا سودا کر بیٹھتا ہے۔کچھ نادان تو ایسے ہیں کہ اپنی اولاد کی زندگی بھر کی خوشیوں تک کا سودا کر بیٹھتے ہیں......سب کچھ اپنی اس ہوس کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔پھر پچھتاوے سے کیا ہووے ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......نہ دولت ملی نہ خوشیاں۔ملے تو صرف آنسو اور زندگی بھر کی رسوائی۔

سب کچھ دیکھتے بھالتے۔سوچتے سمجھتے ہوئے بھی انسان اپنی فطرت سے باز نہیں آتا۔دولت کے پیچھے دوڑتا جاتا ہے۔بھاگتا جاتا ہے......جب تک تھک کر خود منھ کے بل گر نہیں جاتا......بس ایسی ہی حرماں نصیب عورت تھی ہیراوتی۔جس نے آنکھیں تو ایک غریب خاندان میں کھولیں پر اس کی آنکھوں نے بچپن سے ہی سپنا۔موٹر۔فلیٹ،اور روپیوں کے ڈھیر کا دیکھا۔من ہی من میں سوچ کر خوش ہوتی اگر ایسا ہو جائے تو پھر نا کوئی بھی غم ہوگا ناں دکھ......بس خوشیاں ہی خوشیاں ہونگی۔

بڑی ہوئی تو آنکھوں میں انوکھے سپنے سجائے اپنے شوہر کے دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچا دی گئی۔خدا نے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں سے نوازا......درگا اس کی بچپن کی سہیلی تھی جو شادی کے پانچ سال کے بعد بھی ماں نہ بن پائی تھی۔جب برسوں بعد دونوں ملی تو درگا نے کہا اچھے بھاگ ہیں تیرے۔بیٹا ہے دو بیٹیاں ہیں......مجھ بدنصیب کو دیکھ حویلی ہے......دولت ہے پھر بھی دل خالی ہے......بھلا اولاد سے بڑھ کر بھی کوئی دولت ہو سکتی ہے۔ہیراوتی کا دل مطمئن ہو گیا پر سپنوں کی ڈور نہ ٹوٹی......

سچ ہے ذہانت وراثت میں نہیں ملتی۔ہیراوتی اور مکیش بابو دونوں ہی پڑھے لکھے نہ تھے مگر ان کی پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ساگر کو بچپن ہی سے کتاب اور قلم سے بیحد انسیت تھی۔اسکول گیا تو

سارے بچوں پر سبقت لے گیا۔ حد درجہ ذہانت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی میں کچھ اس کی قسمت کا بھی دخل تھا۔ اسکول میں وظیفے ملے۔ اور یہ سلسلہ کالج تک جاری رہا...... انجینئرنگ پاس کی اور پھر ایم۔ بی۔ ایم کی ڈگری ملتے ہی ساگر کی قسمت کے دریچے کھل گئے۔ ماں نے ملک سے باہر جانے سے روک لگا دی۔ ساگر ہی کب ہندوستان کی سرحدیں پار کرنا چاہتا تھا۔ اسے بھی تو یہاں کسی کا انتظار تھا۔

بڑی کٹھن ڈگر پار کر کے جب ہیراوتی نے تین بیڈروم کے خوبصورت اور کشادہ فلیٹ میں قدم رکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے بڑے فلیٹ کو کیسے سجائیں۔ کیسے سنواریں...... ان کے پاس فرنیچر وغیرہ کوئی خاص تھا ہی نہیں۔ کبھی کرسی ادھر رکھتی تو کبھی میز ادھر کھسکاتیں۔ وہ بیحد خوش تھیں۔ برسوں پہلے دیکھے سپنے جو پورے ہو رہے تھے۔ کمپنی سے بیٹے کو موٹر اور فلیٹ تو مل ہی گیا تھا۔ بس اب روپیوں کا ڈھیر اور پانا تھا۔ انہوں نے سوچا وہ بھی حاصل کر کے ہی دم لوں گی اور لگ گئیں منصوبے باندھنے۔

اس دن مکیش بابو اور ہیراوتی دونوں ہی کام میں مصروف رہے۔ ڈنر کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ بیٹے کی پہلی تنخواہ آتے ہی سب کے لئے نئے کپڑے خریدے گئے تھے۔ وہی کپڑے زیب تن کئے سب ساگر کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ساگر نے آتے ہی اپنی چھوٹی بہن شیلا سے کہا۔ اب آئندہ میں اپنی پیاری بہن کو کبھی کوئی دکھ نہیں ہونے دوں گا...... ہیراوتی کو کچھ زیادہ ہی بولنے کی عادت تھی...... فوراً ہی بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی...... بھول نہ جانا اپنا وعدہ...... اور یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہارے پتا جی فیکٹری کے ایک معمولی سے ملازم تھے۔ ان کے آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ وہ اوورٹائم کر کر کے وقت سے پہلے ہی بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ہماری ساری امیدیں تم سے وابستہ تھیں سو ہم نے تمہاری ہر ضرورت پوری کی۔ جو ہاتھ آیا سب تم پر لٹا دیا۔

پیسے کی کمی کی وجہ سے تمہاری بہن شاردا کی شادی مجبوراً مجھے اپنے دور پرے کے رشتے داروں میں کرنی پڑی۔ میری بدنصیب بیٹی آج تک غریبی کی چکی میں پس رہی ہے۔ اب شیلا کی شادی کی پوری ذمہ داری تمہارے سر ہے۔ ہمارے پاس تو اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ جو کمایا سب تمہارے اوپر صرف کر دیا۔ اب تم ہی ہماری آرزوؤں اور ارمانوں کے واحد مرکز ہو۔ اب آگے اس نیا کی پتوار تمہارے ہاتھوں...... مجھے یقین ہے تم اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھاؤ گے۔ آج کل کے لڑکوں کی طرح عین وقت پر مکر نہیں جاؤ گے۔

ہیراوتی کو ہر بات کو طول دینے کی بری عادت تھی...... ان کے سامنے تو مکیش بابو کو بھی زبان ہلانے کی جرأت نہ تھی تو بھلا بیٹا کیا چیز تھا...... وہ بڑی ہمت جٹا کر بولا...... اماں میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا...... یہ میرا وعدہ ہے...... مگر اس وقت پیٹ میں چوہے کبڈی کھیل رہے ہیں۔ پیچھے سے مکیش بابو بھی بولے...... ہاں بھئی اب کھانا ہو جائے...... نصیحتیں دینے کے لئے تو ساری زندگی پڑی ہے سو تم دیتی رہنا......

کھانے کے بعد شیلا اور ساگر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ان لوگوں کو پہلی بار رنگین ٹی وی میسر ہوئی تھی سو ہیراوتی اور مکیش بابو ٹی وی دیکھتے رہے اور اپنی خوش قسمتی کا جشن مناتے رہے۔

ساگر نے جب سے کلپنا کو پہلی بار کالج کے فنکشن میں دیکھا تھا تب سے ہی وہ اسے چاہنے لگا تھا

......کلپنا کے ساتھ ہوئی چند ملاقاتوں کو ہی ساگر نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا تھا۔ وہ تو کلپنا کی محبت میں بیگانہ ہو چکا تھا۔ مگر اس شدت کی چاہت کے باوجود وہ اپنی پسند کا اظہار نہیں کر سکا تھا...... کیسے کرتا...... وہ غریب باپ کا بیٹا تھا اور جانتا تھا کہ آج کل کی کاروباری دنیا میں کسی لڑکی کے پاس غریب لڑکے کے لئے وقت ہی نہیں ہے...... پہلے اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہوگا...... ادھر کلپنا کو بھی امریکہ جانے کی لگن تھی۔ اس کے پاس کسی کے بارے میں سوچنے کا قطعی وقت ہی نہ تھا۔

اب ساگر برسر روزگار تھا۔ اپنی ماں کے رویے سے وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی سب ماؤں کی طرح مفاد پرست ہے۔ جہاں معاوضہ کی امید نہ ہو وہاں وہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرے گی۔ ساگر سمجھدار تھا اس لئے ماں کی باتیں سن کر اپنے آپ کو فضول کے خیالات سے پریشاں نہیں کرتا تھا۔ اس نے بھی تہیہ کرلیا تھا ماں جو بھی کہے کرے گا وہ اپنے من کی......

دن گزرے۔ ماہ بیتے۔ اڑتے اڑتے خبر ساگر کے کانوں تک پہنچی کہ جسے وہ سالوں سے صرف اپنے خیالوں میں بلاتا رہا تھا۔ جس کے عکس ہر وقت اس کی آنکھوں میں ابھرتے تھے وہ لوٹ آئی ہے۔

کلپنا اپنے آفس سے نکلی۔ سامنے ہی ساگر سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا مخمور نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا...... کلپنا سے ملنے اور اس سے اپنے دل کی باتیں کرنے کے خوش کن احساس کے ساتھ وہ آگے بڑھا...... دل نے پیار کی سرگم چھیڑی تو زبان نے بھی ساتھ دیا۔ مسکرا کر سوال کیا...... کیسی ہو تم......

کلپنا نے بھی ہنس کر کہا...... ٹھیک ٹھاک...... بس ٹھیک ٹھاک...... ساگر کے لہجے میں افسردگی عود کر آئی ......وہ پھر ہنس پڑی...... ارے بھئی کیا آج میں کچھ الگ دکھائی دے رہی ہوں...... اب یوں نہ کہنا کہ میں امریکہ جا کر بدل گئی ہوں...... کیونکہ میں بدلنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں...... میں کل جیسی تھی آج بھی ویسی ہی ہوں اور سدا رہونگی...... وہ ہچکچاتے ہوئے بولا...... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا...... کہ...... کہ...... اتنے عرصے کے بعد مجھے سامنے پا کر تمہارے دل میں کوئی ہلچل برپا نہیں ہوئی...... کلپنا نے مسکرا کر کہا...... ہلچل...... مگر ہلچل کیوں...... پرانے دوست ملنے پر دل خوش ہوتا ہے...... ہلچل وہلچل کیوں ہوگی...... کلپنا نے حیرانی سے سوچا...... اس کو کیا ہوگیا...... اس نے سوال کیا...... ایک بات بتاؤ کیا تم اپنے سب دوستوں کے لئے ایسے ہی پریشان ہوتے ہو......

نہیں...... سب کے لئے نہیں...... صرف تمہارے لئے کیونکہ تم میری بہت خاص دوست ہو...... میں اور خاص...... وہ کیسے اور کیوں...... کلپنا نے ساگر کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور آگے بڑھی ہی تھی کہ ساگر بولا...... سنو...... وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا پر کہہ نہیں پا رہا تھا اور کلپنا کو گھر جانے کی جلدی تھی......

وہ پھر بولا...... ایک بات کہنا ہے...... وہ رک کر بولی جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد کہہ ڈالو...... مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے...... ساگر کے سارے جذبے جھاگ ہوگئے۔ بیزاری سے بولا...... تو تم جاؤ...... پھر کسی اور دن...... آج نہیں...... کلپنا نے کہا جو کچھ کہنا ہے آج ہی کہہ ڈالو۔ میں کوئی کام کل پر نہیں چھوڑتی...... وہ ہمت کر کے بولا...... یقین کروگی میری بات کا...... کہو تو اگر یقین کرنے کے قابل ہوگی تو ضرور یقین کرلونگی...... پر بات کیا

ہے۔تم مجھے ایک بات تو بتاؤ۔تم مجھے کیوں یاد آتی تھیں۔کون ہوتم میری جو مجھے اتنا ستاتی تھیں۔تم چلی گئیں ......یقین کرو میں اتنا زیادہ اداس ہو گیا......میرے اندر تنہائی اور افسردگی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔سچ تو یہ ہے جب سے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا اس دن سے ابھی تک مجھے اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔میں نے بڑی آس لئے تمہیں امریکہ خط بھیجا تھا پر جواب نہیں آیا......اگر آج تم یہاں نہ ملتیں تو شاید تاعمر میرا دل تمہاری تلاش میں بھٹکتا پھرتا......میرے انتظار کی کوئی معیاد ہی نہیں ہوتی بس خدا ہی جانتا ہے میں نے کس طرح یہ ڈھیر سارے دن گذارے ہیں۔تم ہی بتاؤ میں اس دل کو کیسے سمجھاؤں......یہ جو تمہیں یاد کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ سات سمندروں کا راستہ پار کر کے تم صرف میرے لئے ہی لوٹ آؤ گی۔

کلپنا حیرانی کے عالم میں گنگ کھڑی اس کی ہر بات سن رہی تھی۔......وہ بےخودی کے عالم میں بولتا ہی گیا اور اس نے اظہار دل کر ڈالا......کلپنا......بولی اب تو تم پورے ہوش وحواس میں ہو......تو میری بھی سن لو......میں امریکہ پڑھنے گئی تھی......میرے پاس فضول باتوں کے لئے سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔وہ واقعی ساگر کے جذبوں کی شدت سے ناواقف تھی اس ہی لئے تو بڑی لاپرواہی سے بولی......میرا اپنا خیال ہے افسردگی اور تنہائی کا احساس صرف وقتی ہوتا ہے۔انسان کی اپنی سوچ کے مطابق ......آہستہ آہستہ ہر انسان اس پر قابو پالیتا ہے......بس اب آگے کچھ نہ کہنا کیونکہ نا ہی میں نے شادی کے بارے میں سوچا ہے اور نا ہی کبھی تم کو اس نظر سے دیکھا ہے۔ہم صرف اچھے دوست ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ساگر نے اس کا چہرہ بغور دیکھا اور سوال کیا......اس کا مطلب تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں ہوا ......یقین کرو میری نظروں میں تو بس تم ہی تم سمائی ہو۔گذرے ہوئے ہر پل تمہیں یاد کیا...... ہر لمحے تمہاری واپسی کا انتظار کیا......کلپنا سوچنے لگی......کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ایک طرفہ محبت اور وہ بھی اتنی شدت سے......وہ بولی مجھے محبت کی کسی بات پر یقین نہیں......آگے محبت کا حوالہ نہ دینا......کیونکہ میں صرف اس شخص کو چاہوں گی جو زندگی کی دھوپ میں میرے لئے گھنا سایہ ہوگا۔

امریکہ میں رہ کر میں نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا......مرد اقرار محبت میں دیری نہیں کرتے۔لڑکی کی رضامندی کے بعد چٹ منگنی اور پٹ باہ رچا لیتے ہیں......شادی کے بعد ہی ساری محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ پھر باہمی تناؤ شروع ہو جاتا ہے۔اور تناؤ بھی ایسا کہ طلاق پر جا کر ختم ہوتا ہے۔کوئی شادی ٹکتی ہی نہیں......محبت کا افسانہ یوں ختم ہوتا ہے ٹریجیڈی میں۔

دونوں ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بلڈنگ سے باہر آ چکے تھے۔کلپنا نے بائے بائے کہا اور اپنی گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔

ہیراوتی کیا کیا سپنے دیکھ رہی تھیں......اور بیٹا اپنے ادھورے سپنوں کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرداں تھا......ساگر ذرا دیری سے گھر پہنچا تو ماں کے دل میں کھلبلی مچ گئی......ماں نے بیٹے کا مسکراتا چہرہ دیکھتے ہی سوال کیا......کیا بات ہے......ایسے خوش نظر آ رہے ہو جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو......وہ جھوٹ نہ بول سکا...... ہاں اماں آج میں واقعی بہت خوش ہوں......اماں گھبرا گئیں......اپنی خوشی کا راز ہمیں بھی تو بتاؤ......کیا تنخواہ میں اضافہ ہو گیا......یا

پھر......ساگر نے بڑی بیزاری سے کہا......اماں آپ ہر وقت خزانے اور روپیوں کے سپنے دیکھنا چھوڑ دیں ......کیونکہ دولت سے خوشیاں نہیں خریدی جاتیں......خوش ہونے کے لئے اور بھی سبب ہو سکتے ہیں۔ ماں کا غصہ تو ناک پر بیٹھا رہتا تھا فوراً بھڑک اٹھیں......بڑی جلدی بھول گئے اپنی مفلسی کی داستان......تم کیا جانو دولت کیا شے ہے۔ جب دولت ہاتھ لگے گی تب اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا......ساگر کو اماں کی باتیں ازحد ناگوار گذریں......بولا......بس کریں اماں......میرے لئے میری محنت کی کمائی ہی دولت ہے کیونکہ محنت کی کمائی میں برکت ہوتی ہے۔ دولت پانے کی خواہش ہی انسان سے نا جانے کیا کچھ کروا دیتی ہے......ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ کافی ہے......ساگر اٹھ کر جانے لگا تو اسے روک کر بولیں......آج کچھ لوگ آئے تھے......رشتہ لے کر......آپ انکار کر دیں......کیونکہ ابھی میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے......ماں دھک سے رہ گئیں......جس فرمانبردار بیٹے پر انہیں اٹوٹ اعتماد اور بھروسہ تھا آج وہ پہلی بار ان کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرات کر رہا تھا......ان کی نظروں سے نظریں ملا کر اپنا حتمی فیصلہ سنا رہا تھا۔ ماں کی ٹٹولتی نظریں بیٹے کو جانچنے لگیں......کیا یہ بہک گیا ہے......وہ غصہ میں بلبلا کر بولیں......تمہارا کیا ارادہ ہے اور کیا نہیں میں نہیں جاننا چاہتی......اس گھر میں آج تک ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوگا......تم اس گھر کے قانون بدلنے کی کوشش بھی نہ کرنا......تم نے مجھے زبان دی ہے......مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے مایوس نہیں کرو گے......ساگر بری طرح گھبرا گیا ......بولا......اماں نہیں کروں گا......کبھی نہیں کروں......لیکن آپ جہیز لینے کا خیال دل سے نکال دیں......اپنے بچوں کی قیمت لگانا چھوڑ دیں......مکیش بابو کی آواز آئی......بہت رات ہوگئی ہے۔ ساگر تم سونے جاؤ۔ باقی باتیں کل کر لینا......اماں نے بھی بحث سمیٹنے ہی میں عافیت سمجھی تو چپ ہو کر اندر چل پڑیں......

مکیش بابو نے ٹی وی بند کی اور ہیراوتی سے بولے......آج تک میں نے گھریلو معاملات میں دخل اندازی نہیں کی۔ تم نے جو چاہا سو کیا......لیکن میرے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ کرتے سے کوئی ایسی احمقانہ حرکت نہ کرنا جو اس کی بربادی کا باعث بن جائے......ہیراوتی کا پارہ تو یوں بھی ہائی تھا......کرخت لہجے میں بولیں......بیٹے کی اتنی فکر......کبھی یہ بھی سوچا شیلا کی شادی کیسے ہوگی......تم چاہتے ہو کہ میں شیلا کو بھی جہنم میں جھونک دوں......مکیش بابو نے حیرت بھری نظریں بیوی پر ڈالیں......بڑے گھمبیر لہجے میں بولے......وہ لوگ تمہارے رشتے دار ہیں کوئی غیر تو نہیں......نہ معلوم تمہیں شاردا کے سسرال والوں سے کون سا بیر ہو گیا ہے......کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری مالی حالت ان سے ذرا بہتر ہوگئی ہے تو تم سارے رشتے داروں کو نیچی نگاہ سے دیکھنے لگی ہو......تم نے اپنے مزاج سے بہتوں کے دلوں کو چوٹ پہنچائی ہے......دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اگر تمہاری باتیں ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئیں تو جانتی ہو شاردا کا کیا حشر ہوگا......وہ اس جہنم سے یہاں منتقل کر دی جائے گی......اور پھر شاردا کے لئے باپ کا گھر جہنم سے بھی بدتر ہو جائے گا......آئندہ بات سوچ سمجھ کر کرنا......شاردا اپنے گھر سکھی ہے......یہ تمہارا وہم ہے کہ اس کی ساس لالچی اور جابر ہے۔ ہمارے دیس میں زیادہ تر لوگ غریبی میں زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ تم نے خود بے انتہا دشواریوں کا سامنا کیا ہے......میری مانو تم یہ چھوٹے سپنے دیکھنا چھوڑ دو ورنہ ہم سب تباہ و برباد ہو جائیں گے......

ہمارے یہاں دولہے فروخت ہوتے ہیں...... جتنا قابل لڑکا اتنا ہی زیادہ دام...... زیادہ اونچی اڑان نہ اڑو۔ ورنہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھودو گی...... ہیراوتی پورے یقین سے بولیں...... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی نہیں۔

ساگر کو آفس کے کام کے لئے شہر سے باہر جانا پڑا۔ وہ واپس لوٹا تو سیدھا کلپنا کی آفس میں پہنچا...... وہاں معلوم ہوا کہ کلپنا بینک کے کام سے سنگاپور گئی ہے۔ ساگر کا دل دن بھر مرجھایا مرجھایا رہا...... شام کو گھر پہنچتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کلپنا کا فون نمبر لگا کر دل بھر کر باتیں کیں...... پھر یہ تو اس کا روز کا معمول بن گیا...... وہ دیوانہ وار بولے جاتا اور کلپنا سنتی رہتی...... اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دے...... ادھر ساگر کلپنا سے صرف ایک لفظ سننے کا منتظر تھا۔ اس ایک لفظ پر ساگر کی زندگی بھر کی خوشیوں کا انحصار تھا۔ کلپنا نے اگر ہاں نہیں کی تھی تو اس نے انکار بھی تو نہیں کیا...... امید کی ڈور کا سرا ہاتھوں میں تھامے وہ اپنی سوچوں کے گرداب میں ڈوبا ہوا تھا...... اماں کی آواز اسے باہر کھینچ لائی......

لو دیکھو...... تم بھی دیکھ لو...... تمہاری شادی کے بعد ہی میں شیلا کی شادی کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔ تصویریں آگے بڑھاتے ہوئے اماں بولیں تھیں۔...... اماں آپ شیلا کی شادی کی بات پکی کر دیں۔ میری وجہ سے اس کی شادی روکنے کی ضرورت نہیں...... اماں سے اس نے کہا تو وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتی ہی رہ گئیں...... وہ بیٹے کی حرکتیں دیکھ کر سمجھ تو گئی تھیں کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور آج بیٹے کا دل کرید رہی تھی۔ وہ چیخیں...... یوں تو بڑے عقلمند بنتے ہو اتنی ذرا سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ تمہاری شادی پہلے ہونا ضروری ہے...... جو جہیز کی رقم میں تمہاری شادی پر وصول کرونگی اس سے ہی تو شیلا کی شادی کر پاؤنگی......

ماں کی یہ بات ساگر کی برداشت کے بعید تھی...... وہ جھنجھلا کر بولا...... آپ کی ہر بات پیسے سے شروع ہوتی ہے اور پیسے پر ختم ہوتی ہے۔ اب تو آپ پیسے کی فکر کرنا چھوڑ دیں...... میں ہوں اپنی بہن کی فکر کرنے کے لئے...... میں اپنی حیثیت کے مطابق شیلا کی شادی کروں گا...... ہم کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلائیں...... آپ صرف لڑکا تلاش کریں...... ہیراوتی دھیرے سے بولیں...... ایک اچھا لڑکا ہے میری نظر میں...... دبئی میں بزنس کرتا ہے۔ بمبئی میں اس کی کوٹھی ہے۔ اسے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس پانچ لاکھ کیش مانگتا ہے۔

بڑی کوٹھی...... ساگر نے حیرت زدہ لہجے میں کہا...... اماں ہمارے پاس گاؤں میں کچا مکان ہے۔ سر پر پکی چھت تک نہیں...... کل اگر نوکری نہ رہی تو یہ فلیٹ بھی نہیں رہے گا...... اور آپ کوٹھی والوں کے ساتھ ناتا جوڑنا چاہتی ہیں...... آپ شیلا کے لئے اپنے برابر والوں میں لڑکا کھوجیں...... جہاں وہ خوش رہ سکے...... جو انسان شادی سے پہلے ہاتھ پھیلائے اس کے اوپر اعتماد کرنا حماقت ہے...... اماں بولیں...... یہ لو...... اس میں حماقت کی کون سی بات ہے۔ جہیز کا لین دین تو آج کل فیشن بن گیا ہے۔ لوگ بڑے غرور سے جہیز میں ملی رقم کا ذکر کرتے ہیں...... ساگر سمجھ گیا ماں کو سمجھانا بے فائدہ ہے۔ اس میں اور سننے کا یارا نہ رہا...... زور سے بولا...... اماں نا ہم جہیز لیں گے اور نا ہی کسی کو دیں گے......

ائیر پورٹ پر ساگر کی منتظر اور بے تاب نظریں کلپنا کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ کلپنا کے دل میں بھی ایک عجیب

سی خوشی کا احساس امڈ آیا تھا...... وہ سوچنے لگی ایسا سچا اور نیک جیون ساتھی بڑے نصیب سے ملتا ہے ساگر کے ساتھ زندگی ہنستے مسکراتے گزر جائے گی...... آج تم واقعی بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔ ساگر کی آواز میں جوش تھا۔ امید تھی ......"وہ کیسے" کلپنا نے مسکرا کر سوال کیا...... وہ بولا چہرے سے زیادہ آنکھیں بولتی ہیں...... خیر چھوڑو...... ایک عرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ آواز محبت کی شدت سے بھرپور تھی...... جواب بھی تمہیں آج اور ابھی دینا ہوگا نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے تم میری زندگی ہو...... میری محبت قبول کرلو...... تمہارے بغیر میں......

اندرونی مسرت سے کلپنا کی آنکھوں میں ایک چمک سی پھیل گئی۔ وہ بولی اور آگے کچھ نہ کہنا...... میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو...... تب ہی ساگر نے سوال کیا...... تو کیا میں یہ سوچ لوں جس کی جستجو میں سالوں گزار دیئے اسے میں نے پالیا ہے۔ کلپنا کے دل میں بھی ساگر کے لئے والہانہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ بولی اگر دل گواہی دے تو یقین لازمی ہے...... ساگر ایک دم سنجیدہ ہوگیا...... جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو...... یہ میرا وعدہ ہے کہ اپنی آخری سانس تک تمہیں چاہونگا۔ تم میری بن کر دیکھو تو سہی۔ میں تمہیں اپنے دل میں بسالوں گا۔ اس کے لہجے سے صداقت اور یقین چھلک رہا تھا۔۔

زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے سمے دونوں ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کلپنا بولی مجھے سچے اور صاف دل لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ تم نے مجھے اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتادیا۔ ذات پات کے فرق کو میں اپنی معاشرت کا ایک ناسور سمجھتی ہوں...... دولت آنے جانے والی شے ہے۔ اس کی کمی ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ تم نے اپنی محبت اور پرخلوص جذبوں کا اظہار کیا تو مجھے تمہاری محبت کی صداقت پر یقین ہوگیا ...... یہی وہ قیمتی احساس ہے۔ جس کے بغیر کوئی انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ اب مجھے تمہاری طرف سے کسی قسم کی بدعہدی کا اندیشہ نہیں رہا۔ اسی پل دونوں اس وعدے کے بندھن میں بندھ گئے۔ دونوں نے زندگی کے نئے سفر پر ساتھ ساتھ چلنے کا عہد کیا......

ساگر کا خوشی کے احساس سے بھرا دل بے قابو ہو رہا تھا...... وہ اپنی خوشیاں اپنوں کے ساتھ شیر کرنا چاہتا تھا۔ گھر پہنچا تو سامنے شیلا مل گئی۔ اس نے شیلا سے کہا...... آج میں بہت خوش ہوں...... وہ آگئی ہے جس کا مجھے انتظار تھا...... جس کی خاطر میں اپنی شادی ٹال رہا تھا...... شیلا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا...... کون ہے وہ جو میرے بھیا کی نیندیں چرا کر لے گئی تھیں۔ ساگر ہنس کر بولا۔ اسکا نام کلپنا ہے...... وہ امریکہ سے لوٹ آئی ہے۔ اور اسی شہر میں ہے ایک لمبے انتظار کے بعد آج اس نے شادی کے لئے ہاں کردی ہے۔ شیلا خوش ہوکر بولی تو پھر جلدی سے شادی کر کے میری بھابھی کو گھر لے آئیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔

نہ جانے اماں کہاں سے برآمد ہوگئیں...... "مزہ تو میں چکھاتی ہوں تمہیں" آواز تھی کہ آگ...... ساگر نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جن کی بھوئیں تن چکی تھیں...... واہ رے میرے لعل...... جب ماں کے حقوق ادا کرنے کا وقت آیا تو عشق کر بیٹھا۔ میں نے سب سن لیا ہے۔ تو سپنے دیکھنا چھوڑ دے۔ شادی تیری وہیں ہوگی جہاں میں چاہونگی۔ ماں کی باتوں نے ساگر کے سارے احساس ہی زائل کر دئے۔ یہ بھی سچ ہے محبت نڈر ہوتی ہے۔ انسان کو تقویت بخشتی ہے۔ ساگر نے بھی ماں سے صاف صاف کہنے کی ٹھان لی...... بولا...... اماں میں نے

شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کہہ تو گیا پر خوف سے اس کی آواز میں لرزش اتر آئی۔ یہ سنسنی خیز خبر سن کر اماں کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ دہکتی آواز میں بولیں۔ جو لڑکی امریکہ میں رہ آئی ہے اس کا بھلا اس گھر میں کیسے نباہ ہوگا۔ کم سے کم میں تو اتنی اڈوانس اور ماڈرن لڑکی کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی...... ساگر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ٹھان لی تھی...... بولا...... امریکہ جا کر لوگ بدل تو نہیں جاتے۔ وہ اڈوانس ہونے کے باوجود بالکل مشرقی ہے۔ بالکل شیلا کی طرح...... اماں انسان کی پرکھ کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ جب آپ ساتھ رہو گی تب ہی تو سب معلوم ہوگا۔ میں اسے کالج کے زمانے سے جانتا ہوں۔ اس میں کوئی بری عادت نہیں۔ تمہاری دلی تمنا تھی کہ میری شادی بڑے گھرانے کی لڑکی سے ہو۔ سو تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوجائے گی...... وہ ایک بڑے افسر کی بیٹی ہے۔ اماں نے آنکھیں پٹ پٹائیں...... شاید سن کر دل کو تھوڑی تسلی ہوئی تھی کہ سرکاری افسروں کی اوپری انکم بے حساب ہوتی ہے۔ مگر اماں وہ اپنے اصولوں کے بیحد پکے ہیں۔ جس کرسی پر براجمان ہیں اگر چاہتے تو آج کروڑوں کے مالک ہوتے۔ لیکن انہوں نے صرف ایمانداری پر قناعت کی۔ رشوت خوری اور جہیز کے سخت خلاف ہیں۔ ماں کے چہرے کا رنگ ہی پھیکا پڑ گیا۔ من میں سوچا پھر یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔

اماں کلپنا فارن بینک میں کام کرتی ہے۔ مجھ سے دوگنا کماتی ہے۔ مجھے اس پر پورا یقین اور بھروسہ ہے۔ وہ ہماری ساری الجھنیں سلجھانے میں مدد کرے گی۔ ہیراوتی کو اپنے لاڈلے بیٹے سے یہ امید نہیں تھی۔...... شاید بھٹک گیا ہے...... آج اس بیٹے نے جوان کے ہر حکم پر اپنا سرخم کردیتا تھا ان کے اعتماد کی دھجیاں اڑادی تھیں۔...... اور وہ بھی محض ایک لڑکی کی خاطر...... ان کا جی چاہا بیٹے کے منہ پر زوردار طمانچے جڑ دیں...... غضب اور غصے میں احتجاج کیا...... ہم نے تیری تعلیم اور تربیت پر اپنی ساری صلاحیت اور توانائی لگادی۔ اپنی جوانی کا ایک ایک لمحہ قربان کردیا اور ہماری قربانیوں کا یہ صلہ دے رہا ہے...... ایک لڑکی کی محبت میں پڑ کر سب کچھ بھول گیا۔ اب تجھے ہماری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں رہی۔ وہ دکھ اور غصے کی شدت سے نڈھال ہوکر بولے ہی جارہی تھیں۔

ساگر نے ماں کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا...... اماں ایسا نہیں ہے کہ مجھے آپ کی پرواہ نہیں ہے مجھے معاف کردینا۔ شادی زندگی میں ایک بار ہی تو ہوتی ہے...... پھر کیوں نہ اپنی پسند کی ہو...... میں اچھی طرح اپنی اوقات سمجھتا ہوں...... ہماری اتنی اوقات کہاں جو کلپنا جیسے بڑے گھر کے دروازے پر دستک دیتے...... لوگ چار پشتوں کا حساب مانگتے ہیں...... سب کے خیالات کلپنا کی طرح نہیں ہیں...... کلپنا کے دل میں اونچ نیچ۔ ذات پات۔ امیری غریبی کا بھید بھاؤ قطعی نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی ہوتا تو مجھ سے شادی کرنے کے لئے ہرگز راضی نہ ہوتی۔ کلپنا کے ساتھ شادی صرف میرے لئے ہی نہیں پورے خاندان کے لئے اعزاز ہوگا......

اماں سمجھ گئیں آگے اور کچھ کہنا فضول تھا...... بڑے کرخت لہجے میں بولی تیری مرضی۔ جو چاہے سو کر...... لیکن میں اس لڑکی...... وہ بولتے بولتے رک گئی۔ مکیش بابو کی آواز پر اماں اندر چلی گئیں...... شیلا بیحد ڈر گئی تھی اور حواس باختہ سی کھڑی تھی...... بولی...... اب اماں کو کیسے منایا جائے...... ساگر بولا...... ماں کا ممتا سے بھرا دل کب تک اپنے بچوں سے ناراض رہ سکتا ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا...... لیکن اس نادان لڑکے کو یہ علم نہیں

تھا کہ کوئی ساس اپنی شکست قبول نہیں کر سکتی...... اور گھر کی چار دیواری کے اندر عورت ہی عورت پر ظلم و جبر کرتی ہے کیونکہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔

کلپنا شام کو اپنے گھر پہنچی تو اکیلی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا...... یہ کون ہے...... بولی یہ میرا چوکیدار ہے...... آفس میں پارٹی ہے میرا جانا ضروری ہے۔ میں جانتی ہوں تم مجھے اکیلی نہیں جانے دو گی...... ہم دونوں کا آفس ایک ہی بلڈنگ میں ہے...... پھر ساگر کی طرف دیکھ کر بولی...... تم میری اماں سے باتیں کرو...... اور خود اندر بھاگ گئی...... تیار ہو کر باہر آئی...... ساگر سے سوال کیا...... کیسی لگی میری اماں...... ہیں نا بہت پیاری...... اب اٹھو میں بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔ دونوں چلے گئے اور میں دیر تک ساگر کے بارے میں سوچتی رہی۔

کچھ دنوں بعد ہی کلپنا میرے پاس آ کر بیٹھی اور بڑی سنجیدگی سے بولی...... اماں آپ کو ساگر کیسا لگا...... میں ہڑ بڑا گئی...... کچھ تو تھا اس کے طرز تکلم میں جو مجھے بھایا نہیں تھا...... میں نے کہا...... کیوں کیا...... بات ہے...... پہلے آپ بتائیں...... اس کے بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں...... بس ٹھیک ہے...... اماں یہ تو میرے سوال کا جواب نہ ہوا...... ساگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے...... میں نے اس سے سوال کیا اور تم کیا چاہتی ہو...... وہ مجھ سے لپٹ کر بولی...... جو وہ چاہتا ہے...... میں نے فوراً کہا...... شادی کی اتنی جلدی بھی کیا ہے...... کچھ دن اس لڑکے کو دیکھ لو...... پہچان لو...... پھر سوچنا شادی کے بارے میں......

کلپنا کے پتا راجیش بابو سنتے ہی باہر آ کر بولے...... میں مانتا ہوں تم نے بھی دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ شاید ایک حس ہوتی ہے پہچان کی...... شاید وہ تم میں بھی نہیں ہے۔ مرد کی فطرت ہے کہ وہ بہت جلد اور بہت خوبصورتی سے اظہار محبت کرتا ہے۔ معصوم لڑکی کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ اس کی خامی اور برائی کو کھوج سکے...... وہ اپنی خامیوں پر بآسانی پردہ ڈال کر صرف اپنی خوبیاں ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور لڑکی کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں اس طرح قید کر لیتا ہے کہ پھر اس لڑکی کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی...... جب وہ ہوش میں آتی ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے...... تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کے بدلے اس نے زندگی بھر کا روگ مول لے لیا ہے۔

اس عہدے پر رہ کر میری زندگی آدمیوں کے درمیاں گزری ہے۔ قسم قسم کے مردوں سے سابقہ پڑا ہے میرا...... میں انسانوں کے چہرے پہچانتا ہوں...... ان کی آنکھوں میں کیا ہے پڑھ سکتا ہوں...... جو انسان آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے میں جھجکے وہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ مرد کو پہچاننے کی صلاحیت ابھی تم میں نہیں ہے۔ کلپنا کو اپنے والدین کی باتوں سے بہت دکھ تو ہوا تھا۔ لیکن اب واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو دل کی ایک ایک دھڑکن ساگر کے نام ہو چکی تھی۔

وہ دھیرے سے بولی...... اماں ایسا نہیں ہے کہ ساگر مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گیا یا مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ میں اسے پچھلے سات برسوں سے جانتی ہوں۔ کالج کے ہر فنکشن میں ہم لوگ ملتے تھے۔ اس وقت مجھے امریکہ جانے کی لگن تھی اور ساگر کو اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر...... اگر میرے دل میں اس کیلئے ذرا سا بھی نرم گوشہ ہوتا تو میں اس کے خط کا جواب ضرور دیتی۔ یہاں اس سے ملی تو معلوم ہوا کہ وہ اتنے سالوں سے میری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

آپ لوگ اس کے خاندان کے بارے میں جان کر خوش تو نہیں ہوں گے اس کے باپ نا صاحب

حیثیت ہیں اور نا صاحب جائداد۔ باپ فیکٹری میں میکینیک تھے۔ ان لوگوں نے خود مشکلات جھیلیں لیکن اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دی۔ زندگی ایک چھوٹے سے مکان میں گذار دی۔ اب ساگر کو کمپنی کا فلیٹ ملا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے۔ سب ساتھ رہتے ہیں۔

گھر میں سناٹا چھا گیا۔ بہت سوچ وفکر کے بعد راجیش بابو بولے۔ نہ اچھا خاندان ہے اور نا ہی خاندانی بنیادیں ہیں...... مانا ساگر پڑھا لکھا ہے لیکن اس کا خاندان...... کیا ہے...... رہنا تو تمہیں پورے خاندان کے ساتھ ہے بچے جس ماحول میں بڑے ہوتے ہیں اس ماحول کا اثر تا عمر رہ جاتا ہے...... اندر رچ بس جاتا ہے...... وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے خول سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اس چھینا جھپٹی کے دور میں کسی کی نیت صاف اور کون دھوکے باز کہا نہیں جاسکتا......

وعدے تو بہت لوگ کرتے ہیں...... پر وفا کوئی نہیں کرتا...... بیٹا یہ تو تم بھی جانتی ہوگی کہ تعلیم کی کمی جہالت کی نشانی ہے۔ تعلیم سے ہی کردار بنتا ہے اور کردار سے معیار زندگی...... میں ساگر کے والدین کے لئے سوچ رہا ہوں۔ میں نے پڑھے لکھے جاہل دیکھے ہیں لیکن انپڑھ جاہل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ جنگلی درندے کی طرح خوفناک۔ جب وہ بے قابو ہو جاتا ہے تو اپنے دشمن کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے جیسا میں سوچ رہا ہوں وہ ویسے نہ ہوں۔ بیٹا میں تمہارا باپ ہوں اور تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔ آگے تم سمجھدار ہو...... اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہو...... ہماری خوشی تم ہی ہو...... ہم تمہاری خوشیاں چاہتے ہیں...... اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو...... لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا اس دلدل میں خود کو نہ ڈھکیلو۔ اس کے آگے وہ بول نہ سکے۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور آواز بھاری۔

ماں نے اپنا کہا دہرایا...... صرف چھ ماہ کے لئے شادی ملتوی کردے...... ساگر نے نہ اپنی ماں کی سنی اور نا ہی کلپنا نے اپنے باپ کی نصیحتوں پر دھیان دیا...... آخر ہوا وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے...... اولاد کی خوشیوں کے سامنے والدین کو سر جھکانا ہی پڑا...... ہیراوتی کے سپنے بکھر گئے...... کلپنا کے والدین کا دن رات کا چین لٹ گیا......

ساگر کی ماں ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ ہر سانس پر نفع ونقصان رکھنے والی...... ان کے سارے حربے ناکام ہو چکے تھے...... انہوں نے من میں ٹھان لی کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ اس لڑکی سے گن گن کر لیں گی...... جلد از جلد کوئی ایسی ترکیب نکالیں گی جس سے یہ لڑکی گھر سے باہر ہوگی اور ان کی من پسند بہو اس گھر کے اندر......

کلپنا سسرال پہنچی تو اسے یہ گھر شادی گھر معلوم ہی نہیں پڑا...... دو چار ساگر کے دوستوں کے سوا اور کوئی مہمان نہیں تھا...... نہ روشنی...... نہ پھول...... نہ خوشبو...... فضا میں عجب سا تناؤ اور اداسی پھیلی ہوئی تھی...... ایسی خاموشی اور اداسی کہ کلپنا کا دل گھبرا اٹھا...... ماں کی آنکھوں سے نفرت اور حقارت ٹپک رہی تھی۔ بس شیلا خوش نظر آرہی تھی...... رات کافی بھیگ چکی تھی...... عجب خاموشی کا سماں تھا یہ شادی کا گھر...... یہاں تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سب سو چکے ہوں۔ نیا گھر...... رات کا گھور اندھیرا...... اس پر عجب قسم کے لوگ...... کلپنا کے اندر ایک ہولنا کی سی چھا گئی۔

جب ساگر آیا تو اس نے ایک گہری لمبی سانس لی...... اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا...... یوں لگا جیسے وہ کوئی بڑا مرحلہ حل کر کے آیا ہو...... کلپنا کے وجود کی تھکن اور بیزاری اس کے چہرے پر نمایاں تھی...... اس کی طرف دیکھ کر بولا...... کیوں کیا ہوا...... تھک گئی ہوں جناب...... آپ کا انتظار کچھ زیادہ ہی کرنا پڑا...... اس نے کہا تو...... وہ

بولا...... لو میں تمہیں بتا ہی دوں...... میری اماں کو ہر بات بڑھا کر بولنے کی عادت ہے سو ان کی پرواہ نہ کرنا...... آج وہ شیلا کی شادی کا ذکر لے بیٹھیں...... بس پھر کیا تھا...... بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں...... اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا...... کلپنا کو اندر ہی اندر ایک ٹھیس سی لگی تھی...... کہ ہماری شادی کی بنیاد ہی جھوٹ پر پڑی ...... اب آگے کیا ہوگا...... کلپنا نے کہا آج انہیں ہماری فکر کرنی بجا تھی۔ شیلا کی نہیں...... وہ بیچ میں ہی بول پڑا...... ماں ہیں۔ ڈرتی ہیں کہیں تمہاری محبت کی دیوانگی مجھے میری ذمہ داریوں سے بھی بیگانہ نہ کردے...... کلپنا نے سوال داغا...... کیا تمہاری ماں ہماری شادی سے خوش نہیں...... ایسی بات نہیں ساگر نے کہا...... اصل میں ہر ساس کی طرح وہ بھی سوچتی ہیں کہ کہیں ان کی سلطنت پر کوئی اور راج نہ کرنے لگے...... او...... تو ایسا ہے...... تب ہی گھر پر ویرانی چھائی ہوئی ہے، کلپنا نے کہا...... ساگر نے نظریں اوپر نہیں اٹھائیں...... نیچی نظریں تھیں اور وہ کہہ رہا تھا ہر خاندان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ میرے خاندان میں بھی ہیں۔ ہو سکے تو ان خامیوں کو نظر انداز کر دینا۔ ٹھیک ہے وہ تو میں کر ہی دونگی کلپنا نے کہا۔ مگر تمہیں ان خامیوں کا ذکر بھی پہلے ہی کرنا چاہیے تھا...... شادی تو خوشی اور شادمانی کا موقع ہوتا ہے۔ اگر تم نے مجھ سے اصلیت نہ چھپائی ہوتی تو آج...... تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو...... ساگر نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر التجائی لہجے میں کہا...... اب چھوڑو بھی اس قصے کو...... ان سہانے لمحوں کو یوں برباد نہ کرو...... ساگر کی محبت کی بوچھار میں کلپنا کے دل کے مرجھائے پھول تازہ ہو گئے۔ اس کے نادان دل نے پھر خوشگوار ثمر کی تمنا کی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو ماں اور باپ میں بڑی گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ساگر نے سنتے ہی کہا۔ تم کسی بات کا برا نہ ماننا۔ خیال رکھنا۔ بڑا پھر بڑا ہی ہوتا ہے خواہ جاہل ہو یا پڑھا لکھا۔ کلپنا سوچنے لگی جیسے بھی ہیں اب تو میرے بھی ہیں۔ آہستہ آہستہ میں سب کو اپنے سانچے میں ڈھال لونگی۔...... کچھ دیر بعد دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ جہاں ہیراوتی اور مکیش بابو ناشتہ کرنے میں محو تھے۔ ساس نے دیکھتے منہ سکوڑا۔ شیلا فوراً ہی دو پیالے گرما گرم چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جیسے ہی کلپنا نے چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اماں تلخی سے بولی اس گھر میں نوکروں کی فوج نہیں ہے۔ سب کو اپنے اپنے کام خود کرنے ہوتے ہیں۔ اور تم اس گھر کی بہو ہو مہمان نہیں...... یہ پہلا تیر زہر میں ڈوبا اماں نے کلپنا کے دل میں اتارا تھا۔ دل اندر ہی اندر تڑپ اٹھا تھا مگر وہ ضبط کر گئی۔...... چہرے پر ایک شکن بھی نہ ابھری تھی۔...... ساگر نے شیلا سے کہا...... تم اپنی بھابھی کو ناشتہ دو...... سنتے ہی ماں پوری جان سے جل گئی...... بلبلا کر بولیں...... ساگر اس گھر میں آج تک میرا حکم چلا ہے اور ہمیشہ چلے گا...... تم اس گھر کے قائدے قانون بدلنے کی کوشش بھی نہ کرنا...... ورنہ......

ناشتہ ختم ہوا تو دونوں اٹھے ہی تھے کہ اماں نے پھر سوال داغا...... اب کہاں چل دیئے...... ساگر نے ہچکچاتے ہوئے کہا...... جانا تو آپ کو بھی تھا لیکن میں سوچتا ہوں آپ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے...... سو ہم دونوں ہی چلے جاتے ہیں۔ کلپنا کی ممی نے سب کو بلایا تھا...... یہ ان کے خاندان کا دستور ہے...... وہ پھر تلخ ہوئیں...... ہمارے یہاں ایسا کوئی دستور نہیں...... اس لڑکی سے بولو اب ماں کے گھر کو بھول کر اس گھر میں دل لگائے اور تمہیں بھی اس کے باپ کے گھر کی دہلیز پر جا کر بار بار ماتھا ٹیکنے کی ضرورت نہیں۔

کلپنا کا خیال تھا شاید صبح حالات تھوڑے بہتر ہونگے پر یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور تھا...... وہ اپنی ساس کے

چہرے پر ناگواری کی ابھری شکنیں دیکھتی رہ گئی......دل میں سوچنے لگی ایک ماں کے دل میں اتنی نفرت اور حسد اور غصہ......توبہ۔توبہ......کہاں پھنس گئی میں......چلو کلپنا......ساگر کی آواز پر وہ بھی آگے بڑھ گئی......اور ہیراوتی اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہوئی جارہی تھیں......سوچ رہی تھیں مجھے جلد ہی کچھ کرنا ہوگا......ورنہ یہ لڑکی میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لے گی......

رات کھانے کے بعد ساگر نے ہنی مون کے لئے باہر جانے کا ذکر کیا تو اماں کے اندر شعلہ لپکا......بولیں جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے تمہارے پاؤں گھر میں نہیں ٹکتے......یہ ہنی مون کیا ہوتا ہے......امریکہ کے چونچلے یہاں نہیں چلیں گے......خوب اچھا بہانہ ڈھونڈھا اپنوں اور اپنے گھر سے دور بھاگنے کا......یہ فضول خرچی مجھے پسند نہیں......تمہاری بہن اپنا گھر سنسار چھوڑ کر آئی ہے اور تمہارے پاس دو منٹ اس کے ساتھ گذارنے کا وقت نہیں......وہ یہاں اکیلی کیا دیواروں سے سر ٹکرائے گی۔ کچھ دیر کے لئے مکمل سناٹا چھا گیا۔ سب ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔اماں پھر بھڑکیں......ایسا کر اپنی بہنوں کو بھی ساتھ لے جا......اگر نہیں تو کوئی نہیں جائے گا......ساگر کو ماں کی بات پر ہنسی آگئی......بولا......اماں یہ شادی کی بارات نہیں کہ سارا خاندان ساتھ چلے......ہنی مون کے لئے صرف نیا کپل جاتا ہے......جانتی ہوں جانتی ہوں مجھے سبق نہ پڑھا......یہ بتا کہاں اور کیسے جارہا ہے یہ نیا کپل......فرسٹ کلاس کا سن کر وہ چونکی......ماں باپ نے کبھی فرسٹ کلاس کا ڈبہ نہیں دیکھا اور بیٹا چلا فضول خرچی کرنے......وہ بھی صرف ایک رات کے سفر کے لئے۔یہ نہیں ہوسکتا......آخر دونوں کو سیکنڈ کلاس میں جانا پڑا۔

گرمی بھی شدت کی پڑرہی تھی۔ جب تک ہوٹل پہنچے کلپنا کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔رات بھر بخار کی وجہ سے پریشان حال رہی......دوسرے دن حالت ذرا سنبھلی تو دونوں گھر لوٹ آئے۔کلپنا کا زرد چہرہ دیکھ کر شیلا بولی......بھیا ڈاکٹر بلاؤ......اماں نے سنتے ہی کہا......یہ لڑکی تو چھوئی موئی کا پیڑ ہے......ارے گرم ملک میں پیدا ہوئی ہے ذرا سی گرمی برداشت نہیں کرسکتی......اتنی سی بات کے لئے اب ڈاکٹر بلایا جائے گا......ڈاکٹر آکر کیا کرے گا......بس نبض پر انگلی رکھ کر اپنی جیب گرم کرکے چل دے گا......اسے کمرے میں لے جاؤ......شام تک ٹھیک ہوجائے گی......خدا خدا کرکے چار دن کٹے......

ساگر اور کلپنا آفس جانے کے لئے تیار تھے۔ماں نے ساگر کے سامنے ناشتہ رکھا اور خود پاس بیٹھ گئی۔ساگر نے پلیٹ کلپنا کی طرف بڑھادی۔ جیسے ہی دونوں باہر نکلے اماں نے زور سے کہا شام کو سیدھے گھر آنا۔ادھر ادھر ڈولتے نہ پھرنا۔واپسی دیری میں ہوئی تو اماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔بولیں......یہ وقت ہے گھر لوٹنے کا......اماں ہم سیدھے آفس سے گھر آئے ہیں......کلپنا کا آفس دیری میں بند ہوتا ہے۔اسی طرح دن گزرتے گئے۔اماں روز ہی ایک نیا وار کرتیں اور کلپنا ان کے وار سہتی چلی گئی......

رات کافی گزر گئی تھی۔کلپنا سونے کی کوشش کررہی تھی پر ٹی وی کا شور سونے نہیں دے رہا تھا۔آنکھوں سے نیند غائب تھی۔دل میں سکون وقرار نہ تھا۔سوچ رہی تھی ساگر تو اخلاق سے معمور ہے۔مہذب قسم کا شخص ہے اور ماں اتنی سخت دل ہے......ان کے دل میں الفت۔محبت۔انس وپیار کی بو تک نہیں......ساگر نے پاس آکر سوال کیا......کروٹیں کیوں بدل رہی ہو......کیا ہوا......صبح سے ہی چپ چپ سی ہو......کیا مجھ سے بھی خفا ہو......ساگر نے اپنے دونوں کان

فوراً پکڑ لئے...... بھئی مجھ سے کبھی خفا نہ ہونا ورنہ میری جان چلی جائے گی...... کلپنا نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ...... بڑی کمزور جان ہے تمہاری...... اپنی جان کی اتنی فکر کبھی میری جان کی فکر نہیں کی...... خاموشی سے سہے جا رہی ہوں تمہاری ماں کی خفگی...... جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی...... یوں لگتا ہے انہیں ہمارا ساتھ ہی گوارا نہیں......

ساگر نے بڑی لاپروائی سے کہا یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے۔ ساس اور بہو میں کب پٹی ہے۔ ان کی بات چھوڑو...... ہم تو ہے تمہارے سارے ناز اٹھانے کے لئے۔ اس رہگزر میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ میں ہوں نہ سارے کانٹے چننے کے لئے۔ ماں کی اور تمہاری اہمیت میری زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ نا ماں سے دور ہو سکتا ہوں اور نا ہی تم سے جدا ہو کر جی سکتا ہوں۔...... تم میری زندگی ہو اور ماں نے مجھے زندگی دی ہے...... میری خاطر...... ہم دونوں کی خاطر ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو...... حقیقت تمہیں بتا دی ہے کہ وہ ہر سانس کی طرح ڈرتی ہیں کہ کہیں میں تمہاری محبت میں اندھا ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار نہ کر دوں۔ کاش انہیں ذرا سا احساس ہوتا کہ وہ اپنی حرکتوں سے مجھے بھی بے انتہا دکھ دے رہی ہیں...... آج بھی بڑی آسانی سے ساگر نے حقیقت چھپانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہو گیا۔

کلپنا بولی برداشت تو کر رہی ہوں اور آگے بھی کرتی رہونگی لیکن اتنا ضرور کہونگی جس انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے پر خلوص پیار نہیں ہوتا وہ انسان قابل احترام نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہی حال رہا تو...... ساگر نے اس کے لبوں پر اپنی انگلی رکھدی۔ کلپنا۔ ایک وعدہ کرو...... مجھ سے کبھی نہیں بچھڑوگی...... ساگر کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور کلپنا کا سارا غصہ کافور ہو گیا...... دھیمی آواز میں بولی آج صرف اتنا کرو کے یہ ٹی۔ وی ہمارے بیڈروم کے سامنے سے ہٹا کر کہیں دور رکھ دو۔ پھر بیشک وہ دونوں رات بھر پروگرام دیکھیں۔ ہمیں تو آرام کرنے دیں۔ ساگر نے بڑی گہری نظروں سے کلپنا کو دیکھ کر کہا۔ اب بس بھی کرو...... کیا میری ماں کے سارے دوش آج ہی بتانا ضروری ہے۔ میری ماں نے میری تمام زندگی مجھے دے دی اور اس کے بدلے وہ جو بھی کرے مجھے ہنس کر یا رو کر قبول کرنا ہوگا......

کچھ دن خاموشی سے گزر گئے۔ رات کے کھانے کے بعد اماں پھر بگڑ پڑیں۔ تیز آواز میں بولی لڑکیاں نوکری کے ساتھ گھر داری بھی کرتی ہیں...... فوراً ہی ساگر بولا...... کلپنا یہ تمہارا گھر ہے...... اب تم اپنے گھر کے سارے بکھیڑے سمیٹو اور میری ماں کو چھٹی دے دو پھر اماں سے بولا۔ اماں آپ متھرا اور ہری دوار چلی جائیں...... اماں خاموش کھڑی ساگر کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ جب کلپنا چلی گئی تو اماں بولیں بیوی کے غلام...... شروع کر دی بیوی کی وکالت...... اسی دن کے لئے تجھے میں نے جنم دیا تھا اور لگیں رونے...... ساگر تو پانی پانی ہو گیا...... بولا...... میں بیوی کی وکالت نہیں کر رہا...... آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں...... اگر یہ نوکری نہیں کرے گی تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا...... یہ گھر اس کا بھی ہے...... وہ میری بیوی ہے تو آپ کی بہو بھی تو ہے...... ذرا سا اس کا بھی تو خیال کریئے...... ماں غصے میں بلبلا کر بولیں بدقسمتی تو میری ہے...... میرا ہی سکہ کھوٹا نکلا...... ہیرا وتی کے دل میں حسد کا جذبہ اور بڑھ گیا......

ساگر اندر روٹھی بیوی کو منانے گیا تو وہ بھی بھڑک اٹھی...... اگر تمہیں اپنی ماں سے اتنا ہی پیار تھا تو شادی بھی ان کی رضامندی سے کرنی تھی وہ ہنس کر بولا۔ سنا ہے جوڑے تو آسمان میں بنتے ہیں...... اب اس میں میرا کیا قصور...... تم

خواہ مخواہ مجھ پر بگڑ رہی ہو۔ کلپنا بولی۔ اپنی ماں کو سمجھاؤ ہنستے ہوئے گھر بستے ہیں۔ اور خوش حال گھرانوں کے سب فرد ہنستے ہیں...... وہ بھی ہنسا کریں...... تم دیکھنا اس گھر کا ماحول بدل جائے گا...... گھر خوشیوں سے بھر جائے گا۔ ناحق چہرے پر ہر وقت غصہ اور ناراضگی کا خول چڑھائے رہتی ہیں۔ دیکھتے ہی دل ڈر جاتا ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح گھر پر خاموشی طاری تھی۔ معلوم ہوا اماں کی طبیعت ناساز ہے۔ اماں کہہ رہی تھیں میں رات بھر سونہ سکی۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے میرے سر کی نسیں پھٹ جائینگی۔ پاپا بولے...... ہر وقت کا غصہ اور جھنجھلاہٹ تمہارے دماغ کو چین نہیں لینے دیتا۔ تم جو بھی کر رہی ہو وہ درست نہیں ہے۔ ذرا صبر اور تحمل سے کام لو۔ اماں بولیں کلیجہ پر پتھر رکھ کر صبر ہی تو کرلیا ہے۔ اب جو بھی کر رہی ہوں اپنے بیٹے کی بھلائی کے لئے ہی کر رہی ہوں۔

کلپنا دروازے پر کھڑی سب سن رہی تھی۔ ساگر کے ساتھ اندر گئی۔ کلپنا نے ساس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بخار کی شدت سے تپ رہی تھی۔ کلپنا نے ایک دم ڈاکٹر بلایا۔ واقعی ڈاکٹر نے بتایا کہ بلڈ پریشر خطرناک لیول پر پہنچ گیا ہے بہتر ہوگا انہیں ہسپتال میں شفٹ کردیں...... اماں نے انکار کردیا...... کلپنا اور ساگر نے اماں کی دیکھ بھال بڑی احتیاط سے کی۔ پر ساس کا دل نہ پگھلا۔

اماں کی ہر وقت کی چخ چخ سے ساگر بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ کلپنا کو جانچنا چاہتا تھا۔ بولا...... خدا نے یہ زندگی ضائع کرنے کے لئے نہیں دی۔ اماں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ایک دن آئے گا کہ ہمارے درمیان بھی تناؤ شروع ہو جائیگا۔ وہ وقت آنے سے پہلے میں ماں اور بابا کو گاؤں بھیج دینا چاہتا ہوں۔ کلپنا نے حیرت انگیز نظروں سے ساگر کو بغور دیکھ کر کہا۔ بڑھاپے میں اولاد ہی ماں باپ کو تحفظ دیتی ہے۔ اور تم انھیں بے سہارا کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو...... وہ تمہیں چاہے کھوٹا سکہ سمجھتی ہے پھر بھی بیٹا جیسا بھی ہو ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے دور کبھی نہیں کرسکتی۔ اور میں اتنی کم ظرف بھی نہیں کہ ایک ماں کو اس کے بیٹے سے الگ کردوں۔ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی میں اس گھر کو چھوڑ دونگی......

ساگر ایک دم کلپنا کے قریب جا بیٹھا...... خدا کے لئے یہ پھر نہ کہنا...... تمہارے بغیر یہ گھر اجڑ جائے گا...... مجھے ہر گام پر تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے...... تم عقلمند ہو تم نے تعلیمی بنیاد کے ساتھ اچھی تربیت بھی پائی ہے...... اماں کو کچھ بھی نہیں ملا...... نہ علم...... نہ کوئی خوشی...... ہر انسان اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوچتا ہے۔ بس یہ سوچ کر ہی اماں کی باتوں کو دل پر نہ لیا کرو...... ساگر کی بات میں اتنی حسرت تھی کہ کلپنا پگھل کر رہ گئی۔

وہ پھر بولا...... میں بھی انسان ہوں اور بڑی کش مکش میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف تم اور دوسری طرف ماں...... مجھ پر اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا کہ مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگے...... کلپنا ہنس دی...... کہتے تو تم ٹھیک ہو...... انسان کو بدلنے میں پل نہیں لگتا...... خیر جو بھی ہے اپنی ماں کو سمجھاؤ کہ اس گھر میں اختلاف کا بیج نہ بوئیں...... کیونکہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا بھی ہے۔

رات بھر کلپنا سونہ سکی تھی...... وہ جاننا چاہتی تھی آخر کیوں اس کی ساس کے دل میں اس کے لئے اتنی نفرت اور کدورت بھری ہوئی ہے۔ ساگر کی باتوں میں اب اسے سچائی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ کچھ تو تھا جو وہ اس سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دن ذرا اطمینان سے گذرے۔ اچانک ہی سسر جی کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ کلپنا نے ان کے علاج

کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ سیوا بھی دل وجان سے کی۔ گھر لوٹے تو ان کے کمرے میں روز کچھ نہ کچھ بحث ہوا کرتی۔ ایک رات ذرا دروازہ کھلا تھا۔ باتوں کی ہلکی ہلکی گونج سنائی دے رہی تھی۔ شیلا کی شادی کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ساگر آیا۔ وہ خاموش تھا اور بہت الجھا الجھا سا پریشاں سا دکھائی دے رہا تھا۔

رات کھانے کے بعد مکیش بابو نے شیلا کی شادی کا ذکر چھیڑا تو کلپنا نے بھی بڑے تجسس سے پوچھا۔ ''کب ہو گی شیلا کی شادی''...... مکیش بابو بولے یہ لو میرج نہیں ہے جو آسانی سے ہو جائے۔ وہ لوگ پانچ لاکھ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اب تم ہی ہماری پریشانی دور کر سکتی ہو۔ پانچ لاکھ۔ بے ساختہ کلپنا کے منہ سے نکلا۔ یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ پھر ساگر کی طرف دیکھ کر بولی...... میں یہ کیسے کر سکتی ہوں......

ساگر نے اپنا مشورہ دینے میں دیر نہیں لگائی۔...... تمہارے لئے تو یہ معمولی سی بات ہے...... تمہارے بینک میں کیش ہے اور شیرز بھی ہیں۔...... شیرز بیچ ڈالو...... وہ گھبرائی نہیں پختہ لہجے میں بولی۔ وہ تو تمہارے پاس بھی ہیں۔ ساگر نے کہا...... بھئی ایک ہی بات ہے تم دو یا میں دوں......

کلپنا بولی...... میرا اپنا خیال ہے انسان کو اپنی اوقات میں رہنا چاہیئے۔ اتنے ہی پیر پھیلائے جتنی اس کی چادر ہو۔ فضول خرچی سے ہی بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں جہیز کے خلاف ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے کسی فیصلے پر انحراف نہیں کیا۔ لیکن میں اسقدر محنت اور جانفشانی سے جمع کیا ہوا اپنا روپیہ ایک لالچی آدمی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتی۔ اگر تم جہیز دینا صحیح سمجھتے ہو تو شوق سے دو...... لیکن یہ یاد رکھنا جو شخص شادی سے پہلے ہی ہاتھ پسارے کھڑا ہے وہ آگے کیا کرے گا۔ ایسے انسان کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔ اس شخص کے اوپر بھروسہ کرنا بھی حماقت ہے۔ تم کب تک اس کی جھولی بھرتے رہو گے۔ آگے چل کر تم اس کی مانگیں نہ پوری کر سکو گے تو ہو سکتا ہے وہ تمہاری بہن کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرے......

بند کرو تم اپنی یہ بکواس ساگر چیخا...... ہر بات میں تمہاری یہ ''لیکن'' کیوں آڑ میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ۔ لیکن وہ۔ میں سن سن کر تھک گیا ہوں۔ کلپنا ایکدم کھڑے ہو کر بولی۔...... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ ساگر کا جملہ خنجر سے کم نہ تھا۔ کلپنا کے دل کو چیرتا پھاڑتا نکل گیا تھا...... سسر جی بھی کلپنا کی ساری بھلائیاں بھول گئے تھے۔ ایک گہری ہنکاری خارج کی اور طیش سے لرزتی آواز میں بولے اگر تمہیں اس گھر کے معاملات سے سروکار نہیں تو اس چھت کے نیچے رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ یعنی وہ صاف لفظوں میں کلپنا کو گھر چھوڑنے کا آدیش دے رہے تھے۔ ان کے لہجے میں پدرانہ شفقت کا عنصر غائب ہو چکا تھا۔ یہ وہی تھے جو ہسپتال میں کہہ رہے تھے۔ بہو ہو سکے تو اپنی ساس کو معاف کر دینا۔ ساس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آج ان کی دلی تمنا پوری ہو گئی تھی۔ سب ہی کلپنا کو برا بھلا کہہ رہے تھے دل کو ذرا ٹھنڈک پہنچی تھی۔ اماں نے کلپنا کی جانب عجب نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ میرے سارے منصوبوں پر پانی پھیرنے چلی تھی...... میرے ہاتھوں سے تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تجھ کو جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔

کلپنا حیرت اور صدمے کے شدید احساس میں گھری ساکت کھڑی اپنے سسر جی کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ جاہل انسان کے خیال اور عمل میں زیادہ وقفہ نہیں ہوتا سوچ کر ہی اس کا بدن لرز اٹھا تھا۔ بیٹا بھی ڈانو ڈول ہو رہا تھا۔ انسان کتنا

بھی سمجھدار اور عقلمند ہو ہمیشہ درست نہیں ہوتا۔......ساگر تم......اتنے تعلیم یافتہ اور تمہارے یہ خیالات......وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کلپنا آنے والی مصیبتوں کے خیالوں میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ میں ہی کیسا غلط انتخاب کر بیٹھی۔ جب میرے اور ساگر کے خیالات ہی نہیں ملتے تو زندگی کی گاڑی آگے کیسے چلے گی۔ رات کے بارہ بجے کے بعد ساگر آیا......آتے ہی بولا......تمہیں اتنا بولنے کی کیا ضرورت تھیں......عجب اکھڑا لہجہ تھا......کلپنا نے بھی روکھا سا جواب دیا......ضرورت تھی......وہ بولا......تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم بولتی ہی چلی جاتی ہو......کسی اور کی سنتی ہی نہیں ہو......وہ بولی میں نے ایک بات بھی غلط نہیں کہی......ٹھیک ہے بابا تم اپنے اصولوں کو مت چھوڑنا چاہتی ہو نا چھوڑو......میری ماں نے تمہارے باپ کی ساری جائداد تو نہیں مانگی تھی......کلپنا نے ساگر سے سوال کیا......کیا میرے اصول غلط ہیں......سچ سچ بولنا ساگر......وہ بولا......میں نے یہ کب کہا لیکن میری جان اپنوں کے لئے کبھی کبھی اصول توڑے جا سکتے ہیں۔ ورنہ......وہ بولی ورنہ کیا......جو بھی ہو ہو جائے......میں اپنے اصولوں پر ڈٹی رہونگی......میں اصول پسند باپ کی اصول پسند بیٹی ہوں......میں پھر کہتی ہوں ہو سکے تو اپنا ارادہ بدل دو......ایک معصوم لڑکی کو آگ کی بھٹی میں نہ جھونکو......شیلا اس ماحول میں کبھی خوش نہیں رہ پائے گی۔

کلپنا کے اعتبار کا خون تو ساگر نے کر ہی دیا تھا۔ کسی طرح زندگی کا دیا جل رہا تھا۔ گھر کے اندر طوفان آ گیا تھا۔ آندھیاں چل رہی تھیں اور کسی وقت بھی اس کی خوشیوں کا دیا گل ہو سکتا تھا......کلپنا نے سارے راز اپنے ماں باپ سے چھپائے رکھے تھے۔ ہر وقت سوچوں میں ڈوبی رہتی......ساگر اس کے قریب آ بیٹھا......بولا......مجھے تم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر تم نے مجھے سخت مایوس کر دیا۔ ماں کے سامنے مجھے نیچا کر دیا......وہ بولی......واہ ساگر......واہ......آخر تم رہیں وہی کہ وہی جہاں سالوں پہلے تھے۔ اتنا علم حاصل کر کے بھی تمہارے خیالات نہیں بدلے......تمہاری سوچیں......وہیں رہیں......کلپنا کی صبر اور برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ چکی تھیں۔......ساگر کا چہرہ فق ہو گیا تھا......آنکھیں جھک گئیں......دھیرے سے بولا......جو بھی ہوا ہے بھول جاؤ۔ پاپا نے جو کہا وہ دھمکی تھی تا کہ تم کسی طرح ہتھیار ڈال دو۔ میری جان......مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جانا......تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ زندگی کے بار گراں ہم دونوں کو مل کر اٹھانے ہیں۔......مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔

کلپنا بولی میں جہیز کے خلاف ہوں۔ مدد کے نہیں۔ میں اپنی حیثیت کے مطابق ضرور دونگی......میری ایک بات مان لو......یہ سودا نہ کرو ورنہ تم بک جاؤ گے......برباد ہو جاؤ گے......اور خدا جانے شیلا پر کیا بیتے گی......ذرا غور سے سوچو اور سمجھاؤ اپنی ماں کو۔ وہ بولا......میری ماں اپنی ضد کی پکی ہیں۔ انہوں نے کب کسی کی سنی ہے......میں تمہیں سمجھا رہا ہوں......تم بہت جلدی برا مان جاتی ہو......کبھی کبھی انسان کو اپنی خواہش کے برعکس بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ اس کے لہجے میں بے بسی عود کر آئی تھی۔ کلپنا نے دھیرے سے کہا تم وہی کرو جو تمہاری ماں چاہتی ہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں ہو گا وہی جو وہ چاہتی ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش میں جھوٹ بول رہے ہو۔ آج سے نہیں۔ پہلے دن سے۔

اگر سچ سنو گی تو برداشت نہیں کر پاؤ گی۔ وہ مجھے الٹے سیدھے سبق پڑھاتی رہتی ہیں۔ یہ بھی کہتی ہیں کہ تمہیں

چھوڑ دوں...... لیکن...... میں ایسا نہیں کرونگا کیونکہ تمہیں پا کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے بے حد حسین انعام بخشا ہے۔ شاید میں اس نعمت کے قابل نہ تھا۔ کلپنا۔ یہ سن کر خوف سے لرز ہی گئی۔ دل میں سوچا اگر...... طلاق ہوا...... تو...... پر وہ مسکرا دی...... یہی تو اس کا کمال تھا کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔

ساگر کا جنم دن تھا۔ اماں نے پارٹی دینے کی اجازت نہیں دی۔ ساگر کی ضد تھی کہ کلپنا کے ماں باپ کو تو ضرور بلانا ہوگا...... کلپنا نے احتجاج کیا...... بولی ہمارا ایک دو دن کا تو ساتھ نہیں...... ہم دونوں کو تو زندگی اکھٹی گزارنی ہے۔ اگر اماں ایسا کریں گی تو زندگی کے دن کاٹنے کٹھن ہی نہیں ناممکن ہو جائیں گے۔ ہمارے اپنے دوست ہیں۔ ناں ہمیں کہیں جانے کی اجازت ہے اور نا ہی کسی کو گھر بلانے کی۔ کب تک ایسا چلے گا۔ کلپنا کے لہجے میں اضطراب ہی اضطراب تھا۔ ساگر عجب انداز میں مسکرا کر بولا۔ تمہیں زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑیگا...... کلپنا اس دو معنی جملے کو سمجھ نہ پائی۔ ماحول میں ایک عجب قسم کا تناؤ تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی بھونچال آنے والا ہے۔ آگے کلپنا کی ماں کی زبانی۔

فون بجا تو میں نے اٹھایا...... نہ دعا نہ سلام...... میں ہیرا وتی بول رہی ہوں...... میں ٹھٹکی...... آپ میری بات غور سے سنیں...... ساگر کے پتا جی گاؤں چلے گئے ہیں اور میں ابھی بمبئی جا رہی ہوں...... آئندہ آپ کو ساگر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... اس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے گھر میں نوکرانی ہے۔ آپ آج سے اپنی بیٹی کی فکر کرنا کیونکہ اب کلپنا ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ ساگر بھی طلاق چاہتا ہے۔ آپ ساگر سے بات کریں۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتی ساگر کی آواز آئی...... آنٹی میں بھی وہی چاہتا ہوں جو میری ممی چاہتی ہیں...... فون کٹ گیا...... دونوں نے مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا...... مجھے یوں محسوس ہوا کہ آگ برس رہی ہے اور میں شعلوں میں گھری بدحواسی کے عالم میں چیخ رہی تھی...... یہ ناگہانی عذاب...... کیوں...... ساگر ایسا نا کرنا...... میری بیٹی کو اور خود اپنے آپ کو اس عذاب سے بچا لو...... طلاق سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں...... عورت اور مرد دونوں کے لئے ہی باعث شرم ہے اور ندامت ہے۔

کلپنا کے پتا جی دوڑے آئے...... کیوں واویلا مچا رکھا ہے۔ اب کون سی آفت آن پڑی...... ارے کچھ تو بولو...... کہ بس روئے جاؤ گی...... میں نے کہا آفت ہوتی تو جھیل لیتے ہمارے اوپر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے...... ساگر طلاق چاہتا ہے۔ رنج و غم کی شدت سے نڈھال وہ وہی ڈھے گئے...... ٹوٹے...... بکھرے سے آنکھوں میں آنسو بھرے وہ بے بسی سے مجھے تکتے رہ گئے۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایسا طوفان اٹھا تھا پل بھر میں ہماری ساری خوشیاں اڑا کر لے گیا تھا۔ ایک عجب سا بھیانک سا سناٹا تھا۔ بولنے والا سناٹا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھڑی کی سمت تاکتے رہ گئے تھے۔ شاید مصیبت کی گھڑی میں ایک دوسرے کو سہارا دینے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ چپکے چپکے رونا...... اور غموں کو اندر اتار لینا...... منہ سے کچھ نہ کہنا...... لفظوں میں اتنی طاقت کہاں جو اتنے گہرے دکھ کا دعوا کر سکیں۔ کوئی قسم کا مرہم کام نہیں آتا...... بس ساتھ ہی کام آتا ہے......

ہم دونوں حد درجے بے چین اور بیقرار تھے...... کتنے ہی خیال ذہن میں آئے اور چلے گئے...... شاید ہر ساس کی طرح ساگر کی ماں کے دل میں بھی بہو کے لئے نفرت اور کدورت بھری ہے...... شاید ساگر...... یہ نہیں چاہتا...... شاید...... مگر...... پھر...... یہ طلاق کیوں...... ایک ایک پل پہاڑ...... ہر سانس بھاری...... اس سناٹے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی......

ساگر کو دیکھتے ہی ہم دونوں انتہائی بے چینی اور گھبراہٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ہمارے اوپر تو قیامت ٹوٹ رہی تھی اور ساگر کی آنکھیں اور چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری تھا...... نہ کوئی رنج نہ ملال ...... وہ بڑے سکون سے بیٹھا زمین تاک رہا تھا......

کلپنا کے پتاجی بولے...... حیرت ہے تم دونوں کے درمیان اتنی کشیدگی بڑھ گئی کہ انجام طلاق تک پہنچ گیا اور کلپنا نے کبھی ہم سے اپنے سسرال والوں کے خلاف کچھ نہیں کہا...... کیا یہ تمہارا اور کلپنا دونوں کا فیصلہ ہے۔ ساگر بولا...... کلپنا ابھی طلاق کے بارے میں کچھ نہیں جانتی...... یہ میری ممی کا اور میرا فیصلہ ہے۔ لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ نا غصہ نا غم کی جھلک۔ کلپنا کے پتاجی بولے...... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم نے اپنی زندگی کی ڈور اپنی ممی کے ہاتھوں میں سونپ دی ہے۔ پر...... کیوں...... تم بچے تو نہیں رہے...... تم خود پڑھے لکھے عقلمند جوان ہو...... اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکتے ہو...... جہاں تک میرا خیال ہے تمہاری ماں اس شادی کے خلاف تھیں۔...... کیوں...... یہ میں نہیں جانتا...... جتنی جلدی تمہیں شادی کرنے کی تھی اس سے زیادہ جلدی اب شادی توڑنے کی لگی ہے...... شادی کوئی کھیل تماشہ تو نہیں...... شادی کے بعد کچھ تکلیفیں ضرور ہوتی ہیں کیونکہ دو انسانوں کے مزاج فرق فرق ہوتے ہیں۔ دونوں کی رائے بھی متفق نہیں ہوتیں...... یہ عرصہ تو ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی حد تک پروا اور خیال رکھنے کا کہ دونوں کے دلوں سے سارے اندیشے ہی ختم ہو جائیں۔ زندگی وہموں اور گمانوں میں نہیں جی جاتی...... یہ دنیا ہے...... اس دنیا میں اونچ نیچ...... دکھ سکھ سب کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جینا پڑتی ہے یہ زندگی۔ ہنس کر یا رو کر۔

تم ساری زندگی تنہائی کے گہرے اندھیروں میں تو گذار نہیں سکتے...... ساتھی تو ہر انسان کو چاہیئے ہوتا ہے۔ سو دوسری شادی بھی ضرور کرو گے۔ اگر ماں کے دل سے وہ لڑکی بھی اتر گئی تو کیا اس معصوم لڑکی کا بھی یہی حشر کرو گے۔ پھر کہاں جاؤ گے۔ زندگی سے۔ حقیقت سے کب تک بھاگتے رہو گے۔ زندگی سے فرار ممکن نہیں۔ ابھی تو تم دونوں ٹھیک سے بسے بھی نہیں تھے کہ آشیاں اجڑنے کے آثار نمایاں ہو گئے۔

کبھی غور کیا ہے تم نے۔ دو پنچھی کس قدر محنت اور محبت کے ساتھ تنکا تنکا بٹور کر اپنا گھونسلہ بناتے ہیں۔ نادان شکاری ایک کو زخمی کر دیتا ہے۔ شام کو سارے پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں تو وہ بدنصیب پنچھی اپنے ساتھی کے لوٹنے کا انتظار کرتا ہے...... جب ساتھی نہیں ملتا تو دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا ہے۔ تھک کر چور چور ڈال پر تنہا اور پریشان حال بیٹھا زمین کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنے پریمی کو زمین پر پڑا پھڑ پھڑاتے دیکھ وہ فوراً ڈال سے نیچے اترتا ہے۔ اپنا ننھا سا سر پٹک پٹک کر آہ وزاری کرتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا کہتا ہو گا اپنے ساتھی سے۔ التجا کرتا ہو گا...... چل گھر...... اب تیرے بناء میں اس گھر جاؤں کیسے...... میرا گھر اجاڑ کر اس ظالم صیاد کو کیا ملا...... ہم انسان تو اشرف المخلوقات ہیں لیکن انسانوں کے دلوں میں رحم اور محبت کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا تم ایک منٹ کے لئے سوچنا کہ ہم انسانوں سے بھلے تو وہ پنچھی ہیں جو آپس میں محبت کرتے ہیں۔ زندگی کے آخری لمحوں تک ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ خود اپنا آشیانہ کبھی نہیں اجاڑتے۔ بیٹا شادی کا مطلب ہے ہر خوشی اور غم کے لمحوں میں ساتھ دینا...... گھبرا کر ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دینا بزدلی ہے۔ تم ایک ذمہ دار انسان ہو...... میری بیٹی کے شوہر ہو...... مانا کہ وہ برسر روزگار ہے لیکن بیوی ہمیشہ شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تمہارا فرض ہے اس کا ہر حال میں خیال رکھنا...... اور خیال الگ رہ کر تو رکھا نہیں جا سکتا...... طلاق مرد اور

عورت دونوں کے لئے بیحد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ طلاق کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ سچ ہے کہ ماں کی ہر خواہش پوری کرنا اولاد کا فرض ہوتا ہے لیکن ایسی بے جا خواہش پر سرخم کرنا محض حماقت ہے۔ آج جو بات تم اتنی سہل سمجھ رہے ہو کل اس کے انجام سے تم خود دہل جاؤ گے۔

تم نے تو سالوں سال کلپنا کو پانے کا خواب دیکھا تھا۔ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اپنے خوابوں کی تعبیریں مل جاتی ہیں۔ شاید پہلی بار ساگر حالات کی سنگینی کو سمجھا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر ایک عجب سی مسکراہٹ تھی۔ شاید وہ ہماری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ خاموشی سے سر جھکائے باہر نکل گیا......

ہم دونوں گم صم بیٹھے رہ گئے۔ بہت دیر لگی ہوش سنبھلنے میں...... کلپنا کے پتاجی آہستہ لے بولے افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری بیٹی ساگر کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہی۔ اس لڑکے میں وفاداری اور ایمانداری نام کو نہیں ...... میں نے کہا میرا دل تو کل سے ہی لرز رہا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول بتا رہا تھا کہ معاملہ سنگین ہے اور کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔ کیا پتا تھا کہ میری بیٹی ان کی نفرتوں کے تیروں کا نشانہ بنے گی......

پہلے ہی دن سے کلپنا کو اپنی ساس کی طرف سے بھلائی کی کوئی توقع تھی ہی نہیں۔ اب ساگر کی باتیں سن کر وہ بے حد بے چین اور پریشان رہنے لگی تھی۔ شیلا کے جہیز کا معاملہ بھی اس کے ہی سر آپڑا تھا۔ ماں باپ کی لاڈلی ناز و نعم میں پلی کلپنا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس دنیا میں رشتے ناتے۔ پیار محبت...... سب کی قیمت لگتی ہے اور ہر انسان کو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ادائیگی نہ کرنے پر یہ دل کے رشتے جنہیں ہم بے حد مضبوط اور اٹوٹ سمجھنے لگتے ہیں ایک لمحہ میں ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اسے تو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ بدنصیبی اس کا مقدر بن چکی ہے۔

وہ آفس سے گھر پہنچی تو کمرہ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یوں جیسے وہاں کسی نفس کا وجود ہی نہ ہو۔ بیڈ روم میں بتی جلائی تو ساگر کو آنکھوں پر ہاتھ رکھے پلنگ پر دراز دیکھ کر چونک سی گئی...... ارے تم اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو...... میں دن بھر تمہارا انتظار کرتی رہی...... کم سے کم ایک فون تو کر دیا ہوتا...... وہ کچھ نہ بولا تو سیدھی باتھ روم میں گھس گئی۔ فوراً ہی باہر آ کر بولی۔ ٹنکی آج بھی خالی ہے۔ ہاتھ دھونے تک کو پانی نہ ملا...... تم پمپ چلانے کے لئے تو کہہ دیتے...... ساگر نے بڑے طیش بھرے لہجے میں کہا...... کہو تو بالٹی بھر کے لا کر تمہارے قدموں میں رکھ دوں۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ یہ کیا ہو گیا تمہیں تم تو غیروں کی طرح بات کر رہے ہو...... میں جانتی ہوں تم ماں کی کمی محسوس کر رہے ہو...... وہ پھر برہمی سے بولا...... بات وہ نہیں ہے دراصل بات یہ ہے کہ آج تک تم میری ماں پر الزام دھرتی رہیں۔ اب میری باری ہے۔ یہ یاد رکھو میں تمہارا نوکر نہیں جو ہر فرمان بجالاؤں...... کل سے تم اس گھر کو اور بملا کو سنبھالو...... میں یہ سب نہیں کر سکتا......

اوہو بگڑتے کیوں ہو۔ سنبھال لونگی...... کلپنا نے ساگر کا ہاتھ پکڑ کر کہا...... چلو کھانا کھالو...... میں بعد میں نہالونگی۔

کلپنا ڈر رہی تھی اب کوئی نیا ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ وہ رات اس پر بھاری تھی۔ رات سو نہ سکی۔ کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی ضرور ماں نے میرے خلاف کان بھرے ہیں تب ہی تو اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ یوں بھی اب کلپنا کو ساگر پر بھروسہ اور یقین نہیں رہا تھا۔ اس رشتے میں اگر یقین اور بھروسہ ٹوٹ جائے تو...... پھر...... انجام...... وہ انجام کا سوچ کر اندر ہی اندر دہل گئی۔

صبح ماحول خوشگوار نہیں تھا۔ ماحول میں عجیب سا تناؤ تھا۔ ساگر اپنے خیالوں میں ڈوبا تھا۔ شاید اپنی ماں کے منصوبوں پر غور کر رہا تھا جو اسے کسی بڑا فیصلہ لینے پر مجبور کر رہے تھے...... کلپنا اس تناؤ کو دور کرنے کی غرض سے بولی...... ارے صبح صبح بچوں کی طرح منہ بسورے کیوں بیٹھے ہو...... لو گرم گرم چیئے پیو...... چائے کی پیالی تھامتے ہوئے ساگر نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔ تم جانتی ہو میری زندگی میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ بتاؤ کہ اب کیا سوچا تم نے...... کلپنا نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا...... میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے پیسہ کی پروا نہیں لیکن میں اپنے اصولوں پر سودا ہرگز نہیں کر سکتی۔

ساگر نے کلپنا کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا...... میری جان...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو...... میری ماں نے اپنا فیصلہ بدلنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ شیلا کے جہیز کی ادائیگی میری ماں کی انا کا مسلہ بن گیا ہے۔ اس انا اور اصولوں کی جنگ میں کسی نہ کسی کو ضرر تو ضرور پہنچے گا۔ اور میں نہیں چاہتا اس جنگ میں تم پر ذرا سی بھی آنچ آئے۔

کلپنا بولی تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اپنے فیصلے بدل سکتے ہو...... پر تمہاری ماں نہیں...... تم کب تک اپنی ماں کے ذہن سے سوچتے رہو گے۔ ذرا خود اپنے ذہن پر زور ڈالو...... اور سوچو...... اور وہی کرو جو درست ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے یہ میرا گھر نہیں میدان جنگ ہے۔ جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی میرے مقابل مجھے گھائل کرنے کو تیر و کمان لئے تیار کھڑا ہے۔ آج ماں نہیں تو تم ہو...... اس گھر میں رہنے والے سارے کے سارے سطحی سوچ کے مالک ہیں۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اماں کے تو تن بدن میں آگ لگی تھی۔ بڑے تپتے لہجے میں بولیں...... کیا بولا اس کا باپ...... ساگر نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا...... اس نے لمبی سانس لی...... کلپنا بیڈروم میں جا چکی تھی۔ اماں پھر شروع ہو گئی۔ نکال دیا اس لڑکی کو یا نہیں۔...... اماں دھیرے سے بولو...... وہ سن لے گی تو...... اماں چیخیں...... لگتا ہے اس کی محبت کا بھوت تیرے سر پر ابھی تک سوار ہے...... سن لے گی تو ہمارے لئے بہتر ہوگا...... تو نے اس لڑکی سے میری پسند کے خلاف شادی کی...... میں ضبط کر گئی...... اب تو تو نے بھی دیکھ لئے اس کے رنگ ڈھنگ...... تو سوچتا تھا کہ وہ اپنی کمائی کی پائی پائی تیرے قدموں میں نچھاور کر دے گی...... صرف کمائی ہی نہیں باپ کی جائیداد تیرے نام لکھ دے گی...... بھگت لیا خمیازہ اپنی پسند کی شادی کا...... اب جلد از جلد اس سے چھٹکارا پا کر میری پسند کی لڑکی سے شادی کر...... نہال کر دے گی وہ تجھے۔ اپنی بہن کی خوشیوں کی خاطر تجھے یہ قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ اگر وہ خود نہیں گئی تو یاد رکھ میں آ کر دھکے مار مار کر اس لڑکی کو گھر سے نکال دونگی...... میں تیری شادی ایک ایسی امیر زادی سے کرواؤنگی جو پوری کی پوری ہمارے قبضے میں رہے گی تو اسے باہر نکال۔ اماں اس کی نوبت نہیں آئے گی...... وہ چلی جائے گی...... تم پریشان نہ ہو...... یہ گھر تمہارا ہے...... تم آ کر ٹھاٹ سے اپنے گھر میں حکومت کرنا......

دوسرے فون پر کلپنا نے سب کچھ سنا اور فیصلہ بھی کر لیا...... آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... اس کے اندر دھواں سا پھیل گیا...... جو شکوک اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے سب ہی پورے ہو رہے تھے...... ہمت۔ صبر اور حوصلے...... سب ہی چور چور ہو گئے تھے۔ پر اس نے بامشکل ضبط کر رکھا تھا...... زخم تازہ تھا...... تکلیف بھی بہت ہو رہی تھی...... درد سمیٹتی آگے بڑھی۔

وہ باہر آئی...... ساگر خاموش کھڑا تھا...... ساگر کی خاموشی اس کے لئے باعث اضطراب بن گئی تھی...... ساگر

کے چہرے پر کھلی سی ہنسی تھی۔ نا وہ چونکا تھا اور نا ہی اسے کوئی حیرت ہوئی تھی۔...... کیوں ہوتی...... جو وہ چاہتا تھا وہی تو ہو رہا تھا...... وہ اس سے کہنا چاہتی تھی...... ہماری شادی کی بنیاد ہی لالچ۔ حرص اور ہوس پر ہوئی۔ اگر شادی کی بنیاد ہی خلوص۔ نیک نیتی اور ایمانداری پر نہ ہو تو وہ شادی ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم دھوکے باز ہو خود غرض ہو...... لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی...... اندر طوفان برپا تھا...... دل اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہا تھا...... حوصلے ریت ہو چکے تھے۔ امیدیں ٹوٹ چکی تھیں......

وہ نا محسوس طریقے سے ساگر کو نظر انداز کرتی آگے بڑھتی چلی گئی...... نہ ساگر نے روکا...... اور نا ہی کلپنا نے پلٹ کر دیکھا...... جان گئی تھی ساگر اپنی ماں کے حکم پر عمل کرنے پر آمادہ ہے۔

مستقبل کے خاردار راستوں کا سوچ کر کلپنا تھرا گئی تھی۔ اتنی رات گئے دروازے پر کلپنا کو کھڑا دیکھ اس کے پاپا کو نا کوئی اچنبھا ہوا نا حیرت۔ نڈھال سی کلپنا بے تماشہ آنسوؤں کے درمیان اپنی ماں کی بانہوں میں سما گئی۔ ممتا کی ٹھنڈک محسوس کی تو آہستہ آہستہ اسکے اندر کی بے چینی اور بے قراری اور اضطراب میں کمی ہوئی۔ ظالم ساس اور سخت دل اور بے وفا شوہر کے ہاتھوں اٹھائے دکھوں کا درد کم سا ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے وجود کے اندر کا الاؤ ٹھنڈا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ذرا ہوش سنبھلے تو بولی اماں میں آ گئی ہوں کبھی واپس نہ جانے کے لیئے۔ وہ لوگ انسان نہیں درندے ہیں۔ اندر سے بھیانک اور بیحد خوفناک...... کچھ بھی کر سکتے ہیں...... ساس بڑی ظالم اور کٹھور ہے۔ مجھے ان کے ساتھ رہنے میں خوف آتا ہے۔ وہ گھر نہیں ہے خطروں کا گڑھا ہے۔ وہاں معمولی سی بات پر آگ بھڑک جاتی ہے۔ وہاں میرا اپنا کوئی نہیں۔

باپ نے شفقت بھرا ہاتھ سر پر رکھا تو کلپنا کے لرزتے دل کو سکون ملا...... بیٹا جب سے ساگر واپس گیا ہے ہمارے دلوں میں لاتعداد اندیشے کلبلا رہے تھے۔ بس سوچتے رہے کہیں ایسا نہ ہو گیا ہو کہیں ویسا نہ ہو گیا ہو...... کلپنا نے سر اٹھا کر سوال کیا ساگر کب آیا تھا یہاں...... میں نے کہا...... کل صبح...... اور پھر انہوں نے تفصیل سے سارا قصہ سنا ڈالا...... خیر اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا...... قسمت کے لکھے کو کون مٹا پایا ہے۔ پاپا بولے...... اب ہمت باندھو...... حوصلے مضبوط کرو۔ تم تنہا نہیں ہو۔ ہم سب اس مشکل کا سامنا مل کر کریں گے...... اس کے آنسو رواں ہوتے دیکھ کر بولے...... پونچھ ڈالو ان آنسوؤں کو جو تم پر گذری ہے اسکا مداوا یہ آنسو نہیں کر سکتے۔ رونے والے لوگ کمزور ہوتے ہیں۔ میری بیٹی کمزور نہیں ہے۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ میری بیٹی اس طوفان کا مقابلہ بھی پوری ہمت اور بہادری سے کرے گی۔ بھول جاؤ ان لوگوں کو ان کی زندگیاں زندگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گذری ہے۔ جن کی ساری زندگی اپنی ہی گتھیاں سلجھانے میں گذری ہو وہ کیا جانیں محبت کرنا...... اور نا ہی وہ دوسروں کی محبت سمیٹنا جانتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی خوبصورتی اور نفاست سے بے بہرہ ہیں۔

ماں بولی...... اچھا ہوا تم صحیح سلامت لوٹ آئیں...... ورنہ وہاں گھٹ گھٹ کر آپ ہی ختم ہو جاتیں یا پھر وہ لوگ...... ارے تم نے اپنی پریشانی اپنے دکھ اکیلے ہی جھیلے ماں باپ تک کو خبر نہ لگنے دی۔ پر کیوں...... کلپنا کا سر جھک گیا۔ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ مجھے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ ایک دغا باز اور مکار شخص کی خاطر میں نے آپ دونوں کا دل توڑا۔ بزرگوں کی حکم عدولی کرنے کی سزا تو مجھے بھگتنی ہی تھی۔ سو خاموشی سے بھگتی رہی۔

ماں نے غمزدہ آواز میں کہا بیٹا انسان کچھ سوچتا ہے اور تقدیر میں کچھ اور لکھا ہوتا ہے۔ تقدیر کے وار سے کوئی

نہیں بچ سکتا۔ جانتی ہوں یہ دکھ بڑا عظیم ہے پر تمہیں سہنا تو پڑے گا ہی۔ یہ راستہ ہی غلط تھا...... تمہارے لئے خوشیوں اور روشنی کا راستہ نہیں تھا...... اب وہ فریبی تمہیں اندھیروں میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا ہے۔ اب یہ سوچ کر ہی صبر کرلو کہ ایسے بے اعتبار شخص سے جان تو چھوٹی...... ایسے مفاد پرست لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ غم کی شدت سے ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ رات کلپنا کے لئے مصیبت کی رات تھی۔ مستقبل میں آنے والے طوفانوں کی گڑگڑاہٹ اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ صدمہ سے چور چور تھی۔ لمحہ لمحہ گذرنا دشوار ہورہا تھا۔ ماں نے دیکھتے ہی کہا تیرے اندر کی ذہنی اور جسمانی ٹوٹ پھوٹ کی شدت کا اندازہ میں تیرا چہرہ ہی دیکھ کر لگا سکتی ہوں۔ ہر انسان کو اپنی زندگی سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور تو ایک لالچی۔ خودغرض اور بے حس انسان کے لئے آنسو بہا بہا کر خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ سیلاب بلا کہاں جاتا ہے اور کتنی تباہی پھیلاتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کی خوشیاں نگل جاتے ہیں ان پر خدا کا قہر بھڑکتا ہے۔ خوش وہ بھی نہیں رہ سکتے۔

پندرہ دن کے بعد۔ ماں کا بیان:۔

ہیراوتی اور مکیش بابو کمرے میں حاضر تھے جب میں۔ کلپنا اور اس کے ڈیڈی ان کے گھر پہنچے تھے۔ نادعا نا سلام۔ ہیراوتی بالکل نارمل اور مطمئن نظر آرہی تھیں کلپنا کو دیکھتے ہی مکیش بابو کے چہرے پر غصے کی ایک لہر دوڑی اور ہیراوتی کی آنکھوں میں واضح طور پر نفرت اور ناپسندیدگی تھی۔ ہم ان دونوں کے چہروں کا اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم گئے تو یہی سوچ کر تھے کہ اگر ساگر کو کلپنا سے ذرا بھی لگاؤ ہوگا تو حالات ضرور سدھر جائیں گے۔ ماحول میں آگ برستی دیکھ کر ہماری ساری امیدیں خاک ہوگئیں۔ کلپنا کے پتاجی ساگر کی طرف دیکھ کر بولے۔ رشتوں کو محبت کی ڈور سے باندھے رکھنے کا نام ہی زندگی ہے۔ نا گیا وقت واپس آتا ہے اور نا توڑے رشتے جوڑے جاتے ہیں۔ اس رشتے میں اگر راستے بدل جائیں۔ پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ تم دونوں تعلیم یافتہ ہو۔ سمجھدار ہو...... پھر تم دونوں مل کر اپنے گھریلو مسئلے حل کیوں نہیں کر سکتے۔ بات اتنی بڑھائی کہ لڑکی گھر چھوڑ کے میکے چلی گئی۔

مکیش بابو غرائے...... یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ پھر کلپنا سے مخاطب ہوئے۔ تمہاری اتنی جرأت اور ہمت کہ تم سارا ساماں اٹھا کر لے گئیں...... میرا گھر اجاڑ دیا تم نے...... کلپنا کے پاس اب کھونے کو بچا ہی کیا تھا۔ وہ تو تہی دامن ہی گئی تھی۔ سو وہ بولی۔ میرے آنے سے پہلے بھی اس گھر میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے آکر اس گھر کو سنوارا سجایا...... جو کچھ میں لے گئی ہوں وہ میری اپنی محنت کی کمائی کا خریدا ہوا ہے۔ پوچھئے اپنے بیٹے سے۔ ساگر جو نظریں نیچے کئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ شاید وہ کلپنا کی بات سن کر چونک گیا تھا۔

ہیراوتی بڑے جلے بھنے لہجے میں بولیں اور بولتی ہی چلی گئیں۔ کتنے ہی الزام کلپنا کے سر تھوپ ڈالے۔ آخر میں بولی۔ بہو کو اپنی حد میں رہنا ضروری ہے۔ اسے تھوڑی بہت گھرداری بھی کرنا چاہیئے۔ کلپنا نے تو مجھے اس گھر میں نوکر بنا رکھا اور چاہتی تھی کہ دونوں ساس سسر کو گھر سے باہر نکال کر خود میرے بیٹے کی کمائی پر عیش کرے۔

کلپنا کے پتاجی زہر کا یہ گھونٹ بھی خاموشی سے پی گئے۔ آہستہ سے بولے اگر بہوؤں سے غلطیاں ہوجائے تو انہیں معاف بھی کیا جاتا ہے۔ انہیں گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔ ہیراوتی بولیں۔ ہر چیز کا دام ہوتا

ہے۔ خوشیوں کا بھی۔ معافی کا بھی...... کوئی چیز آسانی سے کسی کی جھولی میں نہیں آ گرتی...... ان کے چہرے پر فتح مندی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ کلپنا کے دل میں گپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ سیاہ گھٹاؤں میں گھری ہے اور سر پر بجلیاں گر رہی ہیں۔ اس نے پھر اپنے کو سنبھالا...... اور بولی......

میرے اور ساگر کے درمیان کوئی عشق وشق کا چکر تھا ہی نہیں۔ ساگر کا کہنا تھا کہ برسوں سے وہ میرے فراق میں رہا پر منہ سے نہیں بولا کیونکہ وہ جانتا تھا مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ساگر بتاؤ اپنی ماں کو کہ تم نے ہی شادی کے لئے اصرار کیا تھا۔ بے انتہا عہد و پیمان باندھتے تھے۔ اپنے پر خلوص جذبات کا اظہار کیا تو میں نے اس کے کہے ہر حرف کا یقین کر لیا...... اور اسے خدا مان لیا...... اور اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا...... اس کا ہر حکم مانا...... اگر یہ پانچ لاکھ کا مطالبہ نہ کرتا تو مجھے ان لوگوں کی حقیقت بھی کبھی معلوم نہیں ہوتی...... میں جہیز کے خلاف ہوں اور...... وہ رک گئی...... آواز بھر آ گئی تھی...... کچھ وقفہ کے بعد بولی......

میں نے یہ شادی اپنے والدین کی مرضی کے خلاف کی تھی اس لئے یہ زہر کا پیالہ چپ چاپ پیتی رہی۔ اس وقت میری آنکھوں پر محبت کے ایسے دبیز پردے پڑے کہ اپنے ڈیڈی کی بات ہی نہ سنی۔ میں نے آپ کو کبھی نوکرانی نہیں سمجھا۔ آپ کے آرام کے لئے دو نوکرانیاں فراہم کر رکھی تھیں میں نے۔ اب ایک بھی نظر نہیں آ رہی...... میں نے اپنے مقدر بھر آپ لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کی پر نا کام رہی۔ میرا دوش یہ ہے کہ میں ہاں جی۔ ہاں جی والی بہو نہ بن سکی۔

آپ دونوں کو گاؤں بھیجنے کا مشورہ میرا نہیں آپ کے پیارے بیٹے کا تھا جس کی میں نے مزاحمت کی۔ جان سے عزیز بیٹے کی حقیقت معلوم ہوئی تو ماں کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ کلپنا کا دل غم کی شدت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا پر وہ ضبط کر رہی تھی۔...... وہ اپنے قیمتی آنسو ان بے مروت لوگوں کے سامنے نہیں گرانا چاہتی تھی ساگر کی ماں غیض وغضب سے گویا ہوئیں...... مجھے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں...... کلپنا نے ٹیپ چلا دیا...... اور بولی...... یہ تو سن لیں...... تا کہ میرے ڈیڈی کو یقین ہو جائے کہ میں بے قصور ہوں۔

ٹیپ پر ماں اور بیٹے کے درمیاں فون پر ہوئی گفتگو سنتے ہی کلپنا کے ڈیڈی کھڑے ہو گئے۔ ساگر کی طرف دیکھ کر برہمی سے بولے تعلیم یافتہ ہو کر بھی جینے کا شعور نہیں آیا تمہیں۔ میری بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ انسانیت کے بغیر انسان مردہ ہے۔ محبت کے بغیر انسان حیوان سے بدتر ہے اور محبت ہی زندگی ہے۔ میں اور کلپنا بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ اور ان تینوں کے حواس جواب دے گئے تھے۔

کلپنا نے اپنی ساس کو نمستے کہا اور ہاتھ جوڑ کر بولی...... اماں مجھے آپ کا بیٹا نہیں چاہئے...... اور ہم تینوں باہر نکل آئے...... کلپنا نے پلٹ کر اس مکان کے اندر جھانکا جہاں اس کو بے انتہا رسوا اور ذلیل کیا گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ یکا یک ہی اس مکان کے در و دیوار پر اداسی برس پڑی ہو۔ مکینوں پر ایسا غلبہ طاری ہوا کہ تینوں جہاں کہ تہاں ہی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے اور خالی خالی نظروں سے دہلیز تاک رہے تھے۔ وقت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ لمحوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ ان کے چہروں سے مسکراہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ فتح مندی کا نشہ اتر چکا تھا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے پھوٹے نصیب پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ کلپنا کے کمرے سے رونے اور سسکنے کی آواز سن کر میں اس کے کمرے میں گئی۔ وہ

مجھ سے گلے لگ کر بولی۔ اماں مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ میں انگاروں پر بیٹھی ہوں اب اور درد سہنے کی نا مجھ میں ہمت ہے نا شکتی ہے۔اب آگے ہر قدم پر دنیا والوں کے طعنے سننے پڑیں گے۔قدم قدم پر رسوائی...... آنے والے وقت کے اندیشے اسے پریشان کر رہے تھے پھر نیند کیسے آتی۔

میں نے اسے آہستہ آہستہ نرم لہجے میں سمجھایا...... بیٹا اتنا غم فکر کروگی تو یہ غم تمہیں چاٹ جائے گا...... جینے نہیں دے گا...... ماضی کو بھلانا ضروری ہوتا ہے آگے بڑھنے کے لئے...... ہمت سے کام لو...... ہمت ہارنے کا مطلب سمجھتی ہو...... ناکامی اور بربادی کی طرف قدم بڑھانا...... غلطیاں تو سب سے ہوتی ہیں...... اپنی ایک بھول کے لئے تم اپنی ساری زندگی اندھیروں اور اداسیوں میں نہیں کاٹ سکتیں...... اس ماحول سے باہر نکلنے کی کوشش کرو...... اب سونے کی کوشش کرو...... تمہیں کل آفس بھی جانا ہے۔

طلاق کے بعد۔

طلاق کے دوسرے ہی دن ساگر میرے گھر آیا...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس سے کیا کہوں اور کیسا سلوک کروں...... میں نے کہا...... آؤ...... بیٹھو...... اب کیا کچھ اور کہنا باقی رہ گیا ہے۔وہ سر جھکا کر بولا...... آنٹی کلپنا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا...... میری ماں سے کہہ دیا کہ میں ان دونوں کو گاؤں بھیجنا چاہتا تھا...... مجھے غصہ تو بڑی زور کا آیا پر میں نے ضبط کر کے کہا...... اس نے سچ ہی تو کہا تھا...... ارے تم نے تو میری بیٹی کی زندگی تباہ کر دی...... آنٹی...... وہ آنکھوں میں آنسو لئے بولا...... کلپنا کے پاس تو آپ دونوں ہیں...... میں تو اس بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا...... میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھا اور باہر نکل گیا...... میں وہیں ڈھے گئی...... ایک ماں نے اپنے بیٹے کی خوشیاں برباد کر ڈالیں...... مجھے ساگر کے لئے بھی دکھ ہوا...... کتنا بدبخت ہے اپنی ماں کی چالاکی کے جال میں پھنس کر در در بھٹک رہا ہے۔تنہا اور اکیلا......

طلاق کے دس سال بعد۔کلپنا کا بیان

فون نہ رکھنا...... میں اس کی آواز پر چونکی تھی...... اگر جانتی کہ دوسری طرف وہ دشمن جان ہے تو کبھی فون نہ اٹھاتی۔میرا دل چاہا فون پٹک دوں...... ایسے بے اعتبار اور بے حس انسان کا کہا کیوں مانوں...... مگر دوسرے ہی لمحے میرے دماغ میں انتقام کی گھنٹیاں بجنے لگیں...... دل میں دفن کیا ہوا برسوں کا درد ٹیسیں مارنے لگا...... میں گذرے دس سال کے ہر پل ہر لمحے جلی تھی۔یکایک دل میں دبی چنگاریاں شعلے بن کر بھڑکنے لگیں...... میں آج اسے جلا کر راکھ کر دونگی...... آج میری باری ہے برسوں پرانا حساب چکانے کا......

وہ خاموش تھا اور میں چپ۔میں نے اپنے الفاظ کے نشتر تیار کر لیے تھے۔کے الفاظ کے تیر نس نس کو چھید ڈالتے ہیں۔شدید درد دیتے ہیں اور زندگی بھر تڑپاتے ہیں۔تیغ و شمشیر کے زخموں سے کئی گنا زیادہ......

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ایسی درد بھری آہ جو ٹوٹے دل سے ہی نکل سکتی تھی۔جب وہ دیر تک کچھ نہ بولا تو میں نے کہا...... بولتے کیوں نہیں...... زبان کیوں گنگ ہو گئی...... یا پھر...... خیر کیسے ہو تم...... وہ بڑی دلسوز آواز میں بولا...... جی رہا ہوں...... موت کی آس میں...... کسی طرح زندہ ہوں اپنی ماں کی خوشی کی خاطر...... ورنہ اب مجھے زندگی سے کیا واسطہ...... اگر موت کرم فرما ہو جاتی تو مجھے سارے غموں سے نجات مل جاتی...... اپنے جسم کی صلیب کو ڈھوتے

ڈھوتے تھک کے چور چور ہو گیا ہوں...... برسوں بعد آج تمہاری آواز سن کر میرے مضطرب دل کو ذرا سا چین ملا ہے...... چین...... ملا...... میں نے سوچا...... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی...... نہیں...... میں تمہارا چین و قرار چھین لونگی ...... جس عرش پر میں نے تمہیں بٹھایا تھا آج وہاں سے کھینچ کر میں تمہیں فرش پر لے آؤنگی...... جو رسوائی اور ندامت میں نے سہی ہے آج اس سے کئی گنا زیادہ تمہیں میرے ہاتھوں سہنا ہوگی۔ تا کہ تم آئندہ کبھی سکون کی سانس نہ لے سکو...... کلپنا مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے پلیز فون نہ رکھنا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی...... درد تھا...... اور آج مجھے اس کے درد کی مطلق پرواہ نہ تھی......

میں نے کہا ساگر...... انسان بہت سخت جان ہوتا ہے۔ کتنے ہی حادثوں اور صدموں سے گذر جاتا ہے۔ ہر گہری چوٹ کھانے کے بعد موت کو پکارتا ہے۔ بس پکارتا ہی ہے...... مرنا نہیں چاہتا...... آنسو بھی نہیں بہاتا...... اپنے زخموں کو سینے میں چھپائے...... چہرے پر خوشیوں کا خول چڑھائے اس رنگین دنیا کے میلے میں گم ہو جاتا ہے...... بالکل تمہاری طرح......

وہ جواب کیا دیتا...... آج تو میں اسے لہولہان کرنے پر تلی ہوئی تھی...... وہ درد دینا چاہتی تھی جو زندگی بھر کے لئے لا دوا ہی رہے۔ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ ایک مطلقہ عورت کتنے عذابوں سے دوچار ہوتی ہے۔

کہو...... امریکہ کیا بزنس ٹرپ پر آئے ہو...... اپنے بہنوئی اور سسر کے توسط سے بلاشبہ تم ایک کامیاب بزنس مین تو بن ہی گئے ہونگے۔ اور کروڑ پتیوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی آ گیا ہوگا...... یہی چاہتی تھی نہ تمہاری ماں...... اور تم بھی ...... وہ دھیمی آواز میں بولا...... ایسا کچھ بھی نہیں ہے...... میرا یقین کرو...... میں نے فوراً کہا...... یقین اور تمہارا...... اب یہ ممکن نہیں...... میں تمہارے منہ سے نکلی کسی بھی بات کا بھی یقین نہیں کر سکتی...... اتنا بڑا دھوکا کھانے کے بعد...... ہرگز نہیں......

وہ دھیرے سے بولا...... کم سے کم میری بات تو سن لو...... میری ماں کی ضد مجھے لے ڈوبی...... تباہی اور بربادی کی آخری دہلیز تک پہنچا دیا مجھے...... میں ابل ہی جو پڑی...... ماں کے فرمانبردار بیٹے اپنی کمزوریوں کو ماں کی ضد کا نام مت دو۔ تم نے جو میرے ساتھ کیا تھا آج وہی اپنی ماں کے ساتھ کر رہے ہو...... ارے ماں کے سر لگا قتل کا الزام بیٹا اپنے سر لے لیتا ہے اور تم جو اپنی ماں کے اکلوتے چہیتے بیٹے ہو...... ان کی عدم موجودگی میں اپنے گناہوں کا الزام اپنی ماں کے سر لگا رہے ہو گناہ عظیم تم نے کیا...... گنہگار تم ہو اور مجرم اپنی ماں کو ٹھہرا رہے ہو۔ طف ہے ایسی اولاد پر جو اپنی ماں کے دودھ کا یہ صلہ دے اور وہ بھی غیروں کے سامنے......

شاید وہ شرم سے چور چور ہو گیا تھا۔ تب ہی تو حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اور یہی میں چاہتی تھی ۔...... اسے اس کی نگاہوں میں زمین بوس کرنا...... بے انتہا شرمندہ کرنا کہ زندگی بھر سر اٹھا کر نہ چل سکے۔

کلپنا...... میں زندہ در گور ہوں...... اب میرے بے بسی کے مزار پر اور خاک ڈال کر میری قسمت کے اندھیروں میں اضافہ نہ کرو...... میں بے حد شرمندہ ہوں...... اس کے لہجے میں اضطراب تھا...... بے حد درد سے پر تھا ایک ایک لفظ...... اضافہ...... میں نہیں وقت کریگا...... کیونکہ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ اور میں اس وقت کا انتظار کرونگی

خیر...... اس قصے کو چھوڑو...... یہ بتاؤ تمہارے گھر میں سب کیسے ہیں...... وہ کچھ وقفہ کے بعد بولا...... وہ

گھر......اب گھر نہیں رہا......پاگل خانہ بن گیا ہے......کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا......اور سب مجھے شک کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں......ماں کا وشواس ٹوٹ چکا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہیں میں انہیں گاؤں نہ بھیج دوں......بیوی کو یقین ہے کہ میں اسے چھوڑ دونگا......رشتوں سے بھروسہ اور وشواس اٹھ جائے پھر جینا محال ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے اس ماحول میں رہ کر میں پاگل ہو جاؤنگا......

میں نے کہا......اب پتا چلا کسی کے بھروسے اور اعتبار کو توڑنا کتنی ذلیل حرکت ہے۔ تم بھول گئے میں اسی راہ گذر سے گذر چکی ہوں......اور یہ سب تمہاری بزدلی کا نتیجہ ہے۔ اگر پہلے دن سے تم اپنی ماں کے غیر انسانی رویے کی سخت مخالفت کرتے تو آج تمہارے گھر کا یہ براحال نہ ہوتا......تم نے اپنی ماں کو نا کبھی روکا نا ٹوکا......

مائیں کب ٹھیک ہوتی ہیں۔......انہیں تو اپنے ہر بچے کی فکر پریشاں کرتی رہتی ہے۔ پر تمہاری ماں اور سب ماؤں سے فرق نکلیں۔ انہیں تمہاری خوشیوں کی ذرہ برابر پرواہ نہیں تھی۔......شیلا کی خوشیوں کے لئے پورا خاندان پھونک ڈالا......وہ خود بھی چلتی پھرتی کوہ آتش فشاں تھیں......پھر ان کا گھر تو پہلے جلنا ہی تھا......اور تم نے بھی اپنی ماں ہی کا ساتھ دیا......اب اپنے ہی ہاتھوں بگاڑی تقدیر کا شکوہ کرنا فضول ہے۔ انسان جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔

وہ بولا......شکوہ تو مجھے اپنے آپ سے ہے۔ کیونکہ میری بربادی میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ اس وقت میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔

میں نے کہا ہر مرد اپنے کو عورت سے برتر سمجھتا ہے۔ اپنی بیوی کو احمق سمجھتا ہے۔ بیوی صحیح بات بھی کہے تو شوہر کی انا کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کرتا وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ چاہے بعد میں زندگی بھر پچھتانا ہی پڑے۔ دیکھ لو وقت کیسے پلٹتا ہے۔ رشتے ناطے سب بدل جاتے ہیں۔ سب کچھ الٹا پلٹا ہو جاتا ہے۔ شکوے شکایت تو مجھے کرنا چاہیئے۔ مگر میں نے اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہی عدل وانصاف کرنے والا ہے۔

کلپنا خدا کے واسطے اور کچھ نہ کہو......انصاف ہو چکا ہے۔ مجھے میرے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ ایک دشمن سے بھی بدتر سلوک کیا......دوست بن کر دغا دی......میں تو یہ بھی کہنے کے لائق نہیں رہا......کہ مجھے معاف کر دو......جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ میرے کہے یہ چند الفاظ اس کا مداوا ہرگز نہیں کر سکتے......

میں چیخ پڑی......کیا کہا......معاف کروں......کیا تمہاری زبان سے نکلے یہ دو لفظ میرے دل کے زخموں کو بھر سکتے ہیں۔ ارے تم نے مجھے تو کیا میری روح تک کو مجروح کر دیا تھا۔ مجھے دنیا میں رسوا اور ذلیل کیا......اب کہتے ہو......معاف کر دو......نہیں ساگر......کبھی نہیں......تم جیسے فریبی انسان کو کبھی معافی نہیں مل سکتی......

وہ افسردگی سے بولا......اگر تم نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا تو میں زندگی بھر یونہی بے قرار رہونگا۔ اور یہ بے قراری مجھے جینے نہیں دیگی۔ میرے سر دو بچیوں اور دو بزرگوں کی ذمے داری ہے......کلپنا......مجھ پر رحم کرو......مجھے جینے کا سہارا دے دو......

میں نے کہا اس وقت کروڑ پتی بننے کا ایسا جنون تمہارے سر سوار ہوا تھا کہ تم نے میری اور میرے بوڑھے ماں باپ کی زندگیوں کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں سمجھی......کیا سوچا تھا تم نے......میری آواز کی ترشی اور بڑھ گئی تھی۔

کلپنا میں خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں...... جس جس نے ہمارے طلاق کے بارے میں سنا حیران رہ گیا...... جانتی ہو سب نے مجھے ہی دوشی ٹھہرایا...... اب انہیں حقیقت کیسے بتاتا کہ......

میں نے کہا حقیقت چھپانے کے لئے تم نے سارا دوش، سارے الزام میرے اور میرے والدین کے سر تھونپ دیئے۔ سب سے یہی کہا کہ تم بے قصور ہو...... میرے ماں باپ مجھے زبردستی لے گئے...... اپنی ساری خطاؤں کی ہی تو معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ جس دن سے تم نے گھر چھوڑا میں سکون کی سانس نہ لے سکا...... پیار چھوٹا...... عزت گئی...... دوست دوست نہیں رہے...... میرا حال تو ایک فقیر سے بدتر ہو گیا ہے۔

حالانکہ اس کی آواز سے دکھ برس رہا تھا پھر بھی میں نے اس پر ایک اور وار کیا...... کتنی آسانی سے گھر چھوڑنے کا الزام بھی میرے ہی سر لگا رہے ہو...... تم نے اور تمہاری ماں نے وہ سب کہا اور کیا جو واجب نہیں تھا۔ میں ہمیشہ تمہاری ماں کے غیض و غضب کا شکار ہی رہی...... مگر ان کی نفرت اور کدورت کی وجہ نہ جان پائی تھی۔ تم جھوٹ بولتے رہے اور حقیقت چھپاتے رہے۔ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف مجھے گھر سے ہی نہیں تمہاری زندگی سے بھی باہر نکالنے کے منصوبے بنا رہی تھیں...... تم دونوں نے مل کر میرے اوپر گھر کے دروازے بند کر دیئے۔ تو مجبوراً مجھے جانا پڑا......

یقین کرو اگر کوئی غلط فہمی ہم دونوں کے درمیان ہوتی اور تم مجھے دھکے مار کر بھی گھر سے باہر نکالتے تو بھی میں چوکھٹ کے باہر قدم نہ رکھتی...... ارے شادی تو جنم جنم کا ساتھ ہوتا ہے۔ بھلا کوئی عورت اپنا بسا بسایا گھر اجاڑنا چاہتی ہے۔ عورت جانتی ہے کہ گھر کی دہلیز پار کرنے کے بعد باہر والوں کی اٹھنے والی ہر نظر اسے چیر پھاڑ ڈالے گی۔ رسوائی اور ندامت کے سوائے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ لیکن اس دن کے فون کال نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا......

تمہاری ماں کے دل میں پنپتی نفرت اور عداوت کا علم تو مجھے روز اول سے ہی تھا۔ جب تمہارا رویہ بدلا تو تمہارے دل کے بدلنے کا احساس ہوا۔ احساس ہونے کے بعد یقین کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا...... میں خاموشی سے سارا تماشہ دیکھتی رہی۔

فون پر سارا راز کھلا...... یہ جان کر کہ تم بھی ماں کی سازش میں ملوث تھے میرے اوپر تو بجلی ہی گر گئی تھی ...... دونوں نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی...... میرے سر پر سے چھت کھینچ لی تھی...... پھر اور دوسرا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا......

شوہر تو عورت کی طاقت ہوتا ہے...... اس کی ڈھال ہوتا ہے...... ہر مصیبت سے بچانے والا...... ہر مشکل میں قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ چلنے والا...... جب ڈھال ہی ٹوٹ جائے تو عورت کو تحفظ کون دیگا...... کون...... تم بتاؤ۔

ساگر تم نے تو زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی...... کہا تھا تمہیں مجھ سے بے پناہ پیار ہے...... کیا پیار ایسا ہوتا ہے۔ چلو مانا تمہاری ماں مفاد پرست ہیں پر تم بھی بے حد خود غرض اور مطلب پرست انسان ہو۔ ایک تعلیم یافتہ انسان اس حد تک گر جائے گا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا......

جانتے ہو ساگر دنیا کا سب سے موذی روگ جہالت ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ دنیا تم جیسے تعلیم یافتہ جاہلوں سے بھری پڑی ہے۔ جہالت کا روگی بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ اپنے مفاد کے لئے پلک جھپکتے ہی اپنے سارے رشتے ناطے توڑ ڈالتا ہے۔ اپنے پیاروں تک کو نہیں چھوڑتا...... ڈس لیتا ہے۔ جیسے تم نے مجھے...... مجھے خدا پر بھروسہ تھا اور تمہیں دولت پر یقین تھا۔ تمہاری ماں نے تمہیں دولت کے سنہرے سپنے دکھائے...... صرف دولت کی چمک دمک کے تصور سے

ہی تمہاری آنکھیں چندھیا گئیں......اور تم بن پیندے کے لوٹے کی طرح گھوم گئے۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا تم اپنی ہی چالاکی کے چال میں پھنس چکے تھے۔ تم جیسے لوگ ہمیشہ ہی شکست و ریخت کا شکار بنے رہتے ہیں......اور شکست ہونی بھی چاہئے۔ یہ بھول جاتے ہیں دوسروں کی خوشیاں نگل جانے والوں پر خدا کا قہر ضرور برستا ہے۔ مجھے تمہاری حالت ویسے بھی موت سے بدتر نظر آ رہی ہے......ایسے حالات میں اکثر لوگ خودکشی کر لیتے ہیں......تم اپنے کو سنبھالنا......

یاد کرو وہ دن جب تم نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر میرا قتل کیا تھا......مجھ سے میری زندگی چھین لی تھی ......مجھے موت کے منہ پہ لا کر کھڑا کیا تھا......اگر میرے ماں باپ مجھے نہیں سنبھالتے تو شاید میں بھی گھبرا کر خودکشی کر لیتی۔

کلپنا مجھے بددعائے نہ دو......تمہاری آہیں مجھے تباہ کر دیں گی......میں اپنے حصے کی سزا بھگت رہا ہوں اور یہ سزا تو مجھے تاعمر بھگتنی ہوگی۔ تم نے بھی مجھ سے پیار کیا تھا......تمہیں اس پیار کا واسطہ......مجھے معاف کر دو......

میں اپنی بے کسی اور بے بسی کا ذکر کس سے کروں......میں اپنے والدین کا چہیتا اکلوتا بیٹا تھا......ان کی ہر امید ہر آس مجھ سے وابستہ تھی......اس لئے تو ہر قدم پر درد ہی درد ملے......میری ماں نے ساری زندگی پیسے کا رونا رویا......وہ شیلا کو غریبی کے عذاب سے بچانا چاہتی تھی......انہوں نے خیالوں اور خوابوں میں آرزوؤں اور خواہشوں کا ایک محل تعمیر کر لیا......خوابوں اور حقیقت میں آسمان اور زمین کا فرق ہوتا ہے۔ آگے جو ہوا سو تم جانتی ہی ہو......میں پانچ لاکھ روپے کہاں سے لاتا......وہ بضد تھیں......آخر انہوں نے اپنے دودھ کے معاوضے میں......ہمارا طلاق مانگا......پھر ان کا وہ محل بھی ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو گیا......اور ہمارا پورا کا پورا خاندان اس ملبے میں دب کر سخت زخمی اور گھائل ہو گیا۔ تم اپنے اصولوں کی پابند رہیں جو درست تھے......اور میں مجبور تھا......

میری آواز اب دھیمی پڑ گئی تھی......سو تمہاری ماں نے اپنی تمناؤں کو تکمیل پہنچانے کے لئے میرا گلا گھونٹ ڈالا......اور تہمتیں میرے والدین پر لگائیں......انہیں سر عام رسوا کیا......میں پہلے ہی دن تمہارا چہرہ دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر تم میں حق بات بولنے کی ہمت نا تھی تو خاموش رہتے۔ لیکن تم مجھے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلاتے رہے۔ مجھے دھوکا دیتے رہے۔ میں بولتی ہی چلی گئی۔ مجھے اپنے اوپر کوئی اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ میرا لہجہ بھی طرار ہو گیا تھا۔

دنیا میں ذلیل اور خوار کرنے کے بعد کہتے ہو تمہیں معاف کر دوں۔ تم ہی منصفی سے کہو اگر ایسا تمہاری بہن کے ساتھ ہوتا تو تم کیا کرتے......ساگر کو ایسا لگا جیسے گرم گرم پگھلا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا ہو......وہ جواب نہ دے سکا......خاموش کیوں ہو گئے......جواب دو......تمہارے دل کی عدالت کیا کہتی ہے۔

کافی دیر کے بعد دھیمی اور آزردہ آواز میں بولا......کاش شیلا کے ساتھ اتنا ہی ہوا ہوتا......اس معصوم کو تو میرے اور میری ماں......دونوں کے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اور اسے ساری عمر اکیلے ہی جینا پڑے گا کیونکہ اس کا تو طلاق بھی نہیں ہوا......میں نے ایک دم حیرانی سے سوال کیا......کیا ہوا شیلا کو......میں نے سوچا ایک شیلا ہی تو اس گھر میں تھی جو میرا خیال رکھتی تھی......میری بہی خواہ تھی۔

اس کی آواز میں درد گھلا تھا......ہم اسے اس بلا سے نہ بچا سکے......شیلا کا شوہر پانچ لاکھ روپے اور زیور لے کر بھاگ گیا......سات دن کے بعد شیلا ہونگ کونگ سے اکیلی واپس لوٹ آئی......آج تک اس کے شوہر کا سراغ نہیں ملا

......وہ کون تھا......کیا تھا......کسی کو نہیں معلوم......سب فروڈ نکلا......ہم اس کا نام تک نہیں جانتے......

شیلا کی ایک بیٹی ہے۔ ماں اس کی پرورش کر رہی ہے...... بچی گونگی ہے......گھر والوں کی کڑوی کسیلی باتوں سے گھبرا کر شیلا لندن چلی گئی......وہاں نوکری کر رہی ہے......کسی طرح رو رو کر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے......یہ درد ناک قصہ سن کر مجھے بے انتہا رنج ہوا......میں اندر ہی اندر سسک اٹھی تھی......ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ ستائی ہوئی لڑکی سمجھ رہی تھی۔......شیلا کے ساتھ تو اور بھی برا ہوا تھا۔......مکمل خاموشی۔ مکمل سکوت چھا گیا تھا۔ میں جانتی تھی ساگر کی مایوسی عروج پر تھی۔ بڑی مشکل سے بول پائی۔ میں نے کہا تھا نا بک جاؤ گے......میرا تو رواں رواں رو رہا تھا پھر میری آواز ہی نہ نکلی......

ساگر بولا......سب کچھ کھونے کے بعد میری ماں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے۔ بار بار کہتی ہے میں اپنے کو بہت ہوشیار اور عقلمند سمجھتی تھی۔ دولت کی ہوس نے میری عقل اندھی کر دی تھی۔ اب جہیز کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں کہتی ہیں ہم سب کو مل کر اس لعنتی چیز کو مٹانا چاہیئے۔ جہیز نے ہم جیسے معمولی انسانوں کو پریشاں کر رکھا ہے۔ اب تو بس تمہارے ہی گن گاتی ہیں......پاپا بھی کہتے ہیں تمہارے دل میں کوٹ کپٹ نہیں تھی۔ تم خاندان کا بھلا چاہتی تھیں......ہم نے ہی اسے نیکیوں کے بدلے بدی دی......اس کی خوبیوں کو نہ سمجھ پائے۔

ساگر کچھ وقفہ کے بعد بولا، میں اپنی کتھا سنائے جا رہا ہوں......اپنا حال تو بتاؤ......میں نے کہا جب خدا دوست ہو تو پھر کسی کی دشمنی سے کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے میرے لئے کچھ اور ہی سوچا تھا۔

غموں کے انبوہ ساتھ ساتھ رواں دواں تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ غموں کی دھوپ اور کڑی ہو گئی تھی۔ رسوائی اور تنہائی مجھے ڈسنے لگی تھی۔ پھر بیماری نے آدبوچا......میرے حوصلے جواب دینے لگے تھے۔ آگے کا تنہا سفر اور بھی کٹھن نظر آ رہا تھا......

. خدا کو مجھ پر رحم آ گیا......مجھے ایک ایسی ہستی سے ملایا جس نے میرے زخمی وجود کو تھام لیا۔ مجھے دوسری زندگی دی۔ ایک بار پھر معاشرے میں مجھے ایک مقام دلایا......وہ بولا......میری زندگی کا ہر پل......ہر لمحہ ایک سزا بن کر رہ گیا ہے۔ کسی طرح دل کو چین و قرار ہی نہیں ملتا۔ ایک بار تمہارے روبرو کھڑے ہو کر......ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگ لوں تو شاید یہ بے چینی اور بے قراری ذرا کم ہو جائے۔ اگر تم مجھے معاف کر دو گی تب ہی تو میں سوچونگا کہ بھگوان نے بھی مجھے معاف کر دیا۔ اور میری تکالیف و آرام اور پریشانیاں دور ہو جائینگی۔

اچھا ہوا تم نے مجھے اپنے دل سے باہر نکال پھینکا......سمجھ میں نہیں آتا کس طرح تمہاری یادوں کے چراغوں کو......میں فوراً بولی......بجھا دو ان ماضی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو......بے نور کر دو انہیں......بھول جاؤ اس کالے اندھیرے ماضی کو اور نئی روشنی میں قدم بڑھاؤ......اگر اب بھی تم نے خود کو نہیں سنبھالا تو تا عمر بھٹکتے ہی رہ جاؤ گے۔ نئی زندگی کا آغاز کرو جس کی نیو صرف اور صرف ایمانداری اور وفاداری پر ہو۔ اگر نیو پختہ نہ ہو گی تو آندھی کا پہلا جھونکا ہی گھر کی دیواروں کو ہلا دے گا۔ یہ زندگی کا سفر تو جاری رہے گا ہی۔ سو آئندہ ہر ایک کے ساتھ حکمت سے پیش آنا۔ کتنی بھی آفتیں اور مصیبتیں آئیں......میداں چھوڑ کر نہ بھاگنا......ہمیشہ ایک بات یاد رکھنا......دنیا میں سب سے قیمتی شے محبت ہے۔ جس کے بغیر امیر ہو یا غریب کسی کو راحت نصیب نہیں ہوتی۔ سو محبت سمیٹنا اور محبت

بانٹنا سیکھو ورنہ دنیا میں تنہا رہ جاؤ گے۔

وہ سن کر کچھ دیر بعد بولا...... میں تمہاری ہر بات مانوں گا...... تم صرف میری ایک بات مان لو...... میں نے کہا جو تم چاہتے ہو...... وہ اب کبھی نہیں ہو سکتا...... میں اب تم سے بہت دور ہوں...... اب ہم دو الگ الگ راستوں پر کھڑے ہیں۔ ہماری منزلیں جدا جدا ہیں۔ اب کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چل کر ہم دونوں مل سکیں۔ زندگی کے سفر میں جو بچھڑ جاتے ہیں وہ پھر کبھی نہیں ملتے۔ یہی دستور زندگی ہے۔

وہ بولا...... آس تو ہمیشہ دل میں زندہ رہے گی۔ منتظر رہوں گا...... شاید...... کبھی...... کہیں...... زندگی کے کسی موڑ پر ہم پھر مل سکیں......

کلپنا...... پلیز...... میری بات مان لو...... یہ ضروری تو نہیں جو ایک بار منہ کے بل گر جائے اور روند ڈالا جائے اسے سہارا دے کر اٹھایا نہ جائے...... بس اتنا کہہ دو کہ تم نے میری ساری خطائیں بخش دیں۔

میں اپنا دکھ بھول کر شیلا کے بارے میں سوچنے لگی...... شیلا کا قصہ سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں دیر تک ریسیو پکڑے بیٹھی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں شیلا اور ساگر کے خاندان کے ہر فرد کی سکھ شانتی کی دعا مانگی۔...... میں نے تمہیں معاف کیا...... ساگر...... دل سے معاف کیا......

کلپنا...... تم اب اگر نہ ملو تو کیا...... اور ملو بھی تو کیا...... تم تو دیوی ہو...... میں زندگی بھر تمہاری پوجا کروں گا۔ یہ سن کر مجھے بھی صبر ہو گیا...... اسے بھی چین آ گیا تھا...... آہستہ آہستہ میں نے ریسیور رکھ دیا......

☆☆☆

منجدھار (۱)

وہ کسی سے باتیں کرنے میں محو تھی جب سومناتھ کی پہلی نظر اس پر پڑی۔ سومناتھ نے اسے بڑے سرسری انداز سے دیکھا تھا۔ اور ایک نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ سو وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن کچھ تو ایسا ضرور تھا اس لڑکی میں جس نے سومناتھ کو دوبارہ مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار سومناتھ نے اسے غور سے دیکھا اور منہ سے بے ساختہ نکلا...... ''گدڑی میں لعل'' ...... اتنی حسین اور اتنی بھولی صورت ...... یہ تو دل میں بسانے کے لائق ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس خیال نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ...... نہیں ...... ایسا نہیں ہوسکتا ...... یہ ایک ...... اور میں ...... اسی پل حیثیت کے فرق کی ان دیکھی دیوار آن کھڑی ہوئی ...... اس نے فوراً ہی یہ خیال دل سے جھٹک دیا......

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ...... دروازہ کھولا ...... لڑکی کو کھڑا دیکھ سومناتھ نے حیرت سے پوچھا ...... کون ہو تم ......؟ ...... میں جی ...... میں لڑکی ہوں بابو جی ...... وہ بھنائی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ تو مجھے بھی دکھ رہا ہے کہ تم لڑکی ہو ...... لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ...... وہ پھر شوخ ہوئی ...... میں یہاں کر تو کچھ نہیں رہی ...... ایک بات بتاؤ بابو جی کیا یہی سومناتھ بابو کا گھر ہے؟ ...... وہ بولا گھر یہی ہے اور میں ہی سومناتھ ہوں......

''تو آپ ہٹو ...... راستہ دو گے تب ہی تو میں اندر جا کر آپ کے گھر کا کام کرونگی ...... ایسا ہے بابو جی میری ماں شدید بیمار ہے ...... آج سے میں آپ کے گھر کا کام کرونگی ...... بابو ناراض نہ ہونا ...... ساری رات ماں کے پاس ہسپتال میں جاگ کر کاٹی ...... صبح ذرا آنکھ لگ گئی تھی ...... سو آنے میں دیر ہو گئی۔'' وہ پھر مسکرائی'' ...... خفا تو نہیں ہوئے بابو جی آپ......

سومناتھ غرایا ...... ''تم باتیں بہت زیادہ کرتی ہو ...... اتنی بکواس کرو گی تو کام کیا کرو گی ...... سومناتھ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ...... میرا دماغ کھاؤ گی ...... اپنے گھر جاؤ ...... آرام کرو ...... جب رات بھر جاگی ہو تو کام کیا خاک کرو گی......

وہ بند دروازے کو دیکھتی ہی رہ گئی ...... لیکن بڑی ڈھیٹ تھی ...... ٹل کر نہ رہی ...... کچھ وقفہ کے بعد اس نے پھر بیل بجائی ...... سومناتھ نے اندر ہی سے ڈانٹ پلائی ...... کہا نا ...... گھر جا کر آرام کرو ...... کل آجانا ...... پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم خود بخود دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

دروازہ کھولا ...... اب وہاں ایک کے بجائے دو لڑکیاں کھڑی تھیں ...... وہ حیرانی سے دوسری لڑکی کو دیکھتا ہی چلا گیا ...... دل گنگنایا ...... ''یہ تو وہی ہے ...... بڑی لڑکی نے اپنی آبدیدہ سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ نجانے کیا تھا ان خوبصورت جھیل جیسی آنکھوں میں ...... سومناتھ ان آنکھوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ لڑکی نے سر جھکایا تو آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہتے چلے گئے ...... سومناتھ اس کی یہ حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھا ...... بھئی روتی کیوں ہو ...... فٹافٹ چھوٹی لڑکی بولی ...... بابو جی ماں بیمار ہے نا ...... اور دوائیوں کے لئے ...... ''ٹھیک

ہے ٹھیک ہے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے...... اس نے جیب سے نوٹ نکال کر آگے بڑھائے۔ چھوٹی لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ تھامے اور بولی۔ ''بابو جی کتنے ہیں'' ہم محنت کر کے کماتے ہیں...... کسی سے خیرات نہیں لیتے ...... یہ ادھار رہا...... آپ تنخواہ سے کاٹ لینا......

سومناتھ کا پورا دھیان تو لڑکی پر تھا...... اس نے چھوٹی لڑکی کی بات پر کان بھی نہ دھرا...... بڑی لڑکی متواتر روئے جا رہی تھی ...... سومناتھ بولا...... بھئی اب تو رونا بند کرو...... اور گھر جا کر دونوں آرام کرو...... رات بھر جاگی ہو...... ایک دن کھانا نہ کھانے سے میں مر تو نہیں جاؤنگا...... چھوٹی نے فوراً جواب دیا...... مریں آپ کے دشمن ۔بابو آپ تو بازار سے لے کر کچھ کھالو گے...... بھوکے تو ہم مر جائیں گے۔ کام نہیں کرینگے تو کھائینگے کیا...... ہم غریبوں کی قسمت میں آرام کہا...... پانچ گھروں کا کام نمٹا کر ہسپتال جانا ہے۔ ماں ہسپتال میں اکیلی پڑی ہے'' بڑی لڑکی دھیمی آواز میں بولی۔ ماں کہہ رہی تھی کہ آپ کو تو چائے بنانی بھی نہیں آتی ...... یہ سن کر سومناتھ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی...... دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا...... جب بڑی لڑکی اس کے پاس سے گزری تو بولا...... ''پہلے ایک پیالی چائے بنا دو...... بری عادت پڑ گئی ہے ناچائے پیئے بناء دماغ کام نہیں کرتا......

چھوٹی فوراً گھر کی صفائی میں مصروف ہوگئی اور بڑی نے کچن سنبھالا ...... چائے بنا کر کھڑی تھی ...... سونی کو دیکھا تو بولی ...... سونی ادھر آ ...... بابو کو چائے دے آ...... دیدی تم دے دو میں ذرا دکان جا رہی ہوں...... کہتی ہوئی وہ باہر بھاگ گی......

موہنی کی جان پر آبنی...... کرے تو کیا کرے...... مرتی کیا نہ کرتی...... چائے لے کر آگے بڑھی...... وہ ہر قدم ڈر ڈر کر اٹھا رہی تھی۔ کبھی کمرے کا دروازہ تکتی تو کبھی ہاتھ کی پیالی...... سومناتھ اپنے آدھے کھلے دروازے سے یہ سارا منظر دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا...... جیسے ہی دروازے پر نوک کیا...... سومناتھ نے سونے کا ڈھونگ رچایا...... وہ اسے سوتا دیکھ کر واپس پلٹی...... دروازے تک پہنچی...... پھر پلٹ کر دیکھا...... سومناتھ اپنی آنکھیں مل کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا...... اس نے میز پر چائے رکھی اور بمشکل دھیمی سی آواز اس کے حلق سے نکلی...... بابو جی چائے ...... فوراً ہی سومناتھ نے اس کا چہرہ گھورتے ہوئے کہا...... تھینک یو ویری مچ...... تم بہت اچھی ہو......

موہنی کا دل ایک سرخوشی کے عالم میں تیزی سے دھڑکنے لگا...... لیکن اس نے ایسے جتایا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ...... اور غیر محسوس انداز میں بابو کی طرف دیکھ کر بولی ...... کیا پکاؤں بابو جی...... سامنے کھڑے بے انتہا خوبصورت نازک سے وجود کو دیکھ کر سومناتھ کے ہوش اڑے جا رہے تھے...... جواب کیا دیتا...... جب وہ کچھ نہ بولا...... تو لڑکی آگے بڑھ گئی......

پیچھے سے آواز آئی...... جو تمہاری مرضی...... وہ ایک دم پلٹی...... دل نے کہا گھر تمہارا...... مرضی ہماری ...... پر ایسا کیوں...... ایک نظر بابو پر ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی...... سنو...... تم نے اپنا نام نہیں بتایا...... وہ پھر رکی اور پلٹ کر دیکھا...... بولی ایک کام والی کا نام جان کر کیا کرو گے بابو؟...... اور پھر چل دی...... سنو تو...... وہ پھر رکی ...... تم میرے لئے ایک کام کرنے والی نہیں ہو...... اس نے بابو سے آنکھ ملا کر سوال کیا...... تو پھر کیا ہوں میں ...... بابو جی...... دھیرے سے مسکرا کر بولا...... تم اپنے دل سے سوال کرو...... جواب مل جائے گا...... اور ہاں اب تو

نام بتادو......وہ پھر بولی...... "موہنی"......بابو مسکرایا "دل موہ لینے والی موہنی"......موہنی کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے......لیکن وہ سر جھٹک کر باہر نکل گئی......

دوسرے دن وہ گھر میں داخل ہوئی تو گانا سن کر ٹھٹک کر رہ گئی......تم کو چاہا تو خطا کیا تھی بتادو مجھ کو ......دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو......سومناتھ نے کیسٹ بند کیا اور موہنی کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر بولا......سچ ہی تو ہے......ہے کوئی تم جیسی؟......وہ شدید حیرانی سے ایک قدم پیچھے کھسکی......وہ آنکھوں میں خمار لئے کہہ رہا تھا......کیا جواب دیا تمہارے دل نے میں تو رات بھر سو بھی نہ سکا......موہنی الجھی ہوئی نہایت پریشاں سی دونوں پیر جما کر کھڑی رہی......اس کی آواز پر چونکی......کچھ تو بولو......میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں......موہنی نے بابو کے چہرے پر آنکھیں جما کر کہا......یہ دل کی باتیں تو آپ جیسے بڑے لوگوں کی عادت ہے۔ہم غریب تو کسی طرح جیئے جاتے ہیں جبکہ موت آ کر ہمیں اس دنیا سے چھٹکارا نہ دلا دے۔یہ دل کے رشتے جنہیں ہم بہت مضبوط سمجھ لیتے ہیں۔دراصل بہت نازک ہوتے ہیں......ذرا ہواؤں کا رخ بدلا اور رشتے چھن سے ٹوٹ جاتے ہیں۔آبگینوں کی طرح......پھر انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں بچتا......بس ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔"

ارے تم تو بڑی سیانی ہو۔بڑی اونچی اونچی باتیں کر رہی ہو......وہ غمناک لہجے میں بولی......صرف باتیں ہی نہیں۔یہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے۔وہ فرش پر بیٹھ گئی۔میں نے اس چھوٹی سی عمر میں اتنے دکھ سہے ہیں کہ اب کوئی دل کی بات بھاتی نہیں......یقین نہیں آتا ان باتوں پر......ہم بھی ذات کے برہمن ہیں......آج جو ہمارا حال آپ دیکھ رہے ہیں......ایسا پہلے نہ تھا......یہ درد......یہ خواری تو ہمارے اپنوں کی دی ہوئی عنایات ہیں۔

ایک زمانہ تھا......سب کچھ ہی تھا ہمارے پاس......دیس چھوٹا......گھر دوار......زمین جائیداد سب ہی چھوٹ گیا......سچ بابو بدلے ہوئے حالات سے دل خوفزدہ ہے۔جب سگے بھائی اور باپ ہی نے چھوڑ دیا تو غیروں سے کیا توقع کریں......ماں کہتی ہے کبھی کسی مرد کی بات کا یقین نہ کرنا......فریبی ہوتا ہے مرد......بابو ہمیں نہ چھیڑو......ہم قسمت کے مارے ہیں......بڑے بھائی کی بے رخی۔باپ کی بے وفائی کا دکھ ہر دکھ پر بھاری ہے۔......ماں کہتی ہے دونوں ہاتھ پھیلا کر مانگا تھا انہیں میرے باپ نے۔بہت چاہتے تھے......بابو کیا پیار بھی مر سکتا ہے......اس نے بابو سے سوال کیا......

بابو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا......پیار تو دائمی شئے ہے......دنیا کی ہر شئے فنا ہو جاتی ہے۔پیار ہے تب ہی تو دنیا چل رہی ہے۔......نہیں بابو......وہ بڑے غمزدہ لہجے میں بولی......یہ سب کتابوں کی باتیں ہیں......مجھے ان باتوں پر یقین نہیں رہا......وہ اپنی کہانی سنانے لگی......جب بنگلہ دیش میں واویلا مچا تو ہم جان بچا کر بھاگ رہے تھے......باپ بیٹھا دیکھ رہا تھا......ماں سے بولا......یہ میری جنم بھومی ہے......میں یہیں جیوں گا یہیں مروں گا......پل بھر میں سارے رشتے توڑ دیئے اس نے......سب کا خیال تھا دیس کی مٹی میں بڑی کشش ہوتی ہے......اس مٹی کے سامنے بیوی بچوں کی محبت ماند پڑ گئی......وہ سب جھوٹ تھا بابو......سب جھوٹ......حقیقت بڑی کڑوی تھی......میرا باپ تو بھرشٹ ہو گیا......اپنا نام اور ایمان دونوں ایک عورت کے ہاتھ بیچ ڈالا......زہرہ خالہ جیسی بلا کی خوبصورت......زمینوں جائیداد والی جوان بیوہ کے لئے رشتوں کی کیا کمی

تھی۔......لیکن اپنے ہی اپنوں کے گلوں پر چھریاں چلاتے ہیں۔زہرہ خالہ اور میری ماں کی بہت گہری دوستی تھی ......سب انکی دوستی پر رشک کرتے تھے......لیکن وہ بھی دغا دے گئیں......خالہ نے ہمارے ہی گھر میں نقب لگائی اور اپنی دوست کی سب سے قیمتی شے چرالی......چھپ کر وار کیا تھا خالہ نے......ماں کو خبر بھی نہ ہونے پائی تھی ......ماں نے باپ کے پاؤں پکڑ لئے......پرانی رفاقتوں کا واسطہ دیا......پر باپ تو خالہ کی محبت میں سب بھول گئے تھے......ایک نہ سنی......ہم دونوں بہنیں ان سے لپٹ کر بہت روئیں......گڑگڑانے پر وہ ہاتھ چھڑا کر پلٹ گئے......یہ تو ہم سب ہی جانتے تھے کہ اب بچھڑے تو زندگی بھر نہیں ملنا......اسی لئے تو ماں کہتی ہے مرد کا دل بدلتے دیر نہیں لگتی......

سومناتھ بولا......تمہاری ماں تو اتنے دکھ سہنے کے بعد بھی بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہیں......بالکل تمہاری طرح......موہنی نے نظریں اوپر کیں......سومناتھ کی شوخی اور شرارت سے بھری آنکھوں کو دیکھ کر ذرا ہچکچائی ......پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی......شادی سے پہلے ہر مرد کو اپنی بیوی سندر لگتی ہے۔نہ جانے شادی کے بعد مرد کے دل کو کیا ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنی بیوی میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی......میرے باپ کے دئے سارے غم ماں نے اپنے دل میں چھپا رکھے ہیں۔یہاں کوئی نہیں جانتا کہ ہمارے باپ نے ماں کو چھوڑ دیا ہے۔بابو آپ بھی تو ہماری ذات کے ہیں۔آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم لوگوں میں بیواؤں کی عزت اور قدر ہوتی ہے۔ہمارے یہاں طلاق کا رواج ہی نہیں۔مرد جب چاہے بیوی کو چھوڑ کر چل پڑتا ہے اور چھوڑی ہوئی عورت سب کی نظر میں گر جاتی ہے حالانکہ وہ بے قصور ہوتی ہے......قصور تو سارا اس کے شوہر کا ہوتا ہے۔سچ بابو ہمارے یہاں تو سارے دوش عورت کے ہی سمجھے جاتے ہیں۔یہاں ہمارے دل ابھی تک خون کے رشتوں کے لئے تڑپ رہے ہیں......پر اب کیا ہو سکتا ہے۔باپ نے اپنے جیتے جی یتیم کر دیا ہمیں......

اس نے سومناتھ سے سوال کیا......بابو مرد اتنے سنگدل کیوں ہوتے ہیں۔......اپنی خوشی کی خاطر سارے پرانے رشتوں کو......یہاں تک کہ اپنی اولاد تک کو روند کر چلے جاتے ہیں......جبکہ ماں مرتے دم تک اپنے بچوں کو آنچل میں چھپائے رکھتی ہے کہ کہیں تیز اور گرم ہوا کا جھونکا اس کے بچوں کو جھلسا نہ دے......موہنی کی آواز ہی آنسوؤں کی آمیزش ہونے لگی تو وہ اچانک کھڑی ہوگئی اور کچن کی طرف بڑھ گئی......

ماں کو پھر دل کا دورہ پڑا......موہنی دو دن کام پر نہ جا سکی......سومناتھ کے دن رات کٹنے محال ہوگئے......بڑی بے تابی سے وہ موہنی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔جب وہ آئی تو اسے دیکھتے ہی بولا......اس دن تمہاری داستان الم نے ہلا کر رکھ دیا......میں نے اپنے آپ سے کئی بار یہ سوال کیا......کہ مرد اتنے سنگدل کیوں ہوتے ہیں......جواب ایک ہی ملا کہ سب مرد ایک سے تو نہیں ہوتے......موہنی......میں تمہیں سچے دل سے چاہتا ہوں......اور تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں......وہ تو جیسے اچھل گئی......کیسی باتیں کرتے ہو بابو......ہوش میں آؤ......یہ ناممکن ہے......ایسا کبھی نہیں ہو سکتا......سومناتھ بولا......دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں......ایسا ہی ہوگا۔ ہم اور تم......وہ بولی......یہ ایک خواب ہے بابو اور خواب کبھی سچے نہیں ہوتے......

وہ اسے یقین دلانا چاہتا تھا......اس کے بالکل قریب آ کر بولا......آج تک میرا ہر خواب پورا ہوا

ہے...... یہ بھی ہوگا...... وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی...... بابو اپنا دامن کانٹوں میں نہ الجھاؤ...... وہ جتنا سومناتھ سے دامن بچا رہی تھی اتنا ہی وہ سومناتھ کے دل میں اترتی جا رہی تھی...... وہ مڑ کر جانے لگی تو سومناتھ نے اس کا راستہ روک کر کہا ...... خدا کے واسطے میرا یقین کرو...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... سومناتھ کے لہجے سے اشتیاق اور آنکھوں سے محبت چھلک رہی تھی......

موہنی نے اپنے بگڑے ہوئے حواس کو سنبھالا اور سخت لہجے میں بولی...... میں نے کہا ناں...... یہ نہیں ہو سکتا...... وہ ایک دم چل دی...... بولی بابو...... بس...... مجھے کام بھی کرنا ہے...... لیکن اس کے دل میں ایک عجب سی ہلچل مچ گئی تھی......

دوسرے دن جب صبح کی چائے لے کر سومناتھ کے کمرے میں گئی تو اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر گھبرا کر پوچھا...... بیمار ہو بابو...... ڈاکٹر کو دکھا دو...... وہ بولا...... تم ہی تو میری ڈاکٹر ہو...... وہ اسے سمجھانے بیٹھ گئی...... بابو اس دنیا میں ہر انسان محبت کا بھوکا ہے...... لیکن آپ سے اس محبت کے تقاضے اٹھائے نہیں جائینگے...... بابو محبت اور شادی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ شادی تو پہلے سے ہی کاروباری معاملہ تھا...... اس خود غرض زمانے میں اب محبت بھی کاروباری ہو گئی ہے۔...... کہتے ہے دل پر زور نہیں...... اس لئے غریب لڑکی سے محبت کا اظہار تو کیا جا سکتا ہے لیکن مجھ جیسی غریب یتیم لڑکی سے شادی نہیں کی جا سکتی۔ آپ کا خاندان...... سماج...... رتبہ آپ کو اس شادی کی اجازت کبھی نہ دے گا......

وہ بولا...... میں نے تم سے اپنے دل کی بات کہی اور تم دنیا داری کے تقاضے لے کر بیٹھ گئیں...... پیار میں نہ کوئی دنیا داری نہ مجبوری...... پیار تو پیار ہوتا ہے......

''وہ بولی آپ شادی بھی کر لو گے پھر آخر ہو گا وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے''......

وہ بولا...... کیا ہوتا آیا ہے''......

موہنی نے نظریں اٹھا کر کہا...... آپ مجھ سے اپنا دامن چھڑا کر چلے جاؤ گے۔ اور دنیا والے مجھے ٹھکرائیں گے...... سومناتھ بولا...... ایسا کبھی نہیں ہو گا...... وہ مسکرا دی...... موہنی کے دل کی دھڑکنیں تو پہلے ہی اتھل پتھل ہو چکی تھیں...... شادی کا ذکر ہوتے ہی اسے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ دروازے پہ دستک ہوئی ...... موہنی کے اندر ایک زوردار جھٹکا سا ہوا...... ہواؤں کے دوش پر لہراتی وہ دھم سے نیچے آ گری...... موہنی کہاں ہے تو تیری ماں کی حالت زیادہ بگڑ گئی ہے...... جلدی ہسپتال پہنچ...... موہنی باہر بھاگی...... سڑک پر جاتے ہوئے خالی رکشے پر سوار ہو گئی......

ماں کی حالت ذرا سنبھلی تو موہنی کام کرنے چلی گئی...... نیند میں ڈوبی بھاری آواز کمرے کی فضا میں گونجی ...... موہنی چائے...... وہ چائے لے کر گئی...... آنکھوں میں محبت کے جلتے دیئے لے کر وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا...... مسکرا کر بولا...... ''میری بات مان لو'' ...... وہ دور جا کھڑی ہوئی...... بولی...... یوں بھی بستی والوں نے میرا جینا محال کر دیا ہے...... روز کوئی نہ کوئی رشتہ لے کر ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے...... ہم غریب لوگ ہیں اور غریبوں پر انگلیاں اٹھانے والے بھی بہت ہیں جبکہ آپکی دولت آپ کے سارے عیب ڈھانک لے گی...... ماری تو میں جاؤں گی

......سو اس قصے کو یہیں ختم کر دو......

میرا یقین کرو کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... ابھی اور اسی وقت...... اسی حال میں...... یقین سے بھرپور لہجہ...... آنکھوں میں پیار کی چمکتی لو...... موہنی ٹپٹا گئی...... ایک حسین...... تعلیم یافتہ شائستہ جوان...... ایک غریب بے سائبان لڑکی سے زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کر رہا تھا...... پھر وہ نادار...... مسکین لڑکی کیسے یقین نہ کرتی ......وہ تو یقین کی منزل سے بہت آگے نکل چکی تھی...... لیکن اندیشوں سے دل پھر گھبرایا......

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا...... محبت میں اندھا انسان سب کچھ بھول جاتا ہے...... ایسا ہی سومناتھ کے ساتھ ہو رہا تھا...... موہنی کی محبت میں ایسا دیوانہ ہو گیا تھا کہ اپنی حیثیت۔ خاندان۔ اور اپنا مقام سب بھول گیا تھا...... یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے پاپا اسے سمندر کی تہہ سے بھی برآمد کر سکتے ہیں......

وہ اپنے کام میں مصروف تھی جب سومناتھ نے اسے آواز دے کر بلایا تھا...... وہ فوراً ہی کام چھوڑ کر بھاگی تھی...... کیا ہوا بابو...... کچھ چاہیئے......

''جو چاہتا ہوں تم دینے کو راضی نہیں...... آؤ میرے قریب تو بیٹھو......

وہ اس سے دور جا کر بیٹھ گئی...... بولو بابو...... میں یہاں ہی ٹھیک ہوں...... تم اپنی ضد چھوڑ دو...... بابو سمجھتے کیوں نہیں...... شادی بڑا گمبھیر معاملہ ہوتا ہے...... یہ دو خاندانوں کا بھی ملن ہوتا ہے...... میرے سر پر باپ اور بھائی کا سایہ نہیں...... ماں کی حالت سے تو آپ واقف ہو۔...... ان کا بستر علالت کسی بھی دن بستر مرگ بن سکتا ہے۔ نا ہی میرا کوئی خاندان ہے...... اور نا ہی اینٹ گارے کی دیواریں ہیں...... یتیم ہوں بابو...... بے گھر...... بے سہارا...... عورت کو مرد کا سہارا تو ہر قدم پر چاہیئے...... پر میرا دل کسی طرح شادی کرنے پر راضی نہیں...... باپ کی حرکتوں نے مجھے یہ سکھا دیا ہے کہ کبھی کسی مرد کا یقین نہ کرنا...... مرد کا دل پلٹنے میں دیر نہیں لگتی......

ایک دن وہ اس کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا...... میری طرف دیکھو...... کیا میں تمہیں دھوکے باز مکار بدمعاش دکھائی دیتا ہوں...... میرا یقین کرو کہ میں تمہاری خاطر اپنی ساری دولت تیاگ دونگا......

بابو غریب تو صرف وفا کے طلبگار ہوتے ہیں...... آرام...... آسائش...... یہ چیزیں تو دینے والے نے میرے مقدر میں نہیں لکھیں تو آپ مجھے کیسے دو گے...... مقدر میں سکھ نہیں تھے اسی لئے تو باپ نے فقیر بنا دیا ......اب ان چیزوں کی خواہش ہی مر گئی...... میں شادی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی...... آپ جانتے ہیں میرے اوپر ماں اور بہن کی ذمہ داریاں ہیں...... موہنی کے انداز میں فکرمندی شامل تھی......

وہ بولا...... کچھ نہیں ہوگا تمہاری ماں کو...... علاج تو جاری ہے۔ ٹھیک ہو جائینگی...... اور تمہاری بہن میری بھی تو...... نہیں بابو...... یہ سب باتیں ہیں...... صرف زبانی محبتوں کا دعویٰ کرنا بڑا آسان ہے۔ مجھے وشواش نہ دلاؤ...... کہ اگر تم وعدہ نہ نبھا سکے تو میں مر جاؤنگی...... سومناتھ کو اس پیاری سی لڑکی کی صاف گوئی اچھی لگی تھی......

ماں کی حالت ایسی نہ تھی کہ موہنی ان سے کچھ بھی کہتی یا وہ کچھ فیصلہ سنا سکتی...... وہ روز بابو کے گھر کام کرنے جاتی...... سومناتھ اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا...... اسے قیمتی تحفے تحائف دیتا جو وہ وہی چھوڑ جاتی...... ایک دن اس کا راستہ روک کر بولا...... میں تمہیں بڑے جذبے سے یہ تحفے دیتا ہوں اور تم میرے تحفے قبول نہیں کرتیں

......وہ بولی...... کیونکہ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں...... صرف آپ کی محبت ہی کافی ہے۔ میرے لئے...... بس مجھے اپنے دل سے نہ نکال دینا......

ماں کو بستر مرگ پر بھی موہنی کی فکر تھی...... وہ جانتی تھی کہ موہنی کی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے بستی کے جوان اور بوڑھے بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہے۔ ایک دن بڑی نحیف سی آواز میں بیٹیوں سے بولیں...... میں نے غریبی میں بھی تمہیں بڑے لاڈ اور پیار سے پالا ہے...... پر اب یوں لگتا ہے میں زیادہ دن تمہارے ساتھ نہ رہ پاؤنگی...... وہ دونوں رو پڑیں...... موہنی بولی...... آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو...... اماں تمہیں ہمارے لئے جینا ہی ہوگا...... تمہارے سوا اور ہے ہی کون ہمارا...... تم بابا کا غم کرنا چھوڑ دو...... اپنے بیٹے کی فکر کرنا چھوڑ دو......

ارے بیٹا...... یہ دل وجگر کی باتیں ہیں...... اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے بھول جاؤں...... ان کی یادیں ہی تو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں...... سانسیں ٹوٹیں گی تو یادیں بھی چھوٹ جائینگی...... زیادہ فکر تو تم دونوں کی ہے۔ میرے مرنے کے بعد کون تمہیں سہارا دے گا...... موہنی...... میری بچی تو بلرام سے شادی کے لئے ہاں کر دے ...... وہ بھلا آدمی ہے...... بس ذرا غصہ ور ہے...... میں ڈرتی ہوں کہیں خطرناک قسم کا آدمی نہ ٹکرا جائے جو سوائے نقصان کے کچھ بھی نہ دے...... اور تیری زندگی تباہ کر جائے...... بلرام سے شادی کر کے تو بستی میں رہے گی...... تو سوہنی کا بھی خیال رکھ پائے گی......

موہنی بولی...... اماں...... پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ...... پھر شادی بھی ہو جائے گی...... ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے...... موہنی ماں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ بلرام سے شادی نہیں کر سکتی...... وہ تو بابو کی امانت ہے...... اگر بابو کے ساتھ میری شادی نہ ہوئی تو میرے سارے ارمان مٹی میں مل جائیں گے...... پر وہ خاموش ہی رہی کیونکہ ماں کی حالت ایسی نہ تھی جو کوئی بھی دھماکہ خیز خبر برداشت کر پاتیں...... وہ تو جانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ موت سے جنگ لڑ رہی تھیں...... اماں کا iv انٹروینس چلتا رہا اور ان کی دونوں بیٹیاں پاس بیٹھی ان کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی رہیں۔ اور وہ رات آہستہ آہستہ بیت گئی......

دوسرے دن موہنی کام پر نہ جا سکی...... سوم ناتھ کا دل بیقرار ہوا تھا...... وہ سوہنی کے ساتھ موہنی سے ملنے گیا ...... سوم ناتھ موہنی کی رہائش گاہ دیکھ کر نہایت حیران ہوا...... سوہنی سے بولا...... اسے تم اپنا گھر کہتی ہو...... سوہنی بولی...... کیا آپ نے کبھی بستی نہیں دیکھی...... صرف ہم ہی نہیں اس دیس کے آدھے سے زیادہ لوگ اسی حالت میں جیتے ہیں......

ہمیں کم سے کم دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا تو مل ہی جاتا ہے۔ نجانے کتنے لوگ روز بھوکے سوتے ہیں"

وہ وہاں کھڑا سوچنے لگا...... اس سے بہتر تو ہمارے اصطبل ہیں...... ان غریبوں کا حال تو ہمارے پالتو جانوروں سے بھی بدتر ہے...... بابو جی کیا سوچنے لگے...... اندر چلو...... سوہنی کی آواز پر وہ آگے بڑھا......

موہنی اندر ایک طرف زمین پر آنکھیں موندے پڑی تھی...... بھاری قدموں کی دھمک گونجی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا...... اندر نیم تیرگی سی پھیلی تھی...... سوہنی نے موم بتی جلا کر موہنی کے چہرے کے پاس رکھی...... دیدی اٹھو...... دیکھو بابو تمہارا حال پوچھنے آئے ہیں...... سوم ناتھ قریب آیا...... دیکھا موہنی کی آنکھوں سے سراسیمگی ہویدا تھی...... چہرے پر آزردگی چھائی ہوئی تھی...... بابو کو دیکھ کر آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے...... سوم ناتھ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا...... اٹھو...... میں

تمہیں ابھی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا...... بھاگتے دوڑتے تم تھک گئی ہو......

نہیں بابو...... میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی...... سونی نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی...... وہ نہیں اٹھی...... بڑے رندھے ہوئے لہجے میں بولی...... میری ماں نے میری قسمت کا فیصلہ سنادیا ہے......

سونی فوراً چہک کر بولی...... اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے...... بابو...... بلرام بھائی ایسے ویسے نہیں ہیں...... بہت اچھے انسان ہیں...... بڑا رعب ہے انکا...... بھلا مجال ہے جو کوئی بستی کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے یا چھیڑ چھاڑ کرے...... بس ان کی ماں دن بھر چیختی چلاتی رہتی ہیں...... جب زیادہ دماغ خراب ہوجاتا ہے تو پوری بستی کو سر پر اٹھا لیتی ہیں...... بستی کے چھوٹے بڑے سب ان کو ماتا جی کہتے ہیں...... ان کے چرن چھوتے ہیں...... مجال ہے جو ان کے سامنے چوں بھی کر سکے...... ہمارے گھروں میں تو غیروں نے آگ لگائی تھی...... انہیں تو اپنوں نے پھونک ڈالا...... بابو ان کی فیکٹری تھی...... اس بستی کے تقریباً ہر گھر کی روزی روٹی کا ذریعہ وہ فیکٹری تھی...... جب شہر میں بلوہ ہوا تو دہشت گردوں نے فیکٹری میں آگ لگادی...... تباہی مچادی...... کربناک چیخیں فضا میں بلند ہوئیں تو لوگ پانی کی بالٹیاں لے کر دوڑے...... لیکن آگ تیزی سے بڑھتی گئی۔ بہت جانوں اور مال کا نقصان ہوا...... اس رات بابو جی ہماری بستی ماتم کدہ بن گئی تھی...... سب ہی رو رہے تھے...... نوحہ گر تھے...... کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں کوئی جان کا نقصان نہ ہوا ہو...... کوئی اپنے باپ کے لئے تڑپ رہا تھا تو کوئی اپنے بیٹے کے لئے...... اور کوئی اپنے دوست کے لئے...... جن کی مانگیں سونی ہوگئیں ان کا حال تو دیکھا ہی نہ جاتا تھا سب ہی رنجور تھے...... بستی پر اندھیرا چھا گیا تھا...... کسی کے گھر چولہا نہیں جلا تھا......

سومناتھ کے تو ہاتھ پاؤں شل ہوگئے...... بڑی ہی دھیمی آواز میں سوال کیا...... کون تھے وہ لوگ...... وہ بولی جو بھی تھے شیطان تھے...... ایسے لوگوں کو کسی سے ذرہ برابر محبت نہیں تھی...... نہ اپنے ملک سے اور نہ ہی انسانوں سے...... ان کا کوئی دھرم نہیں...... فیکٹری کی آگ تو بجھ گئی ماتا جی کے اندر اس آگ کی چنگاریاں دہک رہی ہیں...... انہیں آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان شعلوں میں آج بھی ان کے بیٹے جل رہے ہیں...... تڑپ رہے ہیں...... چلاتی ہیں...... چیختی ہیں...... ارے آگ بجھاؤ...... میرے بچے جل رہے ہیں...... دیکھو میرے بیٹے جل رہے ہیں...... کوئی پانی پلاتا ہے تو کوئی ان کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتا ہے تب بڑی مشکل سے انہیں چین آتا ہے۔ پھر ماتھا پیٹ پیٹ کر رو رو کر کہتی ہیں...... ارے ظالمو! تم نے کیوں میرے بچے جلا ڈالے...... کیوں قتل و غارت کر رہے ہو...... کتنے بے رحم ہو...... تم نے اپنے بھائیوں کو مار ڈالا...... اے میرے بچو...... تمہیں کب عقل آئے گی کہ ہم سب ایک ہیں۔ یہ وطن ہم سب کا ہے۔ جب تھک کر بالکل نڈھال ہوجاتی ہیں تو اندر جا کر سوجاتی ہیں......

"پر بابو جی ایسی پیاری اماں کے سامنے بستی والے کیسے زبان کھول سکتے ہیں...... بلرام بھائی ان کے ہی بیٹے ہیں...... اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں...... گھر دوار ہے۔ دیدی کے سر پر پکی چھت ہوگی۔ ایک مضبوط آدمی کا سر پر سایہ ہوگا...... ذرا سا بلرام بھائی کا غصہ ہی تو سہنا پڑے گا...... بابو بہت کم لوگ ہیں جو صرف دوسروں کی بھلائی کے لئے سوچتے ہیں......

سومناتھ ذرا زور سے بولا...... کچھ نہیں سہنا پڑے گا تمہاری دیدی کو...... وہ بابو کا مطلب نہیں سمجھی...... ارے بابو عورتوں کو نہ جانے کیا کیا دکھ سہنے پڑتے ہیں...... جدائی کے دکھ...... غصہ سہنا اتنا مشکل کام تو نہیں......

سونی تیار ہوگئی...... اتنے میں باہر عورتوں کا ایک مجمع ہوگیا...... ایسا شور مچایا کہ سومناتھ گھبرا ہی گیا...... چیخ رہی

تھیں...... باہر نکالو اس بابو کے بچے کو...... ہم بستی والوں کے اپنے قاعدے قانون ہیں...... کوئی ہماری بیٹیوں کو کسی جال میں پھنسانے کی کوشش کرے گا تو اپنی جان سے جائے گا...... سونی باہر نکلی...... کیوں ناراض ہو رہی ہو وہ جا رہے ہیں...... دوسری چیخی...... کہہ دے اس بابو سے آج آیا سو آیا...... آج چھوڑ دیا ہے...... آئندہ ہماری بستی میں قدم رکھنے کی جرآت نہ کرے...... یہ اس کا شہر نہیں کہ منہ اٹھائے جس گھر میں چاہے گھس جائے...... بستی والوں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے...... ہم اسے اپنی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالنے دینگے...... سونی بولی...... کہہ دوں گی ماسی سب کچھ کہہ دونگی۔ اب جگہ تو دو...... جانے تو دو انہیں...... ہلڑ موقوف ہوا تو سوم ناتھ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا......

سوم ناتھ بستی سے نکلا اور سونی موہنی کو لے کر سیدھا مندر گیا...... حالانکہ موہنی شادی سے انکار کر رہی تھی لیکن اب مندر میں بوکھلا سی گئی تھی...... وہ سوم ناتھ کو کھونا بھی نہیں چاہتی تھی...... وہ جانتی تھی کہ کھوئے ہوئے لوگ بہت کم اپنوں کو دوبارہ مل پاتے ہیں...... بعض اوقات تو کبھی نہیں مل پاتے...... بابا اور بھائی کی طرح...... مجھے کسی پر تو اعتبار کرنا ہی ہوگا...... سو تم ہی سہی...... پھر سوم ناتھ نے اسے یقین بھی تو دلایا تھا اس کی محبت میں کھوٹ نہیں...... ہر بات میں سچائی ہے۔ پیار میں سچائی ہے...... موہنی نے بھی تو بابو کی آنکھوں میں پیار اور سچی محبت دیکھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ روز روز تو قسمت کے در نہیں کھلتے موہنی نے بابو کی محبت نعمت سمجھ کر قبول کر لی......

اور یوں دو پیار کرنے والوں کی خوشیوں اور امنگوں کا جہاں آباد ہو گیا...... محبت اور یقین کی روشنی میں موہنی کو یہ دنیا پیاری لگنے لگی...... موہنی اپنے نصیبوں کو کوستی تھی اپنے وجود کو حقیر سمجھتی تھی آج بھگوان کے گھر میں بابو نے اس سے بیاہ کر کے اسے معتبر کر دیا تھا...... اب تم میری ہو...... میری امانت ہو...... میری ذمہ داری ہو...... آج سے میں تمہارا پورا پورا خیال رکھونگا لیکن ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اسے نہ بھولنا...... موہنی سے بولا...... اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا جب تک میں نہ کہوں......

سوم ناتھ کی محبت کی دھیمی دھیمی پھوار نے موہنی کے دل کے سارے رنج و غم دھو ڈالے...... اس کی مسکراہٹ دیکھ کر سوم ناتھ نے اس کی مانگ چوم لی...... بولا...... آج سندور کی جگہ یہ ہے......

سونی نے اعتراض کیا بابو جی یہ کیسی شادی...... وہ بولا...... ہاں جب گھر آئینگی تب سارے دستور ان کے ہاتھوں پورے ہونگے...... کیا تم اس جہنم سے باہر نہیں نکلنا چاہتی ہو...... سوم ناتھ نے موہنی سے کہا...... اب تم نہ کبھی واپس اس بستی میں لوٹنا نہ ہی تم دونوں کسی کے گھر کام کرنے جاؤ گی...... سونی خوش ہو گئی۔ اسے گھر گھر جھاڑو دینا بہت ہی برا لگتا تھا...... بولی۔

اور بابو میرا اسکول...... سب ہو جائے گا۔ کہہ کر سوم ناتھ نے قدم آگے بڑھائے...... سوم ناتھ انہیں مکان میں لے گیا تالا کھول کر بولا...... موہنی اندر آجاؤ...... آج سے یہ گھر تمہارا ہے......

کسی بے بس اور مجبور انسان کو اچانک وہ سب کچھ مل جائے جسے اس کی بے انتہا ضرورت ہو تو وہ پاگل ہو اٹھتا ہے۔ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑتے ہیں...... آج موہنی اور سونی کے دلوں کا بھی وہی حال ہو رہا تھا...... موہنی نے بڑی تعجب خیز نگاہوں سے سوم ناتھ کو دیکھا تھا...... وہ بولا...... اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو...... تم اب میری بیوی ہو اور میری بیوی اس ڈیرے میں نہیں رہ سکتی......

ایک مدت کے بعد سر پر پکی چھت اور ایک مرد کا مضبوط سہارا پا کر دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑیں...... اچانک خوشیوں کی بارش یوں ہوگی موہنی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سوم ناتھ سے کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ وہ جھکی...... سوم ناتھ کے پاؤں پکڑ کر بے تحاشا رونے لگی...... پاؤں...... اپنے سے بڑوں کے پاؤں چھونے کا ہی تو رواج

تھا ان کے گھر لانے میں..... آج مدت کے بعد یہ موقع آیا تھا..... باپ سے جدا ہوتے وقت باپ کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر التجا کی تھی ..... اور آج بابو کے پاؤں خوشی کے آنسوؤں سے بھگو دئے تھے گھر بند کر کے جب تینوں باہر نکلے..... سوہن ناتھ نے موہنی کو پیکٹ دیتے ہوئے کہا یہ ماں کے علاج کے لئے ہیں۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا..... موہنی کھڑی سوچتی رہی، بابو انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ نہیں یہ تو دیوتا ہیں......

دونوں سوہنی اور موہنی ہسپتال پہنچیں تو دیکھا..... ماں کے پاس ڈاکٹر کھڑے ہیں جن کے چہرے سے ناامیدی ٹپک رہی تھی..... ماں کی حالت دیکھ کر یوں لگ رہا تھا ان کا دم واپسی قریب ہے۔ آخر ڈاکٹر سر جھکا کر چلے گئے جس کا مطلب صاف تھا..... اب ہمارا کام ختم..... آگے خدا کی مرضی..... ماں کو ابھی تھوڑا ہوش باقی تھا..... موہنی کی آواز سنتے ہی آنکھیں کھولیں..... آنکھیں دونوں بیٹیوں کے چہرے پر ٹک گئی تھیں۔ موہنی نے ماں کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھا اور بولی..... اماں میں نے بابو سے شادی کر لی ہے..... مجھے اور بابو جی کو آشیرواد دو..... پھر دوسرا ہاتھ سوہنی کے سر پر رکھ کر بولی..... اماں اپنی دونوں بیٹیوں کو آشیرواد دو تمہاری دعائیں ہماری حفاظت کریں گی۔ زندگی کے ہر آڑے وقت پر تمہاری دعائیں ہی ہمیں آگے بڑھنے کا راستہ دکھائیں گی..... اماں میں نے زندگی میں تمہارا ایک ہی حکم توڑا..... بلرام سے شادی نہیں کی..... مجھے معاف کر دینا..... اماں مجھے اور بابو جی کو آشیرواد دو کہ ہم دونوں سدا خوش رہیں......

اماں کے ہونٹ جنبش کرتے دکھائی دے رہے تھے پر آواز اتنی نحیف اور کمزور تھی کہ لفظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔ آنکھوں میں اب بھی زندگی کی ہلکی سی رمق باقی تھی۔ پھر ماں آہستہ آہستہ زندگی کی جنگ ہار گئیں۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ کر زار زار رو رہی تھیں..... موہنی کے اندر سے ایک چیخ نکلی..... بابا آج ہماری ماں غریبی کی بھینٹ چڑھا دی گئیں..... اور اس کے ذمہ دار تم اور بھائی ہو..... کبھی ہماری یاد آئے تو سوچنا تم دونوں نے کتنا بڑا جرم کیا تھا......

واقع غریبی سب سے بری بلا ہے۔ اگر یہ بدنصیب عورت بے کس اور غریب نہ ہوتی تو اسکے علاج میں تاخیر نہ ہوتی..... اگر شوہر نے اس کا سارا زیور اور اس کے حصے کا روپیہ دے دیا ہوتا تو پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر اسے اور اس کی دونوں بیٹیوں کو در در جا کر دن بھر محنت و مشقت نہ کرنی پڑتی..... اگر اس بدبخت عورت کے اکلوتے بیٹے اور شوہر نے اتنی بڑی آفت جھیلنے کے لئے دنیا میں اسے تنہا نہ چھوڑ دیا ہوتا..... تو شاید آج بھی یہ بدنصیب عورت اپنی بیٹیوں کی ڈھال بن کر زندہ رہتی..... پر اسے تو بے سائیگی اور غریبی نے ڈس لیا..... اپنوں کے دکھ نے مار ڈالا..... بستی کے لوگ ماں کی لاش اٹھا کر لے جا رہے تھے..... یہ دیکھ کر موہنی کا دل پھٹ پڑا..... دونوں چیخ چیخ کر باپ اور بھائی کو پکارنے لگیں..... وہ عورت جس نے آج تک تمہارے نام کے سندور سے اپنی مانگ سجائی..... جس کے دل میں صرف تم رہتے تھے۔ جس کی آخری سانس پر صرف تمہارا اور تمہارے بیٹے کا نام تھا..... آج میں نے تمہاری اس امانت کو غیروں کے حوالے کر دیا ہے..... آج کہاں ہے اس بدنصیب ماں کا لخت جگر اور اس بدبخت سہاگن کا پتی..... آؤ دیکھو..... آج صرف تمہاری ساری یادیں ساتھ لئے غیروں کے ہمراہ..... اجنبیوں کے کاندھوں پر سوار وہ اپنے آخری سفر پر جا رہی ہے......

پھر وہ ایک دم ہی کسی خیال سے کانپ اٹھی..... سوہنی سے بولی..... برہمنی کی چتا میں آگ کون لگائے گا..... یہاں پر تو اپنا کوئی بھی نہیں..... فکر و رنج سے وہ گرنے ہی والی تھی..... بلرام نے عین اس کے پیچھے چل رہا تھا اسے تھام لیا..... سنبھالو اپنے آپ کو..... وہ دھیرے سے بولا..... موہنی نے فوراً اپنے آپ کو بلرام کی گرفت سے آزاد کیا..... اور

سر جھکا کر آگے بڑھی...... بلرام اس کے برابر پہنچا...... سرگوشی کی...... "اگر تم اجازت دو تو میں یہ آخری رسم ادا کروں...... اس نے دھیرے سے "ہاں" کہا اور پھر سسکنے لگی...... پھر سوچنے لگی ماں نے بلرام کو اپنا بیٹا ہی تو مانا تھا...... اتنا پسند کرتی تھیں کہ داماد بنانا چاہتی تھیں...... پھر بلرام کی طرف دیکھ کر بولی...... اس کے لئے میں ہمیشہ تمہاری احسان مند رہونگی...... سوچا اماں تم ٹھیک ہی کہتی تھیں یہ آدمی بھلا ہے...... ہر انسان کی مشکل آسان کرنے والا...... بستی کے ہر فرد نے موہنی کی ہر طرح سے مدد کی...... نہایت ہمدردی دکھائی...... بلرام تو پیش پیش تھا...... ساری رسمیں پوری ہوئیں......

اسی رات دل میں ماضی کی یادیں سمیٹے دونوں بہنوں نے باہر کی دنیا میں قدم بڑھائے...... اندھیرے میں بستی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ گئیں......

دوسرے دن وہ موہنی کے روبرو کھڑا تھا...... دبی دبی معنی خیز مسکراہٹوں کے ساتھ موہنی کو دیکھ کر بولا...... آج ہم اپنی شادی کا جشن منائینگے...... ایک لمبی لسٹ سوہنی کے ہاتھ میں پکڑائی...... تم بازار سے یہ سامان لے آؤ...... باہر ٹیکسی تمہارا انتظار کر رہی ہے......

دروازہ بند کر کے وہ دو قدموں میں موہنی کے قریب آ گیا...... اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا...... اتنی مدت بعد ملی ہو...... پھر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی دلکشی سے مسکرا کر کہا...... میری بس یہ آرزو ہے کہ تم میری نظروں سے ایک پل کے لئے بھی دور نہ ہو...... بڑی دیر میں سہی...... آئی تو سہی یہ ملن کی گھڑی...... جس کا میں نے بے انتہا انتظار کیا ہے......

موہنی تو شرما کر بابو کی باہوں میں پگھلتی چلی گئی...... وہ بولے گیا...... مجھے صرف تمہارے پیار کی پیاس ہے بھئی تمہارا بھی تو دل کچھ کہتا ہوگا...... تم بھی کچھ تو بولو...... وہ بولی...... بابو آپ ملے تو میری زندگی کی ڈگر روشن ہوگئی...... وہ بولا...... میں نے تم سے کہا تھا میرے خواب کبھی ادھورے نہیں رہتے...... موہنی فوراً بولی...... پر میرا خواب ابھی ادھورا ہے...... سچ سچ بتاؤ بابو کیا آپ اپنے والدین کا سامنا کر سکو گے...... کیا وہ لوگ مجھ جیسی دیہاتی...... غریب لڑکی قبول کر لینگے......

وہ بولا...... ابھی مسرتوں کی گھڑی ہے آج صرف خوشیوں کی باتیں کرو...... کل کیا ہوگا اس کی فکر کل کرینگے...... آج ہماری زندگی کی نئی سحر ہوئی ہے...... آج صرف روشنی اور خوشیوں کی باتیں کرو...... وقت تو آنے دو...... وہ بھی ہو جائے گا...... جب یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو آگے بھی...... آج صرف تم اور ہم...... ہم اور تم...... موہنی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا...... یہ آنسو کیوں...... آج کے دن سارے بیتے دکھ بھول جاؤ...... دنیا کے سارے غم و فکر دل سے نکال دو......

"وعدہ کرو بابو آپ بدل تو نہیں جاؤ گے...... وہ ہنس کر بولا...... بھئی بدلنا تو ہوگا...... ضرور بدلیں گے...... تم جیسا بناؤ گی ویسا ہی بن جاؤں گا۔

تب ہی سومناتھ نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا...... ارے پگلی تم اپنے دل سے سارے شک نکال دو...... میں زندگی میں تو تمہیں چاہونگا ہی...... مر بھی گیا تو بھی تمہاری یادوں میں زندہ رہونگا......

بس بابو اور آگے نہ بولنا...... ورنہ میں رو پڑونگی...... تو اب سارے سوال و جواب بند...... یہ کہہ کر

سومناتھ نے اپنے ہونٹ موہنی کی پیشانی پر رکھ دیئے......

محبت کا نشہ بھی عجیب شئے ہے...... پل میں انسان کو جنت کی سیر کرا دیتا ہے...... محبت میں چور موہنی کو یوں لگا کہ بابو کی بنائی ہوئی جنت کی وہ واحد حور ہے...... تب ہی دروازے پر دستک ہوئی موہنی کا اداس چہرہ دیکھ کر سومناتھ نے اور بھی وعدے کر ڈالے......

سومناتھ اس طرح وقت بے وقت آتا اور چلا جاتا...... وہ آتا تو موہنی گلاب کی طرح کھل اٹھتی اور جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کی جان بھی ساتھ لئے جا رہا ہو...... زندگی میں تھوڑا ٹھہراؤ آیا تو موہنی کے دل کے گہرے زخم ذرا مندمل ہونے لگے...... موہنی کو مستقبل کی فکر تھی...... سومناتھ کے آتے ہی سوالوں کا پٹارا کھولا...... بابو ایک بات تو بتاؤ تمہارے شہر کا کیا نام ہے اور تم کہاں رہتے ہو......

وہ ہنس کر بولا...... اب یہ بھی بتانا پڑے گا...... ارے شادی کے بعد کتنے سوال کرنے لگی ہو...... اتنا بھی نہیں جانتی کہ میں تمہارے دل میں رہتا ہوں......

وہ شرما گئی...... دھیرے سے بولی...... میرا مطلب ہے آپ کا خاندان...... آپ کا پریوار......

وہ بولا...... جب وہاں جاؤ گی تو اپنی حویلی دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی...... اب جو کچھ میرا ہے وہ سب تمہارا بھی تو ہے...... موہنی آگے کچھ نہ بول سکی...... پھر کچھ وقفے کے بعد بولی...... کیوں نہ ہم حویلی میں جا کر رہے...... چلیں گے...... بہت جلد چلیں گے......

موہنی اب نئے نئے سپنے دیکھنے لگی تھی...... کبھی اچھے...... کبھی برے...... سسرال جانے کے سپنے...... ساس سسر کی سیوا کرنے کے سپنے...... کبھی کبھی سوچ کر ہنس دیتی...... تو کبھی اتنی دہشت زدہ ہو جاتی کہ آنسو گرنے لگتے...... ایسے ہی ایک دن پریشان بیٹھی تھی کہ سوہنی نے دیکھ لیا...... وہ گھبرائی...... ''دیدی کیا ہو گیا''...... سوہنی ایک بات بتا...... ''کیا دیدی''...... ''میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

وہ بھی دیدی کو چھیڑنے کے موڑ میں آ گئی۔ بولی...... اب یہ تو بابو ہی بتا سکتے ہیں...... وہ جو چاہیں گے وہی ہو گا...... اب تمہارے ہاتھوں میں کچھ نہیں...... کیونکہ اب تمہاری قسمت کی لکیریں بابو کی مٹھی میں بند ہیں...... موہنی روہانسی ہو کر بولی...... نہ جانے مجھے عجیب عجیب خیالات ستاتے ہیں...... ''سوہنی بولی'' شادی سے پہلے تو تم بڑی بہادر اور حوصلہ والی تھیں...... یہ بابو کی محبت میں ڈوب کر تمہارا دل کچھ کمزور سا نہیں ہو گیا...... بات بات پر پریشان ہو جاتی ہو...... ارے میری بھولی دیدی اب ڈرنے کے دن ختم...... اب جو تم چاہو گی وہی ہو گا کیونکہ بابو نے اپنی زندگی کی ڈور تمہارے ہاتھوں میں سونپ دی ہے......

موہنی خوش ہو گئی...... بولی کاش ماں ہماری خوشیاں دیکھ پاتیں...... انہیں تو بس زندگی میں غم ہی غم ملے...... غموں نے ان کا دل چھلنی کر دیا......

تب ہی سومناتھ نے گھر میں قدم رکھا...... ارے بھئی کس کے غم میں کس کا دل چھلنی ہو گیا...... موہنی بولی ماں کا...... معلوم نہیں کس کا دکھ زیادہ تھا...... بیٹے کا یا شوہر کا...... سومناتھ نے بغور موہنی کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا...... دونوں کا غم جان لیوا تھا......

اس رات تینوں نے مل کر بہت دیر تک باتیں کی تھیں...... صبح جاتے وقت سومناتھ نے موہنی کو بڑے غور سے دیکھا تھا...... وہ ڈر گئی...... بابو جی مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی کیا...... ارے نہیں غلطیاں ہم جیسے انسان کرسکتے ہیں تم جیسی لڑکی کبھی غلطی کرہی نہیں سکتی......

بابو تو چلا گیا...... موہنی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی...... کہ بابو نے ایسا کیوں کہا......

نا جانے کیوں موہنی کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی...... دن کا اجالا مدھم پڑنے لگا تھا...... اور بابو نہیں آئے تھے...... ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی...... پھر اچانک ہی تیز تیز ہوائیں چلنے لگیں...... جیسے بڑا طوفان آنے والا ہو...... بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی...... بجلی کی گڑگڑاہٹ سے دل ہول رہے تھے۔...... دیکھتے ہی دیکھتے سڑکوں پر پانی بھر گیا...... اور سارا ٹریفک بند ہوگیا...... موہنی کے اندر عجیب سی پریشانی نے سر اٹھایا...... اوہ میرے بھگوان...... سوہنی دوڑ آئی...... کیا ہوا دیدی...... وہ گھبرائی ہوئی تو تھی ہی تیز آواز میں بولی...... یہ بارش...... اب بابو کیسے آئینگے...... بھگوان جانے کہاں ہونگے......

سوہنی نے ڈھارس بندھائی...... دیدی وہ بچہ تو نہیں جو تم اتنی پریشان ہو رہی ہو...... اب اتنی بارش میں پیدل چل کر تو آ نہیں سکتے سو تیر کر آ رہے ہونگے...... موہنی تھوڑی ہنس دی...... سوہنی دیدی کی پریشانی محسوس کر رہی تھی سو آگے بات بڑھائی...... دیدی مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بابو نے ہم غریبوں سے رشتہ جوڑا اور اس رشتے کو نبھا بھی رہے ہیں......

موہنی بولی...... اس میں تعجب کی کیا بات ہے...... تو ابھی چھوٹی ہے...... دل کی باتیں تو سمجھ نہیں سکتی...... محبت میں دھن دولت...... اونچ نیچ کی بات نہیں کی جاتی۔ محبت تو محبت ہوتی ہے......

لیکن سنا تو یہی ہے کہ دولت سے دستبردار ہونا بڑا کٹھن کام ہے...... موہنی بولی...... ٹھیک ہی سنا ہے...... یہ بھی تو سنا ہوگا کہ محبت کی خاطر بادشاہوں نے اپنے تاج وتخت چھوڑ دیئے......

ہاں دیدی افسانے تو بہت سنے ہیں۔ پر دیکھ پہلی بار رہی ہوں کہ بابو نے اپنا سب کچھ تیاگ کر تم کو اپنایا ہے۔ موہنی کا دل اندر ہی اندر جھوم اٹھا...... آخر اندھیرا ہوگیا سڑکوں پر۔ ہر سرسراہٹ پر اسے یہی دھوکا ہوتا کہ شاید وہ آگئے۔ وہ نظریں اٹھاتی...... اور دروازے پر ٹک جاتیں...... وقت کب کٹا کئی دن بیت گئے...... بابو نہیں آئے...... سوہنی حیران و پریشان تھی کہ اتنا پیار کرنے والا شوہر کیا اتنا لاپرواہ ہوسکتا ہے۔ اس نے دیدی سے سوال کیا...... کیا تمہیں بابو پر اعتماد نہیں......

موہنی نے مضطرب لہجے میں کہا...... اعتبار تو سو فیصد ہے لیکن...... دل ڈرتا رہتا ہے...... ان پر کوئی ناگہانی مصیبت نہ آن پڑی ہو...... میں کیا کروں...... سمجھ میں نہیں آتا...... کوئی ہمدرد نہیں کس کے پاس جا کر روؤں...... کس سے مدد مانگوں......

دن گذرتے گئے...... موہنی کے اندر غضب کا اندھیرا پھیلتا چلا گیا...... اسے ہر چیز پر مردنی سی چھائی نظر آنے لگی...... ایک بھیانک خوف اس کے اوپر طاری ہوگیا تھا...... پھر...... ایسا ہی ہوتا ہے جب امید کی رسی ہاتھوں سے پھسلتی جاتی ہے۔...... شامیں رلانے لگیں...... رات کی تنہائی جگانے لگی...... موہنی کی بیقراری اور بے

چینی اتنی بڑھی کہ سونی دیکھ کر گھبرا گئی......اب اسے ہی کچھ کرنا ہوگا......

دن کے اجالے میں سونی نے بابو کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھا......شاید کوئی بستی والا مل جائے......تو......اندھیرا ہوتے ہی وہ بابو کے گھر گئی......دروازہ کھلا ہی تھا......پہلے تو سوچا اندر چلی جائے ......پھر رک کر بیل بجادی......سامنے کھڑی عورت کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی......ان کی آنکھوں سے قہر برس رہا تھا ماں جی......وہ سومناتھ بابو......جو یہاں رہتے تھے......اس نے اٹک اٹک کر کہا......

اے لڑکی تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ میرا گھر ہے...... یہاں کوئی بابو شابو نہیں رہتا......دروازہ کھٹاک سے بند ہوگیا......وہ حیرت اور بے یقینی سے دروازے کو دیکھتی ہی رہ گئی......پھر سوچا ہم پر بہت بڑی مصیبت ٹوٹی ہے......ایسے میں اگر بابو کے پڑوسیوں کو ذرا سی زحمت اٹھانی پڑے تو کیا......اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی......نیند سے بوجھل آواز میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی......وہ سمجھ نہ پائی کہ نیند کا نشہ تھا کہ واقعی وہ شخص شراب کے نشے میں چور تھا......اس وقت کون آمرا......

سنکر وہ ناامید تو ہو چکی تھی پھر بھی کھڑی رہی......بابو جی وہ سامنے والے سومناتھ بابو......کہاں چلے گئے......انہوں نے آنکھیں ملیں اور سامنے کھڑی سونی کو بغور دیکھ کر بڑی عجیب سی ہنسی ہنسی......ارے اندر آجانا۔

نہیں بابو......وہ سومناتھ بابو......

لڑکی! وہ سومناتھ نہیں رام پال تھے......اس شرابی نے پھر ہاتھ بڑھایا......آ اندر تو آ......شاید تو نام بھول رہی ہے......ویسے تو تیرا بابو تھا عجیب آدمی......کسی سے ملتا جلتا بھی نہ تھا......تو اندر آ کر بیٹھ تو سہی......

نہیں بابو......پھر آؤنگی......آج جلدی میں ہوں......ہاں وہ تیرا بابو کہاں سے آیا تھا......کہاں چلا گیا کوئی نہیں جانتا......وہ سونی کی طرف لپکا اور سونی تیزی سے بھاگی......

سونی چند سیکنڈ سانس لینا بھول گئی......وہ سرتاپا کانپ رہی تھی......ہے بھگوان اب میری دیدی کا کیا ہوگا......میں یہ روح فرسا خبر اس کو کیسے دونگی......مجھے ہمت دے طاقت دے کہ اپنی دیدی کو سنبھال سکوں......آنسو بے تحاشا بہہ رہے تھے......وہ روتی دھوتی گھر پہنچی تو دیکھا دیدی بیقراری کے عالم میں چیخ رہی تھی......بابو......تم اپنی قسمیں اپنے وعدے یاد کرو......یاد کرو وہ ملاقاتیں......وہ پیار کی باتیں......بابو ہم تو پہلے سے ہی لٹے پٹے تھے ......تم بھی مجھے بھول گئے......

سونی نے چپ رہنے ہی میں عافیت سمجھی......اور کتنے ہی دن ایسے ہی گزر گئے......مونی کا لمحہ لمحہ بڑی اذیت میں بسر ہو رہا تھا......وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی......بابو سے دوری کا خیال ہی اس کے لئے سوہان روح تھا......اور آج وہ یہ بھی نہ جانتی تھی کہ اسکا شوہر......اس کا جیون ساتھی کہاں ہے......کیوں اسے چھوڑ گیا ہے ......یہ اس کے کس جرم کی سزا ہے......ان سوچوں نے مونی کو بہت کمزور کردیا تھا......رنگ زرد پڑ گیا تھا......

سونی نے دیدی کی تندرستی کو بگڑے دیکھ سوچا کہ اب وقت آگیا ہے حقیقت بتانے کا......مونی کے پاس بیٹھ کر بولی......دیدی مرنے والوں پر صبر آجاتا ہے لیکن جو زندہ رہ کر بچھڑ جاتے ہیں ان کی جدائی برداشت نہیں ہوتی......مونی بولی......کیا کہہ رہی ہے تو......میری سمجھ میں نہیں آرہا......تجھے کیسے معلوم کہ......

کیوں کہ میں بابو کو ڈھونڈنے گئی تھی...... دیدی جو اس دنیا کہ میلے میں کھو جاتے ہیں وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے...... کیوں کہ جاتے وہی ہیں جو لوٹ کر واپس آنا نہیں چاہتے...... دھما کہ اس قدر زوردار تھا کہ ایک لمحے کو موہنی کو لگا اس کی سانسیں رک جائینگی...... ہوش وحواس...... تاب وتواں تو پہلے ہی چلے گئے تھے...... آج امید کی جو ہلکی سی لو ٹمٹمارہی تھی وہ بھی بجھ گئی...... جب دونوں دیر تک رو دھو چکیں تو سوہنی بولی...... اب اپنے آپ کو مضبوط کرلو...... اور سنو...... وہاں کوئی سومناتھ نام کا آدمی تھا ہی نہیں...... کوئی کہتا ہے اس کا نام رام پال تھا کوئی کہتا ہے مہندر پال تھا...... یعنی بابو کا اصلی نام کوئی نہیں جانتا...... سامنے والے سے دریافت کیا تو وہ بولا معلوم نہیں وہ کون تھا...... کہاں سے آیا تھا اور کہاں چلا گیا...... ایک بچے نے بتایا کہ دو فارن کار آئی تھیں...... جو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھی تھیں...... اسی رات جس رات بے انتہا بارش ہو رہی تھی...... معلوم نہیں کون لوگ تھے...... وہ لوگ اس گھر میں گئے تھے...... اور تھوڑی دیر میں واپس چلے گئے...... دیدی ہو سکتا ہے وہ لوگ ہی بابو کو لے گئے ان کے گھر کے لوگ ہونگے......

موہنی کا دل اچھل کر حلق میں آ کر پھنس گیا...... بکھرے بال...... سرخ سوجی آنکھیں...... اور اب تو موہنی کو اپنی ہستی کے بے مول ہونے کا یقین ہو گیا...... موہنی بری طرح رو رہی تھی...... سوہنی سے بولی...... بابو نے اتنی باتیں کی تھیں لیکن کبھی کوئی اوچھی حرکت نہیں کی...... کبھی مجھے چھونے تک کی کوشش نہیں کی...... میں خود نہیں جانتی کب کیسے میں ان سے بے پناہ محبت کرنے لگی...... ان کی ہمدردی نے ہمیں مرعوب کر دیا...... بابو نے ماں کے علاج کے سلسلے میں تمام اخراجات برداشت کیے تھے۔ بس میں ان کی ہر بات کا یقین کر بیٹھی...... بابو نے میری محبت کا یہ صلہ دیا ہے......

پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی...... نہیں بابو ایسا نہیں کر سکتے...... شاید موہنی یہ کہہ کر خود کو باور کرا کر اپنا درد اپنی بے یقینی ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوہنی نے موہنی کو اکیلا چھوڑ دیا کہ دل بھر کر اپنی بربادی پر آنسو بہا کر ہی اس کا دل تھوڑا ہلکا ہو گا...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بابو کی المناک جدائی کے صدمے نے موہنی کو نڈھال کر دیا ہے

سوہنی پھر اسے دلاسا دینے لگی...... دیدی سنا ہے کہ مرد کی فطرت ہے کہ وہ ہر خوبصورت لڑکی کو حاصل کرنے کا شوق ظاہر کرتا ہے...... اور جب وہ اسکو مل جاتی ہے تو خود ہی اس سے دستبردار ہو جاتا ہے...... اور بابو نے تو ساری حدیں ہی توڑ دیں...... شادی کر کے کتنی آسانی سے تمہیں حاصل کر لیا...... پھر دغا دے گئے......

موہنی بولی...... لڑکی کو محبت میں اپنا ہوش ہی کہاں رہ جاتا ہے...... لڑکی ہمیشہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ پھر کسی حال میں اپنے محبوب کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر پاتی...... بابو نے مجھے خاک کر دیا......

سوہنی بولی...... دیدی تمہارے صدمات واقعی ناقابل برداشت ہیں...... جو نقصان تم نے اٹھایا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس دکھ کو برداشت کرنے کے لیے بڑا کلیجہ چاہیے۔ وہ تمہیں بری طرح زخمی کر کے دفع ہو گیا۔ اور تم ایسے بے وفا اور ستمگر کے لئے بیٹھی آنسو بہا رہی ہو۔ اب دانشمندی اسی میں ہے کہ تم اپنے آپ کو کسی طرح سمیٹنے کی کوشش کرو...... صبر اور حوصلے سے کام لو تو شاید بہتری کی طرف لوٹ سکو......

کئی دن اور بیتے مگر موہنی کے غم میں کمی نہ ہوئی...... سوہنی پھر بولی...... دیدی بابو جی تو ساری

عمر کا دکھ دے گئے ہیں جو ہمیشہ آپ کا دل کا ستا رہے گا...... لیکن ہم جیسے لوگوں کو اپنے غموں پر رونے کا وقت ہی کہاں ہے۔ صرف دن بھر بیٹھ کر رونے سے تو غم کم نہیں ہوگا...... تم اس غم کو اندر ہی اندر محسوس کرو اور سہو...... اور اب آگے کی بھی سوچو...... اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور سوگ منانے سے تو ہماری زندگی پار نہیں ہوگی...... اور سوگ تو مرنے والوں کے لئے منایا جاتا ہے نا کہ ایسے دھوکے باز اور دغاباز انسان کے لئے...... ایسے انسان کی یادیں بھی اپنے دل و ذہن سے نکال دینا ہی بہتر ہے...... اب کوئی نہیں آئے گا ہماری مدد کرنے اور نہ ہی اب ہم کسی پر بھروسہ کرینگے اور نہ ہی گھر گھر جا کر برتن دھوئینگے...... پاس میں ایک اسکول ہے جہاں بچوں کے لئے ٹفن بنا کر دینا ہے اور کئی ایسے بزرگ رہتے ہے جو اپنا کام خود نہیں کر سکتے۔ ان کے بچے ہیں کچھ امریکہ میں جا کر بس گئے ہیں۔ جو یہاں ہیں انہیں بھی والدین کی فکر نہیں...... وہ کہتے ہیں ہمارے بچوں کے پاس ہمارے لئے وقت نہیں۔ انہیں دو وقت کا کھانا سپلائی کرنا ہے...... ابتداء کے لئے یہی کافی ہے......

موہنی بولی...... ارے تو بڑی ہوشیار ہو گئی...... سوہنی نے کہا...... ہونا پڑا دیدی...... ہونا پڑا...... آپ کے آنسوؤں نے مجھے بڑا کر دیا...... ہم دونوں مل کر محنت کرینگے تو ایک دن آئے گا مردوں کے دوش بدوش کام کرینگے...... کیوں نہ یہ کام آج سے ہی شروع کر دیں......

موہنی کے اندر ایک عجیب سی پریشانی پھیلتی جا رہی تھی...... طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی...... موہنی نے بامشکل ضبط کر رکھا تھا...... وہ سمجھ تو گئی تھی...... پھر بابو کی یاد نے تڑپا دیا...... بابو تم تو کہتے تھے کہ میں تمہارے لئے دنیا کی سب سے اہم لڑکی ہوں...... کیا زندگی میں جو اہم ہوتے ہیں انہیں اس طرح برباد کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے...... میں نہ کہتی تھی کہ میں شروع سے ہی بدنصیب ہوں...... قسمت کی ماری ہوں...... تم نے تو میرا سب کچھ چھین لیا...... اس دنیا میں رہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا...... تم ہی بتاؤ میں جیوں تو کس طرح جیوں...... وہ بھولی نہیں تھی کہ کس طرح اس کی ماں کو بے عزت کیا گیا تھا...... ماں نے بہت سے مقامات پر بے پناہ تحقیر محسوس کی تھی...... کیونکہ ان کے ہمسفر نے انہیں چھوڑ دیا تھا......

اماں میرا مقدر بھی تمہارے نصیب کی طرح ہے۔ مجھے بھی تحقیر و تذلیل سے بھرپور زندگی گزارنی ہوگی...... اماں میں تو بابو کا نام بھی نہیں جانتی...... اماں میرے بابا نے تمہاری زندگی کی کشتی منجدھار میں ڈوبنے کو چھوڑ دی...... تم کسی طرح تو ساحل تک پہنچ گئی تھی...... اماں میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں جا کر ڈوب مروں...... غرق ہو جاؤں...... ایسے برے وقت میں موت ہی سہارا دیتی ہے...... لیکن...... پھر سوہنی...... میرا مرنا بھی تو میری خوشی سے نہیں ہو سکتا...... وہ اٹھی...... ڈاکٹر کے پاس گئی...... جب ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو اس کے اعصاب تھرتھرا اٹھے......

دواخانے سے لوٹی تو چکر کھا کر پلنگ پر گر پڑی...... سوہنی نے اسے ٹھنڈا شربت پلایا...... کہاں سے آ رہی ہو دیدی...... موہنی نے ہچکچاتے ہوئے کہا...... دواخانے سے...... تمہیں کیا ہو گیا دیدی...... سوہنی بری طرح گھبرائی...... موہنی بولی...... وہی جو ہونا نہیں چاہیے تھا......

سوہنی چیخ پڑی...... دیدی پہیلیاں نہ بجھاؤ...... مجھے صاف صاف بتاؤ تمہیں کوئی مہلک بیماری تو نہیں ہوگئی'' موہنی نے نیچی نظریں کر کے کہا اگر وہ ہو جاتی تو مجھے ذلت تو نہ اٹھانی پڑتی......

کیسی باتیں کرتی ہو...... جانتی ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اس دنیا میں تنہا رہ جاؤنگی...... اور تمہیں ذلت کیوں اٹھانی پڑے گی...... تم نے کیا کر دیا...... ارے پگلی...... یہ تو ہونا ہی تھا...... میں بابو کے بچے کی ماں بننے والی ہوں......

''بچہ''...... سوہنی چیخی...... دیدی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ خوش ہوؤں یا روؤں...... تمہارا آشیانہ اجڑ گیا...... بسیرا لٹ گیا...... اور اب بچہ...... وہ بچہ جس کے باپ کا اتا پتا نہیں...... بڑا ہوگا تو اسے باپ کا نام کیا بتائینگے...... پھر کچھ وقفے کے بعد بولی...... میں تو جانتی ہوں تمہاری شادی ہوئی ہے...... بچے کا اس میں کیا قصور...... بچہ ہمیشہ خوشیاں لے کر آتا ہے...... یہ بچہ بھی ہمارے لئے خوشیاں لے کر آئے گا...... ہم اسے خوب پڑھائینگے...... تم کوئی فکر نہ کرو...... جو ہوگا ہم دونوں مل کر اس کا بھی سامنا ہمت سے کرینگے......

نہیں...... موہنی سخت لہجے میں بولی...... ایسا کبھی نہیں ہوگا...... ہم بچے کو یتیم خانے میں دینگے یتیم خانے میں کیوں...... دیدی...... ماں نے کتنے دکھ اٹھائے...... دکھ سہتے سہتے مر گئیں...... انہوں نے تو ہمیں یتیم خانے میں نہیں چھوڑا...... کیا ہم دونوں مل کر ایک چھوٹی سی جان کو نہیں پال سکتے۔

تو سمجھتی کیوں نہیں...... کوئی بڑا آدمی اس کو گود لے لے گا...... میرے بچے کو باپ کا نام مل جائے گا...... بچے کی قسمت سنور جائے گی...... سوہنی کو غصہ آگیا...... بولی جیسے امیر کبیر بابو جی نے آپ کی قسمت سنوار دی ہے ارے دیدی آدمی وہ بڑا ہوتا ہے جس کا دل بڑا ہوتا ہے...... دھن دولت سے آدمی بڑا نہیں ہو جاتا...... بابو کا جانا ضروری تھا...... نہ جاتے تو وہ سب کیسے پاتے جو...... خیر یہ حویلی والے اپنی اولاد چھوڑ سکتے ہیں...... ہم نہیں...... دیدی ہمارے دیس میں دھن والوں کی کمی نہیں...... اگر ایک دھنوان ایک غریب بچے کی انگلی تھام لے...... اسے پالے پوسے...... تو اس دیس کا ایک بچہ بھی روٹی کو نہ ترسے...... یہاں کوئی یتیم خانہ نہ رہے...... لیکن محتاجوں پر امیروں کی نظر نہیں پڑتی...... بچہ آئے تو اس دنیا میں...... میں اسے سینے سے لگا کر پالونگی...... اب آئندہ ایسے برے برے خیالات ذہن میں نہ آنے دینا ورنہ...... اس نے مسکرا کر دیدی کو گلے لگا لیا......

محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی...... ان بہنوں کی محنت بھی رنگ لائی...... کام میں اضافہ ہوتا گیا...... زندگی معمول پر چل پڑی...... دن گذرنے لگے...... اور موہنی کے ماں بننے کا وقت بھی آگیا......

ہسپتال میں بڑے ہی شگفتہ لہجے میں ڈاکٹر نے کہا...... موہنی تمہارے بیٹا ہوا ہے...... موہنی نے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا اور آنسو لگاتار بہنے لگے...... تم پہلی لڑکی ہو جو سن کر خوش نہیں ہوئی......

ڈاکٹر میں بیٹی چاہتی ہوں...... بیٹا نہیں...... موہنی کے لہجے میں سخت انداز نفرت تھی......

ڈاکٹر نے کہا...... دنیا کے کونے کونے میں بیٹے کی پیدائش پر جشن منائے جاتے ہیں اور تم

رو رہی ہو..... مگر کیوں..... کیوں کہ مرد ذات ہی بے وفا ہوتی ہے..... میں نے مرد کے ہر رشتے میں دھوکہ کھایا ہے..... ہمارے گھر کے مردوں نے ہمارے اوپر بڑے پہاڑ توڑے ہیں بھائی نے آنکھیں پھیرلیں..... باپ کے زندہ رہتے ہوئے یتیم ہوگئے..... باپ نے تو ایک عورت کے ہاتھوں اپنا دھرم اور ذات ہی بکری کردیا..... بابو سے شادی کے لئے میں راضی نہیں تھی..... بہت قسمیں کھائیں..... زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا..... انہوں نے شدید اصرار کیا..... اور مجھے اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسالیا اور پھر اس حال میں مجھے چھوڑ کر چلے گئے..... بس اب ایک ماں اور بیٹے کا رشتہ باقی رہ گیا ہے..... ماں بیٹے کو پالنے میں اپنی ساری عمر گزار دیتی ہے۔ اور آخر میں وہ بھی اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ ماں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اس کے گھر میں ماں کو ایک کونا نصیب نہیں ہوتا..... آخر میں ماں کو کسی پاگل خانے یا کسی اولڈ ہوم میں چھوڑ آتا ہے..... وہ زمانے جاتے رہے جب بیٹے ماں کا احترام کرتے تھے..... سمجھتے تھے کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے..... بیٹی دور ہو کر بھی یاد تو کرے گی..... مجھے نہیں چاہئے بیٹا.....

سوہنی قریب آئی..... دیدی آپ اپنے ہوش میں ہو یا دماغی توازن کھو بیٹھی ہو..... اولاد خدا کی طرف سے نعمت ہے..... بچہ عورت کی سب سے بڑی ڈھال ہوتا ہے.....

موہنی نے اپنے اندر کا الاؤ نکال کر رونا شروع کردیا تھا..... نہیں..... نہیں..... چاہیئے..... مجھے بیٹا..... سوہنی نے بچہ موہنی کی گود میں دیتے ہوئے کہا..... ہمارے اندھیرے گھر میں چاند چمکا ہے..... یہ ہمیشہ اندھیرے میں روشنی بن کر چمکے گا.....

بچہ رو رہا تھا..... موہنی اسے چپ کراتے ہوئے بولی..... سوہنی تو کہتی ہے تو مان لیتی ہوں..... پر اتنے..... دھوکے کھانے کے بعد..... اب.....

بچہ مسلسل رو رہا تھا..... موہنی اسے چوم رہی تھی..... سوہنی ہنس رہی تھی..... دیدی سارے رشتے ناطے دھوکہ دے سکتے ہیں..... ماں کی ممتا نہیں.....

موہنی کے چہرے پر ممتا ہی ممتا بکھری ہوئی تھی.....

☆☆☆

منجدھار (۲)

خوشیوں سے گلنار چہرہ لئے سوہنی اپنی دیدی کے کمرے میں داخل ہوئی اور کھنکتی آواز میں گویا ہوئی...... دیدی ابھی گھر چلو...... ڈاکٹر نے تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔
موہنی گھبرائی اور بیحد خوفزدہ آواز میں بولی...... ابھی نہیں...... اندھیرے کے بعد...... سوہنی نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا تھا...... مگر...... کیوں...... اندھیرے کے بعد...... کیوں...... کیونکہ میں رسوائی سے بھری ہوں...... دن کے اجالے میں سب کے سامنے سر اٹھا کر نہیں چل سکتی میری جگہ کوئی اور ہوتی تو کب کی ڈوب کر مرگئی ہوتی۔...... مگر میں......
سوہنی فوراً ہی بولی تھی...... دیدی کیسے کیسے خیالات تمہیں پشیمان کرتے رہتے ہیں جبکہ اس پورے قصے میں تم بالکل بے قصور ہو...... گنہگار تو بابو ہیں جو تمہیں دنیا کی نظروں میں رسوا کر کے چھوڑ گئے۔ تمہارا تو صرف اتنا قصور ہے کہ مجرم کو مجرم نہیں سمجھتیں اور ناحق سارے الزام اپنے سر لگا رہی ہو' مجھے تو دکھ صرف یہ ہے کہ ہم مجرم کا نام تک نہیں جانتے ورنہ......
تم یہ دکھ جھیلنے والی پہلی لڑکی تو نہیں...... بابو جیسے بے وفا اور سنگدل مردوں کے ہاتھوں تم جیسی کتنی ہی معصوم لڑکیاں تباہ ہو رہی ہیں...... آئندہ جان دینے کی بات کبھی مت سوچنا...... زندگی اتنی سستی بھی نہیں جو ایسے دغاباز اور دھوکے باز شخص کے لئے قربان کر دی جائے......
موہنی بولی...... میں بے حد خوفزدہ ہوں ایک دہشت میں گرفتار ہوں......
کیسی دہشت...... کس کا خوف...... سوہنی نے سوال کیا......
موہنی بولی آنے والے کل کا خوف اور جو طوفان آئے گا اس کی دہشت......
سوہنی نے اپنی دیدی کو دلاسا دیا...... تم بے خوف ہو کر گھر چلو...... آنے والا کل تو آئے گا ہی مگر آنے والے طوفان سے ٹکرانے کے بعد میں سوچیں گے......
موہنی بولی...... تو نہیں جانتی دہشت کیا ہوتی ہے...... میں ہر وقت خوف کے شکنجے میں جکڑی رہتی ہوں۔ خون کے رشتے ٹوٹ گئے...... باپ اور بھائی کے چھوڑنے کے بعد میں نے اپنی زندگی کا ہر پل خوف کا سامنا کرتے ہوئے کاٹا ہے...... بے سائیگی کا ڈر...... تنہائیوں کی دہشت...... افلاس اور بھوک کا ڈر...... پھر مرتی ہوئی ماں کے چہرے کی دہشت...... جو پیار میری زندگی ہے اور جس کے بارے میں دن رات سوچتی رہتی ہوں آج اسی محبت کا خیال مجھے ڈرا رہا ہے...... آخر آ ہی گئی میری رسوائی کی نوبت...... لوگ سوال تو ضرور کرینگے میں جواب کہاں سے لاؤنگی...... کیسے سہوں گی محلے والوں کی زبانی کوڑوں کی مار...... نا جانے کیا ہوگا...... کل......
سوہنی کی حیرت مزید بڑھ گئی...... موہنی کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی...... میں محلے والوں کو تم

تک پہنچنے دونگی تب ہی تو وہ تم سے سوال کریں گے۔ سارے سوالوں کا جواب میں دوں گی ...... میں کروں گی ہر طوفان کا مقابلہ...... تم بالکل بے فکر رہو......

دیدی تم ماں بن گئیں اور ابھی تک اپنے اندر ہمت پیدا نہ کر سکیں ...... ماں اپنی اولاد کی خاطر ہزار قسم کی مصیبتیں جھیل کر ہر حال میں جیئے جاتی ہے۔ تمہیں میری خاطر بھی جینا ہوگا۔ تمہارے سوائے اور کوئی نہیں ہے میرا...... بھول گئیں ...... اماں کو دیا وچن ...... کہ تم ہمیشہ مجھے سہارا دو گی......

موہنی نے نظریں جھکا کر کہا...... تو چھوٹی ہو کر اتنی بہادر ہے ...... میں تو تیرے لئے کچھ بھی نہ کر سکی ...... الٹا تو ہی مجھے سنبھال رہی ہے......

ایسا نہ کہو ...... وقت دور نہیں جب ہم دونوں مل کر اپنے جیسے بے سہاروں کو سنبھالینگے ...... مصیبتوں اور طوفانوں سے ٹکرا کر ہی تو ہم دونوں مضبوط ہوں گے ...... زندگی جینا آسان کام نہیں ...... طوفانوں کا سامنا کرنا ہی زندگی ہے...... ڈرنا نہیں ...... میں شام کو آؤنگی ...... بہت کام کرنا ہے......

موہنی بولی...... میری چھوٹی بہن اور محنت اتنی زیادہ......

دیدی محنت نہیں کروں گی تو اس ننھی سی جان کو کیسے پالونگی......

شام کے اندھیرے چھانے کے بعد ہی جب سوہنی گھر پہنچی تو موہنی بلک کر رو پڑی۔ اسے یوں روتا دیکھ سوہنی بولی...... میرے ہزار تسلی دینے سے بھی تمہارا یہ دکھ ہرگز کم نہ ہوگا...... رونے سے نہ دکھ گھٹے گا اور نا ہی قسمت بدل جائے گی ...... جب دکھ برداشت کے باہر ہو جاتا ہے تو انسان خود اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے۔ سو اب آپ ہی خود سوچو اور سمجھو کہ کیا ایک بے وفا شخص کی خاطر اپنی جان ہلکان کرنا ٹھیک ہے۔

موہنی بولی ...... یہ ممکن نہیں کہ دل کو دل کی خبر ہی نہ پہنچے۔ یاد تو وہ بھی مجھے ضرور کرتے ہوں گے...... حالات جو بھی ہیں مگر میرا دل کہتا ہے وہ بے وفا نہیں ...... وہ تو بڑے مہربان تھے...... وہ ایسے بے مہر نہیں کہ اپنے بچے سے بھی منہ موڑ لے ...... وہ ضرور کسی آفت میں مبتلا ہیں۔ بابو جیسا مخلص انسان جھوٹی قسمیں نہیں کھا سکتا...... انہوں نے وعدے کئے میں نے اعتبار کیا ...... میاں بیوی کے درمیان اگر اعتماد ہی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا...... سوہنی کچھ نہ بول سکی...... بس سوچتی رہ گئی...... جس شخص نے تمہیں ریزہ ریزہ کر کے دم کے دم میں پاتال میں اتار دیا اس پر اتنا اعتبار کہ آج تک اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو دل سے لگائے بیٹھی ہو...... شاید یہی ٹھیک ہے۔ یہی تمہارے جینے کا بہانہ بن جائے...... کبھی کبھی زندہ رہنے کے لئے انسان کو اپنے آپ کو دھوکہ بھی دینا پڑتا ہے

بابو ہم تو پہلے ہی مظلوم لوگ تھے...... اپنوں کے ہاتھوں چوٹ کھائے ہوئے ...... جی رہے تھے کس طرح...... آپ نے تو ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ...... کیا خوب صلہ دیا ہے محبت کا...... میری دیدی کو ارمانوں کی سولی پر چڑھا کر چھوڑ گئے ...... اور وہ آج تک آپ کو دیوتا سمجھ کر پوج رہی ہے۔ من ہی من میں بابو کو کوسنے لگی......

بابو آپ نے ہمارا سکون چھینا ہے آپ کو بھی کبھی سکون نہیں ملے گا۔ انہی سوچوں میں گم وہ آگے بڑھتی گئی اور موہنی کے لئے کھانا لے آئی......

سوہنی کا ارادہ تو تھا کہ وہ رات بھر جاگ کر بچے کو دیکھے گی لیکن دن بھر کی تھکی ہاری تھی۔ پلنگ پر سر ٹکاتے ہی گہری نیند اس پر غالب آ گئی...... بچے کے رونے کی آواز نے اسے جگایا تھا...... ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ دیکھا دیدی بچے کو گود میں لئے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی......اس نے فوراً بچے کو اٹھا کر کہا......نوزائیدہ بچے کے اوپر ماں یوں آنسو بہائے ٹھیک نہیں سمجھا جاتا...... دیدی اولاد خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت ہے اور آپ رو رہی ہو۔ کہتے ہیں اس سے خدا ناخوش ہوتا ہے۔

خدا مجھ سے خوش ہی کب ہے...... موہنی بولی...... نہ کوئی آہٹ...... نہ آواز...... یہ کیسی ویرانی ہے...... خاموشی...... تنہائی......اور مکمل بے بسی......آج جیسی تنہائی تو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی......میں تنہائیوں کے اس بیابان میں تنہا بھٹک رہی ہوں......کوئی راستہ نظر ہی نہیں آتا......

راستہ بھی ملے گا...... دیدی کوئی موڑ تو آئے گا جس کے آگے منزل ہوگی......تمہارے آنسو تمہارے اندر کی تڑپ اور درد کا سارا حال مجھے سناتے ہیں۔ میں تمہیں اس حال میں دیکھ کر بے چین ہو اٹھتی ہوں...... موہنی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی......تم رویا نہ کرو......

کیا کروں......غم ہی غم ہے......درد سے بھرا دل ہے...... میں کب روتی ہوں حالات مجھے رلا رہے ہیں......

سوہنی بولی...... دیدی بیٹے کی ماں ہو...... اتنا غم بھی نہ کرو...... یہ ہے نا......تمہارے دل کی ویرانی کے احساس کو مٹانے والا ایک دن یہ تمہاری جھولی خوشیوں سے بھر دیگا......

موہنی بولی...... سب ٹھیک ہے مگر میری زندگی میں پت جھڑ آ کر ٹھہر گیا ہے۔

سوہنی مسکرا کر بولی......اور یہ بھی تم جانتی ہو کہ موسموں کا بدلنا خدا کی طرف سے ہے۔ آج پت جھڑ ہے تو کل بہار کو آنا ہی پڑے گا...... قدرت کے بنائے اس دستور کو کوئی نہیں بدل سکتا......

موہنی نے اپنی چھوٹی بہن کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ کر کہا...... میں اس موسم کا انتظار کرونگی......

صبح صبح پرندے چہک رہے تھے...... سوہنی نے کچھ دیر بعد ہی آنگن میں جھانکا تھا...... سورج کی سنہری سنہری کرنیں آنگن میں اترتی دیکھ اس نے فوراً دعا مانگی تھی...... بھگوان میری دیدی کے دل کے آنگن کو بھی روشن کر دے...... گرم دودھ لے کر دیدی کے کمرے کا رخ کیا ہی تھا......

دروازے سے پرزور دار دستک سنتے ہی سارے چہکتے پرندے اڑ گئے تھے...... دروازے پر مجموعہ اغیار دیکھ کر وہ کانپ اٹھی تھی...... ایسا زبردست طوفان...... سوہنی کو کم از کم یہ اندازہ نہ تھا......اسے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی تھی...... مگر پل بھر میں وہ سنبھلی تھی...... کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے جو آپ سب پریشان ہیں...... حادثہ...... ابھی ہوا نہیں مگر ہو سکتا ہے...... یہ بچہ کس کا ہے......اس کے

رونے سے ہم رات بھر سو نہ سکے...... سب کی بھوئیں تنی دیکھ کر سونی پہلے ہی ڈر گئی تھی ...... اب آواز کی کرختگی نے اور بھی دہلا دیا تھا...... سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے...... ادھر ادھر دیکھ کر بولی ...... کونسا بچہ......

دیکھو جی صاف صاف جواب دو...... ورنہ بچہ اغوا کرنے کے جرم میں جیل جاؤ گی ...... یہ وہی لڑکا تھا جو اکثر سونی کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا تھا...... آج عجب سی فاتحانہ مسکراہٹ لئے سینہ تانے سونی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا......

سونی بولی ...... بچے تو روتے ہی ہیں ...... انہیں اتنی عقل کہاں کہ پڑوسیوں کی نیندیں خراب کر رہے ہیں...... فضول باتیں کر کے ہمارا وقت نہ برباد کرو...... ہمارے سوال کا جواب دو ...... اس لڑکے کے ساتھی نے چیخ کر کہا...... ''بچہ میرا ہے''

اپنے شوہر کو باہر بلاؤ...... شوہر...... وہ فوجی ہے ...... لام پر گیا ہے...... دیس کا وفادار سپاہی ہے۔ وہ اونچی برفیلی پہاڑیوں پر راتوں جاگ کر وطن کی حفاظت کرتا ہے اور آپ سب آرام کی نیند سوتے ہیں...... آج اس کے بچے کی خاطر آپ لوگ ایک رات جاگے تو اس کے بچے کی بے سہارا ماں پر الزام لگا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی سب کے سر جھک گئے ...... کچھ دیر بعد ہی وہاں مکمل خاموشی چھا گئی تھی ...... سب جا چکے تھے......

موہنی بولی...... تو نے سنبھال لیا...... گر میں اکیلی ہوتی تو نا جانے کیا ہو جاتا...... سونی نے ایک بار پھر دیدی کو ہمت دلائی ...... خود اعتمادی کا جذبہ نا رہے تو انسان کمزور پڑ جاتا ہے۔ دیدی اب ڈرنا چھوڑ دو ...... اس دنیا میں جو ڈر گیا سو مر گیا...... اب کم سے کم محلے والے ہمارے اوپر انگلیاں نہیں اٹھائینگے۔ اسی وقت سونی نے دیپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا......

شام ڈھل چکی تھی ...... آہستہ آہستہ ماحول میں سرمئی اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا...... مٹھائی اور کھانا خریدنے کے بعد سونی اور دیپ ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے......

کاش آج اماں ہوتیں ...... کہتے ہی سونی رو پڑی تھی ...... اللہ جوڑی بنائے رکھے ...... تم دونوں صدا خوش رہو...... شاد رہو...... آباد رہو...... پاس کھڑی خاتون کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو دونوں نے فوراً اس خاتون کی جانب دیکھا جو سر جھکائے ...... نظریں نیچی کئے ان دونوں کو آشیرواد دے رہی تھی...... انہیں دعاؤں سے نواز رہی تھی ......

سونی جو ابھی تک خیالوں ہی خیالوں میں اپنے بابل کے انگنا میں ڈول رہی تھی ...... اپنے باپو کی بے وفائی اور بے حسی پر...... اور اپنی ماں پر توڑے جانے والے ظلم وستم کا سوچ کر دل ہی دل میں آنسو بہا رہی تھی اس خاتون کی باتیں سن کر پل میں حال کی دنیا میں لوٹی...... اس نے فوراً ہی اس خاتون کے دونوں ہاتھ زور سے تھام کر چومے تھے......

اماں...... آپ کو آج بھگوان نے خاص طور سے ہمارے لئے یہاں بھیجا ہے۔ ہم دونوں ابھی

ابھی شادی کر کے مندر سے آ رہے ہیں ...... اس دنیا میں ہمارا اپنا کوئی بزرگ نہیں جو ہمیں آشیرواد دیتا۔ ہمارے سروں پر ہمارے کسی بزرگ کا سایہ نہیں رہا...... میرے باپو اور بڑے بھائی وطن میں رہ گئے اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ دونوں زندہ ہیں بھی یا نہیں...... اماں بھی مجھے چھوڑ کر دور بہت دور چلی گئیں...... آج ان سب کی بہت یاد آ رہی ہے۔ ان کے پیار کی بڑی شدت سے کمی محسوس کر رہی تھی ...... آپ نے ہمیں دعائیں دے کر وہ کمی پوری کر دی ...... اس مبارک گھڑی میں ہمیں بڑوں کے آشیرواد کی بے انتہا ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ زندگی میں آگے ترقی کرنے کے لئے بڑوں کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہوتی ہے...... آپ آئندہ بھی ہمیں اسی طرح دعائیں دیتی رہنا......

بیٹا...... مجھ غریب کے پاس دینے کے لئے دعاؤں کے سوا اور کچھ بچا ہی نہیں ...... اگر اس وقت ہاتھ میں کچھ بھی ہوتا تو میں تمہیں ضرور انعام کے طور پر دیتی ...... بوڑھی خاتون نے پوری صداقت سے کہا تھا......

اماں ...... دینے والے نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے...... جو کمی تھی وہ بھی آج آپ نے پوری کر دی ...... اپنائیت اور پیار بھرے لہجے میں کہے ایک ایک حرف نے خاتون کے اندھیرے اور مایوس دل میں امید کی کرن چمکا دی...... مردہ دل میں نئی زندگی کی روح پھونک دی......

تب ہی دیپ نے سوال کیا...... اماں آپ کہاں رہتی ہیں۔ خاتون نے اشارہ کیا...... وہ نکڑ پر بوسیدہ سا گھر دیکھ رہے ہو...... بس وہیں...... خاک کر دیا میرا آشیانہ ...... پھونک ڈالا میرا گھر...... ان دہشت گردوں نے......

پھر...... گھر...... چلیں...... اماں...... گھر...... گھر...... خاتون گھبرائیں ...... بیٹا تمہارے ساتھ نئی دلہن ہے اور میرے پاس...... مہمان نوازی کرنے کا مقدور نہیں ...... احساس سے بھری بوجھل آواز میں اماں گویا ہوئی تھیں۔

دیپ فوراً بولا...... اماں ...... بیٹا اور بہو...... مہمان نہیں ہوتے......

اماں جلد ہی سنبھل گئیں...... ڈھیروں اطمینان لئے گھر کی طرف روانہ ہوئیں ...... اماں نے دروازے پر زوردار دستک دی...... ایک کمزور علیل سی لڑکی نے دروازہ کھولا...... اس کا لباس اور مرجھایا سا بے رنگ چہرہ ان کی بدحالی کا فسانہ سنا رہا تھا...... اماں بولیں ...... بھوک سے نڈھال ہو کر آج پہلی بار اپنی انا اور عزت کو بالائے طاق رکھ کر کچھ مانگنے نکلی تھی...... لاکھ کوششوں کے باوجود بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا سکی ...... شاہین ...... دیکھ اللہ کی شان ...... اس نے میری جھولی بھر دی ...... میرا بیٹا اور بہو مجھے واپس مل گئے......

لڑکی دم بخود اپنی جگہ کھڑی کبھی اماں کو دیکھتی کبھی سوہنی اور دیپ کو...... آہستہ سے بولی...... کیا کہہ رہی ہو اماں...... پھر سوہنی کی طرف دیکھ کر بولی...... دکھ کی شدت سے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے...... اماں آتے ہی تیزی سے اندر کے کمرے میں گھس گئی تھیں پلک جھپکتے ہی ہاتھوں میں ایک

خوبصورت سا ڈبہ لئے لوٹی تھیں......

کاش میں اپنے ہاتھوں سے یہ رسم ادا کر سکتی۔ پر ظالموں نے مجھے بیوہ بنا کر اس قابل ہی نہیں چھوڑا...... لے شاہین ......نئی دلہن کے سر پر لال ڈوپٹہ ضروری ہوتا ہے۔ اڑھا دے اپنی بھابھی کو ...... پھر ہولے سے بولیں ...... یہ ڈوپٹہ ہمیشہ تمہاری حفاظت کرے گا...... خدا میرے بیٹے کو لمبی عمر دے گا......تم دونوں کا ساتھ سدا بنے رہے۔بس میری یہی دعا ہے۔

جھلملاتے لال زرتار ڈوپٹے کے اوڑھتے ہی سوہنی کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا...... اس نے بے ساختہ جھک کر اماں کے پاؤں چھوئے...... وہ بڑے آزردہ لہجے میں بولیں...... آج گھر میں ایک مسری کی ڈلی بھی نہیں جو نئی دلہن کا منہ بھی میٹھا کر سکوں...... صبح سے فاقہ...... پھر ایک دم ہی کچھ سوچ کر چپ سادھ لی......

اماں نے سوہنی کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگایا۔اس کی پیشانی چومی...... سوہنی کو آج مدت بعد یوں لگا جیسے وہ اپنی سگی ماں کی باہوں کے حصار میں ہو...... دیپ نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبہ کھول اماں کے سامنے کیا اور بولا...... اپنی بہو کا منہ میٹھا کیجئے......

ایک عرصے کے بعد محبت...... خلوص اور عقیدت سے۔ چمکتے چہرے دیکھے تو اماں کے بیقرار دل کو راحت نصیب ہوئی تھی...... ان کے چہرے پر بھی مکمل سکون اور اطمینان کے تاثرات پھیلے تھے......انہوں نے فوراً اپنا دکھ بھرا افسانہ سنایا......

انسان انسان کو بیدردی سے مار رہا ہے۔ایک دوسرے پر بے انتہا ظلم ڈھا رہا ہے۔ پہلے میرے اپنوں نے میری جائیداد چھینی پھر جو بچا کھچا سرمایہ تھا وہ دہشت گردوں نے لوٹا......ہمیں غیروں نے نہیں اپنوں نے لوٹا ہے۔تم نے سنا تو ہوگا گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے بس یہی ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔اگر ہمارے اپنے غیروں کا ساتھ نہ دیں...... غیروں کی حمایت نہ کریں تو کس میں مجال جو ہمیں ضرر پہنچا سکے۔ کتنی بے فکری تھی ہماری زندگیوں میں۔ نا دہشت گردی کا ڈر تھا نا بم دھماکوں کا خوف۔ آج قدم قدم پر خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔کوئی بھی...... کہیں بھی محفوظ نہیں...... لٹ گیا...... ہمارے وطن کا چین و امن......

بیٹا میں تو ناامید ہو چکی تھی......امداد کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی...... مرد جھگڑتے ہیں......عورتیں تباہ ہو جاتی ہیں...... بچے برباد ہو جاتے ہیں......آج مجھے یقین ہو گیا کہ......اماں میں صبر کا یارا نا رہا......ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور لبوں سے دھیمی دھیمی سسکیاں نکلتی رہیں......اور آج آپ کو یقین ہو گیا کہ خدا کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا ......اس نے اماں کا کہا ادھورا جملہ پورا کیا......اماں کے ہاتھ پکڑ کر بولا...... آج سے آئندہ آپ اپنے کو کبھی اکیلا نہیں سمجھنا......ہم ہیں آپ کے اپنے۔

شاہین جو بے یقینی کے عالم میں ابھی تک کھڑی سب دیکھ رہی تھی حیران تھی...... اس کے اداس چہرے پر بھی رنگ بکھر گئے تھے...... اتنا بڑا سہارا پا کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی...... اس نے بھی اپنے دل کی کہہ ڈالی......وہ

زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں تھی مگر تھی بڑی خوددار...... بولی...... بھابھی جان...... کیونکہ ہمارے گاؤں میں اسکول نہیں تھا سو میں پڑھ نہیں سکی...... محنت کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ بھر سکتی ہوں...... ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو پڑھانا فضول خرچی سمجھتے تھے...... میرے ابو سمجھتے تھے کہ لڑکی اپنے سسرال میں ہی محفوظ رہتی ہے...... اپنے شوہر کے سائے تلے...... مگر آج کل کے شوہر توبہ توبہ میرے شوہر نے میرا ساتھ نہیں دیا...... دو مہینے کے اندر ہی میرا زیور اور روپیہ لے کر رفو چکر ہو گیا...... آج تک اس کا سراغ نہیں پا سکے ان کے نام پر جی رہی ہوں اور جیئے جاؤنگی جب تک وہ آ کر اپنے ہاتھوں مجھے قبر...... وہ یکا یک چپ ہو گئی دیر سے جمع آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے......

دیپ کے اندر ایک محشر برپا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ منظر جسے وہ لاکھ جتن کر کے بھی بھلا نہ سکا تھا ایک دم چھا گیا...... وہ پتاجی کے سب سے عزیز سب سے قریبی دوست ہی تو تھے...... کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے جب بیدردی سے لوگ میرے ماں اور باپ کو قتل کر رہے تھے۔ ایک بار بھی ہاتھ نہیں روکا تھا۔ احتجاج نہیں کیا تھا...... وہ سوچنے لگا ایسا کیوں ہوتا ہے، ہم جن کو دل و جان سے پیار کرتے ہیں جن پر یقین اور بھروسہ کر کے ان کے منہ سے نکلے لفظوں کو پتھر کی لکیر سمجھ لیتے ہیں وہ ہی ہمیں دھوکا اور فریب دیتے ہیں...... کتنی بار جمال چاچا نے کہا تھا۔ یار تو بے فکر رہ...... میرے ہوتے ہوئے تجھے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا...... حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دونگا...... اور انہیں جمال چاچا نے میری جان بچائی تھی...... مجھے سرحد پار کرائی تھی...... ضرور جمال چاچا بے بس ہو گئے ہونگے...... کچھ مجبوری ہو گی...... ورنہ وہ کبھی اپنے دوست سے بے وفائی نہیں کرتے...... نہ جانے کیا کیا اچھے برے خیالات گڈمڈ ذہن میں گھومنے لگے تھے......

کیا سوچنے لگے...... سوہنی کی آواز پر وہ چونکا تھا...... آس بھری نظروں سے اب شاہین اسے ہی دیکھ رہی تھی...... اور اماں کہہ رہی تھی...... ابھی تو میرے میں بھی اتنا دم خم باقی ہے کہ ایک گھر کا کام سنبھال سکوں...... میری بچی میرے بعد کس کے رحم و کرم پر رہے گی...... اسے جینے کا سہارا نہ دو...... اسے جینا سکھا دو...... اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دو تا کہ یہ خود چل سکے...... جو کام میں نہ کر سکی وہ تم کر دو......

مجبوری تھی...... مرد ہماری باتوں پر کب توجہ دیتے تھے...... مردوں کی دنیا تھی بس وہی راج کرتے تھے...... شاہین بہت لذیذ کھانا پکانا جانتی ہے۔ سلائی بھی جانتی ہے۔ کچھ بھی کر لے گی۔

سوہنی اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولی تھی...... ٹھیک ہے...... اماں...... جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا...... اماں پھر اپنا دکھڑا رونے لگیں...... میرا اپنا بھانجا تھا...... میں نے ہی پالا تھا...... بڑے وعدے کرتا تھا...... میری بیٹی کو دغا دے گیا...... زندہ در گور کر گیا...... اسے پڑھا لکھا کر قابل کر دیا تھا...... کاش میں اپنی بیٹی کو بھی تعلیم دے سکتی تو آج یہ بھی کہیں سرکاری افسر لگی ہوتی......

اماں میں کل آؤنگی...... یقین سے بھرا لہجہ تھا...... اماں کے آنسو پھر بہنے لگے تھے۔ یہ آنسو بھی عجیب ہوتے ہیں...... رنج و غم کے عالم میں لگاتار بہتے جاتے ہیں اور خوشی کے عالم میں بھی رکتے نہیں...... دو چار ضرور بہہ جاتے ہیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے تب ہی تو تھم گئے تھے...... گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی...... ماحول میں خوشگواری پھیل گئی تھی...... اماں آپ دونوں کھانا کھائیں اور ہم دونوں چلتے ہیں۔ گھر میں دیدی ہمارا انتظار کر رہی ہو گی...... ہنستے مسکراتے سوہنی اور دیپ

نے ایک بار پھر ہوٹل کا رخ کیا تھا......

جھکی ہوئی آنکھوں اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ سوہنی اپنی دیدی کے سامنے کھڑی تھی......لال زرتار ڈوپٹے میں سے جھانکتی سوہنی کی سندور سے بھری مانگ اور ماتھے پر لال ٹیکا اور دیپ کا ساتھ......موہنی ششدر نظروں سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھے جارہی تھی۔ پھر اٹھ کر سوہنی کو سینے سے لگایا تھا۔اسے چوما تھا......اور پھر دونوں کو آشیرواد دی تھی......

دیدی تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو......میں نے تمہاری اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھالیا......لیکن میں مجبور تھی......تھک گئی ہوں......دنیا والوں کی چھیدتی نظروں سے۔کب تک اکیلا ان کا مقابلہ کرتی رہتی......آج صبح مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ گھر میں مرد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ ہمارے گھر میں مرد کی کمی تھی تب ہی تو سب کی انگلیاں ہماری طرف اٹھتی تھیں......اور یہ مرحلہ تو مجھے ہی حل کرنا تھا......

بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم چاروں کو ایک دوسرے کے سہارے کی بے انتہا ضرورت ہے۔دیپ کو اپنے دکھ بانٹنے کے لئے ایک پریوار کی ضرورت تھی اور مجھے ایک اچھے ساتھی کی......باعزت زندگی گزارنے کیلئے مجھے یہی طریقہ سب سے مناسب لگا......مجھے بچے کے خوشحال مستقبل کے لئے بھی تو سوچنا تھا......دیدی اولاد نعمت ہی ایسی ہوتی ہے کہ انسان اپنے جگر کے ٹکڑوں کے لئے سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔آج سے چاند میرا اور دیپ کا بیٹا ہے۔

میری بہن......تو نے میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی......

قربانی......کیسی قربانی......دیدی شادی کرنا قربانی نہیں ہوتی......دیپ مجھے اپنے لئے بہترین شخص محسوس ہوا......میں نے اپنی مرضی اور خوشی سے دیپ کو اپنا ہمسفر چنا ہے۔تم مجھے آشیرواد دو کہ بھگوان مجھے شکتی دے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتی ہوں اسے بخوبی انجام دے سکوں......

موہنی نے سوہنی کو اپنی باہوں میں بھرتے ہوئے کہا......اور میری چھوٹی سی گڑیا کیا کیا کرے گی......سوہنی نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر کہا......ابھی تو بتانا مشکل ہے۔بس دیکھتی جاؤ......اس وقت تو میں تمہارے لئے گرم گرم کھانا لینے جارہی ہوں......من میں سوچتی رہی تمہارے خوابوں کو تعبیر دینے کے لئے ہی تو میں یہ سب کر رہی ہوں......وہ کمرے سے باہر نکل گی......

دیپ نے بازار کا کام سنبھالا اور شاہین نے سوہنی کے ساتھ کچن سنبھالا......اماں چاند کے ساتھ دن بھر کھیلتی رہتی تھی......موہنی دن بھر کام میں مصروف رہتی تھی لیکن دیکھنے سے یوں لگتا تھا کہ اسے کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔گھر کے باہر جانا تو وہ پسند ہی نہیں کرتی تھی......

کچھ دنوں کی رفاقت میں دیپ اور سوہنی میں مثالی محبت جنم لے چکی تھی......اور روز بروز اس میں اضافہ بھی ہوتا جارہا تھا......دونوں کو ایک دوسرے کی قربت میں خوش دیکھ کر موہنی خوش ہوگئی تھی......دن اور رات گزر رہے تھے......دیپ نے جلد ہی اپنی محبت اور توجہ سے سب کا دل جیت لیا تھا......بزنس میں بھی منافع ہورہا تھا۔بس موہنی نہیں بدلی تھی......وہ تخیل میں باتیں کرتی تھی۔بابو کی یاد اس کے دل کے ہر گوشے میں بسی تھی......کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ہوش، ہستی سے بیگانہ ہے۔

موسم بدلا...... تیز آندھی اور بارش نے پھر ہاہا کار مچایا...... موہنی کا دل تڑپا...... اس کے پاس کھوکھلی یادوں اور زخمی دل کے سوائے کچھ بھی تو نا بچا تھا...... پھر اس آخری رات کی یادوں میں ڈوب گئی جو دونوں نے ساتھ ساتھ گزاری تھی۔ بے ساختہ ہی دل نے بابو کو آواز دی...... کہاں ہے آپ...... میرے دل کی ہر دھڑکن آپ کو پکار رہی ہے۔ آپ کی یاد میرا کلیجہ چیرنے لگتی ہے...... صرف ایک بار آ کر اپنا بچہ دیکھ جایئے...... وہ بے تحاشا روتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی تھی اور دھڑام سے گری تھی...... آواز سن کر سوہنی دوڑی آئی تھی...... کہاں جا رہی ہو دیدی...... وہ بھی دیدی کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی...... گڑیا...... دیکھ...... وہ بابو...... آ رہے ہیں...... دروازہ کھول دے...... خفا ہو کر واپس نہ لوٹ جائیں ...... دیپ نے دیدی کو اٹھایا تھا...... میں دروازے کے پاس بیٹھ کر بابو کا انتظار کرونگا...... آپ آرام کریں...... اپنے پلنگ پر...... دیپ کا درد سے لبریز لہجہ تھا...... وہ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی...... موہنی کو ایک پل چین نہیں پڑا تھا...... کیسے پڑتا...... بابو دل میں بسے تھے...... موہنی کے زندگی کے لئے انمول تھے...... اور آنکھوں سے اوجھل تھے...... اس کے حال زار پر ساری رات آسمان نے آنسو بہائے تھے......

وقت پر لگا کر اڑے جا رہا تھا...... جتنی تیزی سے وقت دوڑ رہا تھا اسی رفتار سے ان کی بزنس بھی ترقی کر رہی تھی۔ ترقی کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھتے جا رہے تھے...... مگر سوہنی اور دیپ دونوں مل کر ہر مسئلے کے حل کرنے کی ڈٹ کر کوشش بھی کرتے تھے...... موہنی کو کسی بھی بات کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے تھے......

سوہنی کے اپنے دو بچے اسکول جانے لگے تھے۔ چاند کو اسکول یونیفارم میں دیکھ کر موہنی بولی...... اگر ایک بچے پر اتنا خرچ کروگی تو اور دونوں کے لئے روپیہ کیسے بچے گا...... انگریزی اسکولوں کی فیس دینا ہم جیسے لوگوں کے بس میں نہیں۔ سوہنی ہنس دی...... دیدی...... اب ہم اتنے بے بس بھی نہیں رہے کہ ایک بچے کو اچھی تعلیم نہ دلا سکیں...... بنیاد مضبوط ہوگی تب ہی تو عمارت بھی مضبوط ہوگی...... میں چاند کو ڈاکٹر بناؤنگی...... دیکھو میرا بیٹا کتنا اسمارٹ لگ رہا ہے...... اور گھبراؤ نہیں وہ دونوں بھی وقت آنے پر اسی اسکول جائیں گے......

موہنی غائب دماغی کے عالم میں سوہنی اور چاند کو گھورتی رہ گئی...... بولی کچھ بھی نہیں۔

کتنے ہی موسم بدلے...... کتنے ہی تہوار آئے اور آ کر گزر گئے۔ مگر موہنی کے بیقرار دل کو چین نہ ملا...... کیسے آتا جس کے لئے اس کی روح تڑپ رہی تھی وہ ہی اسے بھول گیا تھا...... اس کے پاس صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا...... بہت اپنے رنجور دل کو سمجھاتی لیکن آہیں نکل ہی جاتیں...... بابو کی جدائی کے کرب نے اس کے پور پور کو لہو لہان کر دیا تھا۔ درد بھری لہو میں ڈوبی آواز نے بابو کو پکارا...... اس سے پہلے کہ وہاں جاؤں جہاں سے پھر نہ لوٹونگی بس ایک بار اپنی صورت دکھا جائیں...... آپ مجھ سے خفا ہیں یقین کریئے۔ میں آپ کو روکونگی نہیں۔ بس اس ٹوٹے دل کی آخری تمنا پوری کر دیجئے۔ ایک بار آپ کو دل بھر کے دیکھ لوں...... پھر...... گھنے بادلوں نے آکاش کو گھیر لیا تھا...... تیز بارش ہونے کے امکان تھے...... سوہنی کو کتنا بھی ضروری کام ہوتا تب بھی وہ اس بھیانک موسم میں گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتی...... لیکن آج اسی وقت اس کا جانا بیحد ضروری تھا...... سڑک کے اس پار...... بھوکے...... ننگے...... یتیم بچے...... بے سہارا بچے اس کا انتظار کر رہے تھے...... اسے وہاں جا کر کھانا اور کپڑے بانٹنا ضروری تھا...... آج اس کی ماں کا جنم دن تھا...... ماں...... وہ ماں...... جو آخری دم تک محنت کر کے اپنی دونوں لاڈلی بیٹیوں کو پالتی رہی اور جس نے کبھی اف تک

نہیں کی...... سونی ان بچوں کو کیسے بھول سکتی تھی ...... ایک دن وہ اور اس کی دیدی بھی تو بے سہارا تھی۔ اگر بابو آپ نہ ہوتے تو ہمارا کیا بنتا...... بابو...... آپ تو اتنے مہربان قسم کے آدمی تھے...... ہم سے کیا قصور ہو گیا جو ہمیں اتنی کڑی سزا دے رہے ہیں آپ۔ مجھ سے اپنی دیدی کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی ...... ہم پر دیا کرو بابو...... لوٹ آؤ...... اپنے...... گھر...... لوٹ آؤ......

سونی اپنے رکشا کی جانب بڑھی ...... لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی ...... تم میرے ساتھ ...... میرے گھر چلو...... وہاں پیٹ بھر کر کھانا...... پاس ہی کھڑا لڑکا روہانسی آواز میں بولا...... اس نئی جگہ نئے ملک اور نئے شہر میں ہمارے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ...... بے سہارا ہیں ...... یہاں ہم کسی کو نہیں جانتے...... کوئی ہمارا نہیں...... رات سر پر آن کھڑی ہے...... لڑکی کا ساتھ ہے اور ہم بے گھر ہیں...... ہمیں کھانا نہیں پناہ چاہیئے ...... صرف ایک رات کے لئے...... کل...... یہ کہہ کر وہ بے تحاشا سسکیاں لے کر رو پڑا تھا...... سونی کو آپ بیتی یاد آ گئی ...... سسکیوں نے اس کا دل تڑپا دیا......

فوراً ہی بولی...... رکشے میں بیٹھو...... اور ہاتھ بڑھا کر لڑکی کا ہاتھ تھاما...... نہ جانے کیا کشش تھی اس لمس میں ...... سونی کے جسم و جان میں ایک عجیب سی آسودگی اور خوشی کا احساس در آیا...... دل یوں دھڑکا جیسے کسی اپنے بہت قریبی شخص کو برسوں بعد مل کر دھڑکتا ہے۔ سونی نے بے ساختہ لڑکی کو بالکل اپنے قریب بٹھا کر اس کا ماتھا چوم لیا...... کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں دل اس بری طرح بھر آیا تھا کہ آواز نکلنے ہی نہ دی......

گھبرائی گھبرائی مونی دروازے کے باہر کھڑی سونی کا انتظار کر رہی تھی...... دروازہ یوں کھلا دیکھ اور برسوں بعد مونی کو باہر کھڑا دیکھ سونی حیران تھی ...... دل میں سوچنے لگیں ...... سرحد پار سے آئے ہیں...... اپنے ہی تو ہیں...... ضرور...... بہت...... خاص...... بہت ہی خاص ہیں...... تب ہی تو دیدی اور اس گھر کے درو دیوار تمہارا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔

رکشے سے اترتے ہی بولی...... دیدی...... دیکھو...... دونوں دیس سے آئے ہیں...... اور گنگنانے لگی...... او دیس سے آنے والے بتا...... کس حال میں ہے میرا دیس۔ سنتے ہی مونی کا دل بھی اسی انداز سے دھڑکا جیسے کسی اپنے خون کے رشتے دار کی آمد کی خبر سن کر دھڑکتا ہے۔ بولی...... بھوکے پیاسے ہونگے...... یاد ہے کیا برا حال ہوا تھا ہمارا جب ہم بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ جلدی انہیں اندر لے آ......

بلب کی روشنی میں دیکھا...... دونوں کے چہروں پر خوف طاری تھا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ از حد برے حال میں تھے دونوں...... ننگے پاؤں...... گندے پھٹے لباس میں...... دھول سے اٹے جسم...... آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں...... دونوں کے بدن کانپ رہے تھے...... مونی نے جھک کر لڑکے کا ماتھا چوما اور اسے اپنی باہوں میں یوں سمیٹا جیسے ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو سمیٹ لیتی ہے اور بچے کو یقین دلاتی ہے کہ اب دنیا میں کوئی آفت...... کوئی مصیبت تمہیں چھو نہ سکے گی...... چھی...... چھی...... بہادر لڑکے رویا نہیں کرتے...... کتنے بہادر ہو تم دونوں...... بے انتہا مصیبتیں جھیلتے ہوئے...... پیدل چل کر دیس سے یہاں تک آئے ہو...... اب رونا بند کرو...... مونی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ تب ہی سونی گرم دودھ اور مٹھائی لے کر آئی...... لو کھاؤ...... بولی میں تم سے نہیں پوچھونگی کہ کس حال میں ہے میرا

دیس...... تمہاری بے وطنی دیس کی بدحالی اور بے سکونی کا ثبوت ہے...... اگر وہاں سکون ہوتا...... ظلم کی بارش نہ ہوتی تو تمہارا یہ حال کبھی نہ ہوتا۔ تم وطن بدر کیوں ہوتے...... کیوں بے گھر ہوتے۔ یوں در بدر گھومتے پھرتے...... کیوں در در کی ٹھوکریں کھاتے...... موہنی اور سوہنی دونوں کے دلوں میں محبت کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ من بار بار کہہ رہا تھا یہ اپنے ہیں ۔ہمارے اپنے......

اب اپنے نام بتاؤ...... دونوں خاموش بیٹھے رہے...... ڈرو نہیں...... نام نہیں بتاؤ گے تو ہم تمہیں کس نام سے پکاریں گے...... موہنی نے پیار بھرے لہجے میں کہا......

نام...... لڑکا بولا...... نام سنتے ہی آپ ہمیں پناہ دینے سے انکار کردیں گی...... اس اندھیری رات میں اس لڑکی کو لے کر میں کہاں جاؤنگا...... موہنی بولی...... اب تم ہمیشہ ہماری پناہوں میں رہو گے...... ہم تمہیں وہ آفتیں اور مصیبتیں نہیں جھیلنے دینگے جو ہم نے جھیلی تھیں۔ تم بے خوف وخطر نام کہہ ڈالو......

سہمی سہمی آواز میں لڑکا بولا...... انسانوں کے اس وسیع دشت میں آج کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ملک۔ رنگ۔ قوم۔ مذہب یہاں تک کہ نام کی خاطر انسان انسان پر بے انتہا ظلم ڈھا رہا ہے۔ کچھ رک کر بولا...... میں کمال احمد ہوں اور یہ میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہے...... شیرین...... دونوں اس طرح بلک کر روئے کہ موہنی اور سوہنی کے دل ہول اٹھے......

سوہنی نے شیرین کو تھام کر کہا...... تم بڑی پیاری ہو...... بالکل اپنے نام کی طرح میٹھی میٹھی...... پھر کمال کی طرف دیکھ کر سوال کیا...... تمہارے والدین......؟ اس نے بہت ہی دھیمی لرزتی آواز میں کہا...... سب کو ختم کردیا...... میں نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تھا......

میرے ابو بتاتے تھے ان کے خاندان کی جڑیں وہیں تھیں۔ پشتوں سے وہیں رہتے آئے تھے۔ ملک کے بٹوارے کے وقت وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے۔ میرے بڑے بھائی گاؤں میں نہیں تھے جب ان کی امی اور دونوں بہنیں گھر چھوڑ کر بھاگ رہی تھیں پھر وہاں ہی دونوں نے شادیاں کرلیں تھیں۔ دونوں کو اپنے دین وایمان اور نام بدلنے پڑے...... رنگ۔ روپ۔ شکل صورت تو بدل نہیں سکتے تھے۔ بستی کے لوگ ان کے ساتھ حقارت۔ آمیز سلوک کرتے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہی رہتے تھے۔

حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ اس رات چاروں طرف اندھکار تھا۔ خوف اور دہشت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مذہبی جنوں کے اثرات نے لوگوں کو خوفزدہ کردیا تھا۔ اس رات بڑے پیمانے پر جانوں کا اتلاف ہوا تھا۔

ابو نے ان لوگوں کے رنگ میں رنگنے کے لئے سارے جتن کر ڈالے لیکن بھائی اور ابو غدار ہی کہلائے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ جس شخص نے اپنے خون سے غداری کی وہ اس ملک سے کیا وفا کرے گا۔ یہ قبر میں بھی غداری کریگا۔ سو پھونک ڈالو ان دونوں باپ بیٹوں کو اور...... جب ہمیں مارنے کو کلہاڑی اٹھائی تو اسلم چاچا نے کلہاڑی پکڑ کر کہا...... بچوں کو مت مارو...... میں بے اولاد ہوں...... مجھے دے دو...... میں دونوں کو پالونگا...... تب ہی فوجی گاڑیاں آگئی تھیں...... وہ بھاگے...... مگر بھاگنے سے پہلے ہمارے گھر میں آگ لگا گئے۔ میں نے دور سے اپنے گھر میں شعلے اٹھتے دیکھے تھے اسلم چاچا نے رات میں ہمیں سرحد پار کرادی۔ لڑکے نے لرزتی آواز میں سوال کیا...... آپ ہمیں نکال تو نہیں دیں گی

......ارے نہیں...... تم دونوں یہاں ہی رہو گے۔ ہمارے ساتھ...... ہمیشہ...... ہمیشہ...... ہاں یہ بتاؤ تمہاری امی کا کیا نام تھا......

اور تمہارے ابو اور بھائی کا اصلی نام وہ سہمی سہمی آواز میں بولا...... سریندر اور مہندر...... سوہنی اور موہنی دونوں کی چیخیں ایک ساتھ ہی نکلیں تھیں...... دونوں بچوں کو تھامے دونوں متواتر بلک بلک کر روئے جا رہی تھیں۔ ان کی نوحہ گری سن کر دیپ بھی آ گیا...... کیا ہوا...... سوہنی بولی...... یہ دونوں ہمارے اپنے ہیں۔ یہ ہمارا سگا چھوٹا بھائی اور یہ ہے ہمارے بڑے بھائی کی بیٹی...... دونوں ہمارا خون ہے...... ہماری جان ہیں......

موہنی بولی میں تو سدا اپنی تقدیر پر ماتم ہی مناتی آئی صرف یہ سوچ کر کہ کچھ کھو کر کچھ پانا میرے مقدر میں نہیں...... دونوں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر کہا ہم ہیں تمہارے...... ہم بھی سرحد پار سے آئے تھے...... اپنی خوشی سے کون اپنا ملک اور گھر دوار چھوڑتا ہے۔ جان بچا کر بھاگے تھے۔ اس وقت بھی وہی حالات تھے بس فرق اتنا تھا تم دونوں کے والدین وہاں مارے گئے اور ہمارے باپ اور بھائی نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔ کم سے کم ہمیں اپنی ماں کا سہارا تو تھا...... ہم سے زیادہ تمہارا دکھ کون سمجھ سکتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد موہنی بولی...... انہیں کپڑے دے اور جلدی سے کھانا بھی...... کمال اور شیرین سے بولی...... بے فکر ہو کر کھانا کھانا...... یہ گھر تمہارا ہے......

یہ دیس تمہارا ہے...... اب تم بھی ہندوستانی ہو...... اور ہر ہندوستانی کو چاہیئے وہ کسی بھی قوم و ملت کا کیوں نہ ہو فرض اولین ہے کہ اس پیارے وطن کی حفاظت کرے اور موقع آنے پر اپنی جان سے بھی دریغ نہ کرے...... کبھی کسی کی نہ سننا...... کسی کے بہکاوے میں نہ آ جانا...... آئندہ تمہارا ہر قدم صرف اور صرف اس ملک کی بہبودی اور ترقی کے لئے ہی اٹھنا چاہیئے...... تم نے خون خرابہ ہوتے دیکھا ہے...... اپنے اس مہان دیس کی سرزمین کو تم اسی ملک کے پیاروں کے خون سے ہرگز ہرگز نہ رنگنا بلکہ اپنی محبت کے رنگوں سے اس پیاری سرزمین کو جگمگا دینا تا کہ اس ملک پر شہید ہونے والوں کی روحوں کو چین و قرار ملے......

سوہنی کھانا لے آئی تھی...... اس کے پیچھے پیچھے اس کے دونوں بچے آکاش اور بھومی بھی آئے تو تھے مگر کچھ فاصلے پر رک گئے تھے...... یا تو پہلی بار اپنی موسی کو پوری توجہ اور محبت سے دو غیروں کے ساتھ محو گفتگو دیکھ حیران ہوئے تھے ۔یا پھر ان غیروں کے برے حال دیکھ کر پریشان تھے۔ دیپ فوراً آگے بڑھ کر بولے...... تم دونوں رک کیوں گئے...... آگے بڑھو اور ان دونوں سے ملو...... یہ دونوں ہمارے اپنے ہیں۔...... ہمارے گاؤں سے آئے ہیں...... اب یہ دونوں بھی ہمارے ساتھ رہیں گے......

باہر زور کی بارش ہو رہی تھی اور ان چار دیواروں کے اندر میں پیار کے میھ کی مسلسل بوچھاروں نے دو معصوم بے بس دلوں کے گہرے زخموں سے رستے بہتے لہو کی بوندوں کو ڈھوڈالا تھا۔ تب ہی تو ان کے زرد اور مایوس چہروں کی رنگت بدلی تھی اور آنکھوں میں ایک نئی چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ اس محبت برساتے ماحول میں موہنی بھی اپنا دکھ بھول بیٹھی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ابھری تھی۔

اور یوں کئی موسم بدلے مگر نہ بدلی تو بس موہنی کی تقدیر۔ ہر برسات کا موسم اس کے اندر ایک آگ برسا جاتا۔ اس کے دل کی بیقراری میں اضافہ کر جاتا۔ موہنی کو محبت پر یقین تھا اور پورا یقین تھا کہ ایک دن اس کے بابو اس کے پاس لوٹ آئیں گے۔ اسی لئے تو آج تک اس نے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی۔ جب سوہنی نے اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ کرنے کو

کہا تو موہنی نے انکار کر دیا۔ موہنی نے گہری گہری نظروں سے سوہنی کو دیکھ کر کہا تھا...... میں تم کو نہیں روکونگی...... تم سب جاؤ...... یہ گھر جسے تم صرف اینٹ گارے کی عمارت سمجھتی ہو میرے من کا مندر ہے۔ نہ جانے کب میرے بھگوان آجائیں...... اور...... مجھے نہ پا کر خفا ہو کر لوٹ جائیں...... نہیں میں انہیں خفا نہیں کر سکتی...... میں یہاں رہ کر ان کے آنے کا انتظار کرونگی...... سوہنی نے سوال کیا تھا...... آخر کب تک...... وہ بولی تھی جب تک کہ میرے خوابوں کی تعبیر مجھے نہ مل جائے۔ اب تو اس گھر سے ہی میری ارتھی اٹھے گی۔ سوہنی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی دیدی کو مضبوطی سے تھام کر کہا تھا۔ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤنگی...... اور میں بیس سالوں سے بھگوان سے یہی مانگ رہی ہوں کہ میری دیدی کے سپنے پورے ہو جائیں۔

ساون کی ہوائیں موہنی کے ویران دل میں درد کی ٹیسیں بڑھا جاتی تھیں، لیکن آج تو ایک عجیب واقعہ ہوا تھا، برسوں بعد اس کے دالان کی منڈیر پر بیٹھا کاگا کس کی آمد کا پیغام لایا تھا۔ کون آنے والا تھا۔ وہ کیا جانے۔ لیکن یہ کاگا موہنی کے دل میں امید کی ایک نئی کرن ضرور جگا گیا تھا...... موہنی کو جالنے سے باہر جھانکتے دیکھ سوہنی نے سوال کیا...... دیدی کون ہے...... کسے دیکھ رہی ہو...... وہ باہر اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی...... وہ کاگا...... تو نے اس کی آواز تو سنی ہوگی...... نہیں دیدی...... میں نے نہیں سنی...... میں کچن میں چائے بنا رہی تھی...... میں نے سنی تھی...... یاد تو وہ مجھے ہر لمحے آتے ہیں لیکن آج تو یوں لگ رہا ہے کہ وہ یہیں کہیں ہیں میرے آس پاس اور مجھے پکار رہے ہیں...... سوہنی نے اسے دلاسا دیا...... دیدی وہ آپ سے دور ہی کب ہوئے تھے۔ آنکھ سے اوجھل ہونے سے دوریاں بڑھ تو نہیں جاتیں...... موہنی فوراً بولی تھی...... تو ٹھیک کہتیں ہے۔ وہ تو ہر لمحے میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں...... پھر ایک دم ہی دوسرا سوال کیا تھا...... چاند کہاں گیا ہے...... میں نے اسے جاتے دیکھا تھا...... کب لوٹے گا...... سوہنی بولی تھی...... آج ہی دن ڈھلنے سے پہلے ہی واپس آجائے گا...... وہ پاگل خانے کسی مریض کو دیکھنے گیا ہے۔ ڈرائیور بھی ساتھ ہے...... فکر کرنا تمہاری عادت بن گئی ہے۔ اب چاند کی طرف سے فکر مند نہ ہو جانا...... ارے نہیں...... میں نے فکر کر کے کون سے عذاب روک لئے...... جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا...... ہاں...... بس بھگوان کرم کر کے ایک بار ہم سب کو ملا دے...... اس سے پہلے کہ وہاں جاؤں جہاں سے پھر کبھی نہیں لوٹونگی وہ ایک بار اپنی صورت دکھا جائیں۔ میں انہیں دل بھر کے دیکھ لوں...... سوہنی دھیرے سے بولی تھی...... دیدی پھر وہی بات وہ ضرور آئینگے...... آپ یہ اوپر جانے کی باتیں نہ کیا کریں...... میں گھبرا جاتی ہوں دل اس بری طرح بھر آیا تھا کہ وہ آگے کچھ بول نہ سکی تھی...... ڈرتی تھی کہیں موہنی کی خوابوں کی دنیا اجڑ نہ جائے......

موسم کے تیور بگڑتے جا رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ آج پورے بیس سال بعد وہی موسم لوٹ آیا تھا۔ وہی کالی گھٹائیں۔ وہی دل دہلانے والی بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک...... پھر وہی غم سینہ سلگانے لگا تھا۔ وہ چیخی تھی...... سوہنی آج کی کالی گھٹائیں کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ ان کی آواز میرے وجود میں گنگنا رہی ہے۔ لمبے انتظار سے گھبرا کر وہ دروازے کی سمت دوڑی تھی اور لڑکھڑا کر گری تھی۔ اپنے آپ سے بے خبر بولے جا رہی تھی...... دروازہ کھول دو...... وہ آرہے ہیں...... دیپ دوڑ آیا تھا...... موہنی کو سہارا دیکر اٹھایا تھا۔ صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولا تھا۔ دیدی دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں۔ جو لوگ ہمیں پیارے ہوتے ہیں وہ دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں...... وہ آئینگے تو میں دروازہ کھول دونگا...... تب ہی سوہنی اندر آئی تھی...... دیدی ابھی ابھی چاند کا فون آیا ہے...... وہ راستے میں ہے۔ کسی مریض کو بھی ساتھ لا رہا ہے...... موہنی فوراً ہی بولی تھی اور...... وہ...... وہ...... بھی...... تو...... اور رو پڑی تھی

......دیدی کو روتا دیکھ سوہنی کی جان پر بن آئی تھی...... دیپ پھر بولا تھا...... دیدی آپ اندر جا کر آرام کریں...... لیکن سوہنی وہی بیٹھی بے دماغی کے عالم میں دونوں کو گھورتی رہ گئی تھی۔ سوہنی نے دل ہی دل میں دعا مانگی...... اے خدا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ گھر بے رنگ و بو ہے۔ اجڑا...... اجڑا سا...... اس گھر میں اجالا کر دے...... میری دیدی کی لمبی کالی رات کی بھی صبح کر دے......

جب چاند گھر سے نکلا تھا موسم حسب معمول تھا...... مینٹل ہسپتال پہنچنے کے بعد ہی ہواؤں کا رخ بدلا تھا۔ اور پھر آسمان پر کالے بادل چھا گئے تھے اور آسمان سے پانی کے قطرے برسنے شروع ہوئے...... پھر تو ہر پل بارش کی تیزی بڑھتی ہی گئی۔ جب چاند اپنے کام سے فارغ ہوا تو دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا...... جانتا تھا دیری ہوئی تو ماں تو بعد میں پہلے تو اس کی ماسی تہلکہ مچا دیں گی۔ رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیں گی...... پیار بھی تو بے تحاشا کرتی ہیں مجھ سے وہ سوچنے لگا......

ذہنی مریض تھے۔ بجلی کی چمک اور گڑگڑاہٹ اور بادلوں کی گرج کے ساتھ ساتھ وہ بھی چیخ پکار کر رہے تھے۔ ہسپتال میں افراتفری کا عالم تھا...... ہسپتال کا سارا اسٹاف بھاگ دوڑ رہا تھا۔ چاند نے جیسے ہی گھر جانے کے لئے اپنا بیگ اٹھایا کسی انجانی آواز نے قدم باندھ دئے...... ڈاکٹر بابو...... جان بچانا تو آپ کا شیوہ ہے...... اس مجبور...... بے سہارا...... بوڑھے کی جان بچالو...... رہائی دلوا دو اسے ان زنجیروں سے۔ میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ پاگل نہیں ہیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا...... تب ہی وہ بوڑھا بولا...... بیٹا...... میرا یقین کرو میں پاگل نہیں ہوں...... محبت سے لبریز لہجہ تھا...... بیٹا...... ایک عجیب سا جادو تھا۔ اس لفظ میں...... چاند نے ٹھہر کر باغور بزرگ کی جانب دیکھا تھا...... سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہ تھا...... جلدی کرو...... رحیم...... انہیں میری گاڑی میں بٹھا دو...... خود تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھا ذہنی مریض متواتر بولے جا رہا تھا۔ بیس سال سے یہ لوگ مجھے۔ نشیلی ادویات دے دے کر پاگل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب کہتا ہوں کہ میں پاگل نہیں ہوں تو میرا مذاق اڑاتے ہیں...... مارتے ہیں...... ہاتھوں میں زنجیریں اور آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے تاکہ نہ میں کسی کو دیکھ سکوں اور نا ہی کوئی مجھے پہچان سکے......

پاگلوں کی دنیا دیکھ کر چاند کو شدید دکھ ہوا تھا۔ اب ان کی باتیں اس کا دل چیرے دے رہی تھیں...... بے ساختہ ہی اس کا جسم مریض کی طرف جھکا...... مریض کا ہاتھ جو تھاما تو ایک عجیب سی کشش کا احساس ہوا۔ گرفت خود بخود مضبوط ہوگئی...... بس ایک سوال چاند کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ آپ کون ہیں...... کیا رشتہ ہے میرا آپ سے...... کیوں میرے اندر ایک عجب سی سنسنی سی پھیلی ہوئی ہے۔ کیوں مجھے آپ کے تن کی خوشبو اپنی جیسی لگتی ہے۔

بیٹا...... کون ہو تم...... شفقت بھرے لہجے نے بدن میں خوشیاں بکھیر دیں...... وہ دھیرے سے بولا...... ڈاکٹر ہوں...... ڈاکٹر...... صرف ڈاکٹر ہی ہوتے تو مجھے کیوں لگا کہ تمہارا ہاتھ میرا اپنا ہے۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی بولے...... بیٹا...... یہاں کی ہوا کی مہک میرے اندر بسی ہوئی ہے...... میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں پہلے بھی یہاں آیا تھا...... میں اس جگہ کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔ دونوں خاموش آگے بڑھتے گئے تھے......

موہنی کے تن من میں بابو ایسے سمائے تھے کہ اسے اپنی سدھ بدھ ہی نہ رہی تھی۔ ہوا کا ہر جھونکا پچھلی یادیں تازہ کر رہا تھا...... دل کا درد ہر درجہ بڑھ چکا تھا۔ تب ہی تو جب وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے تو وہ اس درجہ محو تصور تھی کہ اسے

کسی کے اندر آنے کی خبر تک نہ ہوئی تھی...... خیالوں ہی خیالوں میں پلکیں موندے بابو کو مخاطب کرتے ہوئے بولی تھی ...... آ۔ اے میری زندگی نزدیک آ...... تنہا ہوں میں۔ موہنی کی بگڑتی دماغی حالت دیکھ کر سوہنی تڑپ اٹھی تھی...... اس نے کب سوچا تھا ایسا بھی ہوگا اور آگے...... شاید...... دیدی بالکل ہی......

کمرے کے اجالے میں سوہنی نے دیکھا اور بے ساختہ چیخ پڑی تھی...... بابو...... دیدی بھگوان پدھارے ہیں تمہارے مندر میں...... موہنی کے خیالوں کی ڈور ٹوٹی...... آنکھوں پر پٹی اور بندھے ہاتھ دیکھ کر...... رو پڑی...... جلدی کھولو ...... انہیں...... چاند جو خود حیرانی کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا...... منہ سے نکلا...... بابو...... یہ بابو...... کون ہیں...... چاند کہاں ملے...... بابو تمہیں...... کون ہے وہ ظالم لوگ جنہوں نے انہیں قید کر رکھا تھا...... چاند سے پہلے دیپ پہنچا...... اس نے پہلے آنکھیں کھولیں اور پھر ہاتھ......

موہنی حواس باختہ تھی بس بابو کو تکے جارہی تھی...... اٹھنے کی سکت تو اس میں نہ بچی تھی...... بابو کو موہنی تک پہنچنے میں پل بھی نہ لگی تھی...... دونوں کے چہروں سے روشنی سی پھوٹی تھی...... آنکھوں میں تاروں کی جھلمل تھی۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تاکے جارہے تھے...... بڑی پرسکون فضا تھی......

موہنی کا خوشیوں سے دمکتا چہرہ دیکھ سوہنی بولی...... مجھ پر جو گزر رہی تھی وہ تو میں برداشت کر رہی تھی مگر میری دیدی جس کرب سے گزر رہی تھی وہ دیکھنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ ہر پل۔ ہر لمحے آپ کی یاد میں تڑپتی تھی۔ آپ نہیں لوٹے اور میری دیدی نے اپنے آپ کو غموں کے ڈھیر تلے دفن کر دیا...... آج ہمارے گھر میں زندگی آئی ہے۔ وہ آگے بڑھی۔ چاند کا ہاتھ پکڑ کر بابو کے قریب آئی۔ چرن چھوؤ اپنے پتاجی کے...... میں نہیں...... تمہاری ماں...... دیدی ہیں...... عجب سماں تھا...... بچھڑے برسوں بعد ملے تھے...... پل میں گھر میں خوشیاں برس پڑی تھیں۔ سب کے چہروں پر سکون اور بشاشت دکھائی دی تھی۔

سوہنی اندر سے پوجا کی تھالی لے آئی تھی۔ بابو...... اپنی دیدی کی سونی مانگ دیکھ کر میں بیس سال تڑپی ہوں۔ اگر اس دن مندر میں آپ انکی مانگ سجا دیتے تو انہیں بیس سال لمبی قید ان چار دیواروں کے قید خانے میں نہ کاٹنی پڑتی...... سونی مانگ لے کر کس طرح دنیا والوں کو بتاتی کہ میں ہوں اپنے اکلوتے بیٹے کی ماں...... آج ان کی مانگ بھر کر انہیں اس قید سے رہا کردو...... سارے دکھوں سے رہائی مل جائے گی ہم سبھوں کو......

موہنی جو کملائی ہوئی عمر رسیدہ عورت لگ رہی تھی اب لال سیندور سے بھری مانگ کے ساتھ کھل اٹھی تھی ...... کمرے میں افسردگی اور غم کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ سوہنی نے اطمینان بھری سانس لے کر پھر سوال کیا تھا بابو...... آپ کہاں تھے...... اتنے سال کہاں گزارے...... وہ بولے۔ دلی خواہش تھی کہ زندگی موہنی کے ساتھ گذاردوں لیکن انسان کی ہر خواہش پوری کب ہوتی ہے۔ جو وہ چاہتا ہے اسے کب ملتا ہے۔ ہم دونوں کی زندگیوں کے سب سے خوبصورت سال جدائیوں کے زخموں کا درد سہتے سہتے گذر گئے۔ میں وہاں تھا جہاں کے مکینوں کے لبوں پر نہ غموں کا تذکرہ ہوتا ہے اور نہ دکھوں کی داستان ہوتی ہے۔ وہ تو سراپا دکھ ہی دکھ ہوتے ہیں۔ ہوش، ہستی سے بیگانے...... اور وہاں کے ظالم حاکم اپنے جارحانہ رویہ سے خطرناک سے خطرناک پاگل کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں انہوں نے مجھ پر بھی بے انتہا ظلم ڈھائے لیکن میرے خوابوں اور میری سوچوں کو قید نہ کر سکے۔

مایوسی اور خوف کے اندھیروں میں محبت کے جگنوؤں کی چمک نے زندہ رکھا اور ملن کی آس نے آس نہ چھوڑی...... بس جیتا رہا...... بیس سال ان ظالموں کی ایک ہی کوشش رہی کہ یا تو میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھوں یعنی مکمل پاگل ہو جاؤں یا پھر تمہیں بھول جاؤں...... حالانکہ بھولنا تو انسان کی صفت ہے۔ مگر انسان لاکھ جتن کر لے اپنا ماضی کبھی نہیں بھلا سکتا...... میں تم کو بھلاتا کیسے...... تمہاری یادیں تو میرے کونے کونے میں بسی تھیں...... بابو نے موہنی کا ہاتھ تھاما ...... شدت برداشت سے موہنی کا کمزور بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا...... اور بابو کے چہرے پر حد درجہ نقاہت تھی۔ سوہنی دو گلاس گرم گرم دودھ دونوں کے لئے لے آئی تھی......

آپ مینٹل ہسپتال کیسے پہنچے...... چاندی کی تجسس بھری آواز پر وہ بولے...... بڑی لمبی کہانی ہے پر سناؤ نگا ضرور ...... جہیز کی ہوس اور دولت کی چاہ نے کتنی ہی زندگیاں سولی پر چڑھادی ہیں۔ انسان راکشش بن جاتا ہے اور اپنا ہی گھر پھونک ڈالتا ہے۔

لوگ اپنی قسمت کا گلہ کرتے ہیں۔ میں اب بھی قسمت کو دوش نہیں دیتا کیونکہ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا وہ لالچی لوگ دیدہ ودانستہ کرتے ہیں۔ میری سوتیلی ماں نے مجھے ڈسا...... ان کے اندر افعی کا زہر تھا...... اول دن سے ہی مجھ سے نفرت کرتی آئی تھی۔ طاقتور تھی سو ایک ناتواں بچے پر ظلم ڈھاتی رہی۔

میرے پتا جی میری ماں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ مجھے جنم دینے کے بعد ہی میری ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ کیونکہ میرے پاپا کا زیادہ وقت ملک کے باہر گزرتا تھا انہیں دوسری شادی کرنی پڑی جو وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جب میری سوتیلی ماں کو پتہ چلا کہ صرف میری پرورش کرنے کی غرض سے وہ ہمارے گھر لائی گئی تھی تو وہ جل کر خاک ہو گئیں...... تب سے ہی میں ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ ہر عورت کے دل میں ممتا کی ذرا سی مہک تو ضرور ہوتی ہے لیکن حسد اور جلن کی وجہ سے شفقت۔ محبت پیار اور چاہت کے سارے سلسلے ختم ہو چکے تھے۔ میرے پاپا ان کی شیطانی جارحانی فطرت کو سمجھ ہی نہ پائے کیونکہ پاپا کے سامنے وہ ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کرنے کی ہمت نہ کرتی تھیں۔ سب کے سامنے جتاتی تھیں کہ انہیں مجھ سے بہت پیار ہے۔ سگی ماں کی طرح۔ ماں کتنی بھی سخت گیر ہو اس کے دل میں اپنے بچے کے لئے محبت کم نہیں ہوتی لیکن سوتیلی ماں میرے وجود کو مٹادینا چاہتی تھیں۔ تاکہ میرے پتا جی کی دولت پر مکمل قبضہ کر سکے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا میرے اوپر بے پناہ مصائب کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ظلم ڈھاتی رہیں اور دھمکاتی رہیں کہ اگر ان کے خلاف ایک لفظ بھی پتا جی سے کہا تو مجھے ہوسٹل بھیج دینگی اور پاپا سے کبھی ملنے نہیں دینگی۔ جہیز کے معاملوں میں لڑکیوں کی قربانیوں کے ذکر تو بہت سنتے آئے ہیں۔ اس بلا سے لڑکے بھی نہ بچ سکے۔ جس نے جہیز چاہا وہ تو بے موت مرا اور جس نے نہیں لیا وہ بھی مارا گیا...... لڑکیوں کی قربانیوں کا ذکر کوئی نہیں کرتا...... اسے فرض سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ شاید میں بھی دولت کی ہوس کا شکار تھا...... میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا تھا جو دیا ان کے گھر کو روشنی نہیں دے گا وہ اسے بجھا دینگی۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے تھے......

میرے شہر آنے پر ماں بہت خوش تھیں۔ میری اور پاپا کی غیر حاضری میں وہ اپنے ماموں زاد بھائی کے ساتھ مل کر ہماری بربادی کے منصوبے بآسانی بنا سکتی تھیں۔ گھر چھوڑتے وقت ماں نے میرے کانوں میں یہ بات تو ڈال ہی

دی تھی کہ میری شادی وہیں ہوگی جہاں وہ چاہیں گی...... کسی امیر کبیر خاندان کی لڑکی سے...... جہاں سے جہیز کی بڑی رقم ملے گی اور ساتھ میں یہ بھی کہا اگر ایسا نہ ہوا تو انجام برا ہوگا...... اسی وقت میں نے سوچا شادی میں اپنے مرضی سے کرونگا......

شہر میں تم ملیں۔ تمہارے پیار نے مجھے ایک نئے جہاں کی سیر کرائی۔ جینے کا سہارا مل گیا۔ دنیا جنت سی لگنے لگی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ تم جیسی سیدھی سادھی لڑکی ہی مجھے ہر وہ خوشی دے سکتی ہے جسے میرے پاپا کی دولت نہیں خرید سکی تھی...... تمہاری محبت میرے لئے زمین و آسمان کے خزانوں سے زیادہ قیمتی تھی...... سو تمہیں اپنا لیا...... مانگ نہ بھرنے کی ایک ہی وجہ تھی...... میں اس راز کو راز ہی رکھنا چاہتا تھا...... لیکن عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا......

اس رات جب تم سے جدا ہوا تھا تو یقین کرو مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں تم سے اتنی دور جا رہا ہوں۔ کیا معلوم تھا اتنا بڑا طوفان آنے والا تھا۔ گھر پہنچا تو پاپا کے ہارٹ اٹیک کی سنسنی خیز خبر سن کر میرے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ بنا کچھ سوچے بوجھے ان لوگوں کے ساتھ ہو لیا......

نہیں معلوم میرے ساتھ کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک اندھیرے کمرے میں پایا...... میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ پیاس کی شدت سے میرا گلہ سوکھ گیا تھا۔ بامشکل بولا تھا...... پانی...... پانی...... کمرے میں آواز گونجی...... تمہارے ساتھ بالکل نرمی نہیں برتی جائے گی کیونکہ تم نے ایک نوکرانی سے شادی رچا کر اپنے پتا جی کے دل پر گہری چوٹ دی ہے۔ انکی عظمت کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ تمہارے پاپا کی ساری توقعات تم سے جڑی تھیں۔ اب اس کا ازالہ صرف اس طلاق نامے پر دستخط کر کے اور انکی پسند کی لڑکی سے شادی کر کے ہی کر سکتے ہو...... سب کی آنکھوں سے آنسوں رواں دواں تھے بابو کچھ وقفے کے بعد نہایت افسردہ لہجے میں بولے...... میرے اپنوں نے مجھ سے عداوت کی...... دشمن ہو گئے تھے میرے...... میں اپنی ضد پر ڈٹا رہا...... جب ان کی نہ بن پڑی تو ایک رات مجھے مینٹل ہسپتال میں یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ اسکی ماں بھی پاگل تھی اور یہ مرض پشت در پشت چلتا ہے۔ یہ اس حد تک پاگل ہو چکا ہے کہ کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔ بس اس دن سے آج تک میں اس آگ کی بھٹی میں جلتا رہا۔ وہاں سے باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو گئے تھے...... وہ لوگ سائے کی طرح میرے سر پر ڈٹے رہتے تھے...... بے انتہا ظلم ڈھاتے تھے...... بار بار کہتے تھے ناداں لڑکا ہے۔ ایک دن سمجھ جائے گا۔ میں اپنی ضد پر ڈٹا رہا۔ لیکن کچھ کر نہ سکا۔ میں جانتا ہوں میری غیر حاضری میں تم دونوں پر کیا بیتی ہوگی...... مجھ جیسا بے بس اور مجبور کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرا وجود بے معنی ہو گیا تھا......

جب اپنے ہی کنارہ کر لیں تو غیروں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہاں تو سب ہی اپنوں کے ٹھکرائے ہوئے تھے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ مجھے کسی نے بھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی...... زنجیروں میں جکڑا سوچتا کہ میرے پاپا بھی بدل گئے۔ سنا تو تھا کہ سوتیلی ماں ہو تو باپ بھی سوتیلا ہو جاتا ہے۔ پر دل یہ یقین کرنے کو راضی نہ تھا کہ میرے پاپا ایسا کر سکتے ہیں۔

آخر خدا نے مجھ پر کرم کیا...... رحیم جیسے نیک دل آدمی کو میری مدد کے لئے بھیج دیا...... نام رحیم خان تھا چین اور رحم سے بھرے دل کا مالک بھی تھا۔ از حد نیک...... سب کا غم خوار ہمدرد۔ سب سے جدا تھا وہ...... غیر تھا پر مجھے بالکل اپنا بھائی سا لگتا تھا...... یوں لگتا تھا کہ میرا اس کے ساتھ برسوں پرانا رشتہ ہے۔ جب مجھے اس کی محبت پر یقین ہو گیا تب میں

نے اسے اپنی داستان غم سنا ڈالی...... وہ میرے ساتھ بیٹھ کر رویا اور بولا..... میں آپ کو اس جہنم سے رہائی دلوا کر ہی سکون کی سانس لونگا...... انہوں نے چاند کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہا۔ پھر خدا نے تمہیں بھیج دیا......

موہنی کی طرف دیکھ کر بولے...... مجھے آج بھی یاد ہے کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔ اس جگہ کا ایک نقش بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا...... بڑی عقیدت اور محبت سے موہنی کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے بولے اگر محبت میں صداقت ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ منزل تو ہم دونوں کو مل گئی تھی مگر...... جدائی قسمت میں لکھی تھی...... ہر عورت اپنے شوہر کو دل وجان سے چاہتی ہے۔ مگر...... تم...... مجھے اسقدر...... چاہتی...... یہ اندازہ نہ تھا...... بابو کے لہجے میں وہ مٹھاس تھی کہ سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ آنکھوں میں محبت کے رنگ دمک اٹھے تھے۔

اب ان چاروں سے بھی ملئے...... سوہنی۔ کمال...... شیرین...... بھومی اور آکاش کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔ بابو نے چاروں بچوں کو اپنے قریب بٹھا کر سوال کیا...... کمال اور شیرین...... یہ نام تو......

کمال اور شیرین کے چہرے دفعتاً عجب سے ہو گئے جیسے دونوں کو کسی خوف نے آلیا ہو...... آنکھوں میں نمی اور کانپتی آواز کے ساتھ کمال بولا...... ہم دونوں چلے جائینگے...... بابو بولے چلے تو جب جاؤ گے جب ہم تمہیں جانے دینگے...... ارے تم تو اس چمن کی رونق ہو...... سوہنی نے فوراً بتایا کہ دونوں ان کے اپنے ہیں...... دونوں سے موہنی اور سوہنی کا خون کا رشتہ ہے۔ سارا قصہ سننے کے بعد بابو بولے...... اجنبیوں سے ڈرنا انسانی فطرت ہے۔ لیکن ہم سب تمہارے لئے غیر نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ بس یہ سمجھ لو ایک دھاگہ میں پروئے ہوئے رنگ برنگی پھولوں کی مالا ہے یہ پریوار...... ہر پھول کی مہک الگ الگ ہے...... آؤ ہم سب مل کر وعدہ کریں کہ اس پیار کے دھاگے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دینگے...... دھاگہ ٹوٹا...... پھول زمین پر بکھر جائینگے اور پھر راہ چلتا ہر شخص پھولوں کو روند کر آگے بڑھ جائے گا۔ کسی کو ہمارے حال پر ترس نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ جو ہماری بربادی پر دو آنسو بھی بہائے الٹا دنیا والے مذاق اڑائینگے۔ کسی کی نظر کرم ہم پر نہیں پڑے گی...... سو آؤ ہم سب مل کر اپنی ایک دنیا پیدا کریں جس میں نہ مذہبی تناؤ ہو نا ہی کوئی اونچ نیچ کی بات ہو...... سوہنی بولی...... بابو...... دیدی اس گھر کو مندر سمجھتی ہیں۔ یہاں ایک مندر بنانا چاہتی ہیں۔ مندر کیوں...... بابو بولے...... مندر...... مسجد اور گرجے میں بھگوان نہیں رہتے...... کبیر نے صدیوں پہلے کہا تھا۔ مجھکو کہا ڈھونڈ رہے بندے...... میں تو تیرے پاس میں...... بھگوان تمہارے اندر بسے ہیں۔ ساری مخلوق میں خدا ہے بھگوان کی بنائی یہ دنیا ہے۔ ہم سب کو مل کر اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ ملک کو مضبوط اور خوشحال بنانے کے لئے عبادت گاہوں کی ضرورت نہیں۔ پاٹھ شالوں اور اسکولوں کی ضرورت ہے۔ خیر ابھی اس کے بارے میں بات کرنے کا وقت میرے پاس نہیں ہے...... مجھے جانا ہوگا...... چاند فوراً کھڑا ہو گیا...... اب آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے...... آپ وہ بولے...... بیٹا...... جیسے تم میرے وجود کا حصہ ہو میں بھی تو میرے پتا کا حصہ ہوں...... نا جانے وہ کس حال میں ہونگے...... میرے سر پر سے قیامت گزر گئی لیکن باپ کی یاد رلاتی رہی...... انہیں بھی بہت یاد کیا...... انہیں بھی تو میرے بن چین نہ آتا ہوگا۔ سوتیلی ماں نے نا جانے کیا تہلکہ مچا رکھا ہوگا ان سے مل کر ہی مجھے مکمل سکون ملے گا......

موہنی اور چاند اور باقی کے سب لوگ بھی ساتھ چل دیئے...... اور قافلہ صبح الصبح حویلی پہنچا...... اپنی زمین پر پاؤں رکھتے ہی بابو کا دل ہلکا ہو گیا۔ بیس سال سے دل پر رکھی بھاری سل آن واحد میں ہٹ گئی۔ دور سے دیکھ کر حیران

ہوئے۔شامیانے لگے تھے۔بچوں کے کھیل کود کا سماں بھی تھا۔وہ آگے بڑھے......

''آپ اندر نہیں جاسکتے'' باوردی چوکیدار نے راستہ روکا...... سامنے سے آتے ہوئے گنگارام خوشی سے اچھل ہی گیا...... چھوٹے مالک آگئے...... چاچا...... ہٹو...... چھوٹے مالک ہیں ہمارے...... دونوں نے قدم بوسی کی...... بابو آگے بڑھے اور باقی لوگ بھی پیچھے پیچھے چلے...... چھوٹے مالک آگئے...... پل میں چھوٹے مالک کے آنے کی نوید پوری حویلی میں گونجی...... حضور...... چھوٹے مالک...... آگئے...... چھوٹے مالک...... بڑے مالک کے کانوں میں یہ خوشخبری بڑے زور سے گونجی...... ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اوپر دیکھا...... تو آگیا میرے بیٹے...... باپ کے قدموں میں سر جھکا کر بیٹا ایک چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رو پڑا...... باپ کی تڑپ بھی قابل دید تھی...... دونوں گلے مل کر کچھ دیر روتے رہے۔دیکھنے والوں کے دل تھرا گئے۔جب دونوں کو تھوڑا قرار آیا تو بڑے مالک بولے...... گھر آنے کے بجائے تمہیں اپنی نئی دنیا بسانے امریکہ کیوں جانا پڑا۔ایک عورت کی خاطر باپ کو بھلا دیا جبکہ تمہاری خوشیاں تو ہماری زندگی ہیں...... ہم تو تمہیں ہی دیکھ دیکھ جیتے تھے...... پھر تم نے ایسا کیوں کیا...... اپنے باپ کے پیار پر یقین کیسے نہیں رہا تھا تمہیں۔تم گئے اور ہم تنکا تنکا ہو کر بکھر گئے۔غموں نے ایسا بوجھ رکھا تھا کہ ہم تو اپنا آپا ہی بھول گئے۔حویلی اتھل پتھل ہوگئی۔زندہ تو رہے مگر زندگی ہم سے بہت دور ہی رہی۔اکلوتا بیٹا چھوڑ کر ہمیں تنہا کر گیا تھا پھر جینے کو بچا ہی کیا تھا بہت گھبراتے رہے مگر دل میں آس بندھی رہی کہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا بس وہی آس لئے تمہاری راہ میں جیتے رہے۔

جھوٹ ہے سب...... پتاجی سب سراسر جھوٹ ہے۔کسی نے آپ کے اور میرے ساتھ دھوکا کیا...... کس نے یہ افواہ پھیلائی کہ میں امریکہ گیا تھا...... بیٹا یہ تو ہم بھی نہیں جانتے...... یہ خبر ہمیں کسی نے فون پر دی...... یقین تو ہمیں نہیں آیا تھا لیکن پھر جب تم نہیں آئے تو ہم خاموش ہوگئے۔تم نے ایک بہت بڑی رقم بھی ہمارے بینک سے نکالی تھی۔خیر رقم کی تو ہم نے پرواہی نہیں کی...... یہ تو آنے جانے والی شے ہے۔ہمیں غم تھا تو یہ کہ ہمارا بیٹا کیسے ہمیں تنہا کر کے اتنی دور چلا گیا۔بس اسی غم سے بیقرار، ہر پل گذرنی بھاری تھی۔تڑپتے رہے اور تمہارے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے۔آج تم آئے تو پھر ہماری یہ چھوٹی سی جنت آباد ہوگئی ہے۔

بابو بیحد غمگین لہجے میں بولے...... یقین کریئے ہر پل میں بھی آپ کے لئے بیحد تڑپا ہوں۔وہ بھی تنہا۔ایک پاگل خانے میں۔زنجیروں میں جکڑا ہوا...... اذیتیں جھیلتا رہا۔صرف اس لئے کہ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ایک غریب لڑکی سے شادی کر لی تھی...... جبکہ آپ کو کسی بڑے بزنس مین سے بڑی رقم جہیز میں ملنے کی امید تھی۔مجھے بھی اغوا کیا گیا۔پھر کہیں قید رکھا گیا کاغذوں پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا...... اپنی بیوی کو طلاق دینے کو کہا گیا اور جب میں راضی نہیں ہوا تو پاگل خانے میں ڈال دیا گیا...... یہ کہہ کر کہ میں نے خاندان کی عزت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔اسکی یہی سزا ہے اور جب تک کہ میرے حواس ٹھیک نہیں ہوجاتے...... اس نے سوال کیا...... کیا میری ماں پاگل تھیں...... پاگل خانے میں یہی بتایا گیا کہ کیونکہ میری ماں پاگل تھی میں بھی پاگل ہوگیا ہوں۔اور یہ اس دن کا قصہ ہے جس دن تیزی سے ہوا چل رہی تھی۔طوفان آیا تھا۔بارش تھم نہیں رہی تھی۔شہر میں ہاہا کار مچا تھا...... آج اس واقع کو پورے بیس سال ہوگئے۔

بیٹا...... جو تم کہہ رہے ہو اس کی مجھے قطعی خبر نہیں...... جوڑے تو آسمان میں بنتے ہیں...... تمہاری پسند تو

کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی...... کہاں ہے اس گھر کی مالکن...... چاند اور موہنی آگے بڑھے......

پتا جی نے چاند کو سینے سے لگالیا...... یہ چاند سا بیٹا میرا پوتا ہے...... موہنی کو آشیرواد دیتے ہوئے بولے...... یہ سنبھالو اپنے گھر کی چابیاں...... تم کون ہو میں یہ جاننا نہیں چاہتا...... بس آج تم ملیں تو میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ آج میری دلی تمنا پوری ہوگئی...... مجھے میری بیٹی مل گئی...... اماں دکھائی نہیں دی...... بابو نے پتا جی سے پوچھا......

ملو گے اپنی ماں سے۔ وہ تو ایک مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئی ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ...... حویلی کے آخری کمرے میں اماں وہیل چیئر پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ بابو کو دیکھتے ہی ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا...... خوف اور کپکپی ان پر طاری ہوگئی۔ بولنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔

بڑے مالک بولے...... بیس سال سے اسی حالت میں ہے...... نہ بول سکتی ہے نہ ہی ہاتھ پیر چلتے ہیں...... اپنا ناکارہ وجود اور اپاہج شخصیت لے کر جیئے جا رہی ہے۔ نوکران کا ناکارہ وجود سنبھال رہے ہیں۔ اپنے بھائی جے چند کے ساتھ شہر گئی تھی۔ ٹیڑھے دماغ کی تو شروع سے ہی ہے...... معلوم نہیں دونوں کیوں اور کیا کرنے شہر گئے تھے۔ واپسی میں گاڑی بس سے ٹکرائی۔ جے چند نے تو گاڑی ہی میں دم توڑ دیا۔ یہ بچ تو گئی لیکن...... ایک برقعہ بھی اس کے بیگ سے نکلا تھا...... پتا نہیں کیا کر کے آرہی تھی...... کون بتاتا...... دونوں ہی ختم ہو گئے تھے...... یہ سانسیں تو لے رہی ہے پر کسی مردہ سے کم نہیں تھی......

برقعہ...... چھوٹے بابو کو یاد آیا...... جو عورت انہیں پاگل خانے چھوڑنے گئی تھی...... برقعہ اوڑھے تھی۔ من میں سوچنے لگے صدیوں پہلے کبیر جی نے کہا تھا۔ مٹی کہے کمہار کو تو کیا روندے موہے۔ ایک دن ایسا ہوئے گا میں روندو گی تو ہے۔ دُربل کو نہ ستائیو جا کی موٹی ہائے...... ان مہمان سادھو...... سنتوں کی کہی انمول باتیں انسان آج تک نہ سمجھ پایا...... اگر سمجھتا اور ان پر عمل درآمد کرتا تو یہ دنیا کتنی سہانی ہوتی...... کتنے ہی دکھ درد نہ ہوتے......

بابو نے جھک کر اپنی ماں کے چرن چھوئے...... پھر دونوں کندھوں کو پکڑ کر مسکرا کر ہولے سے کہا...... خدا انسان کی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے اور وہ ہی سب سے بڑا منصف ہے...... میں نے آپ کو معاف کیا...... جو بات زبان نہ کہہ سکی اماں کی اداس آنکھیں کہہ گئیں۔ پچھتاوے کے آنسوؤں سے انکا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ چھوٹے بابو نے ان کے آنسو پونچھے اور فوراً ہی پلٹے......

چلئے بابو جی...... آج بیس سال کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں بھوگا ہوں...... پھر سوال کیا...... یہ شامیانے کیوں لگے ہیں؟ بڑے بابو بولے...... تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کل تمہارا جنم دن ہے۔

جنم دن...... میرا...... اب یاد آیا...... پاگل خانے کے ماحول میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ مصیبتوں اور آفتوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا......

بڑے مالک بولے...... گذری کو بھلا دینا ہی بہتر ہوگا۔ ایک بہت ہی سنہرا مستقبل تمہارا منتظر ہے۔ تمہارے جانے کے بعد کسی کے ملنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ ہر سال شہر کے یتیم خانوں کے بچوں کے ساتھ تمہارا جنم دن مناتا آیا ہوں۔ اس بھری دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں جا کر میں اپنا غم غلط کرتا اور ان بے گھر اور بے سہارا بچوں کے لئے بھی کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں جا کر کچھ دیر کے لئے یہ آزادی سے سکھ کی سانسیں لے سکیں اور اپنے غم بھول

سکیں...... بچوں کو کھیلتا دیکھ میری جان کو ذرا سی راحت مل جاتی تھی...... اگر ہو سکے تو تم بھی ایسا ہی کرنا۔ یتیموں اور مسکینوں پر رحم کرنے والوں کو، خدا اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے۔

کسی کی دعا کا اثر تو ہے کہ آج ہم ساتھ ساتھ ہیں۔ ......دونوں ڈائننگ روم کی طرف بڑھے تھے جہاں موہنی اور سوہنی نے سب کے لئے ناشتہ تیار کر رکھا تھا...... بچھڑے برسوں بعد ملے تھے۔ برسوں بعد سب کو حقیقی خوشیاں نصیب ہوئی تھیں......

☆☆☆

وارث

حضور میں سچ کہتا ہوں میں نے چوری نہیں کی...... وشنو مالک کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا...... کرخت اور حقارت بھرے لہجے میں مالک نے سوال کیا...... "پھر کس نے کی"...... مالک کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وشنو نے کہا...... میرے باپو نے کہا تھا کہ ہم غریبوں کی بھی عزت ہوتی ہے...... بیٹا محنت کر کے کھانا...... کبھی چوری نہ کرنا...... جھوٹ نہ بولنا اور جس کا نمک کھاؤ اس کے ساتھ غداری نہ کرنا...... اس نے ماں جی کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھا...... وہ بولیں...... میرے سر میں زور کا درد ہو رہا ہے تو جا میرے لئے چائے بنالا......

جیسے ہی وشنو گیا وہ سیٹھ کمل سنگھ سے بولیں...... سمجھتے کیوں نہیں...... زمانہ بدل گیا ہے...... اب ان لوگوں کی زبانیں بھی بولنے لگی ہیں...... آپ تو چلے جاتے ہیں میں نوکروں کے ساتھ دن کاٹتی ہوں...... غصے میں آ کر اگر کسی نے میرا گلا دبوچ دیا تب...... اس لڑکے کی بات میں صداقت ہے۔ ان لوگوں کے رشتوں کے درمیان اب بھی پیار محبت ہے اور خاص بات تو یہ ہے کہ یہ اپنے بزرگوں کا پاس اور لحاظ کرتے ہیں...... اپنے ماتا پتا کا مان سمان کرتے ہیں...... شہر والوں کی طرح نہیں کہ ماں باپ کا مال ضبط کر کے دونوں کو سڑک پر کھڑا کر دیتے ہیں، مالکن نے اخبار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ پڑھئے آج کی تازہ خبر...... سیٹھ نے ایک نظر اخبار پر ڈالی اور بولے...... آج کل تو گھر گھر کی یہی کہانی ہے۔ روز ٹی وی میں دیکھ رہے ہیں۔ شہریوں نے تو ہندوستانی کلچر کی دھجیاں اڑا ڈالی ہیں۔ کیا لباس اور کیا ناچ گانے...... پھر یہ سب تو ہونا ہی ہے......

مالکن بولیں...... آج تو آوا کا آوا ہی بگڑ گیا ہے...... ان پچھڑے لوگوں میں ہی تھوڑی بہت ہماری پرانی تہذیب کی بو باقی رہ گئی ہے۔ پھر وہ کچھ ٹھہر کے بولیں...... اس لڑکے کا چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ سچ بول رہا ہے۔

کمل سنگھ جی مسکرائے...... اوہ...... اب تم چہرے بھی پڑھنا سیکھ گئی ہو۔ وہ بھی ہنس کر بولیں...... آپ کی صحبت میں رہ کر اور بھی بہت کچھ سیکھ گئی ہوں...... ایسا ہے لڑکی اپنی شخصیت تھوڑی تعمیر کرتی ہے...... باقی اس کی شخصیت کی تکمیل تو اس کا ساتھی ہی کرتا ہے۔ سیٹھ جی مسکرائے...... ہاں بھئی...... دن رات ساتھ رہنے کا کچھ تو اثر ایک دوسرے پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔

وشنو ٹرالی ڈھکیلتا اندر آ رہا تھا...... سیٹھ جی اٹھے۔ الماری سے دوائی نکالی...... یہ لو...... چائے کے ساتھ کھالو...... مگر یہ درد کیوں ہو رہا ہے...... بلڈ پریشر تو نہیں بڑھ گیا۔ آج کل بیماریاں بھی تو ہزار قسم کی نکل آئی ہیں۔...... ایک تو تم لاپرواہ بہت ہو...... بس ہر وقت میری فکر کرتی رہتی ہو۔ تھوڑا اپنا خیال بھی رکھا کرو۔ اپنے لئے نہ سہی میری خاطر ہی ڈاکٹر کے پاس چلی جانا......

وشنو نے چائے بنا کر دونوں کو دی...... پھر بولا...... ماں جی میں آج گاؤں چلا جاؤں...... ارے کیوں ...... اب کیا ہو گیا...... پچھلے ہفتے ہی تو گیا تھا گاؤں۔ ماں جی گاؤں سے خبر آئی ہے۔ ماں بیمار ہے۔ کیا ہوا تیری ماں کو...... وہ بولا...... یہ تو معلوم نہیں۔ گاؤں میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں۔ اگر کسی کو ٹھنڈا لگ کر بخار آتا ہے تو کہتے ہیں ملیریا

ہو گیا۔ کوئی چکر کھا کر گر گیا تو ٹونے ٹوٹکے شروع ہو جاتے ہیں کہ بھئی اس پر تو بھوت سوار ہو گیا۔ بڑا برا حال ہے گاؤں میں غریبوں کی کوئی سنوائی نہیں۔ نہ اسکول نہ دواخانہ......

جا...... ضرور جا...... مگر جلدی ہی لوٹ آنا...... جیسے ہی وہ گیا مالکن بولیں ایسا ایماندار لڑکا ملنا مشکل ہے...... یہ لڑکا ایماندار بھی ہے اور وفادار بھی...... مگر مجھے ان لوگوں پر قطعی بھروسہ نہیں۔ سیٹھ جی بولے......

دوسرے دن وشنو رنگ برنگی چوڑیاں اور لال چٹیلا لے کر لکشمی سے ملنے گیا...... وہ باہر ہی مل گئی۔ اسے دیکھتے ہوئے بولی کب آیا تو...... ابھی...... آیا ہوں...... اس نے پیکٹ سامنے کیا...... لے...... تیرے لئے لایا ہوں...... میرے لئے...... وہ کیوں...... وہ بولا...... کیونکہ تو مجھے اچھی لگتی ہے...... وہ روٹھی آواز میں بولی...... جھوٹ بولتا ہے...... تجھے تو گاؤں کی ہر لڑکی اچھی لگتی ہے۔ تب ہی تو مالک کے پیڑوں سے پھل توڑ توڑ کر کھلاتا ہے۔ اور وہ سب تیرے نام کی مالا جپتی ہیں...... کہتی ہیں تو چلا گیا تو سارا گاؤں ہی خاموش ہو گیا ہے۔ سونا سونا سا......

وہ ہنس کر بولا...... اوروں کی چھوڑ...... تو کیا کہتی ہے......؟ سچ میں تو وہاں تیرا نام لے لے کر جیتا ہوں...... لکشمی کا چہرہ سرخ ہو گیا...... بولی کچھ نہیں...... تو بدھو ہے۔ کچھ بھی نہیں سمجھتی...... وہ بولا...... چلے گی میرے ساتھ شہر...... نا بابا...... نا...... مجھے ڈر لگتا ہے...... وہ ہنسا...... مجھ سے یا شہر سے...... تو تو بڑی سورما بنتی ہے۔ جب دیکھو مجھے دیکھ کر جھگڑتی رہتی ہے۔ بات بات پر بگڑتی ہے...... میں یوں ہی نہیں بگڑتی...... تو بتا کیوں بگڑتی ہے۔ نہیں بتاتی...... وہ کہہ کر دوڑی...... وشنو نے اسے پکڑا...... اس کا آنچل پکڑ کر بولا...... کیوں بگڑتی ہے بتا تو...... تو کرشن کنہیا جو بنا ہوا ہے...... وشنو نے اس کا آنچل نہیں چھوڑا...... بولا...... تو رادھا ہے میری...... لکشمی نے اپنے دونوں کان پکڑ کر کہا سچ...... اب نہیں بگڑونگی...... اور نظریں جھکا دیں...... وشنو نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور بولا...... ایسا غضب نہ کرنا...... تو بگڑتی ہوئی...... روٹھی روٹھی سی مجھے اور بھی اچھی لگتی ہے۔ اس نے آنچل چھوڑا اور لکشمی بھاگ گئی...... وشنو چلایا...... اماں بیمار ہے...... خیال رکھنا...... میں آج ہی واپس چلا جاؤنگا......

اری اٹھتی ہے یا میں آ کر اٹھاؤں...... درگا کی آواز میں بلندی کے ساتھ کرختگی بھی شامل تھی...... لکشمی عمر کے اس دور میں تھی جب لڑکیاں بے فکری کی نیند سوتی ہیں...... جب نہیں اٹھی تو دوسرے ہی لمحے درگا اس کے سر پر سوار تھی...... پہلے تو ایک زوردار ٹھوکر سوتی ہوئی لکشمی کی کمر پر ماری پھر اس کے بال پکڑ کر زور سے کھینچتے ہوئے بولی اٹھ نہیں...... تو...... درد کی شدت سے لکشمی بلبلائی۔ آنکھیں مسلتی اٹھی اور بولی...... اماں آج کیا ہو گیا ہے تجھ کو...... اٹھتی ہوں بال تو چھوڑ...... درگا پھر چیخی اٹھ جا اور جا کر تالاب سے پانی بھر لا...... جنگل سے لکڑیاں لانا نہ بھول جانا...... لکشمی روتے ہوئے بولی...... سب لے آؤنگی اماں...... اور سوچنے لگی آج میری ماں کو کیا ہو گیا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا......

رام داس جو تھوڑی دیر پہلے ہی سویا تھا درگا کی چلا چلی سن کر بولا...... اری کیوں چھوری پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ وہ رات میں دیری سے سوئی تھی۔ رات جب میرا اپنڈا بخار سے تپ رہا تھا وہ میرا ماتھا پیٹ رہی تھی...... تو کیا جانے...... ہاں ہاں...... میں کچھ نہیں جانتی...... سب کچھ تو اور تیری بیٹی ہی جانے ہے۔ ارے میں بھی انسان ہوں ...لوہے کی بنی نہیں ہوں۔ دن بھر مزدوری کرتی ہوں پھر تیرے گھر میں کھٹتی ہوں اور اس پر ہزار چنتائیں...... اسے

کیا ہوا...... رام داس نے سوچا......

اری باوری یہ کٹیا میری نہیں تیری ہے۔ تو نے آ کر اس میں جان ڈالی ہے۔ تو ملی تو مجھے یوں لگا سارا سنسار مل گیا...... اب اور زیادہ نہ بگڑ...... ہو جائے گا سب کام کاج...... ساہوکار سے کہنا آج میرا شریر نہیں چل رہا...... ٹانگوں میں زور نہیں رہا...... دل بھی کانپ رہا ہے...... دل سنبھلتے ہی میں چل پڑونگا......

درگا یہ سن کر اور پریشان ہو گئی۔ اسے سب برداشت تھا رام داس کا ذرا سا بھی دکھ گوارا نہ تھا۔ دل کیوں کانپ رہا ہے...... آج مت جا...... گاؤں میں روز ہی کوئی نہ کوئی مر رہا ہے۔ کوئی ملیریا سے گیا تو کسی کو پیٹ کی بھوک کھا گئی۔ ایک دو دن کے اندر رامو چاچا کی بھی کھٹیا اٹھنے والی ہے۔ ٹھیلا کھینچتے کھینچتے انکے دونوں پھیپھڑے پھٹ گئے ہیں۔ خون اگل رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو غریبوں کو دیکھے...... نہ ڈاکٹر نہ دوائی۔ نہ پیٹ بھر روٹی...... کہے دیتی ہوں اس بار میں کسی کو اوٹ ووٹ نہیں دونگی۔ آگ لگے ایسی سرکار میں جسے غریبن کی ذراسی بھی چنتا نہیں۔ اری آہستہ بول۔ کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا...... جانتی نہیں...... ساہوکار سرکاری افسروں کی چلم بھرے ہے...... وہ جاتے جاتے پھر پلٹی رام داس کا ماتھا چھو کر بولی...... اب تو پنڈا گرم نہیں...... میری مان آج کام پر نہ جا...... ایک دن آرام کر لے گا تو...... وہ بولا...... آج کام پر نہیں جاؤنگا تو کل کیا کھائینگے...... ہمارے نصیب میں آرام کہاں...... نہ جانے بھگوان ہم غریبوں کو اس سنسار میں کیوں بھیجتا ہے۔ دکھوں کی پوٹلی ڈھوتے ڈھوتے میں تھک گیا ہوں......

ایسی باتیں نہ کر...... دن بھر تیری خاطر ہی تو کھٹتی ہوں...... درگا جس کا پارہ کچھ دیر پہلے آسمان کو چھو رہا تھا بالکل اس کے قریب بیٹھ کر نرمی سے بولی...... میں بری نہیں ہوں...... دکھ اٹھا اٹھا کر ایسی ہو گئی ہوں...... دل ہر وقت کانپتا ہے۔ ڈرتی ہوں اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میں اکیلی...... تو تو جانے ہے، نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن بس ایک تو ہی تو میرا ہے...... یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

آنسو پونچھ ڈال...... بھگوان بڑا دیالو ہے وہ ہی پار لگائے گا۔ میں نہ مرنے والا۔ تو مجھے مرنے نہیں دیگی۔ اور ابھی مجھے لکشمی کا بیاہ بھی تو کرنا ہے۔ وہ پھر روٹھ گئی۔ روٹھی روٹھی آواز میں بولی...... تجھے تو بس اپنی بیٹی کی فکر کھائے جائے ہے۔ میرے لئے کبھی نہیں سوچا...... بس وہی تیری اپنی ہے۔ میں تو آج بھی تیرے لئے پرائی ہوں...... میں مر کیوں نہیں جاتی...... اس کی آواز میں درد تھا...... رام داس سن کر چونک گیا......

رام داس نے فوراً درگا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ تو جانتی ہے میں تیرا ذرا سا بھی دکھ برداشت نہیں کر سکتا...... پھر بھی آج الٹا سیدھا بولے جا رہی ہے۔ تو ہی تو میری اپنی ہے۔ تو ہے تو میں ہوں۔ تو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ تو تو میرے تن من میں سمائی ہوئی ہے۔ میں اور تو الگ الگ نہیں، جو میں تیرے لئے الگ سے سوچوں۔ جب سے تو مجھے ملی میں نے بھگوان سے اور کچھ نہیں مانگا...... بس تیری سلامتی مانگی......

درگا مسکرا دی...... وہ جانتی تو تھی کہ رام داس اسے بہت چاہتا ہے لیکن الفاظ میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ انسان کے اندر یقین پیدا کرتے ہیں اور طاقت بخشتے ہیں...... درگا میں بھی ایک نئی طاقت ایک نئی امنگ نے جنم لیا...... وہ اٹھی...... اب جا بھی...... دیر ہو گئی تو ساہوکار کے لوگ تیرا نام لسٹ سے کاٹ دینگے...... اور چنتا کرنا چھوڑ دے نہ جانے کونسی چنتا کھائے جائے ہے تجھے۔

باہر لکشمی کو سسکتے دیکھ کر وہ ٹھہری...... اسے اپنی باہوں میں سمیٹ کر چوما...... اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی ...... جا تیرے لئے گڑ اور روٹی رکھ آئی ہوں...... جا کر کھا لے...... کیا کروں جب دماغ میں ڈھیر ساری فکریں اکھٹا گڈمڈ ہو جاتی ہیں تو میں پاگل ہو جاتی ہوں...... ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ کر بولی...... جا دکان سے مٹھائی لے کر کھا لینا ...... تھوڑی آگے بڑھی...... مڑ کر لکشمی کو وہیں کھڑا دیکھ کر زور سے بولی...... اب جا بھی...... اپنے باپ کو چائے بنا کر دے دینا۔ اسے اٹھنے نہ دینا...... اس کا شریر ٹھیک نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹیپ دینا اس کے......

درگا کے جانے کے بعد رام داس حیران و پریشان تھا۔ سوچتا رہا یہ ہر وقت میری دلجوئی کرتی ہے اسے آج کیا ہو گیا جو اتنا زیادہ بگڑ رہی تھی۔ دل ایسا تنگ ہوا کہ لکشمی کو بھی پیٹ ڈالا۔ کچھ نہ کچھ انہونی تو ہونی ہے۔ رام داس کو سوچوں نے گھیر لیا...... آخر اسے چنتا کس بات کی ہے۔ نہ قرضہ نہ کوئی بڑی بیماری...... سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی تو چل رہا ہے معمولی سا مجھے بخار ہے۔ وہ تو ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا پھر کیوں یہ بلبلا رہی ہے۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی درگا کسی بڑی آفت میں مبتلا ہے۔ اس کی ہی زندگی بچانے کے لئے فکر مند ہے۔ درگا اسے کیسے بتاتی...... تھانے دار نے کڑی آواز میں کہا تھا...... جب تک ہم پوری چھان بین نہ کر لے تو اپنی زبان بند رکھنا...... زبان کھولی تو رام داس کے لئے برا بھی ہو سکتا ہے۔ تھانے دار نے کئی سوال بھی کئے تھے۔ رام داس کہاں تھا۔ کس کے ساتھ شراب پی رہا تھا...... جبکہ رام داس شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ تھانے دار تو ایسے بول رہا تھا جیسے رام داس نے کسی کا گلا ٹیپ دیا ہو یا کسی کے چھرا گھونپ دیا ہو۔ وہ بیچارا تو چیونٹی بھی نہیں مار سکتا۔ تو آدمی کیا مارے گا...... ان خیالوں نے درگا کو اندر ہی اندر توڑ ڈالا تھا...... ایک دن میں ہی چور چور ہو گئی تھی۔ درگا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس سے کہے۔ کس سے مدد مانگے۔ یہاں تک کہ اس نے رام داس سے بھی یہ راز چھپا رکھا تھا۔ ڈرتی تھی کہیں اس کے رام داس پر کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔

درگا کا دن بڑی مشکل سے کٹا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑک پر اندھیرا ہو چلا تھا...... اس نے مڑ کر دیکھا سڑک سنسان تھی...... بالکل ویسی ہی خاموش اداس جیسی اس دن تھی۔ جب وہ گھبرا کر اپنی جان دینے کے لئے کنوئیں میں چھلانگ لگانے جا رہی تھی۔ زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا تنہا سامنا کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ کوئی مددگار نہیں تھا۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنا آنچل لپیٹا تھا۔ آنکھیں موندی تھیں۔ اس ہی وقت پیچھے سے رام داس نے پکڑ لیا تھا۔ وہ من ہی من میں مسکائی۔ تو نے مجھے زندگی دی۔ مجھے زندگی بھر کا سہارا دے کر جینے کا حوصلہ دیا۔ اب چاہے میری جان جائے۔ تجھے ضرور بچاؤں گی۔ تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گی......

ان ہی خیالوں میں ڈوبی بوجھل دل و دماغ کے ساتھ بوجھل قدم اٹھاتی اپنی کٹیا کی طرف جا رہی تھی ۔ اچانک ایک جیپ اس کے بالکل پاس آ کر رکی...... اتنے قریب کے اس کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ گر گئی...... دو آدمیوں نے اسے گاڑی میں ڈالا تھا اور گاڑی فراٹے سے سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ دہشت سے شاید وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ کتنی لمبی مصافت تھی اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا...... سر چکرا رہا تھا...... آنکھ کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ پولس والوں کو دیکھ خوفزدہ ہو کر اس نے آنکھیں موند لیں...... تیز آواز پر چونکی...... حضور میں بے گناہ ہوں میں نے کچھ نہیں کیا ...... ابھی اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے لگتا ہے جیسے اسے کوئی بیہوشی کی دوائی دی گئی ہے۔ سونے دو اسے

......بعد میں اس سے بات کرینگے......

اسے معلوم نہیں تھا کتنی دیر وہ سوتی رہی تھی۔ کسی نے اسے جھنجھوڑا تھا...... بڑی کرخت آواز تھی۔ ہم سے جھوٹ بولے گی تو تیرے اور تیرے مرد دونوں کے گلوں میں پھانسی کا پھندا ہوگا۔ سچ بولے گی تو ایک کی جان ضرور بچ جائے گی۔ درگا لرز گئی...... اس کا سارا بدن کانپ اٹھا...... سچ بول دے خون کس نے کیا ہے۔ تو نے یا پھر تیرے مرد نے ......وہ خاموش بیٹھی رہی...... وہ متواتر سوال کرتے رہے...... درگا نے سوچا میں تو طوفانی زندگی لے کر اس دنیا میں آئی ہوں۔ آج بھی آفتوں میں گھری ہوں۔ زندہ ہوں تو رام داس کی وجہ سے۔ آج مجھے رام داس کو بچانا ہوگا...... اگر رام داس نہ بچا تو اس معصوم لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ وہ دوبارہ یتیم ہو جائے گی...... جس دن سے رام داس نے اُسے مٹی کے ڈھیر سے نکالا ہے اپنی بیٹی کی طرح سینے سے لگائے پال رہا ہے۔ دوسروں کے دکھ دور کرنے والے کو جینا چاہیئے۔ اس دنیا میں رام داس جیسے سچے نیک اور رحم دل انسانوں کی ضرورت ہے...... وہ دیر تک اپنا سر پھوڑتے رہے، درگا نے زبان نہیں کھولی ......آخر ہار کر بولے "لے جاؤ اسے بند کر دو"......

کار کوٹھری میں درگا سہمی جا رہی تھی...... رام داس...... نہ جانے تو میرے لئے کیا کیا سوچ رہا ہوگا۔ سر پیٹ رہا ہوگا...... مجھے یاد بھی کیا یا نہیں...... آ دیکھ...... یہ لوگ ہمارے اوپر جھوٹے الزام لگا رہے ہیں۔ نہ جانے کس رئیس زادے کے جرم کا الزام ہمارے سر تھوپ رہے ہیں...... جو بھی ہوگا...... میں سب سہہ لونگی...... تجھے تو اپنے بہت سے کام نمٹانے ہیں...... لکشمی کی شادی کرنی ہے۔ کھیت جوتنا ہے۔ کٹیا سنبھالنی ہے۔ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اب تجھے کیسے بتاؤں کہ چولہے کے نیچے میں نے اپنی لکشمی کے لئے پائل اور چاندی کے کنگن گاڑ رکھے ہیں۔ اب ہم دونوں تو مل نہ سکیں گے۔ مجھے تو پھانسی کی سزا ملے گی ضرور...... یہ سوچ کر وہ بے تحاشا ڈر گئی۔ اس نے کس کر آنکھیں موند لیں۔ دن بھر کی تھکی ہاری تو تھی ہی آخر نیند اس پر غالب آ گئی......

جب درگا گھر نہیں پہنچی تو رام داس کے ہوش اڑ گئے...... نہ دل ٹھکانے رہا نہ دماغ...... وہ دیوانہ وار بھاگتا دوڑتا ساہوکار کی حویلی پہنچا...... ہانپتے ہانپتے فریاد کی...... حضور...... میری...... میری درگا...... کیا ہو گیا ہے تیری درگا کو...... ساہوکار نے مسکرا کر سوال کیا......

حضور...... میری درگا گھر نہیں پہنچی...... پہنچ جائے گی...... پریشان مت ہو...... تیری درگا تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی...... حضور...... میری درگا ایک پل کے لئے بھی کہیں نہیں ٹھہرتی...... کام کے بعد سیدھی گھر آوے ہے......

حضور کے پاس کسی کی فالتو بکواس کے لئے وقت ہی کہاں تھا...... وہ تو شہر کسی میٹنگ میں جا رہے تھے...... دہک اٹھے...... تیور چڑھا کر بولے...... تیری گھر والی کا ذمہ دار میں نہیں ہوں...... مگر حضور آپ ہی تو ہمارے مائی باپ ہو...... ساہوکار چلایا...... جا کر گاؤں والوں سے پوچھ تاچھ کر...... کہیں کسی کا دماغ چاٹ رہی ہوگی...... سنا ہے سب سے جھگڑتی رہتی ہے...... گاؤں میں اسے کوئی ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا...... اگر نہیں ملے تو جا کر تھانے میں رپورٹ لکھا دے...... حضور آگے بڑھ چکے تھے...... نا...... حضور...... نا...... کسی نے غلط کہا ہے میری درگا ایسی نہیں ہے۔

رام داس دیر تک بیٹھا سر پیٹتا رہا...... جا بھئی جا...... یہاں ہم غریبوں کی سنوائی نہیں...... جا کر ڈھونڈ اپنی لگائی کو...... اگر نہ ملے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دے...... یہ چوکیدار تھا۔ جو رام داس کو دلاسا دے رہا تھا......

ارے بھیا جس کے لئے دن رات کھٹتے ہیں جب وہ نہیں سنے ہے تو بھلا تھانے دار کیوں سنے گا...... سنا ہے بڑا ہی رشوت خور ہے۔ مجھ غریب کے پاس اسے دینے کو کچھ بھی نہیں...... چوکیدار نے رام داس کو سہارا دیکر اٹھایا...... روتا ہوا رام داس نراش ہو کر گرتا پڑتا اپنی کٹیا لوٹ آیا۔ چوکیدار سوچتا ہی رہ گیا آج تیرا یہ حال ہے کل اگر مجھ پر کوئی بپتا آئے گی تو یہ مجھے بھی ٹھوکر ہی مارے گا۔ ہم لوگ ان ساہوکار جیسے لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے ہی تو پیدا ہوئے ہیں۔ جب تک ہمارے شریر میں زور ہے یہ ہمارے شریر سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے خون کی ایک ایک بوند چوس لیتے ہیں۔ جب ہم دُربل ہو جاتے ہیں تو آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھتے......

جیسے روح پرواز کرنے کے بعد انسان کا بدن مردہ ہو جاتا ہے...... آج رام داس کی کٹیا کا بھی وہی حال تھا...... رام داس کو لگا جیسے وہ شمشان گھاٹ میں کھڑا ہو...... اور کٹیا جل رہی ہو...... اور...... درگا...... وہ ماضی کی یادوں میں ڈوب گیا...... درگا کے اندر آتے ہی اُسے یوں لگا تھا کہ اس کی پوری کٹیا میں چاندنی بکھیر گئی ہو...... کتنا خوش تھا وہ درگا کو پا کر...... کول سی...... پری جیسی...... اور اس کا دل بھی تو سندر تھا...... آتے ہی لپک کر لکشمی کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ ...... پھر ساہوکار...... کیا بول رہا تھا...... درگا کے پیار میں ڈوب کر جو بات وہ بھلا بیٹھا تھا آج اسے اچانک یاد آ گئی...... درگا کو اسکے ساتھ دیکھ کر گاؤں والوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کیوں انسان انسان سے جلتا ہے۔ جو ہو رہا ہے وہ اسی حسد کا نتیجہ تو نہیں......

لے باپو روٹی کھا لے...... تب خیالوں کی زنجیر ٹوٹی...... اس نے لکشمی کو اپنے قریب بٹھا کر روٹی توڑ کر اس کے منہ میں دی۔ آج میں تجھے کھلاؤنگا۔ کچھ دیر بعد ہی وشنو اندر آیا...... بولا......

چاچا...... اماں نے کھٹیا پکڑلی ہے اور میرا شہر جانا ضروری ہے...... کام نہیں کرونگا تو اماں کا پیٹ کیسے بھرونگا ...... رام داس نے جسے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ جسے خون پسینے کی کمائی کھلائی تھی...... اسے ایک پل میں اپنے سے الگ کر کے کہا...... لے...... جا اِسے...... آج اور ابھی بیاہ کر لے...... وشنو نے ایک نظر لکشمی پر ڈالی اور سوچا گاؤں بھر میں اس جیسی سندھر مکھڑے والی اور سگھڑ دوسری نہیں۔ کانپتی آواز میں بولا...... مگر چاچا...... بیاہ......

ہاں ہاں...... بیاہ...... چل ابھی مندر...... میرے پاس دینے کو کچھ نہیں...... یہ کٹیا لے لینا...... قسم کھا میری بیٹی کو ہمیشہ سکھی رکھے گا۔ تو تو جانتا ہے میں نے اسے بڑے پیار اور دلار سے پالا ہے۔ وشنو بولا...... جانتا ہوں چاچا پورا گاؤں جانتا ہے...... لیکن...... چاچا...... بیاہ......

لیکن ویکن کچھ نہیں...... اگر...... ہاں...... تو بول...... وشنو گھبرائی آواز میں بولا...... میں کب انکار کر رہا ہوں ...... مگر...... چاچا...... ایسے کیسے لے جاؤں......

او...... تو بینڈ۔ باجے کے ساتھ لے جائے گا۔ ارے بھول جا امیروں کے ٹھاٹ باٹ۔ ہماری اتنی بساط نہیں۔ وہ سب تیرے مقدر میں نہیں ہے۔ ارے ہم غریب تو بس کسی طرح اپنی زندگیوں کے دن پورے کرنے اس دنیا میں آتے ہیں۔ جیتے تو ساہوکار جیسے لوگ ہیں۔ ہمارا بھی کوئی جینے میں جینا ہے۔ نہ پیٹ میں روٹی...... نہ تن پر کپڑا...... مرجانے پر چتا جلانے کو لکڑی نہیں...... وشنو...... سوچنے لگا...... کیا ہو گیا ہے چاچا کو...... ادھر ادھر دیکھ کر بولا...... چاچی کہاں ہے دکھائی نہیں دی...... رام داس بولا...... اور دکھائی بھی نہیں دے گی...... وہ مر گئی...... اس کے

دن پورے ہو گئے تھے......مرگئی......وہ......چھوڑ گئی مجھے اکیلا......وشنو اور لکشمی گھبرا گئے۔ لکشمی نے رونا شروع کر دیا ......ہائے میری اماں ۔کب مرگئی ۔وہ اپنے باپ سے لپٹ کر روئے جارہی تھی ۔وشنو نے سوال کیا ......چاچا......کب......مجھے خبر بھی نہ دی......کب مری چاچی......ارے مجھے ہی کونسی خبر تھی......ابھی ابھی تو مری ہے۔ سب نے مل کر اس کی ہتھیا کر دی۔ جب چونٹیاں پاؤں تلے مرتی ہیں تو کون سا شور ہوتا ہے۔ نہ کسی کو احساس ہوتا ہے اور نا ہی کوئی روتا ہے......

یہ کیا کہہ رہے ہو چاچا......ارے ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں......ہمارا حال بھی تو چونٹیوں جیسا ہے۔ دھن والے ہمیں پاؤں تلے روندرہے ہیں۔ چل اٹھ......ابھی مندر چل......رام داس نے ایک ہاتھ سے وشنو کو اور دوسرے ہاتھ سے لکشمی کو تھاما اور کھینچتا ہوا مندر لے گیا......

مندر سے باہر نکلا تو بولا......تیرا باپ میرا دوست تھا وہ یہ رشتہ طے کر گیا تھا......اب میں نش چنت ہو کر مرسکوں گا۔ کیسی باتیں کرتے ہو چاچا......ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ موت کا کیا ٹھکانہ......کبھی بھی آسکتی ہے۔ آج تو میں اپنی زندگی سے بہت دور ہوں۔ اتنی دور......کہ مجھے ہی پتہ نہیں میں کہاں ہوں اور میری زندگی کہاں......ایک بات سن......تو مقدروالا ہے جو شہر چلا گیا......گاؤں میں کھیت سوکھ گئے ہیں......بھکری پھیلی ہے تو گاؤں کا ہے گاؤں ہی لوٹ آنا......شہر میں کسی دھنوان کے پاؤں تلے چیونٹی کی طرح ختم نہ ہو جانا......شہر والوں کے لچھن نہ سیکھ لینا......انسان بن کر اپنے گاؤں لوٹ آنا۔ گاؤں کو تیرے جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔ اس گاؤں کو سنوارنا سجانا......

بھابھی لے اپنی امانت......سنبھال......مادھو کو زبان دی تھی کہ مرنے سے پہلے تیری امانت تیرے حوالے کر دونگا......اسے سنبھال کر رکھنا......اتنا پیار دینا کہ یہ مجھے اور اپنی ماں کو بھول جائے......گنگا بھونچکی دیکھتی رہ گئی......یہ کیا ہے وشنو؟ بڑی کڑوی کسیلی آواز تھی ۔وہ ہولے سے بولا۔ یہ تیری بہو ہے۔ ایسے آتی ہے نئی بہو اپنے سسرال وہ پھر چیخی ......تو کیا اڑ کر آتی ہوائی جہاز میں۔ اماں غریب کی بیٹی ہے۔ آنا تو اسی کو تھا آج نہیں تو کل۔ بس اب آ گئی......تو بھی خوش ہو جا یہ میرے پتا کی مرضی سے آئی ہے۔

ماں کے مرنے کی خبر سن کر ہی لکشمی سن ہی پڑ گئی تھی۔ پھر باپ بھی تو مرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی اس وقت میرا باپو کے ساتھ ہونا زیادہ ضروری تھا۔ لیکن یہ۔ زبردستی کا بیاہ ہائے رے عورت کی مجبوری۔ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ ہماری تقدیر مردوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ایک نے مٹی تلے گاڑ دیا۔ ایک نے ترس کھا کر پالا پوسا اور پل میں اپنے سے یوں الگ کر دیا جیسے میں ایک بکری کا بچہ تھی......اب وشنو......اپنی ماں کی سیوا کرانے کے لئے لے آیا......اب آگے کیا ہوگا......تب ہی وشنو نے اسکا بازو پکڑ کر کہا......ماں کے چرن چھونا......وہ آگے بڑھکر ایک دم ہی جھکی جیسے ہی ماں کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اس نے پاؤں سمیٹ کر کہا۔ بس......بس......دور......رہ......مجھے ہاتھ نہ لگانا......ایک دھماکہ سا ہوا......ماسی نے بھی آنکھیں پھیرلیں......وہ رو۔ پڑی۔ ساس نے نئی نویلی بہو کو کڑے تیوروں سے دیکھا......

اماں یہ خود نہیں آئی......میں لایا ہوں اسے......تیری سیوا کرنے کے لئے۔ اگر یہ تیرے سے دور رہے گی تو تیری سیوا کیسے کرے گی۔ کڑوی کسیلی باتیں سن کر لکشمی وہاں سے کھسک گئی تھی۔

وشنو ماں کو سمجھانے لگا......اماں میں جانتا ہوں تو اس رشتے سے خوش نہیں ہے لیکن یہ میرا نہیں باپو کا فیصلہ

ہے۔اب تو تو سمجھدار ہے...... اگر میں شہر نہیں گیا تو روٹی کے لالے پڑ جائینگے۔میرے پیچھے یہی سنبھالے گی تجھے۔

وشنو یہ بھول گیا تھا کہ ماننے اور منوانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نادان تھا بچارا ابھی عورت کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔نہیں جانتا تھا کہ عورت ہی عورت کو ڈستی ہے۔ کچھ دیر بعد جب ماں کچھ نہ بولی تو بولا...... اماں اسے تیرے پیار کی ضرورت ہے۔تو اسے پیار کرے گی تب ہی تو یہ تیرا مان سمان کریگی...... مت دھتکار اسے...... اپنا لے...... پیار سے...... محبت سے...... ماں کے تیور بگڑے ہی رہے...... اچھا تو ایسا کر ساس بہو کا جھگڑا ہی ختم کردے...... اس کو بیٹی مان کر اپنی سیوا کرنے کا حق دے دے...... وہ پھر بھی چپ ہی رہی...... تو وشنو کا دل ٹوٹ گیا...... اماں تو تو ہمیشہ کہتی آئی ہے کہ دھن وان ہم غریبوں کو اپنے پاؤں تلے کچل رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بلوان دربل کو ستارہا ہے چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔تب ماں بولی...... اچھا...... اچھا...... اب تو جا...... مجھے سبق نہ سکھا...... اماں کبھی کبھی بڑے بھی غلطی کرتے ہیں۔ اگر چھوٹے انہیں سیدھا راستہ دکھادے تو اس میں کیا برائی ہے...... بس اتنی سی بات مان لے...... کہ اب لکشمی تیری بہو ہے۔اسے اپنی سیوا کرنے دے...... تو بھی خوش...... میں بھی خوش...... کچھ دیر ماں سوچتی رہی پھر بولی...... اچھا...... بات تو نے کھری کہی...... مسکرائی اور بولی...... اب جا بھی...... وہ رو رہی ہے۔ جا کر اسے سنبھال۔ کچھ کھانے کو دے اسے بھوکی ہوگی......

لکشمی کی وحشت ٹپکاتی سرخ آنکھیں دیکھ کر وشنو بولا...... اتنا روئے گی اور ڈرے گی تو کام کیسے چلے گا۔ یہ تیرے باپو کا گھر نہیں تیرا سسرال ہے۔ ساس بہو میں کھٹ پٹ تو چلتی ہی رہتی ہے۔ماں کی باتوں کا اثر دل پر مت لینا۔ جو بھی کہے برداشت کر لینا۔ وشنو نے لکشمی کو اپنے قریب لاکر کہا...... اب سسرال کو اپنا مائیکہ بنانا تیرے ہاتھ میں ہے۔ سیوا کر کے اماں کا دل جیت لینا۔ وہ اور رونے لگی۔ اس نے فوراً ہی تھیلا دیتے ہوئے کہا...... لے۔تیرے لئے لایا ہوں۔ میرے لئے...... وہ بولا...... اب تو یقین کرلے کہ تو مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ لکشمی مسکرادی اور اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ وشنو نے پھر اسے چھیڑا۔اب تو نہیں جھگڑے گی...... وہ ہولے سے بولی...... اب تجھے ناخوش کیا تو تو مجھے گھر سے نکال دیگا...... وشنو نے اس کا چہرہ اٹھا کر اسکی آنکھوں میں دیکھ کر کہا...... آج یہ بات کہی سو کہی آئندہ گھر سے نکالنے کی بات نہ کہنا...... آج سے یہ گھر تیرا ہے...... تیرے ہی گھر سے میں تجھے کیسے نکال سکتا ہوں۔ لکشمی اس کے بازوؤں میں کسمسائی...... چھوڑ نا مجھے...... وہ اماں...... وشنو ہنس کر بولا...... تو یوں لجاتی شرماتی تو اور بھی پیاری لگ رہی ہے۔ سن...... کل نہا دھو کر نئے کپڑے پہن لینا...... حلوا پوری بنانا...... چاچا سے مل کر ہم دونوں مندر چلیں گے...... بہت رولی تو...... اب کبھی نہ رونا...... میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں...... جس گھر کی مالکن ہنستی مسکراتی رہے وہ گھر بہشت سے کم نہیں اور جو گھر کی مالکن غصے میں چیختی چلاتی رہے وہ دوزخ بن جاتا ہے۔ لکشمی تو زیادہ سمجھی نہیں...... گھر...... مالکن...... میں اس گھر کی مالکن...... دل میں خوشیاں پھوٹ پڑیں...... چہرہ کھل اٹھا...... ایسا گلنار چہرہ...... ایسی مسکراہٹ تو وشنو نے اس کے چہرے پر پہلی دفعہ دیکھی تھی...... وہ بولا...... بس یوں ہی مسکراتی رہنا...... ہمیشہ...... ہمیشہ مگر وہ بولتی رہی......

امید اور امنگ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب امیدوں کے دیپک بجھ جائیں تو امنگوں کی موت تو خود بخود ہو جاتی ہے۔ رام داس کی زندگی کی امنگ اور خوشیاں درگا کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی تھیں۔ امیدوں کے سارے جگنو اڑ گئے تھے۔ رام داس اپنی اندھیری کٹیا میں پہنچا تو نہ اسے آج کا ڈر تھا نہ آنے والے کل کی فکر تھی۔ نہ جانے کس کی جلی

نظر اس کی دنیا کو آگ لگ گئی تھی۔ غم سے بھرا دل اور اس پر تنہائی کی آگ۔ اس کے ارد گرد...... اندر باہر...... آگ ہی آگ تھی۔ غم اور دکھ نے بڑا زبردست وار کیا تھا۔ آگ کی ہلکی ہلکی تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ اور پھر شعلے بھڑک نے لگے۔...... رام داس کا دم گھٹنے لگا...... سانس رک رک کر آنے لگی...... پیاس اس شدت کی محسوس ہوئی کہ وہ چیخ پڑا" ہے رام" اور یہ صدا ہواؤں میں پرواز کرتی ہوئی دور تک پہنچی تھی...... دور بہت دور...... پرواز کرتی ہوئی...... کٹیا میں اور ایک معصوم...... بے گناہ کا بدن مٹی میں مل گیا تھا......

جیل میں نیند سے کچھ دیر پہلے درگا کو پرانی یادوں نے آگھیرا۔ لکشمی میری بچی...... تو مجھے معاف کر دینا...... آج صبح میں نے تجھے مارا...... تیرے بال کھینچے...... درگا کا دماغ کہیں ٹھہر نہیں رہا تھا...... سوچ لکشمی کے بارے میں تھی کہ ناگہاں ہی یوں محسوس ہوا جیسے رام داس اس کے آس پاس سے گزرا ہو...... پھر رام داس کے خیالوں میں ڈوبی اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ خواب اور خیالوں میں ساری رات درگا رام داس کے پیچھے دوڑتی رہی تھی لیکن رام داس اس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جا رہی ہو......

کسی نے دروازہ کھولا تھا...... خواب ٹوٹ گیا لیکن رام داس اب بھی خیالوں میں بسا تھا...... دیدی وہ...... وہ...... آیا تھا...... یہاں کوئی نہیں آسکتا...... تم نے کوئی ضرور سپنا دیکھا ہوگا...... اب سپنے دیکھنا چھوڑ دو...... کون تھا وہ جو...... دیدی نے پوچھا...... وہ ہولے سے بولی...... میرا ساتھی...... رام داس کا نام زبان پر نہ لا سکی تھا نے دار کی بات جو یاد آگئی تھی...... زبان بند رکھنا...... تم کچھ کھا لو...... سرکاری وکیل صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ سرکاری وکیل...... درگا ماتھا پکڑ کر بیٹھی سوچتی رہی...... اگر ہماری سرکار اور سرکاری افسر سچے اور ایماندار ہوتے تو ہم غریبوں کی یہ درگت نہ ہوتی...... جرم کوئی اور کرتا ہے مجرم ہم غریب ہی گردانے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو ظلم برپا ہے پھر وہ میرا کیا بھلا کرے گا......

ہر لڑکی کے دھڑکتے دل میں چاہے وہ دھن وان کی ہو یا کنگال کی ہزاروں ارمان ہوتے ہیں۔ ہر نئی دلہن ہاتھوں میں خوشیوں کے پھول اور دل میں ہزاروں امنگیں لئے اپنی سسرال جاتی ہے۔ لیکن تقدیر نے لکشمی کے ساتھ عجب ہی کھیل کھیلا تھا...... خالی دل اور خالی ہاتھ...... زور زبردستی سسرال پہنچا دی گئی تھی۔

حالات رام داس کو اس موڑ تک کھینچ لائے تھے جہاں اس کے پاس کچھ سوچنے کا وقت ہی نہ بچا تھا...... اچانک ہی امیدوں کے سارے دیئے بجھ گئے تھے...... اندر باہر ایسا گھنا اندھیرا چھا گیا تھا کہ اسے کوئی راہ دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی...... وقت کس کے لئے تھما ہے۔ کل تو آئے گا ہی لیکن اسے امید نہ تھی کہ وہ آنے والی سحر دیکھ پائے گا...... غموں کے سمندر میں غرق ہونے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کی زندگی کی ہچکولے لیتی ناؤ پار لگانا چاہتا تھا...... سو جو کچھ بھی اس نے کیا تھا وہ ایک غریب باپ کی مجبوری تھی......

بیاہ...... حالانکہ وشنو بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا لیکن وہ لکشمی کی دلجوئی کر رہا تھا...... اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا...... بکنے دے اماں کو...... وہ بولی...... مگر اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی...... ایسے آتی ہے نئی بہو؟ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا...... نہ ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں۔ نہ پیر میں پائل۔ اور نہ ہی تن پر چمکتا دمکتا لال جوڑا...... مجھے تو تو اس میں بھی راجکماری سی لگے ہے۔ ہے گاؤں میں دوسری تیری جیسی...... تو سندر...... تیری چال سندر...... ایسے چلے ہے

جیسے کوئی رانی چلے ہے...... یہ میں نہیں سارا گاؤں بولے ہے......

لکشمی اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی۔ معلوم نہیں وشنو کی بات سنی بھی یا نہیں۔ سسک سسک کر بولی۔ تو نے پہلے کسی باپ کو دیکھا جو اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر زورزبردستی مندر لے جائے اور پھر خود ہی بیٹی کو سسرال چھوڑ جائے۔ میرے ہی ساتھ کیوں یہ انہونی ہوئی ہے۔ کہتا تھا میری ماں مر گئی...... مگر میرا دل نہیں مانتا...... مرجاتی تو ارتھی اٹھتی اسکی...... ضرور کوئی اور بات ہے۔ تب ہی تو باپو کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا ہے۔ سب الٹا پلٹا کر رہا ہے۔ اناپ شناپ بک رہا ہے۔

وشنو بولا...... سچ تجھے دیکھ کر مجھے اپنی سدھ بدھ ہی کہاں رہتی ہے۔ اور آج تو تجھے پا کر میں اتنا خوش ہوں کہ چاچا کے دکھوں کا احساس ہی نہ رہا مجھے۔ یہ سب تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تو سوجا...... کل تڑکے جا کر ہی چاچا کی خبر لیں گے......

سنہری کرنوں سے دھرتی جگمگا اٹھی تھی۔ لکشمی کے چہرے پر بھی خوشی کی لالی چھائی ہوئی تھی۔ اماں کو حلوہ پوری کھلا کر۔ سارے گھر کے کام نمٹا کر لکشمی وشنو کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے جارہی تھی۔ کبھی اپنے کو دیکھتی تو کبھی اپنی کلائیوں کو۔ رنگ برنگی چوڑیوں کی کھنک میں پیار کی دھن تھی...... پائل الگ چھن چھن کر رہی تھی...... دل الگ سے پھولا نہیں سمارہا تھا...... باپو اپنی بیٹی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوگا...... سارے رنج سارے دکھ بھول جائے گا۔ مجھے اپنے سے لپٹا کر میرا ماتھا چوم لے گا۔ آج میں اپنے باپو کو اپنے ہاتھوں سے حلوا پوری کھلاؤں گی......

لیکن...... وہاں جو دیکھا...... اسے دیکھ کر لکشمی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ جان ہی نکل گئی۔ ہائے رے میرا باپو ایسی درد بھری آہ تھی کہ وشنو کا رواں رواں کانپ اٹھا...... اس نے جھک کر دیکھا...... سانسوں کا تانا بانا ٹوٹ چکا تھا...... سینے پر ہاتھ رکھا...... دل کی دھڑکنیں بند تھیں...... نہ جانے کب خون نے گردش کرنا بند کردیا تھا...... جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا...... اور بے رونق بے جان آنکھیں چھت تاک رہی تھیں۔

ہائے رے اتنے عذاب...... ہے بھگوان تو مجھ پر کرم کرنا کیوں بھول گیا...... میں نے تو کوئی پاپ نہیں کیا۔ پھر یہ اتنی بڑی سزا...... میں یتیم ہو گئی...... میرا...... باپو...... میری...... ماں...... لکشمی اپنے باپو کے پاؤں پکڑ کر روئے جارہی تھی...... سینہ پیٹ رہی تھی...... اور وشنو ہونقوں کی طرح کھڑا دیکھا آنسو بہا رہا تھا......

آواز سنتے ہی گاؤں والے آگئے تھے...... سب کی نظریں بین کرتی لکشمی پر پڑیں پھر رام داس کے بے جان شریر پر ٹک گئیں...... کسی نے کہا...... بھلا آدمی تھا...... بیٹی کو تو پار لگا گیا...... دوسرا بولا...... اپنی ہوتی تو ساری برادری کے سامنے سینہ تان کے بیاہ کرتا...... یوں چوری چھپکے ٹھکانے نہ لگاتا۔

وشنو نے کہا...... بس چاچا...... اور نہیں...... اس دکھیاری پر اور ظلم نہ ڈھاؤ...... دو دن کے اندر اندر اس نے اپنے ماں اور باپ کو کھو دیا ہے۔ کل ماں مری اور آج باپ چل بسا...... ایک ساتھ ہی آوازیں اٹھیں...... درگا مرگئی اور ہم سب کو پتا بھی نہیں...... کیسے مری...... کہاں مری...... سڑک پر مری ہوگی...... لاش تھانے لے گئے کیا...... وشنو بولا...... چاچا نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ چاچی مرگئی آگے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ آج چاچا ہی نہیں رہے۔ میں کس سے پوچھوں۔

ارے یہ چھوری تو بڑی منحوس ہے۔ وشنو کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ فوراً بولا...... چاچا انکی موت آئی تھی اب اس بیچاری کو کیوں دوش دیتے ہو۔ اب یہ بھی اس گاؤں کی بہو ہے۔ اس گاؤں کی عزت ہے۔ اس کی مٹی کہیں کی بھی ہو اب یہ

میری دھرم پتنی ہے۔ اور میں اسی مٹی میں جنما ہوں۔ اس گاؤں کا بچہ ہوں تو یہ آپ کی بہو ہوئی نا......

کیلاش بولا...... اس جھگڑے کو بند کرو۔ اور شمشان گھاٹ جانے کی تیاری کرو۔ یکا یک خاموشی چھا گئی تھی کچھ دیر بعد درگا سرکاری وکیل کے روبرو تھی...... "میں سرکاری وکیل ہوں" درگا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ اگر انصاف چاہتی ہو تو سارا قصہ تفصیل میں سچ سچ بیان کرو...... جھوٹ بول کر انصاف کی امید نہ رکھنا...... وہ سوچنے لگی ...... امید...... اور سرکاری وکیل سے...... اگر وکیل ہی سچے اور ایماندار ہوتے تو آج میں اپنے باپ کی زمین و جائیداد کی مالکن ہوتی نہ کہ وہ بے ایمان پٹواری...... بولو...... خون کس نے کیا...... وکیل کے اس سوال پر وہ سوچنے لگی...... خونی کا نام تم اچھی طرح جانتے ہو یہ سوال تم خود سے کرو...... تم میری بات کا یقین کرنا چاہو بھی پھر بھی نہ کرو گے...... کبھی نہیں...... ہرگز نہیں ...... کیونکہ تم تو پہلے ہی بک چکے ہو...... بیچ چکے ہو اپنا ضمیر...... "جواب دو" جانتی ہو اس جرم کی سزا پھانسی ہے۔ ہاں بابو تم غریبوں کو اس سے زیادہ دے بھی کیا سکتے ہو۔ میری زبردست ہار...... میرے رام داس...... کو پھانسی...... نہیں...... نہیں میں جیل کی صعوبتیں...... ساری تکلیفیں سہہ لونگی مگر اپنے رام داس پر آنچ نہ آنے دونگی۔ میں تو طوفانی زندگی لے کر اس دنیا میں آئی ہوں۔ آج بھی آفتوں میں گھری ہوں۔ اگر رام داس کو بچا لونگی...... تو...... وکیل کی آواز نے اس کے خیالوں کے تار کو توڑا ...... "جواب دو" خون کس نے کیا ہے تم نے یا تمہارے...... مرد...... نے......

وکیل مسلسل بولتا رہا...... سوال پر سوال کرتا رہا...... درگا نے زبان نہیں کھولی تو وہ اٹھ گیا...... یہ خاموشی تجھے بہت مہنگی پڑے گی...... ضبط کے بند ایکدم سے ٹوٹے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بری طرح رو پڑی تھی۔ بہت سارے آنسو بہہ چکے تھے...... وکیل صاحب جا چکے تھے...... کوٹھری میں چہرہ چھپائے وہ سسک رہی تھی...... کچھ کھا لے...... یہاں کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے دل و دماغ اور جسم مضبوط رکھنا ضروری ہے۔ آواز میں نمی تھی۔ اسے یوں لگا ہوا کا جھونکا آیا اور اسے چھوتا نکل گیا ہو......

صبح سے ہی طنز بھری باتیں لکشمی کے دماغ میں گردش کر رہی تھیں...... شمشان گھاٹ سے وشنو گھر لوٹا تو لکشمی کو ہچکیاں لے لے کر روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کے قریب بیٹھ کر بولا چاچا کے مرنے کا سوگ منا رہی یا پھر گاؤں والوں کی باتوں پر آنسو بہا رہی ہے۔ دیکھ...... موت تو لازمی ہے...... ہر انسان کو ایک نہ ایک دن جانا ہوگا...... گاؤں والوں کی باتوں پر رونا فضول ہے۔ دُربل کو ستانا اور اسکا دل دکھانا ان لوگوں کا کام ہے۔ چاچا نے تجھے بیٹی مان کر سینے سے لگایا تھا میں نے تجھے اپنی پتنی بنا کر دل میں بٹھایا ہے۔ اب تو صرف اور صرف میری پتنی ہے۔ ہمت باندھ کر...... رونے کی بجائے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر...... ہر عورت کے اندر کہیں نہ کہیں جھانسی کی رانی دبکی بیٹھی ہوتی ہے۔ اور میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ پھر ڈر کیسا......

وہ سسک سسک کر بولی...... تو تو جا رہا ہے...... تیرے پیچھے مجھے ستائیں گے...... نہیں ستائیں گے...... گاؤں والے سیدھی سادھی طبیعت کے لوگ ضرور ہیں مگر بد خو نہیں ہیں۔ انہیں اچھے برے...... جھوٹ اور سچ کا گیان ہے...... پھر کیلاش بھی تو ہے...... اس کے سامنے کسی کی زبان کھولنے کی ہمت نہیں...... جیسے تیرے باپو کے سامنے نہیں تھی...... سچے اور کھرے آدمی تھے وہ......

دنیا میں تنہا ہونا سب سے زیادہ برا ہوتا ہے...... جو اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہہ سکے اس سے زیادہ بدقسمت انسان کوئی نہیں ہوتا...... وہ کسی کی ہے۔ اس کا کوئی ہے۔ اس خیال نے اس کے ٹوٹے دل کے تاروں میں ایک عجب سی

طاقت محسوس کی تھی...... جیسے کچھ کھو کر کوئی بیش قیمت چیز مل گئی ہو۔ دل کو چین ملا تو ہچکیاں خود بخود بند ہو گئیں...... اسے یوں لگا وشنو نے اسکے سر پر کلسی بھر اٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو...... وہ مسرور ہو گئی۔ برسوں بعد حقیقت سے سامنا ہوا تھا......

اماں کی حالت تھوڑی سدھری تھی...... اماں میں جا رہا ہوں...... میں محنت کرونگا...... خوب کماؤنگا۔ تیرے لئے نئی کوٹھری بناؤنگا...... ایک سائیکل خریدوں گا...... گاؤں میں سب سے پہلے تیرے دروازے پر سائیکل کھڑی ہوگی۔ تجھے سائیکل پر بٹھا کر پورے گاؤں کی سیر کراؤنگا...... اماں میں وہ سب تیرے لئے کرونگا جو تو چاہے گی...... بس تو میری ایک بات مان لے۔ بھگوان نے بھی اس لاچار کو پینے کو آنسو دیئے ہیں۔ تو اسے اور دکھ نہ دینا...... دونوں مل جل کر خوش رہنا...... گھر میں جھگڑا ہوتا دیکھ دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اماں بولیں...... ہاں ہاں...... سن لیا...... لڑکی بھلی ہے...... میں نہیں دکھ دونگی اسے...... تو جا...... مت چنتا کر...... وہ اماں سے مل کر خوشی خوشی آگے بڑھا۔

لکشمی نے خاموش مگر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا...... میں چلا...... تو چلے گی میرے ساتھ...... وہ بولی...... بار بار یہی بات کیوں کہتا ہے جبکہ تو جانتا ہے میں اماں کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤنگی...... ان کی سیوا کرنا اب میرا پہلا فرض ہے۔ وشنو نے لکشمی کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر کہا...... واہ...... میری جھانسی کی رانی...... اب میں بے فکر ہو کر جا سکتا ہوں...... تو بالکل اپنے ماں باپ پر گئی ہے۔ دونوں بڑے نیک اور رحم دل تھے اور اپنے فرض کے پکے......

وشنو گاؤں سے آتا رہا اور جاتا رہا...... زندگی معمول پر آ گئی تھی...... لکشمی کے اچھے بیوہار سے گاؤں والے بھی خوش ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا آپ منوا لیا تھا۔ سب نے اسے گاؤں کی بہو سویکار کر لیا تھا......

سرکاری وکیل کئی بار آئے...... اور آخر فیصلے کا دن بھی آ گیا...... کس کا خون ہوا تھا اور کیوں...... درگا کچھ بھی نہیں جانتی تھی...... پھر وہی سوالوں کی یلغار...... پھر وہی دھو کا دھڑی...... کبھی نہیں بدلینگے ہم غریبوں کے نصیب...... کبھی نہیں ہوگا سویرا...... تب ہی جج صاحب کچھ کہہ رہے تھے...... اپنے حقوق کے لئے لڑنا زندہ انسان کی نشانی ہے تم اپنی صفائی پیش کرو...... پھر دماغ میں جھٹکا لگا...... میں زندہ ہی کب ہوں میں تو کب کی مر چکی...... تم سب نے مل کر میرا خون کیا ہے......

پھر جج صاحب نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑا...... یہ میری زندگی کا سب سے عجیب و غریب کیس ہے۔ قیدی نے اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہا...... کورٹ میں ذرا سی ہلچل ہوئی تھی مگر درگا کی جھکی نظر جھکی ہی رہی......

خاموش...... خاموش...... اور پھر دھماکہ...... عمر قید...... با مشقت...... درگا کے ذہن میں آندھیاں سنسنانے لگیں...... عمر قید...... یعنی تمام عمر جیل میں۔ درندوں۔ خونیوں۔ ڈاکوؤں کے ساتھ گذارنی ہوگی۔ دہشت اس شدت کی ہوئی کہ سارا جسم لرز گیا...... دماغ سن پڑ گیا...... ہاتھوں میں ہتھکڑیاں...... سر جھکائے جیسے آئی تھی ویسے ہی لیڈی کانسٹیبل کے پیچھے پیچھے چل پڑی...... قدم ڈگمگا رہے تھے...... جسم بھی کانپ رہا تھا...... کوئی سہارا نہ تھا...... رام داس......

وہ ایک پل کو ٹھہری...... میں جیت گئی...... اسے یوں لگا رام داس اس کے سامنے کھڑا ہے، اس کی بیٹی کے ساتھ...... لیڈی کانسٹیبل نے ہتھکڑی کو کھینچا...... نہ رام داس تھا نہ بیٹی...... وہ آگے بڑھتی گئی...... زندگی کی آس ٹوٹ گئی تھی نئی کوٹھری میں...... دہشت اس شدت کی ہوئی کہ پورا جسم تھر تھر کانپ اٹھا...... وہ وہیں گر پڑی...... دل پر رنج و غم کی تیز بارش ہوئی۔ غضب کا سناٹا اور جان لیوا تنہائی۔ بس دل دھڑک رہا تھا...... بڑی زور زور سے...... وہ اپنے دل کی ہر دھڑکن سن رہی تھی...... اس کے اندر آہوں کا ایک طوفان اٹھا تھا...... زبردست طوفان...... جسے سینے میں دبانا مشکل ہو رہا تھا

۔ہے بھگوان کہاں ہے تو...... مجھے شکتی دو...... حوصلہ دو کے اس بلا کو سہہ سکوں، پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی...... پھر ایک نرم سی آواز...... ایسے روؤ گی تو پاگل ہو جاؤ گی...... اس بستی میں کوئی کسی کے آنسو نہیں پونچھتا...... یہاں تو جس کو دیکھو اس کا ہی دامن بھیگا ہے۔ تمہیں خود اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا...... وہ غائب دماغی کے عالم میں دیدی کو گھورتی رہ گئی۔

صبح وہ بے سدھ پڑی تھی۔ پھر وہی دہشت۔ ساری زندگی ان دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر جینا ہوگا...... دل میں پھر سے درد اٹھا تھا مگر کوئی نہیں تھا جسے اپنے دل کے درد کا حال سناتی...... کوئی نہیں تھا جس سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر روتی کہ دل کو کچھ تو قرار آتا...... تب کسی نے اس کے دکھتے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا...... از حد بے یقینی اور حیرانی کے عالم میں اس نے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا تھا۔ آواز میں نرمی تھی...... افلاس کی ماری ہوئی مخلوق کو یوں پریشان ہوتے میں مدت سے دیکھ رہی ہوں۔ دیکھا نہیں جاتا مگر دیکھ رہی ہوں...... میں کئی دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں اور میرا اپنا خیال ہے تم بے گناہ ہو۔ تم مجرم نہیں ہو کیونکہ تم جیسی عورت کوئی ظلم کر ہی نہیں سکتی۔ جلتے ہوئے دل پر ایک برفیلی پھایا رکھا تھا...... تم جیسے اور بھی بے گناہ قیدی ہیں۔ دھن میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انصاف کے پنڈت بھی اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر ایک کام کا دام ہے...... بس غریب کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ دھن والوں کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھی ہے اور انصاف کے پنڈتوں کی آنکھوں پر لالچ کی...... دونوں ہی اندھے ہیں۔ دیکھ نہیں سکتے کہ مایا بڑی ٹھگنی ہے۔ بڑی چنچل۔ کسی کے یہاں ٹک کر نہیں رہتی۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ ہمارا سارا معاشرہ اس مایا جال میں پھنستا جا رہا ہے ان لوگوں کو نہ دین کا نہ دنیا کا ہوش رہا ہے اور نا ہی اپنی آنے والی نسل کا خیال...... اب تمہاری قسمت کا فیصلہ تو ہو چکا ہے مگر مجھے یقین ہے ایک دن سچائی ضرور سامنے آئے گی اور تمہارے ماتھے کا داغ دھل جائے گا......

درگا نے دیدی کے پاؤں پکڑ لئے۔ بے تحاشا آنسوؤں نے ان کے پیر بھگو دیئے...... دیدی...... بس آج میرے دل کو شانتی مل گئی...... کم سے کم ایک شخص تو ہے اس دنیا میں جو مجھے بے گناہ سمجھتا ہے...... آپ نے میرے ماتھے کا داغ دھو ڈالا ہے۔

پھر اب ہمت باندھو۔ حالات کا مقابلہ کرو...... یہاں کی زندگی بہت سخت ہے۔ دیدی چلی گئی۔ اور درگا دیر تک سوچتی رہی۔ کیا ایسا ہوگا کبھی...... کیا ایسا ہو سکتا ہے...... کیا سچ مچ ایسا ہو جائے گا۔ گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نے دل میں ایک موہوم سی امید کو جنم دیا۔ زندگی کی آس بندھ گئی، اپنوں سے ملنے کی آس۔ اسی آس میں دن گذرتے چلے گئے۔

آہنی سلاخوں کے پیچھے قید خانے کی سخت دیواروں میں ہتھکڑیوں کا بوجھ بڑا مشکل تھا۔ صرف آہنی سلاخیں ہی نہیں تھیں۔ وہاں کے ملازمین کے دل بھی لوہے کے بنے تھے۔ رحم اور ہمدردی کی رمق بھی نہ تھی ان کے دلوں میں اپنے ظالمانہ رویہ سے وہ خوفناک ڈاکو اور قاتل کو زیر کر لیتے تھے۔ ان ظالموں کے درمیان دیدی جیسی بھی ایک ہستی تھیں جن کا برفیلا پھایا قیدیوں کے لئے ایک کرشمہ سے کم نہ تھا۔ موت کے شکنجے میں گھرے لوگوں کو جینے کی امید دلاتا تھا۔ کئی قیدی تو رہا ہو چکے تھے اور جو اندر تھے وہ انہیں دیوی سمجھتے تھے۔ ان کا حکم کوئی نہیں ٹالتا تھا...... درگا نے بھی وہی کیا جو دیدی نے کہا۔ زندگی ذرا آسان ہو گئی تھی۔

وشنو پڑھا لکھا تو خاک تھا۔ گھر کی صفائی اور جھوٹے برتن دھونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اپنی محنت اور دیانتداری

کے بل بوتے پر اس نے سیٹھ جی کا دل جیت لیا تھا۔ جب ان کے ساتھ باہر گیا تو اسے اپنی جہالت اور لاتعلیمی کی وجہ سے قدم قدم پر شرمسار ہونا پڑا۔ اس کمتری کے احساس نے اس کے اندر کچھ بننے کی خواہش اجاگر کر دی اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق خود بخود پیدا ہو گیا......

ہندی کے اخبار پڑھ کر اور ٹی۔ وی میں خبریں سن کر وہ ملول ہو جاتا...... سوچتا رہتا...... دنیا اتنی آگے نکل گئی اور میرے گاؤں والے...... وہ مالکن کے پاس گیا...... ماں جی...... مجھے دس ہزار روپیوں کی ضرورت ہے۔ دس ہزار...... ماں جی ہچکچائیں...... سوچنے لگیں...... کتنی جلدی یہ شہر کی رنگ رلیوں میں پھنس گیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی رہی تو پل میں وشنو نے اپنی زندگی کا سودا کر ڈالا یہ سوچ کر کسی نہ کسی کو تو قربانی دینی ہی ہوگی...... پھر میں ہی کیوں...... نہیں......

ماں جی...... میں اپنی ساری زندگی آپ کی سیوا کرونگا۔ آپ کا غلام بن کر...... تب مالکن کا ماتھا ٹھنکا...... دس ہزار روپے...... سیوا...... غلام...... بولیں کیا کرے گا اتنی بڑی رقم کا...... وہ بولا...... وہ کرونگا جو سرکار میرے گاؤں کے لئے نہ کر سکی...... اور آپ جیسے شہر کے امیر کبیر لوگ بھی شہر میں سوشل ورک کرتے ہیں۔ روز اخبار میں نکلتا ہے۔ کہیں غریبوں کو پرانے کپڑے دان کرتے ہیں۔ کہیں کتابیں کہیں یتیموں کو کھانا دیتے ہیں۔ آپ میں سے کسی کی نظر گاؤں والوں پر نہیں اٹھتی جہاں ہندوستان کی بڑی آبادی غریبی بھوک اور جہالت کے بوجھ تلے جوجھ رہی ہے۔ گاؤں میں ایک اسکول بھی نہیں ہے۔ اب سارے گاؤں کے بچے شہر آ کر پڑھائی تو نہیں کر سکتے نا ہی گاؤں والے شہر میں آ کر بس سکتے ہیں۔ کاشت کرنا بھی تو ضروری ہے۔ غلہ تو سارا گاؤں سے ہی آتا ہے جسے شہر والے بھی کھاتے ہیں۔ پھر شہر کے دھنوان ہماری فکر کیوں نہیں کرتے...... شاید اس لئے کے گاؤں والے ہوشیار ہو گئے۔ لکھ پڑھ گئے تو اپنے فیصلے خود کرنے لگیں گے...... (سرکاری اونچ نیچ سمجھنے لگیں گے) پھر پانچ روپے دے کر منتری ہمارا ووٹ نہیں خرید سکے گا۔ ماں جی ہونقوں کی طرح۔ اس اجڈ۔ ان پڑھ۔ گنوار کا منہ دیکھتی ہی رہ گئیں جو ہوشمندی کی باتیں کر رہا تھا۔ مالکن تو گہری سوچ میں ڈوب گئیں...... اسکے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ ٹھیک ہے۔ دے دیں ماں جی...... میں اسکول کی نیو تو ڈالوں......

وہ ہنس کر بولیں...... تجھے میرا غلام بن کر نہیں رہنا ہوگا...... تجھ جیسا انسان اپنا سب کچھ دوسروں کو دینا چاہے میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ تیرے گاؤں میں ضرور اسکول ہوگا...... جا فکر نا کر......

درگا نے سنا تھا جیل میں سچ اگلوانے کے لئے پولس والے طرح طرح کے حربے آزماتے ہیں لیکن یہاں تو اس کے برعکس ہوتے دیکھ رہی تھی۔ یہاں تو سچ چھپانے اور جھوٹ اگلوانے کے لئے قیدیوں پر ظلم ڈھائے جا رہے تھے...... کسی کے بال کھینچ کر لاتیں مار کر...... کسی کے سر پر مسلسل پانی کی دھار برسا کر ہوش اڑائے جاتے تھے۔ تو کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہنٹر مار مار کر کھال ادھیڑی جا رہی تھی۔ کوئی چھت سے الٹا لٹکا گھنٹوں کراہتا تھا۔ یعنی کسی نہ کسی طرح قیدی کی خودی کو تار تار کرنا ضروری تھا۔ جیل میں خوفناک اذیت ناک درد بھری چیخوں کا مسلسل شور کسی بھی انسان کو پاگل بنا سکتا تھا۔

درگا کی شامیں چھت تاکتے یوں گذرتیں جیسے گاؤں کی سب سے بے سہارا۔ بے بس خوفزدہ بوڑھی کی اپنے بوسیدہ چھپر سے بارش کی ایک ایک بوند ٹپ ٹپ گرتے تاکتے گذرتی ہے۔ درگا نڈھال ہو کر زمین پر ڈھے جاتی...... رات کی تاریکی اور ویرانی میں رام داس کی یاد ستاتی رہتی اور اسے ہراساں کرتی رہتی۔

ہر طویل سنسان رات کے بعد نوحہ کرتی...... آنسو ٹپکاتی زردی مائل سوگوار سی صبح کے وہی خوفناک نظارے وہی

دلدوز چیخیں...... جسم اور روح کو گھائل کرتی رہتی...... کم عمر تھی...... ڈر جاتی...... سوچنے لگتی...... اس جینے سے تو بہتر۔ پھانسی کا تختہ تھا۔ ایک جھٹکے میں سارا کام تمام ہو جاتا...... یوں پل پل تو نہ مرتی میں......

شروع میں درگا نے دنوں کا حساب رکھا تھا...... دو...... چار...... چھ...... چھ دنوں میں اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ پھر یوں لگنے لگا کہ اس دوزخ میں صدیوں سے جل رہی ہوں...... شیشہ دل تو پہلے ہی چکنا چور ہو چکا تھا جس کی کرچیاں قدم قدم پر زخمی کر کے اسے اندر تک لہولہان کر رہی تھیں۔ زندگی کی ہر خوشی مر چکی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ دماغ کے کل پرزے بھی ڈھیلے ہوتے جا رہے ہیں۔ کب تک اپنے مقدر سے لڑتی رہونگی...... زندگی کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ میرا رام داس آزاد ہے۔ کھلی ہوا میں سانسیں لے رہا ہے۔ پھر میں یہ دن رات کا عذاب کیوں جھیلوں...... مگر زندگی سے فرار ہونے کی کوئی راہ نظر ہی نہیں آئی پھر دھیرے دھیرے جوں جوں دن گذرتے گئے وہ جیل کی گھٹی گھٹی فضا میں سانسیں لینے کی عادی ہو گئی......

اس کا ہر دن پہلے دن سے بڑھکر بدتر ہی گزرتا گیا۔ اسے اپنے پاگل ہو جانے کا احساس ڈراتا رہا۔ اور کچھ ہی دنوں میں وہ محسوس کرنے لگی کہ وہ پاگل ہوتی جا رہی ہے۔ جسمانی اور ذہنی اذیتوں سے بے حال تھی...... تنہائی اور ہولناک ماحول سے اس درجہ بیزار ہو گئی کہ اس کے اندر جینے کی خواہش ہی زندہ نہیں رہی۔ رنج۔ مایوسی۔ اور ناامیدیوں کی زنجیروں نے اس بری طرح جکڑا کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ پھر نہ رام داس کا خیال آیا نہ اس کی آمد کا انتظار رہا۔ نہ دنوں کا حساب رہا نہ راتوں کی گنتی...... بس یاد رہا...... عمر قید...... با مشقت......

حوادث اور طوفان سے ٹکراتے ٹکراتے ہار کر جب ناامیدی کے گہرے ساگر کی تہہ تک پہنچی...... تب ساحل سے ایک انجانی آواز سماعتوں سے ٹکرائی...... اٹھ...... حقیقت تھی...... یا پھر...... کوئی نیا خواب دیکھ رہی ہوں...... اب کوئی نہیں آئے گا مجھے بچانے...... ایسا اب ممکن ہو ہی نہیں سکتا...... وہ جیسے بیٹھی تھی گھٹنوں میں سر دیئے ویسے ہی بیٹھی رہی...... بت کی طرح...... بے جان سی...... بے حرکت......

"اٹھ...... اور چل" ...... دوسری پکار پر وہ چونکی...... وہ تیرے لئے بیٹھا نہیں رہے گا...... احساس کے آئینے میں رام داس کا سایہ لہرایا...... تو...... آ گیا...... تب بت میں حرکت ہوئی...... وہ ایک دم کھڑی ہو گئی...... درگا نے ہتھکڑیوں کے لئے اپنے دونوں بازو آگے پھیلائے اور ایک پل ٹھہری۔ جیسے سامنے کھڑی عورت کو اسکی ڈیوٹی کا احساس دلا رہی ہو...... چل...... رک کیوں گئی...... جلدی جلد...... بغیر ہتھکڑیوں کے...... اس نے سوچا...... مردہ دل میں جان آ گئی...... وہ قدم گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔

ہتھکڑیوں سے آزاد دونوں ہاتھوں کو یوں چھپائے رکھا تھا جیسے دنیا کی سب سے قیمتی شے چھپا رکھی ہو۔ کمرے میں بڑے سرکار کو دیکھتے ہی وہ دوسری سانس لینا بھول گئی۔ رام داس سے ملنے کی امید پل میں ٹوٹ گئی۔

بیٹھ جاؤ...... وہ کانپ اٹھی...... شاید میں نے غلط سنا...... قیدیوں کو حکمرانوں کے سامنے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی اسے یاد آیا۔ وہ اپنے اندر بیٹھنے کی ہمت نہ جٹا سکی...... بیٹھ جاؤ...... تب اسے اپنی سماعت کا یقین ہوا تو اس کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی۔ سوچنے لگی ان سنگدل اور کٹھور دل حکمرانوں کا کیا ٹھکانا اب کوئی نیا الزام لگا کر...... سر جھکا کر بیٹھی تھی۔ دل اندر ہی اندر بیحد بے چین تھا...... کہ سر پر لٹکی تلوار اب گری...... یا

تمہارا نام کیا ہے...... وہ نام پوچھ رہے تھے جبکہ میں تو یہاں اپنے نمبر سے پہچانی جاتی ہوں۔ اس نے فوراً اپنا نام سنا تو اسے اپنے وجود کا احساس ہوا...... دیدی نے حسب معمول فوراً مدد کی...... اس کا نام درگا ہے۔ مدت بعد اپنا نام سنا تو اسے اپنے وجود کا احساس ہوا۔ درگا ہے۔ ابھی مری نہیں دل نے دھیرے سے سرگوشی کی۔ میں تو اپنا نام بھی بھول بیٹھی تھی۔ اب دل ذرا سنبھلا۔ تو دل نے رونے کو چاہا...... اتنا روئے اتنا روئے...... مگر قیدیوں کو نہ ہنسے کی اجازت ہے اور نا ہی رونے کی...... سارے آنسو حلق میں اتار لئے۔

پھر وہی بھاری مگر نرم سی آواز...... تمہیں یہاں کتنا عرصہ ہو گیا...... وہ گھبرا گئی...... کیا جواب دیتی...... یہاں تو بس دن ہوتا ہے عمریوں ہی تمام ہوتی ہے۔ سال۔ مہینے۔ ہفتے اور دنوں کا حساب رکھنا فضول ہے۔ آج کیا دن ہے میں کیا جانوں...... وہ چپ بیٹھی سوچتی رہی۔ مگر جواب نہ دے سکی......

درگا تم بے گناہ ہو...... تمہیں رہا کیا جاتا ہے...... یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ برسوں سے سن پڑے دماغ میں بڑے زور کا دھماکہ ہوا تھا...... اسے خطرے کی بو آنے لگی...... میری رہائی یعنی رام داس کی قید...... رام داس جیل میں...... پل میں اذیت ناک نظارے اور درد بھری چیخیں دماغ میں شور مچانے لگیں...... ہے بھگوان تیرے در پر میری دعاؤں کی رسائی نہیں ہوئی۔ میری ساری قربانیاں ساری آہیں بیکار رہیں۔ بھگوان میری جان لے لے مگر میرے رام داس کو ان ظالموں کے ہاتھوں سے بچائے رکھ...... اس ڈرپوک سی لڑکی میں ایک دم ہی سارے سورماؤں کی ہمت در آئی...... بڑے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں بولی...... نہیں...... حضور...... نہیں...... مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور نہیں...... خون میں نے کیا تھا مجرم میں ہوں...... کورٹ میں میرا جرم ثابت ہو چکا ہے اپنے گناہ کی سزا میں کاٹ رہی ہوں۔ میرے گناہ کی سزا کسی اور نہ دینا۔

بڑے سرکار...... دیدی اور جتنے بھی وہاں کھڑے تھے۔ اس بہادر لڑکی کو دیکھتے ہی رہ گئے یہ لڑکی جو کسی اور مجرم کے جرم کا بوجھ اٹھا کر عمر قید با مشقت کی سزا جھیل رہی تھی۔ آج بھی اس شخص کی خاطر رہا ہونے سے انکاری تھی...... کون...... کون ہے وہ خوش نصیب سب کے دماغوں میں ایک ہی سوال تھا۔ بڑے سرکار نے سوال کیا...... صرف یہ بتاؤ کہ تم نے کس کا خون کیا تھا اور کیوں......

وہ لاجواب ہو گئی...... کچھ سوچ کر بولی...... سرکار یہ میں نہیں جانتی...... سرکاری وکیل نے صرف ایک ہی سوال کیا تھا...... خون تو نے کیا یا تیرے مرد نے "خون" جس کا بھی ہوا تھا...... الزام تو ہم غریبوں کے سر ہی تھا۔ سو میں نے چپ سادھ لی...... مجھے عمر قید...... منظور ہے سرکار...... ہاتھ جوڑ کر درگا نے بڑے سرکار سے التجا کی۔ اسے چھوڑ دیجئے سرکار...... وہ خون کر ہی نہیں سکتا...... وہ میرا دوست میرا ساتھی خون کر ہی نہیں سکتا۔

سرکار میں اسے جی جان سے چاہتی ہوں۔ میں نے اس جیسا نیک دل اور بھلا آدمی دوسرا نہیں دیکھا...... اس نے میری جان بچائی۔ لکشمی کو جب وہ اتنی سی تھی مٹی کے ڈھیر سے اٹھا لایا پھر اسے پالا پوسا۔ خود غریب تھا۔ دو وقت روٹی مشکل سے ملتی تھی اسے پھر بھی لکشمی کو نہیں چھوڑا۔ اب آپ ہی بتاؤ سرکار۔ ایسا رحم دل اور انسانیت سے پیار کرنے والا انسان کبھی کسی کا خون کر سکتا ہے۔ نہیں نا...... وہ خود سوال اور خود جواب کر رہی تھی۔ وہ رو رو کر ہاتھ جوڑے التجا کر رہی تھی۔ اسے چھوڑ دو سرکار...... اسے چھوڑ دو سرکار......

بڑے سرکار اور دیدی اس کی ہمت اور جرات دیکھ کر حیران تھے۔ بولے۔ اس زمانے میں ایسے افراد نا پید ہیں جو دوسروں کے لئے اپنی جانیں تک دے دیں۔ تم واقعی درگا ہو۔ اپنے پتی کو بچانے کے لئے تم اپنی جان پر کھیل گئی۔ اس زمانے میں یہ پیار اور یہ قربانی دیکھنے کو نہیں مل سکتی...... تم اور تمہارا مرد دونوں بے گناہ ہو...... نہ تم مجرم ہو اور نا ہی تمہارا مرد...... خونی نے اپنے مرنے سے پہلے اقبال جرم کرلیا ہے۔ پولس کے پاس سارے ثبوت حاضر ہیں۔ اب تو رہائی منظور ہے۔ بڑے سرکار نے اس سے سوال کیا اب اپنے گھر جا کر اپنے پتی کے ساتھ باقی زندگی خوشی خوشی گذارو......

تم اور تمہارا مرد دونوں بے گناہ ہو۔ اس نے دھیرے سے اس جملے کو دہرایا...... سچ حضور...... ہم دونوں بے گناہ ہیں الفاظ تھے کہ پہلی بارش کی بوندیں...... وہ بھی پانچ سال کے لمبے عرصے کے بعد...... سارا بدن سیراب ہو گیا...... دھل دھلا کر پاک صاف...... دل میں پھول ہی پھول کھل اٹھے...... آرزوئیں جاگ اٹھیں...... رام داس سے ملنے کی تمنا۔ گاؤں لوٹ جانے کی خواہش...... تب ہی بڑے سرکار نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارا ہے۔ وہ نہال ہوگئی۔ بے ساختہ ہی منہ سے نکلا...... یہ میری بیٹی لکشمی کی شادی میں کام آئے گا...... دیدی نے نئے کپڑے دیتے ہوئے کہا۔ یہ پہن کر جانا اپنے گاؤں۔ وہ سوچنے لگی یہ بات۔ یہ انعامات ہماری بے گناہی کا ثبوت ہیں۔ دل چاہ رہا تھا اڑ کر گاؤں پہنچ جائے مگر...... میں کہاں ہوں...... گاؤں کہاں ہے...... وہ ایکدم ملول ہوگئی...... دیدی...... میں گاؤں...... کیسے جاؤں...... یہ جیل کونسے شہر میں ہے۔ میں اپنے گاؤں سے کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ لوگ مجھے رات کے اندھیروں میں اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ یہاں ہر پل میں نے اپنے مرد اور لکشمی کی راہ تکی مگر کسی نے میری خبر نہیں لی......

دیدی نے سوال کیا...... اپنے گاؤں کا نام جانتی ہو...... درگا مسکرا دی...... جواب نہیں دیا...... گاؤں کی یادیں...... آزادی کی خوشی...... بھلا اتنی ساری خوشیاں اس کا دل کیسے سنبھال سکتا تھا...... وہ بلک اٹھی...... دیدی کے پاؤں پکڑ کر اس بری طرح سے روئی...... کہ سب دیکھنے والوں کے دل بھر آئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ جب بہت رو لی تو بولی۔ اس مشکل کے سمے جب میں نے سب کچھ گنوا دیا تھا اور میرے اندر جینے کا حوصلہ کم پڑتا جا رہا تھا آپ نے مجھ غمزدہ اور مفلس کو حوصلہ دے کر بچایا تھا۔ دیدی انسان ایک مرتبہ جیتا ہے۔ میں اس جیل میں پل پل مری ہوں...... اور آج پھر آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے......

دیدی نے اسے آشیرواد دی...... جاؤ...... اپنی یہ نئی زندگی نئے ڈھنگ سے شروع کرو...... اپنے پتی اور بیٹی کے ساتھ...... یہاں کا مالی تمہیں تمہارے گاؤں پہنچا دے گا۔ تب اس نے نظریں اٹھائیں...... آج پانچ سال کے بعد اس کی آنکھیں یوں لو دے رہی تھیں جیسے دیئے جل رہے ہوں۔ بڑے غرور سے سر اونچا کر کے وہ پلٹی تھی......

پھونس کی جھونپڑی کی جگہ پکا مکان دیکھ درگا حیران رہ گئی تھی۔ کیا رام داس بھی...... اسے یوں لگا جیسے پورا کا پورا پکا مکان اس کے اوپر آ گرا ہو اور اس کے بدن کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں۔ شدت درد سے وہ کراہ اٹھی تھی۔ تو بھی بدل گیا۔ کاش تو دیکھ سکتا تیری خاطر میں نے کیا کیا نا سہا۔ اس جہنم میں سلگتی رہی۔ روتی رہی۔ اور تنہائی میں اپنے ہی آنسوؤں کے دھاگوں سے اپنے دل کے زخموں کو سیتی رہی۔ اور تو بھی بک گیا۔ تجھے بھی خرید لیا ان دھن وانوں نے ذرا سا دکھ نہ سہہ سکا۔ اپنا وچن بھی بھول گیا۔ وہ متواتر بلک رہی تھی۔

شنکر مالی جس کے ساتھ وہ آئی تھی فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا...... بولا...... بھابھی! رام داس غریب ضرور

ہے۔ مگر بے ایمان نہیں ہے۔ ساری دنیا کی دولت دے کر بھی اسے کوئی خرید نہیں سکتا ہے۔ وہ جان ہار سکتا ہے اپنا وچن نہیں ۔ یہ سن کر درگا کے اوسان ذرا سنبھلے۔ بڑے غور سے شنکر کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ تو رام داس کو جانتا ہے...... وہ بولا...... بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ میرا جگری دوست ہے۔ میں آگے والے گاؤں میں رہتا تھا۔ ہم دونوں اکثر ملتے رہتے تھے۔ پھر مجھے گاؤں چھوڑ کر جانا پڑا۔ جانا تو نہیں چاہتا تھا۔ کوئی اپنا گھر...... دوار...... جگہ...... زمین نہیں چھوڑتا ہے۔ یہ مٹی اپنی طرف بلاتی ہے۔ مگر مجبوریاں سب کچھ کروا دیتی ہیں۔ اگر نہ جاتا تو یا تو مارا جاتا یا پھر تیری طرح عمر قید کاٹتا...... میں آج اسی سے ہی تو ملنے چلا آیا ہوں۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب درگا اور شنکر وشنو کے گھر پہنچے تھے۔ وہموں میں گھری درگا نے رام داس کی تلاش میں آنکھیں دوڑائیں۔ دور سے ہی لکشمی کو رنگین ساڑی میں دیکھ کر غصے سے پھٹ پڑی۔ دور سے ہی کوسنے شروع کیے۔ پہلے تو لکشمی ڈری...... بھوت...... اماں کا بھوت...... مگر بھوت بولتے نہیں...... ہمت کر کے دوڑتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ چھوڑ مجھے...... دور رہ...... وہ چیخی...... جیل میں محنت کر کر کے میرے بدن کا سارا خون جل گیا۔ اور یہاں تو اور تیرا باپ مزے کر رہے ہو۔ تم دونوں کو میرا ایک بار بھی خیال نہیں آیا...... اگر شنکر دادا کے ساتھ نہ آتی تو میں سڑکوں پر اکیلی بھٹکتی پھرتی۔

لکشمی بولی...... کیا بک رہی ہے اماں...... بات تو سن...... درگا پھر چیخی...... پہلے تو یہ بتا تیرا باپ کہاں ہے۔ میں اسے پاتال سے بھی نکال لاؤنگی...... وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی...... لکشمی نے پھر بولا...... اماں پہلے شانت ہو جا...... کچھ دیر درگا چپ بیٹھی رہی...... اب سن اماں...... جو لوگ چلے جاتے ہیں ان کے لئے ایسا نہیں کہتے۔ درگا کچھ بھی نہیں سمجھی تھی یا پھر سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی...... پھر چیخی...... خود چلا گیا اور مجھے موت کے قریب چھوڑ گیا...... جب کہ جانتا تھا میں اس کے بنا نہیں جی سکتی...... اماں جینا تجھے پڑے گا کیونکہ جہاں وہ ہے وہاں سے تو اسے واپس نہیں لا سکتی۔ کبھی بھگوان کے یہاں سے بھی کوئی لوٹا ہے۔ یہ کہہ کر لکشمی بلک پڑی اور درگا کو یوں لگا کہ اس کی جان ہی نکل جائے گی ...... دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر شدت سے رو رہی تھیں۔ جب وشنو باہر ملنے آیا تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں سنبھلی تھیں۔

چاچی...... تم...... وشنو چاچی کو دیکھ کر حیرتوں میں ڈوبا بول رہا تھا۔ کہاں چلی گئی تھیں ہمیں چھوڑ کر۔ یہاں تو سب سمجھے۔ وہ فوراً بولی...... یہی نا کہ میں مر گئی ہوں...... ہے نا...... ارے جیل میں تھی جیل میں...... پائے لگ شنکر دادا کے ...... یہ مجھے جیل سے یہاں تک لایا ہے۔ میرے لئے بھگوان سے کم نہیں...... کہے ہے۔ رام داس اس کا جگری دوست تھا۔

لکشمی بولی...... اماں...... تو جیل میں تھیں اور یہاں لوگ طرح طرح کی افواہیں اڑاتے رہے۔ چھوڑ اس قصے کو بڑی لمبی کہانی ہے۔ فرصت سے بتاؤنگی پہلے اپنے مہمان کو کچھ کھلا...... پلا...... دور سے آیا ہے ہماری خاطر......

شنکر کی نگاہیں لکشمی پر ٹکی رہیں۔ تو...... تو ہے رام داس کی بیٹی...... کتنی بڑی ہو گئی...... سچ رانی جیسی لگتی ہے۔ درگا فوراً بولی...... شنکر دادا...... سچ بتا...... اس سے پہلے تو نے لکشمی کو کب دیکھا تھا......

جس دن اس کا جنم ہوا تھا...... دائی نے اسے میری گود میں ڈال کر کہا تھا...... لے...... دفنا دے کہیں اسے ...... چاچا تو تم اس کے باپ کا اتا پتا بھی جانتے ہونگے...... یہ وشنو تھا جس نے لکشمی کی جڑیں ڈھونڈنے کے لئے لاکھ جتن کئے تھے مگر کوئی سراغ ہی نہ مل سکا تھا...... وہ لکشمی کی اندرونی کیفیت سے واقف تھا۔

اب آگے ایک بھی سوال نہ کرنا...... چاچا بولے...... وہ آدمی بہت ظالم اور بیدرد ہے۔ جو اپنی بیٹی کو موت کے حوالے کر سکتا ہے وہ کسی اور پر کیا دیا کرے گا۔ میں ایک ننھی سی جیتی جاگتی بچی مار نہ سکا۔ اسے رام داس کے حوالے کر کے میں نے اپنا گاؤں ہی چھوڑ دیا۔ سب کچھ کھو کر من کی شانتی تو ملی مجھے۔ آج لوٹا ہوں...... دیس کی مٹی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پھر سوچا رام داس سے بھی ملوں......

وشنو نے کہا چاچا تم جتنے دن چاہو یہاں رہو...... مگر لکشمی کی پہچان اسے دے دو...... بڑی ذلت کی زندگی جی رہی ہے۔ گاؤں والے کھسر پھسر کرتے ہی رہتے ہیں۔ کب تک سر جھکا کر جیتی رہے گی......

دیکھ وشنو...... منہ بند رکھنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ اگر اس کے سنگدل باپ کو معلوم ہو گیا کہ میں اور لکشمی زندہ ہیں تو غضب ہو جائے گا۔ بھید فاش کرنے کے جرم میں مجھے تو تڑپا تڑپا کر مارے گا ہی لکشمی کو بھی ختم کروا دے گا۔ ہو سکتا ہے تیرے پورے پریوار کا انت کروا دے۔ سو چپ ہی رہ۔

درگا بولی نہیں شنکر دادا...... ایک بار منہ بند رکھنے کی بڑی سخت سزا میں بھگت چکی ہوں۔ برباد ہو گئی میں۔ اب میں منہ بند نہیں رکھونگی۔ میں لکشمی کو یوں کڑھتے اور زور زور مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ تجھے بتانا ہی ہوگا کہ لکشمی کا تعلق کس گھرانے سے ہے۔ گہری خاموشی چھا گئی پھر درگا بولی...... رحم کر اس معصوم لڑکی پر۔ گناہ باپ نے کیا سزا بیٹی بھگت رہی ہے۔ کیسا ظالم باپ تھا ایسی پھول سی بیٹی کو پھینک دیا۔ ارے دنیا اولاد کے لئے مرتی ہے۔ مندر۔ مسجد۔ ماتھا ٹیکتے پھرتے ہیں پھر بھی گود نہیں بھرتی۔ اور جنہیں بھگوان یہ دولت دے دیتا ہے وہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اپنی تجوریوں کی حفاظت کرتے ہیں ان سے اپنی بیٹیوں کی حفاظت نہیں ہوتی۔ بتا دے اسے یہ کس کی اولاد ہے۔ گاؤں والے اسے طعنے دیں۔ اسے ذلیل کریں۔ مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔ مجھے بھی بہت ستایا گاؤں والوں نے، مگر میرے باپ کا نام سن کر چپ ہو گئے تھے۔ دیکھ دادا ہمارا سماج بھی بہت بے درد ہے۔ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔ آج یہ دکھ جھیل رہی ہے کل اس کی اولاد جھیلے گی نہ جانے اس کی کتنی پشتوں کو سر جھکا کر جینا ہوگا۔ بتا دے اس کی جڑوں کا پتہ تاکہ یہ بھی سکھ سے پنپ سکے۔ بچا لے اس کی عزت اور اس کی آنے والی نسلوں کی عزت، تو نے اس کی جان بچائی اب اس کی عزت اسکا مان سمان بچا لے۔ اسے خوشی سے سر اٹھا کر جینے کا موقع دے دے۔

وشنو نے کہا...... چاچا تو بھلا آدمی ہے۔ اتنا بڑا راز سینے میں چھپا کر تو چین سے جی نہ سکے گا۔ اس بھار کو دل میں دبائے تو آرام سے مر بھی نہ سکے گا۔

دادا ہم غریب کب تک ان زور آوروں سے ڈرتے رہینگے۔ خاموشی سے ان کے ظلم سہتے رہینگے۔ ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہیں۔ اب انہیں جگانے کا وقت آ گیا ہے۔ تو اپنا فرض ادا کر...... میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دونگی...... ارے میرا کیا ہے...... مار ڈالے وہ ظالم۔ مجھے مار ڈالے۔ رام داس کے بغیر میرے لئے یہ دنیا اندھیری ہو گئی ہے۔ میں تو یوں بھی زندہ لاش ہوں۔

تب ہی گنگا لکشمی کے بیٹے کو گود میں لئے باہر آئی...... ارے پریوار میں ایک آدمی کے مر جانے سے باقی لوگ جینا تو نہیں چھوڑ دیتے۔ میری طرف دیکھ...... اکیلے وشنو کو پالا ہے...... جیسے میں جی لی تو بھی جی لے گی۔ بچے کو درگا کی گود میں ڈالتے ہوئے بولی...... اس کے لئے تو جینا ہی ہوگا تجھے۔ درگا نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اسے اپنے اندر کا دہکتا لاوا ٹھنڈا پڑتا

محسوس ہوا...... لکشمی کب ہوا تیرا بیاہ......

اماں اسی شام جس شام تو گھر نہیں لوٹی تھی...... باپو جان گیا تھا کہ تیرے بنا وہ جی نہ سکے گا۔ بس اپنا فرض ادا کر گیا۔ اب تو ہمارے ساتھ رہ۔ اور مرنے مرانے کی باتیں نہ کر۔ تیرا تو بھرا پورا سنسار ہے۔ یہ سب تیرا ہی تو ہے۔ اچھا چل کچھ کھالے۔

وشنو چل...... تجھے ساہوکار نے بلایا ہے۔ جیسے ہی درگا نے سنا فوراً کھڑی ہو گئی۔ لکشمی کا ہاتھ پکڑا اور وشنو اور شنکر کے پیچھے چل پڑی...... ساہوکار وہیل والی کرسی پر بیٹھا کسی پر برس رہا تھا۔ اسکی بیساکھی پاس پڑی تھی۔ من میں سوچنے لگی۔ تو جو سب کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لیتا تھا بھگوان نے تجھ سے تیرے پاؤں ہی چھین لئے۔ تجھے اب زمین سے کیا واسطہ مگر ابھی تک طنطنہ نہیں گیا تیرا۔ چاروں نے جھک کر سلام کیا......

آ...... وشنو...... آ...... سنا ہے پڑھ لکھ کر شہر میں ہی نوکری کر رہا ہے۔ ارے گاؤں کیوں چھوڑ گیا...... یہاں کیا روٹی کی کمی تھی...... ساہوکار کے سامنے کون بول سکتا تھا سو وشنو بھی کھڑا سنتا ہی رہا...... ایک کام تھا...... تو ہی کر سکتا ہے۔ وہ میری سالی کی حویلی خالی پڑی ہے۔ اچھا بڑا پریوار تھا...... لگاتار پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ پہلی دو جڑواں تھیں...... نمونیہ میں مر گئیں...... پانچویں بیٹی مری پیدا ہوئی تھی۔ پھر چھٹا بیٹا ہوا۔ مگر وہ بھی مرا ہوا...... سالی کو تو اولاد کا غم کھا گیا...... ادھر مرا ہوا بیٹا ہوا اس کے بعد دونوں لڑکیاں بھی مر گئیں۔ بس اسی کے بعد ہی سالی بھی چلی گئی اور پھر اس کا شوہر پاگل ہو گیا شاید دکھ برداشت نہ کر سکا......

سالی کی موت کے بعد ہی ہم نے سمجھایا تھا کہ دوسری شادی کرے لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔ ہم گاؤں سے کئی آدمی بھیج چکے ہیں مگر وہاں کوئی ٹکتا ہی نہیں۔ گاؤں والے بھوت پریت سے، بہت ڈرتے ہیں کہتے ہے حویلی میں بھوت ہے۔ راجکمار کا بھوت رات بھر سونے نہیں دیتا۔ ڈر کر بھاگ آتے ہیں جانتے ہیں راجکمار نے حویلی سے چھلانگ مار کر جان دی تھی۔ اگر شہر میں کوئی بہادر قابل اعتبار جوان مرد ملے تو اسے راجکمار کی حویلی میں چوکیدار لگا دے۔ درگا سوچنے لگی...... لو پہیہ گھوم رہا ہے...... زمیندار۔ ساہوکار۔ اب ہم جیسے غریبوں سے مدد مانگ رہا ہے۔ گاؤں والوں کی قسمتوں کا سورج چمکنے ہی والا ہے۔ وہ خوش ہو گئی۔

وشنو نے ایک دم ہی شنکر کی طرف دیکھا...... جیسے پوچھ رہا ہو...... تو کرے گا یہ نوکری چاچا...... ساہوکار نے پوچھا...... تو کرے گا...... سن کر ہچکچایا...... نہیں حضور...... میری تو سرکاری نوکری ہے۔ مجھے بڑھاپے میں پینشن ملے گی۔ میرے مرنے کے بعد میری گھر والی کو بھی ملے گی۔ بڑھاپے میں بھوکا تو نہیں مرنا پڑیگا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے ساہوکار کے لہجے میں غصہ اور تختی در آئی۔ بھنا کر سوال کیا...... تو ہے کہاں کا رہنے والا اور تیرا نام کیا ہے۔

تب ہی دادی اپنی لاٹھی ٹک ٹک کرتیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ شنکر...... دادی کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا چشمہ ناک پر بٹھاتے ہوئے شنکر کو بغور دیکھ کر کہا...... مجھے یاد آ رہا ہے...... یہ شنکر تو ہماری فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ تب یہ ہوگا چھوٹا اٹھارہ بیس سال کا......

ہاں ماں جی...... کرتا تو تھا...... شنکر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا...... پھر چھوڑ کر کیوں چلا گیا دادی نے سوال کیا۔ بس یوں ہی وہ دھیرے سے بولا...... دیکھ شنکر...... یوں ہی کوئی اپنا گھر اپنا گاؤں نہیں چھوڑتا۔ گاؤں والوں کی جان تو ان کی

مٹی میں ہوتی ہے۔ سچ بتا...... شنکر کی بولتی بند ہو گئی......

درگا بولی...... شنکر سچ بول...... کیا لکشمی راجکمار بابو کی وہ پانچویں بیٹی ہے جس کے لئے کہا گیا تھا کہ مری پیدا ہوئی ہے۔

شنکر نے آنکھیں جھپکائیں...... ادھر ادھر دیکھا۔ نہ ہاں بولا نا نہیں...... دادی بولیں...... مجھے شنکر نامی آدمی کی تلاش تھی۔ جب راجکمار کو پاگل پن کے دورے نہیں پڑتے تھے وہ عقل کی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن وہ کمرے میں بیٹھا زور زور سے بول رہا تھا کہ پانچویں بیٹی کو تو میں نے ہی مار ڈالا...... وہ تو زندہ رہتی...... اگر میں اسے نہ مرواتا...... شنکر...... کہاں ہے تو...... واپس لا دے میری بیٹی...... پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔ اکثر وہ یہی بولتا تھا۔ وہ بیٹی کے غم میں پاگل ہو گیا تھا۔

شنکر نے لکشمی کا ہاتھ تھاما اور اسے دادی اماں کے پاس لے گیا...... مالکن پہچانئے اپنے خون کو۔ یہی ہے وہ بدنصیب پانچویں لڑکی...... مجھے اسے مار ڈالنے کا حکم ملا تھا۔ میں اس معصوم کا خون کر کے بھگوان کو کیا منہ دکھاتا۔ اپنے دوست رام داس کو دے کر شہر بھاگ گیا تھا۔

لکشمی مڑی...... دوڑ کر درگا سے لپٹ گئی اماں یہ سب جھوٹ ہے میں تیری بیٹی ہوں۔ میری رگوں میں اس ذلیل اور نیچ آدمی کا خون بھلے گردش کر رہا ہو جو میرا باپ تھا۔ پالا پوسا تو تو نے۔ بھلے وہ زمیندار تھا۔ فیکٹری کا مالک تھا مگر میں اسے باپ ماننے کو تیار نہیں۔ میں اپنے باپو کی بیٹی ہوں اور میرا باپ مر چکا ہے...... مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں نا ہی یہ میری دادی ہے۔ دادی کی بوڑھی آنکھیں روتے روتے دھندھلا ضرور گئی تھیں مگر اکلوتے بیٹے کا چہرہ تو ان آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لاٹھی کی مدد سے درگا کے قریب جا کر رکیں جو لکشمی کو اپنی باہوں میں سمٹے ہوئے تھی۔ لکشمی کے چہرے کو غور سے دیکھا...... وہی رنگ...... وہی روپ...... پھر آنکھیں کب جھوٹ بولتی ہیں۔ وہی کچھ بولتی۔ کچھ کھوجتی ہوئی آنکھیں۔ انہیں اس لڑکی کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آیا۔ بوڑھے دل پر دھڑام سے ایک بھاری پتھر آن پڑا۔ لکشمی ان کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی...... وہی مسکراہٹ...... میری پوتی...... اس پیاری سی نرالی سی مسکراہٹ نے اس بھاری پتھر کو پرے ڈھکیل دیا۔ یقین کر بیٹی...... جو کچھ تیرے ساتھ ہوا میرا اس میں کوئی قصور نہیں بیٹی ہم عورتیں بہت مجبور ہوتی ہیں۔ مرد چاہے شوہر ہو یا بیٹا ہو۔ اپنی مرضی کرتے ہیں۔ ہماری کب سنتے ہیں۔ اس کے باپ نے تو اس کے لئے جنت تیار کر دی تھی۔ وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر جہنم پہنچ گیا۔ ساتھ میں تجھے اور مجھے بھی برباد کر گیا......

وہ جیسا بھی تھا تھا تو تیرا باپ...... حقیقت یہی ہے کہ تو راجکمار کی بیٹی ہے اور میری پوتی۔ میرا خون...... اب سنبھال اپنی یہ ساری دولت...... میں چلی متھرا اور بنارس۔

اماں مجھے کچھ نہیں چاہیئے مجھے جو چاہیئے تھا وہ مجھے مل گیا۔ میری پہچان...... اب میں سر اٹھا کر جی سکوں گی۔ درگا نے بیٹی کو باہوں میں سمیٹ کر کہا...... جسم کے قاتل کو پھانسی لگائی جاتی ہے۔ اس بچی کی روح کو قتل کرنے والوں کو کیا سزا دی جائے۔ ساہوکار سے بولی۔ حضور میں یہ مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کرتی ہوں۔ اس معصوم لڑکی کو انصاف ملنا چاہیئے۔

دادی کی آواز آئی...... روح کے قاتل کی سزا کسی بھی کتاب میں درج نہیں کیونکہ اس عظیم جرم کی سزا انسان نہیں خدا دیتا ہے۔ اس کا قہر روح کے قاتلوں کو بھسم کر ڈالتا ہے۔ پورا خاندان تہس نہس کر دیتا ہے۔ زمین سے اس کا نام ونشان مٹا

دیتا ہے۔ جیسے میرے ساتھ ہوا ہے...... سب کچھ ہے ایک وارث نہیں...... اب تو ہی سنبھال یہ سب...... تیرا بیٹا میرا وارث ہوگا......

لکشمی نے وشنو کو آگے کیا...... میرا مالک یہ ہے...... یہ جو چاہے گا وہی ہوگا...... دادی کا دل کرچی کرچی ہو گیا ...... ان کے ٹوٹے دل میں کوئی کراہ رہا تھا...... اماں اس سے کہو مجھے معاف کردے۔ نا جانے کیا سوچ کو بولیں۔...... تم سب کھڑے کیوں ہو...... بیٹھ جاؤ...... شنکر نے دیکھا...... یکا یک وہیل چیئر پر بیٹھے ساہوکار کے ماتھے پر نا گواری کی شکنیں ابھریں...... اس نے سوچا رسی تمام جل گئی مگر بل ابھی بھی باقی ہیں...... نظریں ایسی کاٹ کھانے والی جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا...... ہم وہی رہینگے جو ہیں ان کی نظروں میں بے مول بے وقت دو ٹکے کے۔

گھر چل...... وشنو کا چٹان جیسا پر عزم لہجہ تھا...... گھر میں ماں پریشان ہو رہی ہوگی...... لکشمی نے درگا کا ہاتھ تھاما...... اماں گھر چل...... پیار سے بھرا لہجہ تھا بیٹی کا...... وشنو نے شنکر کی طرف دیکھا...... چاچا گھر چلو...... سب آگے بڑھے...... وشنو نے مڑ کر دیکھا...... ساہوکار نے ایک طویل سانس خارج کی۔ جیسے بلا ٹلی...... اچھا ہی ہوا چلے گئے ...... جبکہ دادی کی روح تک کانپ گئی تھی۔

☆☆☆

شرن

دن کی کڑی دھوپ میں چھوٹا گوپال اپنے گھر کے سامنے والے گھنے نیم کی چھاؤں تلے بیٹھا پگڈنڈی پر آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا رہتا...... پیاس تو پاس والی ندی کے بہتے پانی سے بجھا لیتا لیکن جب بھوک کی آگ ستاتی تو سسک سسک کر رو پڑتا اور روتے روتے سو پڑتا......

ایسا نہ تھا کہ اس کے باپ کے گھر میں کھانے کی قلت تھی......سب کچھ افراط سے تھا......بس صرف کمی تھی تو ماں کی ممتا کی۔ اس بچے پر گاؤں والوں کو رحم تو آتا تھا......اسے دیکھ ہائے ہائے بھی کرتے لیکن اس کی سوتیلی ماں کی آتش مزاجی کا خیال آتے ہی آگے بڑھ جاتے۔ کبھی بھی کسی نے اس معصوم بچے کے ساتھ پیار اور ہمدردی کا مظاہرہ نہ کیا۔

بیاہ کے بعد دو سال تک تو رام داس آس لگائے بیٹھے رہے......لیکن سحر کا ہر جھونکا ان کی دہلیز سے رخ موڑ کر نکل جاتا۔ جب سارے ٹونے ٹوٹکے بے سود ہو گئے تو دونوں رام داس اور روپا مندر مندر سر ٹیکتے پھرے......

یوں تو رام داس اپنی روپ وتی پر دل و جان سے نثار تھے مگر بھائیں بھائیں کرتا سونا آنگن ان کے دل کو بیحد گراں گذرتا......اس سے پہلے کے رام داس کوئی دوسرا فیصلہ کرتے ان کی اماں کی بوڑھی آنکھیں وارث کی راہ تکتے تکتے اکتا گئیں......پھر تو روزانہ دوسری شادی کا تقاضہ لے کر ہنگامے ہونے لگے......پارو جو کل تک اماں کی چہیتی بہو تھی آج بانجھ ہونے کی وجہ سے آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔

روپا کو ایذا پہنچانے کے لئے ہر وقت منھ سے چنگاریاں اڑاتی رہتیں......بہو کو پل پل جلتے دیکھ ساس کے دل کو عجیب سا سکون ملتا۔ انہوں نے دل میں قصد تو کر ہی لیا تھا کہ اسے اتنا ستاؤنگی کہ ایک دن اپنی زندگی سے اکتا کر یہ منحوس لڑکی یا تو اپنے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر ماچس لگا لے گی یا گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر جھول جائے گی۔ اگر نہیں تو مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔

خیالوں میں بہو کو جھولتا دیکھ بوڑھی آنکھیں نئے نئے سپنے دیکھنے لگتیں۔ نئی بہو آنے کے سپنے۔ ان کے لہلہاتے کھیتوں کا وارث ان کے پشتینی مکان کا مالک......اور یہی سہانے سپنے دیکھتے دیکھتے کئی سال اور بیت گئے۔

رام داس کے دوست بھی یہی مشورہ دیتے......جب ملتے ایک ہی سوال......یار ذرا سوچو تمہاری چتا میں آگ کون لگائے گا......اب نہیں تو کیا بڑھاپے میں دوسرا بیاہ کرو گے......بیٹا چتا میں آگ لگائے گا تب ہی سورگ کے درشن ملیں گے ورنہ نرک میں پڑے پڑے ہمیں یاد کرنا......

نرک کی سن کر رام داس کا دل بہک بہک جاتا......مگر بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا......روپا پر ایشور کی کرپا ہو گئی......اماں کے سپنے ادھورے رہ گئے۔ پوتا تو نصیب میں تھا نہیں۔ ہاں ایک ننھی سی گڑیا نے اس دنیا میں پرورش کر کے روپا اور رام داس کے اس نازک رشتے کی لاج رکھ لی جو کئی بار ٹوٹتے ٹوٹتے بچا تھا۔

بھگوان کی دی قیمتی سوغات جو ملی تو رام داس کے دل میں ایک لہر امید کی پھیل گئی......جب داتا نے اتنی کرپا کی

ہے تو آگے اولاد نرینہ سے بھی نوازے گا......یہی امید لئے بیٹی کی آمد پر بڑا جشن منایا......گاؤں کے سب لوگ آئے......خوب دل بھر کر خوشیاں منائیں۔پیٹ بھر کر کھایا اور پھر خوب مذاق بھی اڑایا......

واہ یار......بیٹی ہی تو ہوئی ہے......بھلا بیٹی کا بھی کوئی شمار ہوتا ہے......بیٹی کی پیدائش پر یہ عالم ہے اگر بیٹا ہوتا تو نہ جانے تو کیا کر ڈالتا......یوں لگ رہا ہے جیسے آج ہی بیٹی کا بیاہ رچا رہا ہے۔

گانے بجانے کی آواز سن کر چھوٹا گوپال بھی ڈرتے ڈرتے اندر چلا گیا......کاشی رام نے بیٹے کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں لڈو تھماتے ہوئے کہا......جا دیکھ......وہ چھوٹی سی گڑیا......گوپال نے گپا گپ لڈو ختم کیا اور دوڑا......پالنے کی طرف......سامنے اپنی ماں کو دیکھ ایسا خوفزدہ ہوا......قدم جہاں تھے وہیں رک گئے......بے بس بچے نے ادھر ادھر تا کا......روپا کو اس معصوم پر دیا آ گئی......آرے......آ......رک کیوں گیا......آ کر اپنی چھوٹی سی گڑیا کو دیکھ تو سہی۔

گوپال کو نہ ہی کوئی کھلونا نصیب ہوا تھا اور نا ہی کبھی کسی نے اس سے پیار کے دو بول بولے تھے۔چاچی کو مسکراتے دیکھ ہمت بڑھی تو ہولے ہولے آگے بڑھا......پالنے میں بچی کو ہاتھ پیر مارتے دیکھ کر مسکرا کر چاچی سے سوال کیا......چاچی یہ میری گڑیا ہے......؟

چاچی نادان بچے کے اس سوال پر ٹھٹک کر رہ گئیں......بڑے شش و پنج میں پڑ گئیں......ہاں کہوں یا ناں......ابھی وہ ہی تو بولی تھی کہ آ کر اپنی چھوٹی گڑیا کو دیکھ تو سہی......اب اگر ناں کہا تو اس دکھیارے بچے کا دل ٹوٹ جائے گا......آخر منہ سے نکل ہی گیا......ہاں تیری ہی گڑیا ہے......تو روز آنا......اس کے ساتھ کھیلنا میں روز تجھے لڈو دونگی......وہ بولا......چاچی مجھے لڈو نہیں چاہیئے میں تو بس اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلنے آؤنگا گوپال مسکراتا رہا......خوش ہو کر بیٹھا پالنا ہلاتا رہا اور گڑیا سو گئی......

جب کاشی نے بیٹے کو گھر جانے کے لئے کہا تو گوپال بولا......باپو یہ تو سو گئی......اسے گھر لے چلیں......پھر کچھ سوچ کر بولا......اسے یہیں رہنے دو......اماں اسے بھی ماریں گی جیسے مجھے مارتی ہیں۔کاشی سر جھکا کر رہ گیا......

کھلونوں سے پیار کرنا تو ہر بچے کی فطرت ہے۔دوسرے دن گوپال خوشی سے اچھلتا کودتا باپو کے پاس جا کر بولا......باپو میں جاؤں اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلنے......اپنی گڑیا......سن کر باپ کا ماتھا ٹھنکا......بولا......تیری گڑیا......وہ چہکتی آواز میں بولا......چاچی ہی تو کل کہہ رہی تھی کہ وہ میری گڑیا ہے باپ نے سمجھایا......وہ بہت چھوٹی سی ہے۔اس سے جھگڑنا نہیں۔گوپال ہنس کر بولا......وہ تو لڑکی ہے باپو......میں لڑکا ہوں......لڑکے لڑکیوں کے ساتھ نہیں جھگڑتے......

رادھا پالنے سے اتری......گوپال نے اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا......جب دوڑنے لگی تو بڑی احتیاط کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لیجاتا......اسے جھولا جھلاتا......یوں ہی کھیلتے کھیلتے گوپال کی گڑیا پاٹھ شالا جانے کے لائق ہو گئی۔

گوپال نے رادھا کو پاٹھ شالا لے جانے کی بہت ضد کی پر رام داس راضی نہیں ہوئے۔چونکہ گاؤں میں لڑکیوں کو پڑھانا برا مانتے تھے پارو نے رادھا کو پڑھانے کی ذمہ داری گوپال کو سونپ دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کی خبر کسی کو کانو کان نہ لگنے پائے ورنہ......ٹھیک نہیں ہوگا......

پارو دونوں بچوں کو روز پھل مٹھائی دیتی......اگر کسی دن گوپال کھانے سے انکار کر دیتا تو رادھا بھی نہ کھاتی......روٹھ کر دور جا بیٹھتی......جاؤ میں تم سے نہیں بولتی......ہماری تمہاری کٹی......ماں باپ کی لاڈلی تھی بھی بڑی ضدی

......ماں کی تو سنتی ہی نہ تھی...... پھر گوپال ہی اس کے سامنے دست بستہ ہاتھ جوڑتا۔ منت سماجت کرتا۔ اسے مناتا۔ وہ مان تو جاتی لیکن پہلے گوپال کو کھلاتی پھر خود کھاتی...... بچوں کی معصومانہ حرکتیں روپا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتیں...... اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہ معصوم محبت کھل کر رنگ لائے گی...... اور اس کا گھر مہک اٹھے گا۔ لیکن قسمت کی دیوی کہیں دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔

جب رادھا کو معلوم پڑا کہ گوپال پڑھائی کے سلسلے میں گاؤں چھوڑ رہا ہے تو اس نے اودھم مچا دیا...... بس ضد باندھ لی میں بھی ساتھ جاؤنگی...... گوپال نے سمجھایا گاؤں کی لڑکیاں شہر نہیں جاتیں...... تم چاچی کے ساتھ رہو میں جلدی لوٹ آؤنگا...... وہ رودی...... اماں تو دن بھر کام کرتی رہتی ہیں...... تم چلے گئے تو میرے ساتھ کون کھیلے گا۔ جب گوپال نے بھی مخالفت کی تو وہ بہت اداس ہوگئی۔ اس نے بھوک ہڑتال کر دی اور اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ ساتھی بچھڑے، بہت سارے دن بیت گئے تھے۔ وہ اکیلی جھولے پر بیٹھی اپنے ساتھی کے آنے کا انتظار کرتی اس کی یاد میں آنسو بہاتی...... اس کی ناتواں جاں پر یہ دن کتنے گراں بار تھے کوئی نہ سمجھا...... یہاں تک کہ ماں بھی نہیں...... اس پر غضب یہ ہوا کہ باپ نے کہہ دیا ...... لڑکی اب سیانی ہوگئی ہے گھر سے باہر قدم نہ نکالے یعنی یہ کہ رادھا تنہا گھر میں قید کر دی گئی۔

گوپال جب جب گاؤں آتا رادھا کے چہرے پر کرنوں کی تیج بکھر جاتی۔ اسے جاتا دیکھ وہ بکھر پڑتی...... اور روکر اپنی جان ہلکان کر لیتی...... وہی ضد...... میں بھی تمہارے ساتھ چلونگی...... گوپال اگلی دفعہ لے جانے کا وعدہ کرتا اسے بہلا پھسلا کر چل دیتا...... لیکن خود بے چین ہو جاتا...... اور یہی بیقراری اسے بار بار رادھا کے در پر کھینچ لاتی......

مشکل یہ تھی کہ سوتیلی ماں اسے ایک نظر نہیں دیکھ پاتی تھی...... گھر میں ٹھہرنے ہی نہیں دیتی...... اگر کاشی اپنے بیٹے کی طرفداری کرتا تو کملا خودکشی کرنے کی دھمکی دیتی...... بیچارا مجبور کاشی چپ ہو جاتا...... گوپال زیادہ وقت رادھا کے گھر میں گذارتا اور شام ڈھلے شہر چلا جاتا......

رادھا کا قد ذرا اور بڑھا...... رنگ روپ نکھرا تو رام داس نے اس کے لئے لڑکا کھوجنا شروع کیا...... روپا کو پتا چلا تو وہ کہنے لگی...... یہ لو...... بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا...... گوپال سے اچھا لڑکا کہاں ملے گا...... پڑھا لکھا۔ محنتی۔ نیک اور وفاشعار۔ ہرگن اس میں ہے۔ جتنی بھی تعریف کرو کم ہے۔

رام داس کچھ سوچ کر بولے...... کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو...... پورے گاؤں میں اس جیسا سجیلا جوان دوسرا نہیں۔ لڑکا بہت اچھا ہے اور مجھے بہت عزیز ہے...... مگر اس کی وہ...... سوتیلی اماں...... سنا ہے آگ کا گولا ہے...... گولا...... بیحد بد مزاج اور شاطر...... اس نے گوپال کو بے انتہا ستایا اور باپ کچھ نہ کر سکا...... گھر کو تو کارزار بنا ہی ڈالا ہے لیکن وہ تو باہر والوں سے بھی بے حد لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ ایسی عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ بہو کو تو پورے پریوار کے ساتھ نباہ کرنا ہوتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کسطرح دیدہ ودانستہ اپنی پھول سی بچی کو اس آگ میں جھونک دوں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ گوپال کو داماد بنانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس میں ہی ہماری بیٹی کی بہتری ہے۔

شوہر کی زبانی سچائی سن کر روپا خاموش ہوگئی۔ مگر دل ٹوٹ گیا۔ وہ تو گوپال کو دل ونظر میں بٹھا چکی تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ بچپن کے ان دو ساتھیوں میں بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ انہیں جدا کرنا آسان نہ ہوگا۔

رادھا کے کانوں میں جب اس کے بیاہ کی بات پہنچی تو یکا یک شعور کے در کھل پڑے۔ اچانک ہی دل میں ایک

کسک سی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھ نہ پائی کیوں اس کے دل کا عجب حال ہو رہا تھا۔ یاد تو وہ گوپال کو پل پل کرتی تھی لیکن آج یہ کیسی انوکھی یاد تھی۔ دھک دھک کرتا دل کہہ رہا تھا۔ تم ہی میری زندگی۔ تم ہی میری منزل......اب تو آ جاؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ......

پھر پتہ چلا اس کے لئے لڑکے کی تلاش ہو رہی ہے تو سرتاپا بوکھلا گئی۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر سی رہنے لگی......گوپال نے ذرا دور سے رادھا کو جھولے پر بیٹھا دیکھا......رادھا کے چہرے پر خوشیوں کے بجائے ایک درد پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگا جیسے رادھا کے کپکپاتے ہونٹ اس کا ہی نام گنگنا رہے ہوں۔ پاس آیا تو آنکھیں جل تھل تھیں اور پلکوں پر آنسو دیکھ وہ پریشان ہو گیا...... بڑے حسرتناک لہجے میں گوپال نے سوال کیا......اب کونسی آفت آن پڑی جو تم اداس ہو......اور یہ بن بادل برسات کیوں......

رادھا سسک پڑی......اپنے دونوں بازوؤں کا ہار گوپال کے گلے میں ڈال کر بولی......تم کیا جانو میں تو کالے بادلوں میں گھری ہوں۔ آنے کا وعدہ کر گئے اور آج کتنے ہفتے گذر گئے۔ اور یہاں......وہ بے تحاشا آنسو بہانے لگی......اور یہاں کیا ہوا......جو تم اتنی پریشان ہو رہی ہو۔ گوپال نے سوال کیا۔

روٹھے انداز میں جواب دیا گیا......یہاں مجھے مارنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں......تم تو آتے ہو اور دو دن بعد چلے جاتے ہو۔ تم کیا جانو مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تمہارے بنا میں کیسے جیوں......تمہارے یہاں نہ رہنے سے میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ اگر تمہیں میری پرواہ نہیں تو میں تم سے بہت دور چلی جاؤنگی۔ اتنی دور کہ تم ڈھونڈو گے بھی تو مجھے پا نہ سکو گے۔ پکارو گے پر میں لوٹ کر نہ آؤنگی......

اس کی عجیب وغریب باتیں سن کر وہ مسکرا کر بولا......تم ذرا وقت سے پہلے بڑی نہیں ہو گئی۔ اتی سی تو ہو اور باتیں اتنی بڑی بڑی کرتی ہو......میں ادھر دل وجان سے محنت کر رہا ہوں۔ سب تمہارے لئے ہی تو کر رہا ہوں......اور تم دور جانے کی باتیں کر رہی ہو......میری کامیابی کی دعائیں مانگنے کے بجائے مجھ پر خفا ہو رہی ہو......

رادھا بولی......اپنی مرضی سے نہیں جا رہی ہوں......زبردستی بھیجی جا رہی ہوں۔ یہ سنتے ہی گوپال ایک دم سنجیدہ ہو گیا......بڑے گمبھیر لہجے میں سوال کیا......کیا مطلب تمہارا......وہ پھر رو پڑی۔ رک رک کر بولی......باپو......میرا......بیاہ کہیں......اور کر......رہے ہیں......رادھا کی بات سن کر گوپال کو بڑا زبردست جھٹکا لگا تھا......کہیں اور......ان دو لفظوں نے تیر کی مانند دل چھید ڈالا تھا۔ دونوں غموں میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ سوچوں کی یلغار نے دونوں کو بالکل پاگل بنا دیا تھا......رادھا متواتر روئے جا رہی تھی اور ایک ہی بات بار بار کہے جا رہی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ لے جاؤنگا......ضرور لے جاؤنگا......ڈولی میں بٹھا کر......بھگا کر نہیں......پہلے بیاہ تو ہونے دو......وہ نظریں جھکا کر بولیں ہمارا بیاہ تو ہو چکا......چہرے پر لالی پھیل گئی۔

گوپال کی آنکھوں میں اس سہانی شام کا منظر اتر آیا......جب رادھا کی گڑیا کی شادی ہو رہی تھی......گھر میں شادی کا ماحول تھا۔ رادھا کی سہیلیاں ڈھولکی کی تان پر ناچ گا رہی تھیں۔ رادھا سب سے نظریں بچا کر اس کے پاس دوڑی آئی تھی اور اسکے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر ہنستی کھلکھلاتی واپس دوڑ گئی تھی۔ سب کچھ اتنی اچانک ہوا تھا......گوپال کچھ بول ہی نہ پایا تھا بس حیرانی سے اسے تکتا رہ گیا تھا......لیکن وہ تو کھیل تھا......گڈے گڑیا کی شادی تھی۔ یہ پگلی لڑکی اس کو ہی

سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے......

رادھا نے سوال کیا......اب کیا سوچنے لگے......گاؤں میں کبھی کسی لڑکی کا دوسرا بیاہ نہیں ہوتا......اگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میں ندی میں کود کر اپنی جان دے دونگی مگر کسی اور کے ساتھ بیاہ ہرگز نہیں کرونگی۔

"جان دے دونگی" گوپال کا دل اس زور سے دھڑکا کہ قیامت ہی کردی......معاملہ اتنا گمبھیر ہو جائے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا......وہ تو بس ایک بات جانتا تھا کہ رادھا اس کی ہے......وقت آنے پر بیاہ بھی ہو جائے گا......وہ سوچنے لگا اصل میں قصور میرا ہے میں نے اس واقع کو کھیل سمجھ کر کبھی اہمیت ہی نہیں دی......جب کہ اس نادان لڑکی نے اسے دل سے لگائے رکھا......اسی لئے ہر بار ساتھ جانے کی ضد کرتی ہے۔

گوپال نے رادھا کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ آج تک میری اجازت کے بغیر تم نے کبھی کچھ کام نہیں کیا۔ بنا مجھ سے پوچھے مرنے کی ٹھان لی......ارے پگلی ایک تمہاری ہی جان کا سہارا ہے میرے جینے کے لئے۔ اس جان کو سنبھال کر رکھنا......تم ہو تو میں ہوں......تم نہیں تو کچھ نہیں......میری ایک بات کا بھروسہ کرلو۔ ہم دونوں ساتھ جئیں گے اور ساتھ مرینگے......دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کرسکتی......اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا اب یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوٹے گا......ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوٹے گا......اس پل دونوں کو لگا جیسے چاند تاروں نے انہیں گھیر لیا ہو۔ اور آسمان سے پھولوں کی ورشا ہو رہی ہو......رادھا کے چہرے پر خوشی اور خوشحالی پھیلی دیکھ گوپال کے دل کو ٹھنڈک پہنچی۔ دلی سکون ملا۔ تو وہ آگے بڑھا......چاچی سے ملنے......

چاچی کا چہرہ بالکل بدلا بدلا تھا......سر تا پا بے چین نظر آئیں......نہ بولیں نہ مسکرائیں......گوپال نے چاچی کے پاؤں پکڑ کر فریاد کی۔ چاچی میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ مجھے کیسے بھول گئیں......کیا خطا ہوئی مجھ سے جو میں آپ کے دل سے اتر گیا......اتنے سالوں کے بعد مجھ میں کیا کمی نظر آگئی۔ کیا بھول ہوئی مجھ سے جو آپ کی نظروں میں میری قدر و منزلت کم ہوگئی۔ چاچی وہ دن یاد کریئے جب آپ نے کہا تھا "یہ تیری گڑیا ہے" اس دن سے آج تک میں آپ کی بیٹی کو گڑیا ہی سمجھتا آیا ہوں......بچپن سے لے کر......آج تک۔

چاچی درمیان میں بول اٹھی......بچپن بیت چکا ہے۔ بچپن کے ساتھ گڈے گڑیا کی کہانی کا بھی انت ہو گیا ہے۔ کل کی گڑیا اب سیانی ہوگئی ہے۔ اور سیانی لڑکی کو گھر میں کب تک رکھا جاسکتا ہے۔ اس کا بیاہ تو کرنا ہی ہوگا۔ جو کچھ وہ کرتی تھی اور کہتی تھی سب بچپنا تھا۔ بھول جا ان باتوں کو......

ماحول پر اداسی چھا گئی......گوپال بدحواس سا چاچی کا منہ تکتا رہ گیا۔ ذرا ہوش سنبھلے تو بولا......نہیں چاچی اس کہانی کا انت نہیں ہوا بلکہ کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔ بھگوان نے ماں کی ممتا سے محروم کردیا۔ سوتیلی ماں کی ضد اور خوف نے باپ کے دلار سے۔ مجھ ابھاگے کو صرف سوتیلی ماں کی بددعائیں ہی ملیں۔ چاچی پیار کھلونا تو نہیں جیسے بازار سے قیمت ادا کر کے خریدا جا سکے۔ یہ تو ہو جاتا ہے۔ جیسے مجھے ہو گیا آپ سب سے۔ میں نہیں جانتا تھا پیار کیا شے ہے۔ آپ نے مجھے پیار دیا۔ آپ کا پیار ملا تو محبت کرنا میری عادت بن گئی۔ یہ گر تو آپ نے ہی مجھے سکھایا ہے۔ اسی پیار کا واسطہ دے کر آپ کے سامنے جھولی پھیلا رہا ہوں۔ وہ آگے بول نہ سکا۔ آواز بھاری ہوگئی۔ بہتے آنسو دل بیقرار کا افسانہ سنا رہے تھے۔

چاچی آپ چاچا سے بات کریں۔ رادھا میرے جینے کا سہارا ہے۔ اس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اور مجھے یقین ہے میری تباہی آپ کو بھی دکھی کر دے گی۔

چاچی بولیں...... میرے دکھوں کی بات نہ کرو۔ تو ہزار ہیں۔ یہ دکھ بھی سہہ لونگی۔ ارے تو مرد بچہ ہے۔ تیرے جیسے لڑکے کے لئے لڑکیوں کی کیا کمی...... ہاں بیتے دن بھولنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ مجھے تیری فکر زیادہ ہے رادھا کی کم ہے۔

لڑکیاں کسی شمار میں نہیں۔ لڑکی اور مویشی میں کیا فرق...... جس کھونٹے سے باندھ دو وہیں کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ رادھا کو تو میں کسی طرح سنبھال ہی لونگی۔ باپ کے سامنے چوں بھی نہ کرے گی۔ تجھے کون سمجھائے گا۔ کون سنبھالے گا۔ کوئی بھی تو نہیں جو تیرے دکھ درد سمجھے۔

نہیں چاچی لڑکیوں کے دلوں میں بھی پیار بھرا ہے۔ وہ مویشی نہیں خدا کی بنائی بیحد خوبصورت مخلوق ہے۔ اس نے لڑکی کو کتنا سندر روپ دیا ہے اور انسان نے اسے مویشی بنا دیا۔

چاچی بولیں...... چل چھوڑ اس قصے کو...... یہ صدیوں پرانے رواج ہیں انہیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ وہ بولا...... میں بدلونگا...... چاچی رادھا جیسی ضدی لڑکی کو سمجھانا بھی آسان نہ ہوگا...... وہ ہرگز نہ مانے گی...... مر جائے گی مگر کسی دوسرے مرد کے ساتھ بیاہ نہیں کرے گی...... میں نے تو اسے پہلے ہی دن سے اپنا مان لیا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ بھی میرے اتنا ہی قریب آ گئی جتنا میں اس کے...... ہم دونوں کو یوں لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی جان ہیں...... اور جان ہی تو انسان کو سب سے پیاری ہوتی ہے۔ جان بچانے کے لئے انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ رادھا کو سمجھانے بجھانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا

چاچی بری طرح گھبرا گئیں۔ بولیں۔ تو مجھے بیٹا جیسا پیارا ہے۔ تو جانتا ہے گاؤں کے قائدے قانون۔ رسم و رواجوں کے رکھوالے ظلم سے مبلس ہیں۔ انکے خلاف جانے کی ہمت بھی نہ کرنا۔ بڑے ہی سخت دل لوگ ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر زندگیوں کا سودا کر ڈالتے ہیں۔ ان کے شکنجے میں جو بھی پھنسا برباد ہو گیا۔ لیکن اپنی خواہشوں کے لئے یہ لوگ سارے رسموں رواجوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ہم غریب کسان کسی گنتی میں نہیں۔ اس لئے کہہ رہی ہوں قانون کے دائرے میں رہنا۔ ان ظالموں کی نظروں سے بچ کر رہو...... وہ بڑے بوجھل انداز میں بڑی دھیمی آواز میں بول رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو کے دھارے بہہ رہے تھے۔

چاچی کے ہمدردانہ انداز نے ایک بار پھر دل کے ارمان پورے ہونے کی آس دلائی...... بڑے ہی مغموم لہجے میں بولا...... باپ کا اکلوتا ہوتے ہوئے بھی بچپن سے آج تک ان کے پیار کے لئے ترستا رہا...... جو کچھ ملا آپکے ہی در سے ملا...... سونا چاندی تو میں آپ کی بیٹی کو دے نہ پاؤنگا۔ ہاں میرا پیار اسے یوں گھیرے رہے گا کہ دکھ اور مصیبت کا سایہ اسے چھو بھی نہ پائے گا۔ چاچی رادھا میری ہے۔ اسے پرائی نہ کریں...... وہ جیسا آیا تھا بھوکا پیاسا انہیں قدموں سے واپس چلا گیا۔ یہ جان کر کے گوپال کے ارادے انتہائی مضبوط ہیں۔

چاچی کو یوں لگا جیسے تیز طوفانی ہوائیں ان کے در و دیوار ہلا گئی ہوں۔ مصیبتوں کا سیلاب ان کی چوکھٹ تک پہنچ گیا ہو......

گوپال باہر آیا جہاں رادھا بڑی بیقراری سے اس کی منتظر تھی۔ گوپال نے نظر بھر کر رادھا کو دیکھا اور دونوں کے چہروں پر خوشی چھا گئی۔ کچھ دیر دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہے۔

گوپال بولا...... بہت دیر ہوگئی ہے۔اماں گھر میں گھسنے نہیں دینگی...... اب چلتا ہوں۔کل آؤنگا۔جیوں ہی وہ آگے بڑھا...... رک جاؤ...... رادھا کی آواز سن کر وہ مڑا...... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے...... تم میری منزل ہو...... میرے جینے کا سہارا ہو۔

وہ تو ٹھیک ہے لے کہاں جاؤں۔تھوڑا انتظار اور کرلو۔ابھی میری کوئی حیثیت نہیں جو جاکر تمہارے باپو سے تمہارا ہاتھ مانگ سکوں...... میں پوری لگن سے کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

رادھا بولی...... وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا...... اور اب میں وقت کا انتظار نہیں کرسکتی۔تم جب کامیاب ہوکر لوٹو گے تو میری ارتھی اٹھ چکی ہوگی۔بچپن سے لے کر آج تک تمہاری ہی تو سنتی آئی ہوں لیکن اب اور نہیں۔جیونگی تمہارے ساتھ اور مرونگی بھی تمہارے ساتھ یہ میرا فیصلہ ہے اور آخری ہے۔

وہ بولا...... اسطرح گھر چھوڑنا ٹھیک نہ ہوگا...... ہمارا سماج ہمیں یہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔سماج میں رہنا ہے تو سماج کے رسم ورواجوں کو ماننا بھی ہوگا۔سب لوگ ہم سے نفرت کرینگے۔کوئی ہم سے ملنا اور بات کرنا بھی پسند نہیں کریگا۔تم جانتی ہو میرا اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی میں بے گھر ہوں۔کہاں لے کر جاؤں تمہیں۔وہ بولی...... جہاں تم رہتے ہو میں بھی وہیں رہونگی۔وہی کٹیا ہم دونوں کا گھر ہوگا۔تم نہیں جانتیں ہم کتنی خطرناک دنیا میں زندہ ہیں۔اس جگہ لڑکی اکیلی نہیں رہ سکتی۔وہاں درندے بستے ہیں۔وہ دکھ اور غصے سے بے حال ہوکر بولی...... اگر یہ بڑی دنیا ہم دونوں کے لئے اتنی چھوٹی پڑگئی ہے کہ ہمیں کہیں سر چھپانے کی جگہ ہی نہ ملے گی تو میں تمہیں آزاد کرتی ہوں۔تم مجھے بھول جانا...... میرے لئے دوسرے گھر جانے سے مرنا بہتر ہے......

گوپال بھونچکا رہ گیا...... اسے رادھا کی جرتوں نے پریشان کردیا...... وہ بولا...... میں اتنا کمزور بھی نہیں کہ تمہیں اکیلا مرنے کے لئے چھوڑ دوں...... کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔

رادھا بولی...... ہے...... مجھے تمہارے اوپر پورا بھروسہ ہے...... اپنے باپو پر نہیں...... وہ فوراً چلنے کو تیار ہوگئی...... گوپال کو یقین ہوگیا یہ ضدی لڑکی کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گی...... حالانکہ وہ انجام سے واقف تھا...... اسے پھر کوئی کچھ اور چارہ بھی تو نظر نہ آیا...... گوپال نے رادھا کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما...... آؤ چلو...... اب پیچھے مڑکر نہیں دیکھنا...... گوپال نے دہکتے انگارے کو چھاتی سے لگا کر کالی اندھیری رات میں اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کیا......

دوناداں پریشانی اور بے چینی کے عالم میں آگے بڑھتے گئے۔لشتم پشتم چھپتے چھپاتے کھیتوں کو پار کرتے اپنے گاؤں سے بہت دور نکل گئے...... جب چلتے چلتے تھک کر چور ہوگئے تو گھنے بیابان میں ایک جھونپڑی دیکھ ٹھہر گئے۔

''اندر آجاؤ'' گرجدار انتہائی خوفناک آواز تھی...... سامنے ایک لحیم شحیم مرد کو دیکھ رادھا تو جیسے سن ہی پڑگئی۔وہ شخص بولا...... گھر سے بھاگے...... دو پریمی ہو...... نا

رادھا بولی بھیا...... پانی...... پانی...... دم نکلا جائے ہے...... اس شخص نے فوراً دونوں کو پانی دیا پھر بولا...... بیٹھ جا...... ڈر نہ...... یہ تیرے بھائی کی جھونپڑی ہے...... بھوکی بھی ہوگی...... لے یہ گڑ اور روٹی کھالے...... اس شخص نے کئی سوال کئے...... کھاتے سے گوپال نے اپنی رام کہانی سنائی۔اور پھر سوال کیا...... تم کون ہو...... میں کون ہوں...... ارے گاؤں کا بچہ بچہ مجھے جانے ہے...... منگل سنگھ کا نام سنا ہے...... اس شخص نے سوال کیا...... نام سنتے ہی دونوں کانپ گئے۔رادھا بولی

......وہی منگل سنگھ جس کا نام سن کر پولس والے بھی تھرا جاتے ہیں......ہاں......ہاں......میں ہی ہوں وہ منگل سنگھ......

منگل سنگھ بولا......تم دونوں کی سانسیں ابھی تک تیز تیز چل رہی ہیں۔ رادھا لرزتی آواز میں بولی گاؤں والے ہمارا پیچھا کرتے کرتے یہاں آتے ہی ہونگے......پھر کیا ہوگا......شاید ہم دونوں کو ختم کر دیں......

جرم تو تم دونوں نے بہت بڑا کیا ہے۔ گاؤں میں اس جرم کی کڑی سزا ملتی ہے۔ بوٹی بوٹی کاٹ ڈالتے ہیں......اب تو نے مجھے بھائی کہا ہے تو کوئی تجھے چھو بھی نہیں سکے گا......گردن مروڑ دونگا جو بھی ادھر آیا......جا کر سو پڑ......ڈرنہ......میں جاگ رہا ہوں۔ کل شہر لے جاؤنگا......بہن کا بیاہ کرانا بھی میری ذمے داری ہے۔

گوپال نے سوال کیا......تمہارا ٹھکانا کیا یہی ہے......ارے نہیں بھیا ہمارے کئی ٹھکانے ہیں۔ ارے ڈاکو ایک جگہ دو دن نہیں رہ سکے ہے۔ پولس ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑی ہے۔ گاؤں والے ہماری حفاظت کرے ہیں......گوپال نے بڑے تعجب خیز لہجے میں کہا......گاؤں والے......

منگل سنگھ بولا......ہم مر گئے تو گاؤں کے غریب کسان بغیر دانا پانی کے مر جائینگے......رادھا کی طرف دیکھ کر بولا ۔تیری جیسی ایک بیٹی تھی پھول کی طرح......گھر والی تھی ۔دیکھنے میں رانی سی لگے تھی......دو سال پانی کی ایک بوند نہ برسی ۔زمین تڑپ گئی۔ پر ہم غریبا کا برا حال دیکھ کر بڑے لوگن کے دل نہ تڑکے۔ نہ سرکار نے کچھ مدد کی اور نا ہی زمیندار نے......کسی کو ہم پر دیا نہ آئی......درختوں کی جڑیں کھائیں آم کی گٹھلیاں چبا ڈالیں......آخر میں بہت سے لوگ بھوک کی آگ میں بھسم ہو گئے ۔میری بیٹی اور گھر والی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ مجھے اکیلے دکھ ڈھونے کے لئے......پہلے سوچا اب اکیلے کیا جینا۔ کس کے لئے محنت و مشقت کرنا......

جیوں ہی پھندا گلے میں ڈالا......بھوک سے تڑپتے بچوں کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ سوچا ان کی خاطر جی لوں......روٹی تو اسی وقت چاہیئے تھی نا......کہاں سے لاتا......ڈاکے نہ ڈالتا تو اور کیا کرتا......ارے کوئی اپنے لوگن کو مرت دیکھ سکے ہے......بس نکل پڑا گھر دوار چھوڑ کر۔

اب تو ہری شرن میں آئی ہے تو چنتا کرنا چھوڑ دے۔ بھگوان ہی پار لگا ئینگے......ارے مانش مانش کو کیا دے سکے ہے......اس ہاتھ دے ہے تو اس ہاتھ لے ہے۔ بھگوان ہی کرے ہے سب۔ بولتے بولتے وہ بری طرح رو پڑا......گوپال اور رادھا نے اتنے طاقتور انسان کو بچے کی طرح بلکتے دیکھا تو انہیں اپنے گھر والوں کی یاد نے رلا دیا......دل دکھ سے ہل گئے ......سوچنے لگے کتنا پیار بھرا ہے ان کے دل میں......غیروں کی جانیں بچانے کے لئے اپنا سب کچھ تیاگ دیا......اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں۔ خطروں سے کھیل رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بولا......اپنے تو ساتھ چھوڑ گئے اب سارے غریب ہمار ہیں۔ ......جا سو پڑ......کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنا بڑا سہارا ملا تو گوپال نے اطمینان کی سانس لی۔

دوسرے دن رادھا کو گھر میں نہ پا کر رام داس نے روپا سے کئی سوال کر ڈالے مگر وہ یہی کہتی رہی......ابھی تو یہاں ہی تھی......ماں یہ سوچ سوچ کر خوش تھی کہ بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہے جو زبان کا پکا ہے۔ جو وعدہ کیا ہے اسے نبھائے گا ضرور۔ دھن دولت نہ سہی پیار کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔ وفا جیسا نایاب اور انمول تحفہ سچی محبت کرنے والوں کے نصیب میں ہی آتا ہے۔ رام داس کی طرح گوپال کا دل ڈانواں ڈول ہر گز نہ ہوگا......اس نازک رشتے میں اگر بھروسے کی ڈور ہی ٹوٹ جائے تو زندگی بھر دل کے گھاؤ ڈستے ہی رہتے ہیں۔ مگر ساتھ میں فکرمند بھی بہت تھی۔ آگے کیا ہوگا......

کچھ دنوں تو بات ڈھکی چھپی رہی...... جب گوپال بھی گھر نہیں لوٹا تو کاشی رام گھبرائے۔ سوتیلی ماں کو موقع ملا تو گوپال کی گمشدگی کا ڈھنڈورا پیٹ ڈالا...... گاؤں میں واویلا مچ گیا...... رام داس اپنی تذلیل برداشت نہ کر سکا...... لاٹھی سے کاشی کا دروازہ پیٹ ڈالا...... اسے جان سے مارنے کی ٹھان لی......

کاشی باہر آیا...... رام داس کو غصے میں دیکھ اپنی گردن جھکا دی...... ارے مرے ہوئے کو مارنے آیا ہے...... لے مار ڈال مجھے...... تیرا بڑا احسان ہوگا مجھ پر...... بیٹے نے تو جینے کے قابل چھوڑا نہیں۔ اگر میں اس کا ٹھکانہ جانتا تو تیرے سامنے لا کھڑا کرتا...... نصیب تو میرے پھوٹے ہیں۔ میرے دل کا ٹکڑا...... اس گھر کا مالک...... اگر اس کی ماں ہوتی تو آج تیری بیٹی میرے گھر کا اجالا ہوتی اور دونوں یوں در بدر مارے مارے نہ پھرتے...... نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہیں دونوں......

کاشی یہ دیکھ کر حیران تھا کہ روپا کو جتنی فکر اپنی بیٹی کی تھی اتنی ہی فکر گوپال کی تھی۔ منگل سنگھ کے روپ میں دو پریمیوں کو بھگوان مل گیا تھا۔ دوسرے ہی دن دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ رہنے کو مکان مل گیا...... گوپال نے پرانی نوکری چھوڑ کر ایک مہاجن کی دکان کا حساب کتاب سنبھالا......

زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی تھی...... دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا تھا پھر قسمت سے کوئی شکوہ اور کوئی شکایت ہی نہ رہی...... دونوں اس غریبی میں بھی بے حد خوش تھے۔ انہیں تو سورگ مل گیا تھا۔ خوشی کے لمحات کی عمر کم ہی ہوتی ہے۔ قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی یہ بات وہ دونوں جانتے ہی نہ تھے۔

اس سانحہ کی خبر گاؤں کے چودھری کو پہنچی تو رام داس اور کاشی رام کو بلایا...... بولا ہم عدالتی تحقیقات پر یقین نہیں کرتے کیونکہ عدالتیں کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتیں...... وہ لوگ بس غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ بے قصور کو سزا ملتی ہے اور اصلی مجرم اپنی طاقت اور دولت کے زور سے بچ نکلتے ہیں وہ گاؤں والوں کی غریبی۔ بے بسی اور بے چارگی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر پولس چاہے تو ہوا سونگھ کر مجرموں کا سراغ لگا سکتی ہے۔ پر نہیں...... رشوت کا بازار گرم رہتا ہے سو سب قانون الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ گاؤں میں مستقل امن و امان قائم رکھنے کے لئے ہم اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں اور گاؤں کے سارے معاملے نمٹاتے ہیں......

کیونکہ ہم اپنے گاؤں کے رکھوالے ہیں اس سنگین معاملے کو ہم ضرور ہی نمٹائینگے...... سو دونوں اپرادھیوں کو جلد از جلد ڈھونڈ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔ ورنہ تم دونوں کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا......

"اپرادھی"...... لفظ سنتے ہی کاشی اور رام داس کے چہروں پر پسینے دوڑنے لگے...... بڑی ہمت کر کے کاشی کی دھیمی اور کانپتی آواز آئی...... سرکار...... ناسمجھ بچے نادانی کر بیٹھے...... آپ ہمارے مائی باپ ہو...... داتا ہو...... معاف کر دو سرکار...... ان کی جڑیں یہاں ہے گاؤں میں...... کھیت مکان سب کچھ یہاں ہے...... کب تک دونوں بھٹکتے پھرینگے تھک کر واپس گاؤں ہی آئینگے۔

چودھری کی خاموشی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ دربار کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب جاؤ...... دونوں کے بدن پسینے میں بھیگ چکے تھے۔ دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے...... ہاتھ جوڑ کر چودھری کے سامنے سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے...... آنکھوں میں التجائیں لئے۔ ایک بار پھر کانپتے لبوں سے نکلا۔ سرکار...... معاف کر دو...... بچے ہی ہیں...... دیا کرو سرکار...... ہم دونوں حضور کا ہر حکم ماننے کو تیار ہیں۔ جو ڈنڈ دینا چاہو سرکار ہم دونوں کو دے دو۔ بچوں پر دیا کرو۔ سرکار......

رام داس اچھی طرح جانتا تھا کہ کملا کو گوپال سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں ہے اور اس معاملے میں اسے کاشی رام

سے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہوگی سو کاشی رام کو اپنے گھر لے آیا...... وہاں روپا از حد پریشان تھی۔ دونوں بچوں کے لئے سر پیٹ پیٹ کر دھاڑیں مار رہی تھی۔ اور رادھا کو ہی دوش دے رہی تھی۔

کاشی اس کی حالت دیکھ کر رام داس سے بولا...... ہماری برسوں کی یاری ہے...... مصیبت کے وقت میں ہی دوست پہچانا جاتا ہے۔ تیری بیٹی میری بھی تو بیٹی ہے...... اسے دوش نہ دو...... دوشی تو میرا بیٹا ہے...... اب کہاں جا کر اسے ڈھونڈوں...... وہ میری ہی نہیں تیری جھولی بھی خالی کر گیا...... برداشت کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ کاشی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا......

بہت رو لیا تو بولا...... بیٹا تو میرا تھا...... پر تیرے ہی در پر پڑا رہتا تھا...... روپا کی طرف دیکھ کر بولا ...... تم نے اسے ماں کا پیار دیا...... سوتیلی ماں تو اسکی دشمن بن بیٹھی...... معصوم بچے پر بڑے ظلم ڈھاتی تھی...... میں دیکھ کر خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا کہ میرے پیچھے کہیں میرے بچے کو زہر نہ دے ڈالے...... سچ کہتا ہوں اپنے بچے کو دیکھ دیکھ جیتا تھا۔ تمہارے پیار نے میرے ننھے سے پودے کو سینچ کر ایک تناور درخت بنا دیا اور اس نے تمہیں چھاؤں تو نہ دی اور اتنا بڑا غم دے گیا...... ہم سب کی عزت گاؤں میں خراب کر گیا...... بیٹی کو دوش نہ دو...... دوش تو مرد کا ہوتا ہے اور دنیا والے سزا عورت کو دیتے ہیں۔

کاشی رام۔ رام داس اور روپا کے دن رات پریشانیوں میں گزر رہے تھے۔ گوپال کی سوتیلی ماں ان تینوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے سے باز نہ آتی...... بار بار ایک ہی بات کہتی...... میں جانتی تھی یہ لڑکا کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے گا...... لوگ میری جان عذاب میں کر رہے ہیں...... گاؤں میں اب چین سے جینے کے قابل نہیں چھوڑا...... سوچتی ہوں اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں......

تینوں سن کر خاموش رہ جاتے...... تینوں صدماصدموں کے بوجھ تلے دبے تھے۔ نا معلوم چودھری کیا سزا دے گا۔ غم اور فکر نے انہیں بالکل بے حال کر دیا تھا...... کسی سے کچھ کہنے کے قابل ہی نہ تھے۔ بس بیٹے کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈر تھا کسی دن بھی حقہ پانی بند ہو سکتا ہے۔

گلاب سنگھ کملا سے خار کھائے بیٹھا تھا...... اس نے زوردار قہقہہ لگایا...... بدلہ...... اب لونگا بدلہ میری بیٹی کو اس نے تباہ کیا ہے...... اب میں اس کے بیٹے کو برباد کر دونگا...... بڑی سورما بنی پھرتی ہے۔ گاؤں کے ہر مرد عورت سب سے جھگڑتی ہے اور گاؤں بھر کی خبر چودھری کے کانوں میں انڈیلتی رہتی ہے۔

نا جانے کیسے گلاب سنگھ نے گوپال کو ڈھونڈ ہی لیا۔ شام ڈھلے جب گوپال گھر پہنچا تو چار آدمیوں کو سامنے بیٹھا دیکھ اس کے پاؤں کپکپا گئے۔ وہ بھاگنا تو چاہتا تھا لیکن رادھا کے خیال نے پاؤں روک دیئے ...... اسے اپنا وعدہ یاد آیا...... ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا وعدہ...... وہ ہمت کر کے آگے بڑھا......

رامو کاکا کو دیکھ جان میں جان آئی۔ گوپال بولا...... کاکا ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ بیاہ ہوا ہے ہمارا ...... رامو کاکا بولے...... ایسے بیاہ کو ہم لوگ نہیں مانتے۔ نہ کھانا نہ پینا...... نہ گانا اور ناچ...... وہ سہاگن کیا جس کے سہاگ کے گانے ہی نہ گائے گئے ہوں۔ گھر چل گاؤں میں اپنے طریقے سے ساری رسمیں ہونگی...... خوب جشن منایا جائے گا...... خوب دھوم دھام سے تیرا بیاہ رچایا جائے گا۔ گوپال بولا...... نہیں...... کاکا...... ہم دونوں خوش اور

مطمئن ہیں۔ ہمیں نہ جشن چاہئے نہ دھوم دھام

راموکاکا بولے اور تیرے باپ اور رام داس اور اس کی گھر والی کا کیا ہوگا...... جانتا ہے رو رو کر برا حال کرلیا ہے تینوں نے...... اب چل بھی کہ تجھے اٹھا کر لے جائیں...... بیحد گھبراہٹ کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا ...... بہت ڈرا ہوا تھا...... لیکن راموکاکا نے اسے یقین دلایا کہ گاؤں والوں کو کوئی اعتراض نہیں۔ ان کی باتیں اسے پرسکون کرگئیں...... دل کے سارے خوف سارے اندیشے دور ہو گئے اور دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ روپا نے جالنے سے دیکھا اور دونوں بچوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر گھر لائی...... سب خوفزدہ تھے کہ نہ جانے اب کیا ہوگا ...... رادھا کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور تمام وجود سن پڑ گیا تھا...... آگے بڑھنے کی شکتی نہ رہی تھی...... وہ ماں کے ہاتھوں میں بے ہوش ہوگئی تھی...... گوپال نے اسے تخت پر لٹایا تھا۔

بھگوان جانے کتنے دکھ بھوگ کر گھر لوٹے ہیں۔ آپ دونوں ان کو معاف کر دینا...... انہیں ڈانٹ پھٹکار نا مت...... ایک ماں کی آواز سن کر رام داس اور کاشی خاموش رہ گئے تھے۔ غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

رام داس اور کاشی کو حکم ملا کہ دو دن کے اندر بیاہ کی تیاریاں پوری ہو جائیں...... گاؤں کا ہر شخص بیاہ میں شریک ہوگا...... چودھری کا حکم ماننا ضروری تھا۔ اختلاف کرنے کی جرات ہی نہ تھی۔ دو دن پھر اس کے بعد ...... زبانی حملوں نے دونوں کو تھرا کر رکھ دیا تھا۔

دو دن گاؤں میں خوب جشن منایا گیا...... مہندی کی رسم پر خوب شور شرابا ہوا۔ لڑکیوں نے ڈھولکی پر سہاگ کے گانے جم کر گائے۔ رنگین آنچلوں سے گاؤں کی فضا میں بہار آ گئی۔ خوشیوں بھرے جذبوں سے رادھا کا چہرہ اور کھل اٹھا...... ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں...... اگنی کے سامنے سات پھیرے ہو چکے تھے۔ نا جانے کیوں ...... کیا راز تھا جو سوتیلی ماں، بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

کاشی اور رام داس کے دل کانپ رہے تھے کہ نہ جانے کب چودھری کا قہر عذاب بن کر ان معصوم بچوں پر ٹوٹ پڑے...... اس ظالم انسان سے رحم کی توقع کرنا فضول تھی۔

اچانک ہی گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ گھن گرج کے ساتھ ایک آواز آئی...... ہم چاہتے ہیں ہماری ابھی کی نسل اور آئندہ پشت...... یعنی وہ بچے جو پیدا ہونگے جان لیں کہ بڑے ہو کر اپنی اولاد کو سکھائیں کہ سماج کے قدیمی بنائے حکموں اور رواجوں پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم بڑی عدالت کے دروازے نہیں کھٹکھٹاتے...... اپنے گاؤں کے معاملے خود نمٹاتے ہیں۔ کچھ پلوں کے لئے بڑی گہری خاموشی چھا گئی......

آسمان پر نہ چندا تھا نہ تارے۔ گپ اندھیرا تھا۔ بڑا طوفان آ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں دو معصوموں پر قہر ٹوٹنے والا ہی تھا...... کاشی۔ رام داس اور پارو بیحد بے چین تھے۔ فکر مند تھے۔ کیا ہوگا۔؟ بدلیوں نے پانی برسایا ...... ایک اور گرجدار آواز آئی...... چودھری بے کس اور مجبوروں پر اور ظلم نہ ڈھا...... بہت کر لی تو نے شریروں کی طرفداری...... غمزدہ...... یتیموں کا انصاف کر...... اگر کسی نے غریب کسانوں کو نقصان پہنچایا تو منگل اس کی گردن مروڑ دے گا۔ اسکا اور اسکے پورے کنبے کا نام ونشان اس دنیا سے مٹا دیگا......

برق نے کالی رات کو ایک پل کے لئے روشن کر دیا...... شادی گھر شمشان بن چکا تھا۔ چودھری

......گلاب سنگھ اور راموکاکا کے تڑپتے بدن دیکھ سب لرز اٹھے تھے......زمین کی بنیادیں ہل گئی تھیں......بدلیوں سے پانی برستا رہا......زمین ڈر کر چپ ہوگئی......آسمان خاموش تھا......

پارو نے دونوں خوفزدہ بچوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا......اور سوتیلی ماں اپنے راموکاکا کی موت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں......

☆☆☆

کھٹا میٹھا

رام شرما کا تعلق متوسط طبقہ سے تھا جو ہمیشہ مسائل کی چکی میں پستا رہتا ہے۔ان کے وسائل کم مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔اپنی عزت کا بھرم رکھنے کیلئے انگنت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔چھوٹے قصبوں میں آگے بڑھنے کے مواقع بھی نہیں ہوتے......

گاؤں میں اسکول نہ ہونے کی وجہ سے رام شرما پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔مگر زندگی میں کچھ کرنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی۔اور یہی لگن انہیں ایک بڑے شہر کی طرف کھینچ لائی تھی۔ان کا چھوٹا بھائی پہلے ہی شہر میں کسی دکان میں چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا۔بس کسی حال دال روٹی مل جاتی تھی۔

دوسری کوٹھری کے کرایے کے لئے پیسے ہی نہ تھے سو دونوں نے ایک میں بھی گزارا کیا۔اسی کوٹھی میں رہ کر رام شرما نے اپنی ماں کے ہاتھوں سیکھے کھٹے میٹھے اچار بنا کر بیچنے شروع کئے۔کچھ فائدہ ہوا تو دونوں بھائی کولہو کے بیل کی طرح اس چھوٹے سے کاروبار میں جٹ گئے۔انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایک دن ان کی محنت اتنی پھولے پھلے گی کہ مین مارکیٹ میں بڑی دکان ہوگی اور رہنے کو ایک چار کمروں کا مکان۔دونوں بھائیوں میں پیار بھی بہت تھا۔جو دیکھتا کہتا یہ دونوں بھائی آج کل کے بھائیوں سے مختلف ہیں۔آج کل بھائی بھائی ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے ایک دوسرے کے ایسے دشمن بن جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔زمین جائیداد کے لئے تو بھائی بھائی کا خون بھی کر دیتا ہے۔ان کی محبت ہم سب کے لئے ایک مثال ہے۔یہ ان کے ماں باپ کی تربیت کا اثر ہے۔

جب ٹھیک سے سیٹل ہو گئے تو دونوں نے شادی کرنے کا سوچا۔رام بولے ہم دو بھائی دو بہنوں سے ہی شادی کرینگے۔دونوں بھائی ساتھ ساتھ رہیں گے اور خاندان میں خوشحالی بھی رہے گی۔رشتے تو بہت سے آئے لیکن وہ دونوں آج کل کی فیشن ایبل اور ماڈرن وضع کی لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔

ماسٹر شرما کی دو خوبصورت لڑکیاں کنواری بیٹھی تھیں۔یوں تو ماسٹر جی کی سب ہی عزت کرتے تھے۔لیکن لڑکیوں کا ذکر ہوتے ہی منہ پھیر لیتے تھے۔بنا جہیز کے کوئی بھی ہامی نہ بھرتا تھا۔

اڑتے اڑتے یہ خبر رام شرما کے کانوں تک پہنچی تو رام اپنے چھوٹے بھائی لکشمن کے ساتھ ماسٹر جی کے در پر جا پہنچے۔دست بستہ عرض کی کہ کیونکہ ہمارے سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہیں اس لئے ہم دونوں خود اپنے لئے رشتہ مانگنے آپ کی چوکھٹ پر آئے ہیں۔ماسٹر کو لگا کہ ان دونوں بھائیوں کے روپ میں بھگوان ہمارے گھر پدھارے ہیں۔پہلے تو انہوں نے اپنی کم مائیگی کا رونا رویا اور پھر بیٹیوں کی خوبیوں کا ذکر کیا۔محلے والوں کی زبانی رام پہلے ہی سب سن چکے تھے۔وہ فوراً بولا ہمیں آپ کی ہر بات کا یقین ہے اور آپ بھی ہمارا یقین کرلیں کہ آپ کی دونوں بیٹیوں کو ہماری طرف سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔جتنا بن پڑے گا دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرینگے۔

ماسٹر جی کے چہرے پر فکریں جمی دیکھ کر رام بولے۔آج کل شادی بیاہوں میں فالتو کے ہنگاموں کا اضافہ ہو گیا

ہے۔ بینڈ باجے۔ قیمتی کپڑے۔ قسم قسم کے کھانے۔ گانے بجانے والے۔ پھولوں کی بارش، ہزار قسم کی روشنیوں کے نظارے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ یہ گھر کے لوگ خود نہیں کرتے۔ آج کل یہ کرنے کے لئے بڑی بڑی کمپنیاں بن گئی ہیں جو دونوں ہاتھوں سے پیسہ بٹور رہی ہیں۔ امیر لوگ دونوں ہاتھوں سے پیسہ لٹانے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ نام ہوگا۔ شہر میں چرچا ہوگا ......بس نام کمانے کے لئے کشادہ دلی سے خرچہ کرتے ہیں۔ مگر جن کے پاس ہے ضرور خرچ کریں۔ مشکل تو متوسط طبقے کے لوگوں کی ہے جو ان امیروں کی نقل کرتے کرتے تباہی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ قرضوں میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے دیس میں غریب، بہت زیادہ اور امیر گنے چنے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ پہلے زمانوں میں یہ نہیں ہوتا تھا۔ شادی بیاہ تو خوشی منانے کا ہی موقع ہے۔ پہلے گھر کے لوگ اپنے دوست احباب کے ساتھ مل کر بیاہ کی تیاریاں کرتے تھے۔ خود کھانا پکاتے تھے۔ کپڑے سیتے تھے۔ اور ڈھولکی پر گانا بجانا بھی کرتے تھے۔ سب مل کر خوشیاں مناتے تھے۔ غریبوں کو نہیں بھولتے تھے۔ انہیں دان پن ضرور کرتے تھے۔ مگر آج کل سب بدل گیا ہے۔ حقیقت نے دکھاوے کا روپ لے لیا ہے۔ بھیڑ جمع کرنے کا رواج چل پڑا ہے۔ اور اس پر بے ہنگم لباسوں کی نمائش اور میوزک ایسا تیز کہ کان ہی پھٹ جائیں۔

ہم اس فضول خرچی کے خلاف ہیں۔ محنت کی کمائی اس طرح برباد کرنے میں کونسی عقلمندی ہے۔ یہ روپیہ کسی اچھے کام میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس سے بہت سے کمزور طبقے کے لوگوں کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ ورنہ یہ بربادی کا عالم جاری رہے گا۔

آپ کی دونوں بیٹیوں کی شادی سادگی اور شانتی سے ہوگی۔ برات میں صرف بارہ لوگ ہونگے۔ وہ بھی اس لئے کہ ہمارے یہاں ہر شبھ اوسر پر بارہ برہمنوں کو کھلانا نیم ہے۔ ہم دونوں بھائی باہر کا کھانا کھا کھا کر تھک گئے ہیں۔ بہت دنوں سے گھر کا اچھا کھانا کھانے کو نہیں ملا...... آپ کے گھر کا کھانا کھانے میں مزہ آجائے گا......

کپڑوں اور زیور کی فکر آپ بالکل نہ کرنا۔ یہ سب ہماری ذمہ داری ہے۔ شادی ہم دونوں بھائیوں کی بھی تو ہو رہی ہے تو کیوں نا ہم ہی اپنی شادی کا بھار اٹھائیں۔ میری نظر میں یہ ضروری نہیں کہ لڑکی کے پتا ہی سب کچھ کریں کیا یہ کافی نہیں کہ آپ اپنی پلی پلائی دو بیٹیاں ہمیں دے رہے ہیں۔ آپ کو صرف خوشیاں ہی نہیں ملیں گی۔ بیٹیوں سے جدائی کا دکھ بھی تو آپ سب کو سہنا ہوگا......

کھانے پینے کا دور ختم ہوا۔ رام لکشمن جانے کو اٹھے تو ماسٹر جی نے روک کر کہا...... آپ نے ہماری بیٹیاں تو دیکھی ہی نہیں...... پھر بعد میں اگر...... رام بولے ہمارے یہاں لڑکیوں کی نمائش کا دستور نہیں۔ گھر کی بوڑھی عورتیں دیکھ کر ہی فیصلہ کرتی تھیں۔ اب تو آپ لوگ ہی ہمارے بھی بڑے ہیں اور بات پکی ہو چکی ہے۔

دس دن کے بعد ماسٹر جی کی دونوں بیٹیاں گنگا اور جمنا نے اپنے نئے گھر میں پرویش کیا...... سونے گھر کی در و دیواروں پر رونق چھا گئی۔ خوشیاں چہکنے لگیں۔ رام اور لکشمن نے سنا ہی تھا کہ گنگا جمنا دونوں خوبصورت ہیں مگر یہ دونوں بہنیں تو آسمان کی حوروں سے کم نہ تھیں۔ دونوں نے اس گھر میں محبت اور پیار کی ہوا بکھیر دی۔

کہتے ہے اولاد آدمی کے بھاگ سے ملتی ہے اور لکشمی عورت کے۔ یہ چاروں تو قسمت کے دھنی تھے۔ بہنوں کے مبارک قدم گھر میں آتے ہی بزنس میں ترقی ہوئی اور ایک سال کے اندر دونوں بہنوں نے دو بیٹوں کو جنم دیا۔ خبر ملتے ہی دونوں

بھائی ڈوڑتے ڈوڑتے مندر گئے اور اپنے بھگوان کے سامنے ماتھے ٹیک دیے۔ پھر گھر آئے تو پالنے میں دونوں بیٹے یوں لگ رہے تھے جیسے کہ دو چاند زمین پر اتر آئے ہوں۔ رام اور لکشمن کے ساتھ بہت سے غریبوں اور یتیموں کی دعائیں بھی تھیں۔ انہوں نے جو بھی خدا سے مانگا تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ دونوں بہت خوش اور آسودہ تھے۔

اپنی اس خوشی کے عالم میں وہ اپنی ذمے داریاں نہیں بھولے تھے۔ اپنے گاؤں جاتے تھے اور جہاں تک بن پڑتا تھا گاؤں والوں کی امداد کرتے تھے۔ بچوں کے لئے اسکول بھی کھول دیا تھا۔ اور یہ سب کرنے میں دونوں کو دلی سکون اور خوشی ملتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ دونوں اپنا ماضی نہیں بھولے تھے۔ اکثر یادوں میں وہ کوٹھری میں پہنچ جاتے جہاں دونوں نے مل کر اچار کا بزنس شروع کیا تھا۔ وہ دن یاد کرتے جب صرف دال روٹی ہی کھا کر گذارا کرتے تھے۔ پھل مٹھائی تو تیج تہوار پر ہی مل پاتی تھی۔ دونوں یہ سوچ کر ہی خوش تھے کہ وہ دونوں لاکھوں سے بہتر تھے۔

حالانکہ اب ان کے دن پلٹ گئے تھے۔ بھگوان نے اتنی زیادہ دھن دولت دی تھی کہ وہ دنیا بھر کے آرام اور آسائشوں کا سامان خرید سکتے تھے۔ لیکن اب بھی وہ دونوں ان چیزوں کو فضول خرچی ہی سمجھ کر رد کر دیتے تھے۔ کیونکہ گنگا اور جمنا کا بچپن بھی غریبی میں کٹا تھا سو وہ دونوں بھی کبھی کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔ چاروں اپنے حال میں، بہت خوش اور آسودہ تھے۔

ماسٹر جی کے بھی دن بدلے۔ دونوں داماد اپنے غریب ساس سسر کی بہت عزت اور مان کرتے تھے۔ ان کی ہر ضرورت پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جب بھی ماسٹر جی کچھ کہتے تو دونوں صاف کہتے اب آپ ہی ہمارے ماں باپ ہیں۔ ہمارے اور آپ کے دکھ سکھ سانجھے ہیں۔ اور آپ کی سیوا کرنا ہمارا فرض ہے۔

خوشیاں بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ کسی کے آنگن میں زیادہ دن نہیں ٹکتیں۔ یہ دنیا ہے ہی دکھ سکھ کا سنگم...... دونوں بچوں کو گنگا نے سنبھالا اور لکشمن اور جمنا کو بھگوان کے مندر ماتھے ٹیکنے روانہ کیا...... ابھی وہ دونوں مندر پہنچے بھی نہ تھے کہ سڑک پر افراتفری دیکھ کر ڈر گئے۔ بم پھٹ رہے تھے آگ برس رہی تھی۔ نہ گاڑی میں بیٹھے بنتا تھا اور نہ نکلتے۔ گاڑی شعلوں کی لپٹ میں آ گئی تھی۔

بہت سا وقت گزر گیا تھا۔ جب لکشمن اور جمنا واپس نہیں لوٹے تو رام ان کو تلاش کرتے اسی ہی سڑک پر پہنچے۔ اور لوگوں کی بھیڑ۔ سپاہی۔ ایمبولنس دیکھ وہ گھبرائے۔ ہمت کر کے آگے بڑھے سامنے جو دیکھا وہ ان میں دیکھنے کی ہمت کہاں تھی۔ اپنی خوشیوں کا جنازہ دیکھ وہ گرنے ہی والے تھے کہ سپاہی نے انہیں تھاما۔ چہرہ زرد دیکھ کر سوال کیا۔ بابو جی کیا ہوا۔ وہ جواب کیا دیتے بس اس آدمی کے ہاتھوں میں پھسلتے چلے گئے۔

ظلم کی انتہا دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں سنبھالا...... بہت دیر بعد ذرا ہوش آیا تو گاڑی کی طرف انگلی کر کے بولے...... وہ...... وہ...... میرا بھائی اور جمنا...... آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ آواز بند ہو گئی تھی جسم کانپ رہا تھا۔ سب انہیں سمجھا رہے تھے لیکن جو آدمی اندر سے بالکل چور چور ہو چکا تھا وہ کیا سمجھتا......

دوستوں نے آ کر تھام لیا تھا۔ سپاہی کہہ رہے تھے بابو جی اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا...... آپ گھر جائیں...... وہ دیر تک سوچتے رہے اپنے بھائی اور جمنا کو چھوڑ کر کیسے گھر جاؤں اب گھر میں بھی کیا رکھا ہے۔ میرا سب تو یہیں خاک ہو گیا۔ بڑی مشکل سے دوستوں نے اٹھایا۔ اور ایک دکھیارا بھائی اپنے بھائی کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو پولس کی تحویل میں چھوڑ کر نیم جاں ہو کر ہولے ہولے آگے بڑھا......

وہ گاڑی میں بیٹھے سوچتے رہے۔ کون تھا وہ بے درد۔ جس نے اتنی تباہی پھیلا دی۔ کتنی جانیں لے لیں۔ میرا ہرا بھرا اسنسار پھونک ڈالا...... میرے گھر کے دو پیارے لوگ بجھ گئے۔ میرے گھر کے چراغ بجھ گئے ایک وار میں کتنے ہی دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ کتنے رشتوں کی ڈور توڑ ڈالی۔ ماؤں کی گود خالی کر دی۔ باپ سے ان کا لخت جگر چھین لیا۔ بھائی بہنوں کے سہارے توڑ دیئے اور ایک معصوم بچے سے اس کی ماں کو الگ کر دیا کیسے جیئے گا وہ بچہ بغیر ماں کی ممتا کے بغیر باپ کے سائے کے بغیر کیسے پروان چڑھے گا وہ...... گھر پہنچے تو قیامت ہی آ گئی...... اندھیرے گھر میں پاؤں رکھنا دشوار ہو گیا...... گھر بھرا تھا لیکن رام کی دنیا تو خالی ہو گئی تھی۔ لکشمن کے بغیر وہ تو جینے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اور آج اچانک...... موت...... ہائے ری موت...... تو اتنی کٹھور...... کتنا دکھ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی ان سب کو جن کو تو نے جلا کر خاک کر دیا۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ سب سوگ میں ڈوبے تھے۔ موت ساری آنکھوں کو رلا گئی تھی۔ اور یوں روتے بلکتے۔ دن بیتنے لگے۔ گنگا نے اپنے دکھوں کو بھلا کر دونوں بچوں کی ذمہ داری سنبھالی۔ اشوک اور امبر دونوں کو اپنی چھاتی سے لگا کر اپنا دودھ پلا کر بڑا کیا...... اس نے دونوں بچوں میں ذرا سا بھی فرق نہ کیا۔

گھر تو گنگا اور اس کے ماں باپ نے سنبھال رکھا تھا لیکن رام آہستہ آہستہ اپنے غموں کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ بھائی کی جدائی کا دکھ اسے مارے ڈال رہا تھا۔ ہر وقت کی اداسی اور تڑپ نے رام کی صحت بگاڑ دی تھی۔ جب بالکل ہی جان پر آن بنی تو گنگا نے ڈاکٹر بلایا۔ پھر ڈاکٹر نے سمجھایا کہ انسان کو ہر دکھ اٹھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ مردوں کو کوئی غم دل پر ایسے نہیں لینا چاہیئے۔ جس سے وہ اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کر سکے۔ بھگوان نے غم دیا ہے سہنے کی شکتی بھی دے گا۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ پورے خاندان کا بوجھ تمہارے ہی کاندھوں پر ہے۔ اب بھائی کا غم بھلا کر اس کے بیٹے کی طرف دیکھو۔ اس کی پرورش اب تمہیں کرنی ہوگی۔

ڈاکٹر سے بہت پرانی دوستی تھی۔ دوست کی بات رام کی سمجھ میں آ گئی۔ رام کو اشوک سے زیادہ امبر پیارا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جان سنبھل سی گئی۔ بچوں کی پڑھائی پر زور دیا...... دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ڈاکٹر بن گئے۔ نہ جانے کب سے اماں اپنے دونوں بیٹوں کی شادیوں کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ کھانے کے بعد ایک رات ہمارے سامنے لڑکیوں کی تصویریں بکھیر کر بولیں۔...... ان میں سے جو بھی پسند ہو چن لو...... ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا...... ابھی نہیں...... پہلے کام...... پھر شادی ...... اور یہ...... اتنی فیشن ایبل...... ماڈرن ٹائپ لڑکیاں...... ناں...... ناں...... اماں...... ایسی نہیں...... ہمیں تو تمہاری جیسی سیدھی سادھی چاہیئے۔...... یہ لڑکیاں ہمارے پریوار میں فٹ نہیں ہو سکتیں...... یہ ہم سے نہیں ہماری ڈگریوں سے شادی کرنے کی خواہشمند ہیں۔

اماں بولیں...... بھئی زمانہ بدل گیا ہے۔ زمانے کے ساتھ لڑکیوں کے رہن سہن کے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ تم لوگ خود اپنے اپنے لئے اپنی پسند کی لڑکیاں چن لاؤ۔

اماں کا حکم ملا...... پھر کیا تھا دونوں صبح صبح ہی لڑکیوں کی کھوج میں نکل پڑے۔ امبر کے دوست کا موٹر گراج تھا۔ اسے چار دن کے لئے کہیں باہر جانا تھا۔ بس دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں میں ابھی گرمی نہ تھی۔ میں نے فٹافٹ چائے بنائی اور امبر سامنے والی دکان سے پکوڑے لے آیا...... چل بھائی...... پہلے پیٹ پوجا بعد میں کچھ اور...... میں نے دو پیالیوں میں چائے ڈالی اور جیسے ہی پہلا پکوڑا منہ میں ڈالا...... کھٹ پٹ

......کی آواز پر پلٹ کر دیکھا...... لمبی ہیل...... ٹائٹ جینز اور کالے کوٹ میں وہ تیز تیز ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔ وہ سامنے آ دھمکی...... امبر نے فوراً کھڑے ہونے کی کوشش کی میں نے ہاتھ کھینچ کر بٹھالیا...... یار چائے ٹھنڈی ہوگئی تو دوبارہ گرم کی جا سکتی ہے پکوڑے ٹھنڈے ہوگئے تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا...... پھر اپنا اصول بھی تو یہی ہے۔ پہلے پیٹ پوجا پھر...... اماں بھی کہتی ہیں کھانا چھوڑنے سے خدا ناراض ہوتا ہے ہم انسان کو ناراض کر سکتے ہیں خدا کو نہیں...... اے مسٹر...... وہ میری طرف دیکھ کر مخاطب ہوئی...... اور ساتھ ہی گاڑی کی چابی آگے بڑھائی...... چائے بعد میں...... پہلے میری گاڑی...... میں نے لاپروائی سے ان سنا کر کے دوسرا پکوڑا منہ میں ڈالا...... اور لڑکی کو بغور جانچتی نظروں سے نیچے اوپر دیکھ کر کہا...... میم صاحب آپ کی گاڑی تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ تھوڑا صبر کریئے ہم کھا کر چلتے ہیں۔ اس سردی کے موسم میں ادرک اور گڑ کی گرما گرم چائے پی کر تم کو بھی مزہ آجائے گا۔ پکوڑے کا دونہ اسکی طرف بڑھا کر کہا...... کھاؤ میم صاحب...... اس نے برا سا منہ بنایا...... میں نے فوراً کہا زہر نہیں ہے میم صاحب...... بالکل تازہ پکوڑے ہیں...... گرم...... گرم...... کھا کر دیکھو تو...... سامنے والی مشہور دکان کے ہیں۔ ہم بھی ایسی ویسی چیز منہ میں نہیں رکھتے۔

وہ غصے میں لال ہو کر چیخی...... بدتمیز...... تم کو شریفوں سے بات کرنا نہیں آتا...... میں نے کہا...... کیا گستاخی ہوگئی ہم سے...... تم...... ہماری پہلی مہمان ہو ہم اپنے اسٹائل سے اپنے مہمان کا سواگت کر رہے ہیں...... کیا تمہارے یہاں مہمان نوازی کرنے کو بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔ تمہارا اسٹائل دیکھ کر تمہاری عزت افزائی کی۔ تمہیں میم صاحب کہا...... اگر ہم اپنے گاؤں والے اسٹائل سے تمہیں بی بی جی کہتے تو تم ہمیں قتل ہی کر ڈالتیں......

اتنی خوبصورت صبح...... اور تمہارا یہ غصہ...... توبہ...... توبہ...... ہمارے یہاں لڑکیاں غصہ نہیں کرتیں وہ اور بکھر گئی ......کڑک کر بولی غصہ نہیں کرتی تو کیا کرتی ہیں۔ میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا...... پیار کرتی ہیں میم صاحب...... وہ تو بری طرح چیخی...... کون ہو تم......

میں نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا...... ہم تو ان پڑھ گنوار ہیں...... تم تو پڑھی لکھی معلوم پڑتی ہو اندر آتے وقت بورڈ نہیں پڑھا تھا...... بڑے بڑے حروف میں لکھا ہے...... موٹر کا دواخانہ...... اب دواخانہ چاہے جانوروں کا ہو یا انسانوں کا یا پھر موٹر کار کا...... دواخانے میں ڈاکٹر ہی ہوتا ہے۔ میں نے ایک اور پکوڑا اٹھایا...... تمہارا نام کیا ہے ......میں نے من میں سوچا ایک نظر میں میرا کام تمام کر کے اب اس پر یہ غضب کہ نام پوچھ رہی ہو۔ میں نے کہا میں ڈاکٹر ہوں اور یہ میرا کمپاؤنڈر یعنی موٹر میکینک...... موتی لال ہے۔ وہ بھنا کر بولی اور تمہارا نام ضرور ہیرا لال ہوگا...... میں نے کہا میم صاحب تم تو بڑی گیانی دھیانی جوتشی نکلیں...... بالکل ٹھیک میرا نام ڈاکٹر ہیرا لال ہے میں نے فوراً ہاتھ آگے بڑھایا۔ بتا سکتی ہو لکیریں پڑھ کر کون ہوگی میری ہمسفر...... وہ اور بگڑ گئی...... تم بکواس بہت کرتے ہو...... میں نے کہا اور تم غصہ بہت کرتی ہو جو صحت کے لئے بہت مضر ہوتا ہے۔ شٹ اپ یو فول...... وہ بھنا کر بولی...... مجھے بھی غصہ آ گیا...... یہ کیا اول فول لگا رکھی ہے۔ دیکھو میم صاحب زیادہ انگریزی مت جھاڑو...... یہ انگریزی وِنگریزی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ جانے یہ انگریز جاتے وقت اپنی یہ مصیبت اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ جو کچھ کہنا ہے ہماری بھاشا میں کہو جو ہم سمجھ بھی سکیں...... وہ پیر پٹک کر بولی ......او...... مائی...... گاڈ...... آج صبح کس منحوس کی شکل دیکھی تھی جو اس جاہل سے پالا پڑا ہے۔ میں نے کہا میم صاحب بڑی بھلکڑ ہو...... ابھی تو بتایا تھا تم کو میرا نام...... اتنی جلدی بھول بھی گئیں...... میرا نام جاہل نہیں...... ڈاکٹر ہیرا لال

ہے۔اور یہ موتی لال...... آگے یاد رکھنا کہیں کبھی راستہ بھول گئیں تو کیا ہوگا۔

ہم دونوں مزے سے چائے پیتے رہے اور وہ دیکھ دیکھ اندر ہی اندر جھلستی رہی اور آنکھوں سے انگارے ٹپکاتی رہی ۔میں نے چائے ختم کی اور دھیرے سے پیالی میز پر رکھی پھر ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔وہ آگے آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا کہاں ہے تمہاری گھٹیا گاڑی ۔اس نے مڑ کر بڑی غضبناک نظر مجھ پر ڈال کر کہا...... وہ رہی...... میری آنکھوں کے سامنے نئی چمکتی دمکتی مرسڈیز کھڑی تھی ۔میں نے ہولے سے کہا...... کل رات تو یہ گاڑی کلب کے سامنے تھی۔شاید اس نے سنا نہیں ورنہ دو چار گالیاں اور سنا دیتی...... ذرا جلدی کرو...... مجھے پارٹی میں جانا ہے...... میں بولا...... دن میں تو کام کا وقت ہوتا ہے۔تم...... کچھ کام دام نہیں کرتی...... بس رات دن پارٹی کرتی ہو۔وہ چنگھاڑی تم چپ چاپ اپنا کام کرو...... مجھے تم جیسے مردوں کو چپ کرانا بھی آتا ہے۔اگر اور زیادہ بکواس کی تو جیل کی ہوا کھاؤ گے...... کیوں میم صاحب...... جیل کی ہوا کیوں ...... پہلی بات تو ہم کوئی چور اچکے تو ہیں نہیں اور دوسری بات یہ کہ ہم گاؤں کی صاف کھلی ہوا میں رہتے ہیں۔گاؤں میں وہ کیا ہوتا ہے پلوشن نہیں ہوتا...... ہم نے بچی سیدھی بات کی اور تم ہمیں جیل بھجوانے کی بات کر رہی ہو۔وہاں کی گندی ہوا میں تو ہمارا دم ہی گھٹ جائے گا...... میم صاحب آج کل سب بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں سوشل ورک کرتی ہیں اور بڑا فخر محسوس کرتی ہیں ...... تم بھی کیا کرو ناں تمہارا نام روشن ہوگا اور ہم جیسے غریبن لوگوں کا کچھ تو بھلا ہوگا......

کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا...... لو میم صاحب...... ہم چلے...... ہوگئی تمہاری گاڑی فٹ...... وہ جانے کو تیار تھی ...... میں نے ہاتھ آگے بڑھایا...... میری مزدوری...... وہ بال جھٹک کر بولی...... کتنا بل ہوا...... میں نے کہا پورے پانچ سو روپے...... اس نے سوال کیا...... پانچ سو کیسے...... میں نے کہا تم اگر موٹر کی ڈاکٹرنی ہوتی تو موٹر کی بیماریوں کو سمجھ پاتیں ...... اب تمہیں کیا بتائیں...... چلو...... اگر نہیں دینا مانگتی ہو تو نہ دو ہم تمہارے پتا جی سے وصول کر لینگے۔وہ بری طرح جھنجھلا کر بولی۔تم میرے ڈیڈی کو کیسے جانتے ہو...... جانتا تو نہیں...... پر پتا لگانے میں نہ دیری ہوگی اور ناں مشکل شہر میں تمہاری جیسی گاڑیاں دو چار ہی تو ہیں۔

اس نے پانچ سو کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر بڑی حقارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔میں نے اسے سلام داغا...... فرانٹے سے گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی اور میں مسکراتا رہا...... میں واپس گراج پہنچا جہاں موتی کھڑا ہنس رہا تھا ...... بولا...... بچ کر رہو...... یہ میم تو بڑی تیز طرار معلوم پڑتی ہے...... میں نے کہا...... یہ پہلی ملاقات ہے۔آگے آگے دیکھ تو ہوتا ہے کیا۔

میں تو گراج میں بیٹھ کر ایک دن میں ہی باولا ہوگیا...... دوسرے دن سر کا درد لے کر پلنگ پر پڑ گیا...... موتی نے رات کو بتایا وہ گراج آئی تھی اور میرے بارے میں پوچھ رہی تھی۔میں نے بتایا غریب مزدور ہے۔اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ مالک سے ادھار لینے گیا ہے۔

میں دو دن آرام کرنے کے بعد گراج گیا...... رات کے آٹھ بج رہے تھے۔میں اور موتی گراج بند کر کے گھر جانے کو تیار کھڑے تھے۔سامنے اس کی موٹر کھڑی دیکھ ہم دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے آگے بڑھے۔وہ ہماری طرف لپکی ...... کیا ہوا...... لگتا ہے تمہارے ڈبے کو پھر زکام ہوگیا...... ڈبہ بیچارہ کیا کرے سردی جو غضب کی پڑ رہی ہے۔میں نے اسے جلانے کو کہا۔

وہ نہایت ترش لہجے میں بولی...... خبردار جو میری گاڑی کو ڈبہ کہا...... میں نے کہا...... ڈبہ کے چار پہیے لگا کر ہی تو گاڑی بنتی ہے۔ تم تو یونہی خفا ہو رہی ہو۔ میری گاڑی تو بھلی چنگی تھی...... تم نے خراب کر دی ہے۔ نہ جانے کونسا پرزہ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ اب اسے ٹھیک بھی تم ہی کرو گے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا آج تو ہم چلتے ہیں۔ وہ دیکھو موٹر کا دواخانہ بند ہو چکا ہے۔ تمہاری موٹر کا علاج تو اب نہیں کل ہی ہوگا۔ اس وقت تو بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔ میں نے میم صاحب کہنے سے گریز کیا کیونکہ وہ شلوار کرتا زیب تن کیے ہوئے تھی اور بے چین لگ رہی تھی۔ وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور بڑے تحکم انداز میں بولی...... پہلے میری گاڑی ٹھیک کرو...... بعد میں جاسکتے ہو...... مجھے اس کے رویہ پر غصہ آگیا...... میں نے کہا صبح سے رات ہوگئی۔ ہم بھی انسان ہیں...... وہ ہٹ کرنہ دی...... میں نے کہا دیکھو جی ہم کسی کے کے غلام نہیں۔ ہم پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرنا...... اس کا لہجہ ایک دم دھیما پڑ گیا...... میں گھر کیسے جاؤنگی پلیز مجھے ہیلپ کرو...... میں نے موتی کی طرف دیکھ کر کہا...... کیا کہہ رہی ہے...... وہ بھی مسکرا دیا...... مدد مانگ رہی ہے۔ میں نے کہا جا بھائی کھول گراج...... کر کچھ ورنہ یہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔

سچ تو یہ تھا کہ گاڑی بالکل ٹھیک ٹھاک تھی...... وہ جانتی تھی اور میں بھی...... میں نے ادھر ادھر ٹھوک پیٹ کر انجن اون کیا...... ہوگئی تمہاری گاڑی فٹ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ اس نے آواز دی اے مسٹر...... تم مزدوری تو لینا ہی بھول گئے۔ اس نے پانچ سو کا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھا میں نے کہا...... مزدور اپنی مزدوری لینا کبھی نہیں بھولتا۔ مزدوری نہیں لے گا تو کھائے گا کیا۔ موتی نے گراج بند کیا...... ہم دونوں چل پڑے۔ اس نے موڑ پر گاڑی روک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے اور موتی نے ہنس کر کہا...... گڈ نائٹ۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔

چار دن ہوگئے تھے...... پھر ہم دونوں گراج نہیں گئے۔ دو دن کے بعد نندنی کی مہندی کی رسم تھی۔ صبح سے ہی مہمانوں کا تانتا بندھا تھا۔ موتی نے اور میں نے مالی کا روپ دھار کر نندنی کے باغ میں پرویش کیا...... میرے ہاتھ میں کھرپی اور موتی کے ہاتھ میں پھاؤڑا تھا۔ لڑکیوں نے ہم دونوں کو دیکھتے ہی ہماری طرف قدم بڑھائے۔ ایک سے ایک خوبصورتی کا نمونہ حاضر تھا...... قیمتی خوبصورت لباس اور قیمتی زیورات ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ لڑکیوں کی ٹولی نے ہم دونوں کو گھیر کر ہمارا مذاق اڑانا شروع کیا۔ خوب قہقہے مارے۔ ایک ہنس کر بولی...... دیکھو دیکھو...... نندنی کے دونوں مالی بڑے شاندار ہیں...... دوسری بولی...... دولت ہو تو مالی بھی اسپیشل رکھا جاسکتا ہے۔ ٹولی میں وہ نہیں تھی...... میں نے دور سے اسے آتے دیکھا اور فوراً پاس والے گملے پر جھک گیا۔ وہ کچھ لڑکیوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہیں سے بولی...... وہ ہیرا...... ڈاکٹر...... موٹروں کا...... لڑکیوں کے جھنڈ میں سے نکل کر ہماری طرف دوڑی آئی...... میرے بالکل مقابل کھڑے ہو کر بولی ارے تم...... یہاں کیا کر رہے ہو...... میں نے کہا...... بھئی مزدور آدمی ہوں...... آج یہاں پودوں کی ڈاکٹری کر رہا ہوں۔ اس کوٹھی کا مالک بیمار ہے...... اور آج تم...... سب آرہی تھیں تو مالکن نے کہا کہ باغ کی صفائی کر دوں پل میں ساری لڑکیوں نے مجھے اور موتی کو گھیر لیا خوب تمسخر اڑایا گیا......

وہ آگے بڑھی تو موتی نے زور سے کہا we m be poor but we are also rum ani hi may ہم غریب ہیں تو کیا۔ مگر ہم بھی انسان ہیں۔ سنتے ہی سب لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا...... وہ آئی اور موتی سے بولی...... تم پڑھے لکھے ہو کر مالی کا کام کیوں کرتے ہو...... موتی نے فوراً جواب دیا...... دو لفظ انگریزی

کے بولنے سے ہی انسان پڑھا لکھا نہیں ہو سکتا...... سب اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بولیاں سیکھ بھی لیتے ہیں۔ اس کے لئے کسی مدرسے نہیں جانا ہوتا۔ تم تو پڑھی لکھی ہو...... کیا اپنی کتابوں میں یہی پڑھا ہے کہ غریب انسان۔ انسان نہیں جانور ہوتے ہیں۔ غریبوں کی کوئی عزت اور قدر نہیں۔ ہم غریبوں کی مجبوری ہے۔ پیٹ پالنے کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ڈر تو یہ ہے کہ ایک دن ایسا نہ آجائے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مجبوراً ڈاکہ بھی ڈالنا پڑے۔ بڑے لوگ ڈنکا تو بہت بجاتے ہیں پر غریبن کے لئے کرتے کراتے کچھ نہیں۔

نہیں...... نہیں...... ایسا نہ کرنا...... میرے پتا جی کا بہت بڑا بزنس ہے۔ میں تمہیں نوکری دلوا سکتی ہوں ۔ میں نے کہا...... وہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ گئے تھے سیٹھ شنکر شرما کے در پر...... کسی نے گھاس بھی نہ ڈالی۔ خدا مل جائے پر ان سیٹھ و سیٹھوں تک پہنچنا عام آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ پہرے لگا رکھے ہیں...... ہم آزاد لوگ ہیں ہمیں نہ کرنا ایسے سیٹھوں کی غلامی۔

وہ بولی تم بولتے زیادہ ہو...... سنتے کم ہو...... میں تم دونوں کو نوکری دلوا سکتی ہوں...... میں نے کہا مشکل ہے موتی تو گٹ پٹ تھوڑی انگریزی بول لیتا ہے۔ میں تو بالکل انپڑھ گنوار ہوں۔ مجھے نوکری کون دے گا...... میں دونگی...... اس نے پھر کہا......

میں نے کہا عورت کا سہارا لے کر جینے سے بہتر ہے چلو بھر پانی میں ڈوب کر نہ مر جائیں۔ کسی کے احسان تلے جینا بڑا بھاری ہوتا ہے۔ اور عورت کا احسان لینا...... ہرگز نہیں...... وہ تڑک کر بولی...... در در مارے پھرنا منظور ہے۔ ٹک کر ایک جگہ نوکری کرنا منظور نہیں ۔ وہ غصے میں بلبلاتی آگے بڑھی اور ہم دونوں پیچھے کے دروازے سے باہر نکل آئے۔

جب سارے مہمان چلے گئے ہم دونوں نندنی کے گھر پہنچے...... کچھ کھانے کو ملے گا بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کہا...... وہ بگڑ کر بولی...... اب آئے ہو فنکشن ختم ہونے کے بعد...... میری سہیلیاں آئیں تھیں۔ لگتا ہے تم دونوں کو شادی کرنا ہی نہیں ہے...... موتی نے ہنس کر کہا...... راز کی بات بتاؤں۔ کسی سے کہنا نہیں۔ مالی کے بھیش میں ہم دونوں تمہاری ساری سہیلیوں سے مل لئے۔ میں نے ہنس کر کہا۔ دو چار تو مجھے بھی پسند آ گئی ہیں۔ تم بات آگے بڑھاؤ تو نام بتاؤں...... نندنی بولی...... دو چار...... ناں بابا ناں...... مجھے ماسی سے جوتے نہیں کھانا ۔ ایک کا ذکر کرو تو بات بنے۔ میں پھر ہنس کر بولا...... سب کی سب پری لگ رہی تھیں۔ ایک کو بھی چھوڑنے کو دل نہیں کرتا...... تم نہیں بدلو گے۔ کب جائے گا تمہارا بچپنا...... بڑے پیار سے اس نے سرزنش کی...... بدل جاؤ ورنہ کنوارے ہی مر جاؤ گے...... میں نے کہا تم ایسا نہیں ہونے دو گی......

گھر میں ہماری شادیوں کا ذکر بڑے زور و شور سے چل رہا تھا۔ اماں اکثر لڑکیوں کی تصویریں سامنے رکھ کر کہتیں۔ اب بہت ہو چکا...... تم لڑکیاں پسند کرو تو میں کچھ کروں...... میں نے کہا اماں نوکری تو شروع ہونے دو...... موتی میری طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا...... کیوں اماں کو دکھ دیتا ہے۔ اٹھا لے ایک تصویر۔ اور کر دے ہاں ...... میں نے کہاں مجھے تصویر سے شادی نہیں کرنی۔ لڑکی سے مل کر۔ اسکی مرضی معلوم کر کے ہی ہاں کرونگا۔ دولت مند گھرانوں کی لڑکیاں صبح سے رات تک پارٹی کرتی ہیں کلب میں سیر سپاٹے کرتی ہیں۔ لباس دیکھے ان کے

......کتنے واہیات اور قیمتی...... غریبوں کا مذاق اڑانا تو ان کا شیوہ ہے۔ ہمدردی کا جذبہ تو ان کے دلوں میں ہے ہی نہیں۔ کیا تم کر سکو گے ایسی لڑکی کے ساتھ گزارا...... اماں نے مجھے غور سے دیکھا اور آگے بڑھ گئی......

رمیش کی سگائی میں جانے کے لئے اچھی خاصی تیاری کرنی پڑی۔ داڑھی مونچھیں بڑھانی پڑیں ......میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا...... واقعی چوکیدار ہی لگ رہا تھا...... گوپال چاچا کو کمرے میں بند کر کے میں نے اور موتی نے ان کا گیٹ سنبھالا...... ہر آنے جانے والے کو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا...... کسی کسی میم صاحب کو سلوٹ جھاڑا......

وہ وہاں بھی پہنچی...... میں نے دور سے ہی اس کی گاڑی دیکھی اور فوراً منہ موڑ لیا...... اس نے گاڑی گیٹ کے پاس روکی...... نہ جانے وہ ہم دونوں کو کیسے پہچان گئی...... گاڑی سے اتر کر میرے سامنے کھڑے ہو کر بولی...... تم...... یہاں...... بھی...... میں نے کہاں جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا۔ دراصل اس کوٹھی کا چوکیدار بیمار ہو گیا ہے۔ آج تو ہمارے بھاگ ہی کھل گئے۔ روپے تو ملینگے ہی ساتھ میں عمدہ کھانا کھانے کو بھی ملے گا۔ ہم غریبوں کو یہ نعمتیں کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ آج تو ہماری چاندی ہی چاندی ہے......

خیر ہماری چھوڑو...... یہ بتاؤ تمہاری گاڑی کا مزاج کیسا ہے۔ وہ اپنی ہی بات پر رہی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو...... میں نے کہا ابھی تو بتایا...... تم جانتی تو ہو گی گیٹ پر آدمی کیا کرتا ہے۔ چوکیداری...... سو میں آج چوکیداری کر رہا ہوں...... پکی نوکری کی کھوج جاری ہے۔ مل جائے گی......

وہ میری طرف دیکھ کر بولی...... میری بات مان لو۔ میں نے کہا...... عورت کی بات؟ جس مرد نے عورت کی بات مانی وہ بے موت مارا گیا۔ اور مجھے مرنے کا شوق بالکل نہیں۔ تمہاری دی ہوئی روٹی مجھے کھانا منظور نہیں...... اسے بھی غصہ آ گیا...... بولی تم دونوں احمق ہو...... آج چوکیداری کر رہے ہو کل ٹھیلا گھسیٹو گے۔ میں نے کہا تم نے یہ تو سنا ہی ہو گا کہ بابا آدم نے حوا اماں کی بات سنی اور دونوں باغ عدن سے نکالے گئے۔ ہم زیادہ تو نہیں جانتے بس اتنا جانتے ہیں گوسوامی تلسی داس نے بھی کہا۔ ڈھول...... گوار...... شودر پشو...... ناری...... سب تارنا کے ادھیکاری...... اگر ہمارے گاؤں میں کوئی عورت کسی مرد کو احمق کہہ دے تو مرد عورت کا حال برا کر دے۔ آج کہی سو کہی آئندہ ایسی بات کسی مرد سے نہ کہنا...... ورنہ......

شاید وہ برا مان گئی یا پھر شرما گئی...... خاموشی سے اپنی موٹر میں جا کر بیٹھ گئی ہم پھر گیٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے موتی سے کہا بس بہت ہو چکا اب گھر چلو...... اماں جس لڑکی کو پسند کرینگی میں تو اسی سے بیاہ کر لونگا...... لڑکی کی تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ عورتوں کا کام ہے۔ عورتیں ہی جانیں۔ کچھ دن نرسنگ ہوم کی تیاری میں بیت گئے۔

اماں کے سر پر تو ہم دونوں کی شادی کرنے کی ضد سوار تھی۔ صبح ناشتے کے بعد بولیں آج شام چار بجے تیار رہنا...... ہمیں لڑکی دیکھنے جانا ہے۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کون لڑکی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ ہم محل نما کوٹھی میں بیٹھے لڑکی کی آمد کے منتظر تھے۔ بیحد خوبصورت بنارسی ساڑی میں۔ بالوں میں پھول سجائے وہ ہولے ہولے چلی آ رہی تھی...... میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا...... امبر سے کہا...... بھئی یہ تو وہی ہے...... آ گئی ہم دونوں کی شامت

......اس سے پہلے یہ ہماری ساری پول کھول دے یہاں سے بھاگ چل......سب کی نظریں ہم پر تھیں...... بھاگتے بھی کیسے......وہ بیٹھ گئی......کچھ پلوں کے بعد اس نے اوپر دیکھا......اسے تو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو......اچھل کر کھڑی ہوگئی......تم دونوں یہاں بھی......اماں مجھے اس انپڑھ گوار آدمی سے شادی نہیں کرنا......اس سے اچھا لڑکا میرے لئے تمہیں کہیں نہیں ملا......پھر میرے اور امبر کی طرف دیکھ کر بولی......اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنا پیٹ تو پال نہیں سکتے چلے مجھ سے شادی کرنے......اسکی اماں نے کہاں......اور دو چار پاس بیٹھی خواتین نے سمجھایا ......کہ تمہیں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ وہ اور زور سے چیخی......نہیں......یہ غلط فہمی نہیں......حقیقت ہے۔ اس شخص کا نام ہیرالال ہے۔ یہ موٹر میکنک ہے۔ اپنے کو کبھی موٹر کا ڈاکٹر تو کبھی پودوں کا ڈاکٹر کہتا ہے......اور یہ دوسرا......اسکا اسسٹینٹ ہے۔ موتی لال......میں ان دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں......یہ دونوں پکے فراڈ ہیں۔ پچھلے ہفتے رمیش کے گھر چوکیداری کر رہے تھے۔

اس شخص نے میری گاڑی دیکھ کر ڈیڈی کے بزنس اور بینک بیلنس کا پتا لگا لیا ہوگا......ان کے پاس تو ٹوٹی پھوٹی سائیکل بھی نہیں ہے۔ میں نے تو ان دونوں کو جب بھی دیکھا پیدل چلتے ہی دیکھا۔ اس کا غصہ میں تمتماتا چہرہ بیحد سندر لگ رہا تھا میں اور امبر کسی حال ہونٹوں میں ہنسی دبائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا ......سب ہمارا منھ تک رہے تھے۔

وہ جانے کو مڑی......میں نے اپنے لہجے کی ترشی پر قابو کرتے ہوئے کہا......ٹھہرو......اپنے گھر بلا کر کیا خوب سواگت کیا ہے مہمانوں کا......تم کو جو کہنا تھا کہہ لیا اب کچھ ہماری بھی تو سنو......کیا خطا ہے ہماری......کیا کبھی تمہارے ساتھ گستاخی کی یا کبھی تمہارا دامن پکڑا......ہم سے شکایت ہے یا ہماری غریبی سے......مانا کہ غربت بری بلا ہے۔ سب سے بڑا داغ ہے۔ زندگی کی ہر خوشی غم میں بدل دیتی ہے۔ پر غریبوں سے اتنی نفرت......ایک بات تو بتاؤ......اس بے تحاشا دولت سے تمہارا دل اچاٹ نہیں ہوجاتا۔ خود نمائشی کرتے کرتے تھک کر دل نہیں گھبراتا ......کیا یہی تم نے سیکھا ہے کہ اپنی ساری دولت اپنے اوپر ہی صرف کردو......قیمتی کپڑے اور زیورات۔ بنگلے گاڑیاں ۔ دن رات کلب میں پارٹیاں......بس یہی زندگی ہے......نہ کسی کی تلاش نہ کوئی جستجو......نا کوئی منزل......مقصد کیا ہے تمہاری زندگی کا......چہرہ اتنا خوبصورت اور سینے میں دل پتھر کا......کسی کے لئے اس خود غرض دل میں پیار اور ہمدردی نہیں۔ بڑی بے لطف زندگی بسر کر رہی ہو......ہر دولتمند باپ کی مغرور بیٹی یہی سوچتی ہے کہ ہر مرد اس کے باپ کی دولت ہڑپنا چاہتا ہے۔ مگر سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔ یہ دولت تو آنے جانے والی شے ہے اس پر کیا یقین کرنا۔

آج میں تمہاری غلط فہمی کا علاج کر کے ہی جاؤنگا......وہ حسب توقع جل کر بولا......میری غلط فہمی کا علاج تم کرو گے......میں نے بڑی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا......کسی کو تو کرنا ہی ہوگا......ورنہ یہ تمہاری غلط فہمی تمہیں برباد کردے گی......میں نہیں تو کوئی اور سہی......جتنی جلدی امیری کا بھوت سر سے اتر جائے گا تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ یہ سن کر تو وہ اور بھی جل بھن گئی......دفع ہوجاؤ یہاں سے......مجھے کچھ نہیں سننا......میں نے کہا آج کل عورتوں کی آواز سب سنتے ہیں۔ عورتوں کا بول بالا ہے۔ جھوٹی رپورٹ لکھا کر کتنے ہی شریف مردوں

کو جیل بھجوا چکی ہیں۔ مجھے بھی تو اپنی صفائی میں کچھ کہنے دو...... کسی طرح تمہارے لگائے الزاموں سے تو چھٹکارا ملے......

میں اس کے بالکل قریب گیا...... ذرا سا جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا...... کیا واقعی ہم چلے جائیں...... سوچ لو...... آج چلے گئے تو پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئینگے...... وہ ٹپٹا گئی اور میں نے پلٹ کر سب کی طرف دیکھ کر کہا...... افسوس کہ میرے منصف کو اپنے اس غریب ملزم کا نام تک نہیں معلوم۔ یہ ہیرالال...... جو یہ بار بار دوہرا رہی ہیں یہ نام انہوں نے ہی مجھے دیا...... میں نے اسکی طرف دیکھا اور کہا...... یہ تو فروڈ نہیں ہے۔ میں ہیرالال نہیں۔ اشوک شرما ہوں۔ اپنا نام بھی تو بتاؤ۔ تا کہ کل جب میرے دوست میری اداسی کا سبب پوچھیں تو...... اس کے پاس جا کر سرگوشی کی...... تو اپنے قاتل کا نام تو بتا سکوں۔ اس کے چہرے پر حسین سی سرخی پھیل گئی۔

شاید میرے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ڈولتی شرارت کام کر گئی...... اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا بڑے ہولے سے بولی...... میں...... میں مشٹی ہوں...... میں ہنس دیا...... مشٹی...... اور اتنی جھال...... تمہارا نام تو مرچی ہونا چاہیئے تھا...... بہت غصہ کرتی ہو...... میں نے پہلے بھی کہا تھا غصہ کرنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔

خوشی ہوئی اور ساتھ فخر بھی، تم سے مل کر کہ ہمارے معاشرے میں ایک تو ایسی لڑکی ہے جس نے اپنے حق کے لئے کھلے عام آواز بلند کی...... مجھے نہ تمہاری دولت کی چاہ ہے نہ سہاروں کی ضرورت ہے، دل کی تو ایک ہی تمنا ہے کہ کوئی تو اپنا ہو...... کوئی تو مجھے جانے اور سمجھے...... میرے اندر کی گہرائیوں تک کو جان لے...... راستہ کوئی بھی ہو...... پھولوں سے بھرا یا کانٹوں سے اٹا...... میرے ساتھ میری چنی راہ پر قدم سے قدم ملا کر چلے۔ جب دو افراد دل سے ایک دوسرے کو تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ خود بخود ایک دوسرے کے لئے قربانیاں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کے سفر میں ساتھ رہتے ہیں۔ میری منزل بہت دور ہے۔ اور راہ بہت کٹھن...... بس ایک ہی خواہش ہے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو اپنا شیوہ بنالوں...... غریبوں کو مفت علاج دلوا سکوں...... محتاجوں کو کھانا کھلا سکوں...... اندھوں کو راستہ دکھا سکوں...... اس دل میں جھانک کر تو دیکھو...... یہ دل بہت وسیع ہے...... اس میں صرف تم ہی نہیں...... اور بہت دکھیاروں کے درد سما جائینگے...... ایک بار مجھے اس قابل تو سمجھو...... اوہ...... میں بھی کیا کہہ بیٹھا...... بھلا پھولوں میں بسنے والی اپنے پاؤں کیوں زخمی کرے...... کمرے میں سناٹا چھا گیا...... سب کی نظریں میری طرف تھیں اور میں اسے ہی تکے جا رہا تھا پھر اس کی نظریں جھکتی چلی گئیں۔

تب ہی ایک لڑکی اندر آئی...... امبر اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے پرانی آشنائی ہو۔ مجھے یاد آیا امبر نے ہی تو مجھے بتایا تھا کہ کسی تقریب میں اس کا سامنا ایک بہت سادہ سی لڑکی سے ہوا تھا جو وکیل تھی امبر اس کی سادگی پر دل و جان سے قربان ہو گیا تھا...... آج وہی لڑکی اچانک سامنے تھی۔ کیونکہ دونوں کی نگاہوں سے بھروسہ اور یقین چھلک رہا تھا۔ تب ہی وہ بولی...... میں وکیل ہوں...... غریبوں پر ظلم ہوتے روز ہی دیکھتی ہوں اور کچھ کر نہیں پاتی...... غریبوں کی مدد کرنا تو ہم سب کا فرض ہے۔

مشٹی کی دادی کمرے میں آئیں...... بولیں...... گنگا...... دیکھنے تو ایک لڑکی کو آئی تھیں...... ہماری چینی

بھی......اماں فوراً بولیں...... مجھے دو بہنوں کی تلاش تھی ......امبر جو ہاں سننے کو بے قرار تھا۔ فوراً بولا......اب تو تھوڑی مٹھائی کھالی جائے۔ وہ کھٹی میٹھی شام ہم سب کی سب سے پیاری شام تھی۔

اماں بولیں...... مشٹی ......تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ دونوں میرے بیٹے بیکار ہی ہیں۔ اور بیکار انسان ہی شرارتیں کرتے ہیں......تیار ہو جاؤ کام کرنے کے لئے۔ شادی کے بعد ہی ان دونوں کا نرسنگ ہوم تیار ہو جائے گا......تم چاروں کو مل کر اسے چلانا ہوگا ...... یہ دونوں ڈاکٹر ہیں پر ہیں ایک ایک دوسرے کے اسسٹینٹ ہی...... کمرے کا ماحول خوشیوں میں ڈوب گیا تھا......سب کے چہروں پر شادمانی ہی شادمانی تھی......

☆☆☆

سہارے کی تلاش میں

میں بے حد پریشان اپنے ہی سوچوں میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ اندرا کی تالی کی آواز پر چونکی تھی۔ فوراً ہی میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے سوال کیا...... تم کب آئیں......؟ وہ ہنس کر بولی...... دیر سے کھڑی تمہارے حکم کی منتظر ہوں۔ تم اجازت دو تو میں بیٹھوں......

میں نے کہا تم امریکہ میں نہیں ہندوستان میں کھڑی ہو۔ صرف دو سال امریکہ میں رہ کر تم اپنے سارے ہندوستانی طور طریقے بھول گئیں۔ ہمارے دیس میں بہنوں کو اپنے بھائیوں کے گھر آنے اور رہنے کے لئے کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بھائی کے گھر کے کواڑ اپنی بہن کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

وہ بولی یہ سب طور طریقے اب پرانے ہو چکے ہیں۔ تم کب تک گذری صدی میں جیتی رہو گی۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ اسی تیز رفتاری سے ہمارے قدیمی رسم ورواجوں کی قدریں بھی بدلتی جارہی ہیں۔ رشتوں کی کڑیاں بے حد کمزور پڑتی جارہی ہیں۔ ذرا سا آپسی تناؤ بڑھتے ہی کڑیوں کے دہانے کھل جاتے ہیں اور خاندان بکھر جاتے ہیں۔ میں نے کہا جس رشتے میں صداقت اور پختگی کی کمی ہو وہ ٹک نہیں سکتا۔ مگر یاد رکھنا ہم بدلنے والوں میں سے نہیں ہیں۔

وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ تمہارا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے کہ تم نے آج پھر اعلان جنگ کر دیا ہو۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی...... بھگوان تم میرے بیچارے بھائی جان کو اس لڑکی کے عتاب سے بچائے رکھنا۔...... میں بھی مسکرا کر بولی۔ بھائی کی اتنی طرفداری کرنا ٹھیک نہیں۔ وکیل صاحبہ کبھی تو اپنی اس معصوم سی بھابھی کی بھی وکالت کر دیا کرو۔ یاد رکھو تم میری نند کم اور سہیلی زیادہ ہو۔

شاید وہ میرا بگڑا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... بولی...... سچ تم جھگڑتی بہت ہو...... سنبھل جاؤ...... ''ورنہ'' ورنہ کیا...... میں نے کہا...... ایک وکیل کی زبان سے نکلا یہ ایک لفظ ''ورنہ'' بہت معنی خیز ہوتا ہے۔ مجھے تو تمہارا کہا یہ ایک لفظ خوفزدہ کر دیتا ہے...... اندرا مجھ سے صرف دو سال بڑی تھی۔ بڑی ہونے کے ناطے وہ مجھے ڈانٹنے پھٹکارنے کا حق بڑے خوبصورت انداز میں پورے حق سے ادا کرتی تھی۔ میں بھی یہ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے میرا اپنا...... مجھے میری غلطیوں اور خامیوں کا احساس دلانے والا۔

وہ پھر بولی...... تمہارا بے رنگ چہرہ تمہاری اندرونی فکر اور پریشانی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کیا بھائی جان سے خفا ہو۔ میں نے کہا ہماری ہر جنگ میں ہمیشہ جیت تمہارے بھائی جان کی ہی ہوتی ہے۔ جہاں دل جھکے وہاں سر جھکنا تو لازمی ہے۔ ہمارے دیس میں آج بھی شوہر اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ امیر ہو یا غریب تعلیم یافتہ ہو یا انپڑھ ہر مرد چاہتا ہے اس کی بیوی اسے سجدہ کرے اور اس کی بندگی کرے۔ کوئی عورت اپنے شوہر سے تن کر مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جیت ہمیشہ مرد کی ہوتی ہے۔ بالکل تمہارے بیچارے بھائی جان کی طرح

سچ تو یہ ہے کہ پیار کے اس انوکھے رشتے میں جیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پیار میں تو صرف ہار ہی ہار ہے۔ اور اسی ہار میں عورت کی زبردست جیت چھپی ہے۔

ہاں کبھی کبھی اعلان جنگ کرنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ مزے مزے کی شکایتیں اور چھوٹے چھوٹے گلے شکوے ہی نہ ہونگے تو روٹھنے اور منانے کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا اور زندگی بے رونق ہو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے گلے شکوے ہی زندگی میں لطف بھر دیتے ہیں۔۔ بالکل چاٹ مسالے کی طرح۔

سچ تو یہ تھا کہ میں اپنی پریشانیوں کا پٹارا اندرا کے سامنے کھولنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کے اندر جو راز چھپے تھے میں خود بھی ان سے بہ خوبی واقف نہ تھی۔ رادھا چائے کی ٹرالی دھکیلتی کمرے میں آئی۔ اندرا اسے ایک خاص توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت میں نے بھی رادھا کی سمت دیکھا تھا...... جیسے ہی رادھا کمرے سے باہر گئی اندرا نے کہا...... تمہارے گھر میں رہ کر اس کی تقدیر چمک گئی۔ اس سوکھی ساکھی جھاڑی پر بھی بہار چھا گئی۔ اس کی صحت بہتر ہوتے ہی اس کے مرجھائے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ ایک کم عمر بدھوا کے لئے تین تین بچوں کو پالنا بہت مشکل کام ہے...... آج ہماری جنرل میٹنگ ہے۔ میں رادھا کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ...... شوق سے مدد کرو...... اور جلدی کرو...... ایسی بے سہارا اور بے کس عورتوں کی مدد کرنا تو ہم سب کا فرض ہے۔ سوشل ورکز ڈنکا تو بہت پیٹتے ہیں۔ کرتے کراتے کم ہی ہیں۔ تم ضرور کچھ کر پاؤ گی۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بے حد مدھم لہجے میں بولی...... رادھا کو دیکھنے سے یوں لگ رہا ہے کہ جلد ہی چوتھا آنے والا ہے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا...... کیا...... کہہ رہی ہو...... چوتھا کیا......؟ وہ بولی ...... بچہ...... میں اچھل ہی پڑی...... کیا بک رہی ہو۔ اس کی نیک چلنی کا ذکر سن کر ہی تو میں نے اسے گھر میں رکھا ہے۔ رادھا جیسی ذمے دار عورت کوئی غلط قدم اٹھا ہی نہیں سکتی۔ اس پر شک کرنا بھی پاپ ہے۔ وہ بولی کسی عورت پر اتنا بھروسہ کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ آخر انسان ہی ہے۔ قدم ڈگمگا بھی سکتے ہیں۔ میرا سابقہ تو روز ہی ایسی عورتوں سے پڑتا ہے...... چلو...... بچہ نہ بھی ہو...... شاید ٹیومر ہو...... علاج تو تمہیں کروانا ہی ہے سو جلد ہی اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجو...... میں بے حد گھبرائی ہوئی تو تھی ہی...... فوراً ڈاکٹر مکرجی کو سارا حال سنایا اور رادھا کو ہسپتال بھیجنے کا حکم دیا۔ ادھر مجھے لمحہ لمحہ کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر مکرجی کا فون آیا۔ یہ سن کر کہ رادھا کو نہ t b ہے اور نا ہی ٹیومر اور نا ہی اسے کسی علاج کی ضرورت ہے میں نے کہا ڈاکٹر صاحب پھر کوئی فکر کی بات تو نہیں۔ کچھ رک کر ڈاکٹر بولے فکر کی بات ہے۔ ایک بدھوا کے پیٹ میں بچہ ہونا بہت زیادہ فکر کی بات ہے۔ ایک لفظ "بچے" نے مجھے دہلا دیا۔ بے ساختہ ہی میرے منہ سے نکلا...... نہیں...... ڈاکٹر صاحب...... ایسا نہیں ہو سکتا...... وہ بولے میں پورے ثبوت کے ساتھ آپ سے ملنے آؤنگا۔

میں ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مع ثبوت کے حاضر ہو گئے۔ میں دم بخود ایکسرے پلیٹ کو تاکتی رہ گئی۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں میرا دل اس پر ہرگز یقین کرنے کو راضی نہ تھا۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کے ہسپتال میں روزانہ درجنوں ایکسرے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی دوسری عورت کا ایکسرے آپ کو تھما دیا ہو

...... یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ڈاکٹر نے میری احمقانہ بات پر نہ دھیان دے کر کہا...... ان حالات میں رادھا کو کوٹھی میں رکھنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتی ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بلوا کھڑا کر دیتے ہیں اور یہ معاملہ تو بہت ہی سنگین ہے۔ کبھی کبھی اس طرح کی ہمدردیاں گلے پڑ جاتی ہیں ڈاکٹر کی خوفناک باتوں نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا۔

میرے ذہن میں ڈستے۔ چبھتے سوال ابھرنے لگے...... میں ایک بدھوا کے مقدر پر رو پڑی۔ رادھا کو دیکھ کر۔ غم۔ غصہ۔ فکر۔ سب ایک ساتھ میرے دماغ پر سوار ہو گئے۔ جی چاہا رادھا کو خوب لتاڑوں۔ پھٹکاروں اور دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دوں۔ مگر پھر خیال آیا یہ کہاں جائے گی یہ تو بے گھر ہے۔ ڈوبتے کو بچانا ہی انسانیت ہے سوچ کر میں خاموش بیٹھی رہ گئی۔

رادھا میرے پاس بیٹھ کر بولی...... ڈاکٹر صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ آپ ہی بتاؤ ایک بدھوا کے پیٹ...... میں غصہ میں بلبلا اٹھی...... تم نادان بچی نہیں ہو...... ماں ہو۔ اپنے سوال کا جواب تم خود جانتی ہو۔ وہ اسی سنجیدگی سے بولی...... اماں میرا یقین کرے میں کسی مرد کو نہیں جانتی۔ پھر...... بچہ...... کیسے...... اس کی بے حیائی پر میرا پارہ اور چڑھ گیا۔ میں چیخ پڑی...... اپنی بکواس بند کرو اور جاؤ...... میں تمہارے جیٹھ سے بات کرونگی...... وہ رو پڑی...... ایسا نہ کرنا...... وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گا...... پھر آہستہ سے بولی...... جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا...... اسی کوٹھی میں ہوا...... مجھے لگا رادھا نے ایک نہیں کئی وزنی پتھر میرے سر پر دے مارے ہوں۔ میرے جسم میں عجب سی سنسنی پھیل گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنی طرف بڑھتے اس ہولناک سیلاب کو کس طرح روکوں۔ مجھے ڈاکٹر کے مشورے میں ہی عافیت نظر آئی۔ کچھ دیر مکمل خاموشی طاری رہی۔ جب آپ سب دہلی گھومنے گئے تھے...... وہ رو کر بولی......

مجھے غصہ...... فکر اور گھبراہٹ نے ایسا دبوچ رکھا تھا کہ میں اپنی آواز کی تیزی اور تلخی کم نہ کر سکی۔ ...... میں کراری آواز میں بولی...... میں نے تمہیں کوٹھی میں آنے کو منا کیا تھا...... تم میری غیر حاضری میں کوٹھی میں کیوں آئیں...... وہ ہولے سے بولی...... ہاں اماں کیا تو تھا...... میں خود نہیں آئی میری مجبوریاں مجھے کھینچ لائیں میں دہاڑی...... تم اچھی خاصی زندگی بسر کر رہی ہو۔ کیسی مجبوری کون سی مجبوری...... وہ اپنا قصہ سنانے لگی......

میں تو شروع کی بدنصیب ہوں...... جنم سے ہی میرا رشتہ غریبی سے جڑا رہا۔ گاؤں میں بھوک ہمیشہ میرے ساتھ رہی یا یوں کہوں تو درست ہوگا میں بھوک کے ساتھ رہی۔ میں اور میری ماں سب کو کھلا کر آخر میں جو بچا کچا رہ جاتا تھا کھا کر پانی سے پیٹ بھر لیتے تھے۔ میرے باپ کے پاس نہ زمین تھی اور نا ہی گاؤں میں روزگار تھا۔ ہماری برادری میں سگے ماموں کے ساتھ بیاہ ہوتا ہے۔ میں بیاہ مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ گیارہ سال بھی نہ ہوئی تھی میرا بیاہ میرے ادھیڑ عمر ماموں کے ساتھ کرا دیا گیا جس کی گود میں میں کھیلی تھی۔ میرا سگا ماموں تھا۔ اس ظالم نے میری کم عمری کا بھی خیال نہیں کیا۔ شراب کے نشے میں چور ہو کر مجھ پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ پوری چودہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی اپنے بڑے بیٹے کی ماں بن گئی۔ پھر تین سال میں دو اور بیٹے ہو گئے۔ نہ کھانا تھا نہ تن پر کپڑے۔ نہ معلوم میرا شوہر شراب خریدنے کے لئے روپے کہاں سے لے آتا تھا۔ اس کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت مجھ

میں نہیں تھی۔ بات بے بات پر ڈنڈے برساتا تھا۔ آخر بیڑی اور شراب نے اس کا سینہ پھونک ڈالا۔ گاؤں میں تو علاج تھا ہی نہیں۔ شہر جانے کے لئے پیسے ہی نہیں تھے۔ وہ بنا علاج خون تھوک تھوک کر مر گیا۔ اور میں ۱۸ سال کی عمر میں بدھوا ہو گئی۔

جب تک وہ کھٹیا پر پڑا پڑا خون تھوکتا تھا مجھے لگتا تھا کوئی تو ہے میرا اپنا...... میرے بچوں کا باپ...... جس دن وہ مرا مجھے ایسا لگا کہ میں اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ ایک دم تنہا...... دنیا والوں سے دور...... بہت دور...... میں بہت ڈر گئی تھی...... جب کوئی مدد نہ ملی تو یوں لگا کہ دنیا والوں نے مجھے اور میرے بچوں کو مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ جب بھوک سے بچوں کو بلبلاتے دیکھا تو یوں لگا کہ بھگوان نے بھی مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اسی دن سے میرے اندر ڈر اور دہشت سما گئی۔ ہر وقت سوچتی رہی کہ میرے بعد میرے بچوں کو کون سہارا دے گا۔ بس وہی ڈر مجھے اندھیروں میں ڈھکیلتا چلا گیا...... دوسرے دن میرا جیٹھ جو میرا بڑا ماموں بھی ہے مجھے یہاں لے آیا۔

رہتی اپنوں کے ساتھ تھی پر میرے اپنوں نے کبھی میری پروا نہیں کی۔ کسی نے کبھی اپنائیت کا احساس نہیں دیا۔ سب کی بے توجہی نے مجھے بے حد خوفزدہ اور بے اعتماد کر دیا تھا۔ میری کوئی دوست نہیں تھی۔ کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بھرپور یقین دلایا تھا کہ وہ میرا سچا دوست ہے۔ اور ان کی دوستی کبھی نہیں چھوٹے گی۔۔

آخری دم تک نہیں...... دوستی تک تو ٹھیک تھا...... پھر وہ میرا پیچھا کرنے لگا...... میں جہاں جہاں جاتی وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آتا میں اس سے دور بھاگتی۔ وہ سنہری قسموں وعدوں سے بھرا محبت کا کاسہ لئے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا...... وہ پہلا مرد تھا۔ جس نے لگاوٹ کا اظہار کیا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر قدم پر میرا ساتھ دے گا۔ میرے بچوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ وہ غیر تھا۔ اجنبی تھا۔ مگر وہ میرا بن گیا تھا۔ میں احمق تھی۔ مرد کی خصلت سے واقف نہ تھی۔ اس کی ہر بات کا یقین کر لیا۔ اور آج آفتوں میں گھری بیٹھی ہوں۔

تب ہی اندرا آگے آگے اور رادھا کا جیٹھ زور زور سے روتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ بولا...... اگر میں زور زبردستی اس کی دوسری شادی کر دیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اندرا نے فوراً سوال کیا۔ کس سے بیاہ کر دیتے۔ کیا کوئی اچھا لڑکا تمہاری نظر میں تھا۔ وہ بولا...... آدمی آدمی ہوتا ہے۔ اچھا برا جیسا بھی ہو۔ اس کی عمر کا جوان مرد تین بچوں کی بدھوا ماں سے شادی کرنے کو کیوں راضی ہو جاتا...... اندرا بولی تو تم اسے دوبارہ بوڑھے مرد کے کھونٹے سے باندھنے جا رہے تھے۔...... ہاں ماں جی شوہر بوڑھا ہو یا لاغر...... عورت کے سر پر مرد کا سایہ ہی کافی ہوتا ہے۔ دوست تھا میرا...... سرکاری ملازم تھا۔ ۴ بچوں کا باپ تھا۔ بڑی مشکل سے بیاہ کے لئے راضی ہوا تھا۔ مگر وہ رادھا کے بچوں کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے کہا تھا تو رادھا کو لے جا اس کے بچے میرے ساتھ رہینگے۔ مگر رادھا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ اگر یہ بوڑھا میرے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کرے گا تو میں اس کی اور اس کے بچوں کی غلامی کیوں کروں۔ میں یہاں اپنی برادری کا سرپنچ ہوں۔ برادری کے سارے معاملے ہم خود ہی نمٹاتے ہیں۔ گاؤں میں ایسی عورت کو پھونک ڈالتے ہیں۔ میں اس کلموہی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میری اور میرے پریوار کی عزت مٹی میں ملا دی ہے میں بھی اسے مٹی میں دفن کر دونگا۔ اور وہ بھی زندہ...... وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر رادھا کے گلے کی طرف لپکا۔ اندرا نے فوراً ہی رادھا کو اپنی طرف کھینچا...... بولی یہ تمہارا گاؤں نہیں شہر ہے۔

رادھا کے مرنے سے تمہاری کھوئی ہوئی عزت تمہیں واپس نہیں مل سکتی۔ ذرا سوچو اگر تم جیل گئے تو رادھا کے بچے جو تمہارے بھائی کے بھی بچے ہیں ان کا پالن پوسن کون کرے گا۔ وہ تینوں کیا سڑک پر بھیک مانگیں گے۔ بہتر ہے تم اپنے گھر جاؤ۔ وہ بولا یہ کہتی ہے اس کے ساتھ جو بھی ہوا اسی کوٹھی میں ہوا تھا۔ آپ ہی اس کیس کو سنبھالیں۔ وہ روتا سسکتا اور بے بسی سے اپنے ہاتھ ملتا باہر نکل گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔

اندرا نے پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی اب تو اپنے ذہن کے تالے کھولو۔ آنکھیں کھول کر دیکھو یہ زمانہ بھلائی کا نہیں ہے اور یہ کیس بھی معمولی نہیں ہے۔ جو عورت خود اپنی نگرانی نہ کر سکی وہ تمہاری بچیوں کی نگرانی کیا کرے گی۔ تمہیں اب رادھا پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کہیں ایک دن یہ تمہیں بھی کسی بڑی آفت میں نہ ڈال دے۔

رادھا پھر چائے لے کر حاضر تھی۔ اندرا نے اسے بتایا کہ برسوں پہلے اسی کالونی میں ایسا ہی ایک کیس ہوا تھا۔ لڑکی کورٹ تک پہنچی تھی اور کیس جیت گئی تھی۔ اسے بچے کی پرورش کے لئے ہر مہینہ باپ سے روپیہ ملتا تھا۔ اگر رادھا چاہے تو وہ بھی عدالت کے دروازے کھٹکھٹا سکتی ہے۔ رادھا ایک بڑی غلطی تو تم کر ہی چکی ہو۔ جس آدمی نے تمہارے وجود کو کچل کر رکھ دیا۔ تمہیں دنیا والوں کی نظروں میں گرا دیا اسے بھی تو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیئے۔ تمہاری یہ خاموشی تمہارے اور تمہارے آنے والے بچے کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ شاید تمہاری یہ چپ اسے اور نڈر بنا دے اور وہ کسی اور نئے شکار کی تلاش میں دندناتا پھرے۔ اپنی پیاس بجھانے کی چاہت میں تم جیسی کسی اور مجبور اور بے بس لڑکی کی زندگی تباہ و برباد کر دے۔ آج کی عورت اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جنگ کر رہی ہے۔ تم بھی آگے بڑھو۔

ماں جی میں نے جب سے ہوش سنبھالا دوسروں کی حکم حضوری ہی کرتی آئی ہوں۔ کسی نے کبھی مجھے انسان نہیں سمجھا۔ میں سب کی نظروں میں صرف ایک کام کرنے والی مشین ہی رہی۔ جی تو رہی تھی مگر اپنے لئے نہیں۔ ان سب کے لئے جنہیں میری ضرورت تھی۔ کبھی کسی نے لاڈ نہیں اٹھائے۔ کبھی کسی کو میرے دکھوں کا احساس ہوا ہی نہیں۔ مجھ سے کسی نے یہ نہیں پوچھا۔ رادھا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ تو کیا چاہتی ہے۔

جسے کبھی پیار نہ ملا ہو اسے زندگی سے واسطہ نہیں رہ جاتا۔ وہ جیتا تو ہے مگر مر مر کے۔ اس کے لئے موت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس کے اندر کچھ بھی نہیں بچتا۔ پیار کے بغیر انسان اندر سے بالکل کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ راکھ ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک ایسی ہی عورت تھی۔

وہ پہلا شخص تھا جس نے میری ناز برداری کی۔ اس کی پہلی مسکراہٹ نے میری مردہ روح اور مردہ جسم میں زندگی کی جان پھونک دی تھی۔ اس نے پیار سے جب مجھے پہلی بار چھوا تو میرا دل جی اٹھا اور یکا یک دل میں پیار کے جذبوں کی ترنگ نے جنم لیا۔ اس کے پیار کی سریلی دھن پر میرے من کا مور ناچنے لگا۔ پھر تو میرے پاگل دل کی ہر دھڑکن اس کا ہی انتظار کرنے لگی۔ جدھر جدھر نظر جاتی ہر سو پیار ہی پیار بھرا نظر آتا۔ اس کے پیار نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ کتنی آسانی سے اس نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔ میری دنیا چھین لی۔ جب اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تو وہ خاموشی سے میری زندگی سے باہر نکل گیا۔ مجھے رسوا اور برباد کر گیا۔ پر میں کیا کرتی ماں جی۔ میں مجبور تھی

میری جان تو پیار کی پیاسی تھی ہی۔اس کے پیار نے میری بے جان زندگی میں ایک نئی روشنی بھر دی۔ میں دیوانی ہوگئی تھی۔ بہت کوشش کی اپنے آپ کو سمجھانے کی۔ اپنے قدم روکنے کی۔مگر میرا پاگل دل نہ مانا۔ وہ جو کہتا گیا وہ میں کرتی گئی۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اس کے مرضی کے خلاف میں سانس تک نہ لے سکتی تھی۔ یہ محبت بھی بڑی زہریلی شے ہے۔اس کا زہر انسان کو بے خود کر دیتا ہے۔ مجھے تو اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی پھر دنیا والوں کی کیا پرواہ کرتی......

ہوش تو تب آیا جب اس نے اپنے گاؤں جانے کی بات کی اور وہ بھی اکیلے۔ بولا اگر وہ مجھے ساتھ لے گیا تو گاؤں والے ہم دونوں کو ختم کر دینگے۔تو زندہ رہ کر بچے پال۔ میں واپس لوٹ کر آؤنگا تب آگے کی سوچیں گے۔اب یاد آیا کہ کوئی مرد کسی ننگے سر پر چادر نہیں ڈالتا وہ عورت کے تو تن کا لباس نوچ لیتا ہے۔ میں نے کہا واقعی تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ بولی میں مانتی ہوں کہ میں نے غلط کام کیا ہے مگر جو شیلا کے ساتھ ہو رہا ہے کیا وہ ٹھیک ہے۔اس کے پریوار کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ راجیش بابو شیلا کے کمرے میں رات گذارتے ہیں۔ راجیش بابو کی بیوی بھی جانتی ہے مگر اس میں منھ کھولنے کی ہمت نہیں۔ اگر بولی تو وہ گھر سے باہر پھینک دی جائے گی۔ اپنے بچوں کی خاطر سب کچھ سہے جا رہی ہے۔ مردوں کی ہر غلطی پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے مگر۔ ہم عورتوں کو اسی گناہ کی کڑی سزا دی جاتی ہے۔

چندر مکھی اپنی بیمار دیدی کی سیوا کرنے آئی تھی۔ مگر بہنوئی دیکھتے ہی چندر مکھی پر مر مٹا۔ جب اس کا حال بھی میرا جیسا ہوا تو اس کے آگ لگا دی اور افواہ پھیلادی کہ چندر مکھی پاگل ہوگئی تھی۔ آگ لگا کر مر گئی۔

اندرا نے کہا ہمیں تو اپنے سماج کے ساتھ رہ کر جینا پڑتا ہے۔ سماج کے بنائے رسم ورواجوں اور دستوروں کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔ کبھی سوچا تمہارا کیا حشر ہوگا۔ وہ بولی میرا حال جو ہو سو ہو...... ماں جی غریبی اور بے سائیگی دو بڑی بلائیں ہیں۔ مجھ جیسی غریب اور بے سہارا گھبرا کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان کا سودا بھی کر بیٹھتی ہے۔اس نے میرے بعد میرے بچوں کو سہارا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس کے منھ سے نکلے ہر حرف کو پتھر کی لکیر مان لیا تھا۔ ماں جی جسمانی رشتے محبت کے رشتے کو قائم اور مضبوط کرنے کے لئے ہی تو ہوتے ہیں۔

اندرا بولی غیر مرد کے ساتھ جسمانی رشتے نہیں جوڑے جاتے۔ شادی بیاہ کیوں ہوتے ہیں۔ سماج اور دنیا والے ایسے رشتے کو رشتہ نہیں سمجھتے ...... رادھا بلک پڑی۔ رو رو کر بولی مجھے بچالو میں اپنے بچوں کی خاطر جینا چاہتی ہوں۔ وہ روتی دھوتی باہر نکل گئی۔

اندرا بولی واقعی یہ محبت بھی بڑی زہریلی شے ہے۔ اس کا زہر انسان کو بے خود کر دیتا ہے۔ یاد کرو ۱۸ سال کی عمر میں رادھا اپنی ساری زندگی جی چکی تھی۔ دکھ درد سے بھری زندگی۔ ڈر اور بھوک سے بھری زندگی۔ مرا تو رادھا کا شوہر تھا۔ رادھا تو زندہ جیتی جاگتی عورت تھی۔ دنیا والوں نے زندہ رادھا کو تنہائی کی کالی موٹی چادر میں لپیٹ کر سماج کے ریتی رواجوں کے قدیمی ملبے میں دفن کر ڈالا۔ جانتی ہوا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر مرد بے سہارا اور مجبور عورت کو صرف دل بہلانے والا مٹی کا ایک کھلونا ہی سمجھتا ہے۔

مرد کا جب دل چاہا بس ذرا سا مٹی کا ملبہ سرکایا اور کھلونا حاضر...... میرا سابقہ تو روز ہی یتیم بچوں اور بے سہارا عورتوں سے پڑتا ہے۔ ہمارے دیس میں آج بھی عورتوں اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال میں کمی ہے۔ وہ جانے کے لئے اٹھی اور بولی تم رادھا کو رکھو گی یا پھر...... میں نے کہا اگر انسان ہی انسان کے کام نہیں آئے گا تو انسان اور جانور میں کچھ فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔ تم نہیں بدلو گی وہ ہنسی اور مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دن پریشانیوں میں گزرا تھا۔ رادھا کے خیال نے رات کی نیند بھی رفع دفع کر دی تھی۔ سوچتی رہی غربت واقعی بہت بری چیز ہے۔ اچھا بھلا انسان غربت کے تلے دب کر وحشی بن جاتا ہے۔ آج کل کے مفاد پرست دور میں جہاں روزی روٹی کمانا مشکل ہو رہا ہے کیا وہ وحشی شخص جس نے رادھا کی عزت کی دھجیاں اڑا دی اب آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامے گا۔ رادھا اور اس کے بچوں کا سہارا بنے گا۔ دیر تک یہ سوالات میرے ذہن میں شور مچاتے رہے۔ کچھ دیر بعد شور خود بخود تھم گیا اور حقیقت نے سر ابھارا۔ کہ جس دیس میں دولہے خریدے جاتے ہیں۔ جہیز کی کمی کی وجہ سے خوبصورت۔ تعلیم یافتہ اور قابل لڑکیوں کو ٹھکانے نہیں ملتے وہاں کا یہ مرد ایک بدھوا کی ذمہ داری کیوں اپنے سر لے گا۔ میرے ذہن میں خطرے کے الارم بجنے لگے۔ صبح میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں رو رہی تھی۔

میں بے حد فکر مند تھی۔ کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر گوسوامی کی آواز سن کر مجھے تھوڑی تسلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مکرجی نے انہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور رادھا کو کوٹھی سے باہر نکالنے کی صلاح بھی دی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے میں گھریلو معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کرتا کیونکہ وہ تمہاری سلطنت ہے۔ تم گھر کی مالکن ہو سو رادھا کو کوٹھی میں رکھنے یا نا رکھنے کا فیصلہ بھی تمہارا ہی ہوگا۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہونگا کہ فیصلہ کرتے سمے رادھا کی خوبیوں کو نظر انداز نہ کر دینا...... پچھلے پانچ سالوں سے رادھا پوری لگن۔ وفاداری اور ایمانداری کے ساتھ ہماری خدمت کر رہی ہے۔

خوبیاں ہر نوکر میں نہیں پائی جاتیں اور نا ہی پیسہ دے کر خریدی جا سکتی ہیں۔ تم نے سنا تو ہوگا خدمت کا دوسرا نام محبت ہے۔ تم اس لڑکی کو اس کے پیار اور محبت کا کیا صلہ دو گی۔ اسے بھی تو ہم سے کچھ امید ہوگی۔ ایسے فرمانبردار۔ تابعدار اور وفادار نوکروں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ ہم انہیں بے جان چیزوں کی طرح گھر سے باہر نہیں پھینک سکتے۔ اور یہ بھی نہ بھولنا کہ مصیبتوں اور آفتوں میں گھرا بچہ مدد کے لئے ہمیشہ اپنے ماں باپ کو ہی پکارتا ہے۔ یاد رکھنا ڈوبتے کو بچانا بڑے ثواب کا کام ہوتا ہے۔ فون کٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے اندر گہرائی تک سکون کو اترتے محسوس کیا تھا۔

تب ہی باہر شور و غل سن کر میں چونکی تھی۔ باہر جھانکا۔ رادھا کے ساتھ غریبوں کی ایک بڑی بھیڑ اپنے گھر کے سامنے دیکھ کر میں گھبرا گئی تھی۔ ڈر تھا کہیں یہ لوگ کوئی نیا طوفان نہ کھڑا کر دیں۔ میں باہر گئی۔ سب نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہا تو میری جان میں جان آئی۔ ایک بوڑھا آدمی میرے سامنے آ کر بولا...... اماں...... رادھا آپ کو نام بتانے آئی ہے۔ کس کا نام میں نے پوچھا۔ تو بولا...... جس نے اس کی عزت لوٹی ہے۔ یہ آپ کا پیون ہے جو دبک کر اندر بیٹھا ہے۔ میں فوراً بولی ارے وہ وہ تو بچہ ہے۔ رادھا کے بڑے بیٹے سے صرف تین سال بڑا

ہے۔ رادھا اپنے بڑے بیٹے کو گدھا اور نادان کہتی ہے۔ اگر ایک نادان لڑکا رادھا کے ساتھ غلط حرکت کر رہا تھا تو رادھا کا فرض تھا اسے روکے۔ ڈانٹے۔ پھٹکارے۔ اگر رادھا شور مچاتی تو کوئی نہ کوئی تو اسے بچانے ضرور پہنچ جاتا اس کیس میں لڑکے سے زیادہ قصور رادھا کا ہے۔ رادھا جیسی سیانی عورت نے کیوں ایک کم عمر کے لڑکے کو اپنے قریب آنے دیا۔

سب لوگ خفا ہو گئے اور رادھا کو ملامت کرنے لگے۔ سب ایک ساتھ بولے۔ تو نے تو شرم وحیا کی ساری حدیں توڑ ڈالیں۔ جا کہیں چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جا۔ ارے تو نے تو عمر کا بھی لحاظ نہیں کیا...... کسی نے رادھا کے قریب آ کر تھوکا...... کسی نے اپنی پرانی جوتی رادھا کی جانب پھینکی۔ چیختے چلاتے سب چلے گئے۔ پریشان پریشان سی رادھا سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتی رہ گئی۔

رادھا کے ماں باپ میرے قدموں میں گر کر بولے۔ ماں جی ہم رادھا کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ یہ سب میری برادری کے لوگ تھے۔ زیادہ تو ہمارے رشتے دار ہیں۔ اگر میں رادھا کو لے گیا تو یہ لوگ اسے جان سے مار ڈالینگے۔ میں تو آج جیتے جی ہی مر گیا۔ اس کلموہی نے مجھے مار ڈالا۔

میں نے کہا تم جاؤ۔ رادھا میرے ساتھ رہے گی۔ میں اندر گئی۔ میرا بیون بھاگ چکا تھا۔ بچہ ہونے سے کچھ دن پہلے رادھا کے ماں باپ آئے۔ بولے یہ ناگن پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو بہتر ہوتا اس نے ہمیں ڈس لیا۔ ڈسنے کے ڈر سے ہی تو گاؤں میں ناگن کو پیدا ہوتے ہی کچل ڈالتے ہیں۔ ماں نے رادھا کا ہاتھ تھاما اور اسے لے گئی۔ یہ سوچ کر کہ رادھا محفوظ ہاتھوں میں ہے میں نے سکھ کی سانس لی۔

کچھ دنوں کے بعد ہی رادھا لوٹ آئی۔ میں نے بچے کے بارے میں پوچھا تو بولی...... ناگن کو پیدا ہوتے ہی کچل ڈالا جاتا ہے۔

ماں جی وہ بڑی بھیانک گھڑی تھی۔ لٹ جانے کی گھڑی۔ میں تو اس بری طرح سے یوں لٹی ہوں کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہ بچا ہے۔

اماں اُس ایک پل میں میں اتنی اکیلی اتنی تنہا تھی پہلے کسی شام کسی رات کسی گھڑی نہ تھی۔...... وہ زار وقطار رو رہی تھی۔ میرے آنسو بھی متواتر بہہ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی واقعی غریبی اور بے سائیگی دونوں بری بلائیں ہیں۔ اگر رادھا ہنر مند اور پڑھی لکھی ہوتی تو خود اپنے بچوں کی پرورش کر سکتی۔ کب حالات بدلینگے۔ کب علم کا سورج چمکے گا۔ اور ہمارے دیس کے کونے کونے کو اجاگر کر دے گا۔

رادھا بلک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ پچھتاوے کے آنسو بہا رہی تھی۔ ایسے برے حال میں انسان کو ہمدردی اور پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے رادھا کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر کہا۔ جو ہوا بہت برا ہوا۔ کچھ دکھ تو قدرت ہماری ہتھیلیوں پر لکھتی ہے اور باقی دکھ ہم خود اپنی ذات کے لئے ڈھونڈتے ہیں وہ دکھ جو ہم خود حاصل کرتے ہیں وہ ہی ہماری جان کا روگ بن جاتے ہیں۔ ان سے چھٹکارا کسی طور ممکن نہیں ہوتا۔ تمہیں بھی قدم قدم پر اس حقیقت کا سامنا تو ضرور کرنا ہوگا۔ اپنے رشتے دار۔ دوست۔ احباب اور سماج کے رکھوالے جینا محال کر دیتے ہیں۔ آگے ہوشیار رہنا۔ چاہتوں میں جو یہ وعدے ہوتے ہیں ان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہوتی۔ یہ تو صرف

ایک دوسرے کو بہکانے کی خاطر کئے جاتے ہیں۔ پھر ساری عمر رو رو کر گذرتی ہے۔ اور جن کے لئے ہم روتے ہیں وہ دور سے کھڑے ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ازل سے ہی ہر مرد عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا آرہا ہے اور آگے بھی اٹھاتا رہے گا۔ دکھوں اور آفتوں میں گھری عورت کا ساتھ تو اس کے سگے بھائی۔ بہن یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی نہیں دیتی۔ سو آگے کسی کی باتوں کا یقین نہ کرنا۔

اس نے مجھے مضبوطی سے تھام کر کہا اگر آپ کی نظر کرم رہی تو میں کسی نا کسی طرح جی ہی لونگی ...... میں نے کہا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہونگی۔ اسے خط تھماتے ہوئے کہا۔ یہ لو۔ تمہارے بڑے بیٹے کی نوکری پکی ہوگئی ہے۔ انسانوں پر نہیں بھگوان پر بھروسہ رکھو۔ وہ کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اس کے آنسو یکا یک تھم گئے اور چہرے پر خوشی کی ایک لہر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

رنگین دھاگوں کے بندھن

گوپال فوجی افسر تھے۔ان کی چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔سرحد پر دنگے فساد شروع ہوئے تو گوپال کا بلاوا آ گیا۔وہ چلے گئے۔وہ سنسان برفیلی پہاڑی کی چوٹی پر بنکر میں بیٹھے اپنے ماں باپ اور مالتی کے لئے سوچ کر پریشان ہو جاتے تھے۔مالتی کی دی ہوئی پچھلے سال کی راکھی نکالتے اور سوچتے یہ رنگین چمکتے دھاگے معمولی نہیں۔ان دھاگوں میں بہن کا پیار اور ڈھیر ساری دعائیں چھپی ہیں۔ماں کی کہی باتیں دماغ میں تازہ ہو جاتیں۔...... آج کل کے خودغرض زمانے میں بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ہے۔

بھگوان کرے تم دونوں بھائی بہنوں کا پیار ان دھاگوں سے ہمیشہ بندھا رہے۔تیری عمر دراز ہو اور تو ہمیشہ اپنی بہن کا ہر مصیبت میں ساتھ دے۔لڑکی پرائے گھر جانے کے بعد بھی ان دھاگوں سے ہمیشہ بندھی رہتی ہے انہوں نے راکھی کو چوما اور جیب میں رکھ لی......

گوپال کو بچپن کی یادیں گھیرے رکھتیں۔کبھی وہ مالتی کے ساتھ ہولی کھیلتے تو کبھی دیوالی کے دئے جلاتے۔بس یہی یادیں تو بنکر میں ان کی ساتھی تھیں۔

سوچتے سوچتے مالتی کی شادی کا دن بھی آ گیا۔مالتی کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں آسمایا۔بہن دلہن بنی بیٹھی تھی...... پھولوں سے لدی...... لال ساڑی میں ان کی بہن پریوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔بارات دروازے پر آ پہنچی تھی۔گوپال کے کانوں میں بانسری کی دھن رس گھولنے لگی۔پھر پجاری جی کے منتروں کی آواز گونجنے لگی۔ سات پھیرے ہوئے اور ان کی لاڈلی بہن پرائی ہوگئی۔ان کے منھ سے نکلا۔میری بہن تو ہمیشہ شاد رہے آباد رہے

بارات جا چکی تھی۔بہن سسرال پہنچ گئی تھی۔سوچنے لگے میری شہزادی سی بہن کی پذیرائی کے لئے کتنی لڑکیاں اکٹھا ہوئی ہونگی۔اس کے اردگرد ریشمی رنگین آنچل لہرا رہے ہونگے۔اور دولہا راجا دروازے پر انتظار کر رہا ہوگا۔ایک زوردار دھماکہ ہوا۔پاس والی پہاڑی پر بم برس رہے تھے۔آگ کے شعلے آسماں پر بکھر رہے تھے۔عجب خوفناک آوازیں فضا میں پھیل گئی تھیں...... وہ پل بھر میں خوشیوں کی دنیا سے نکل کر جنگ کی دنیا میں واپس لوٹ آئے...... ہر جوان لڑکی کی طرح مالتی بھی آنکھوں میں بہاروں کے سپنے سجائے سسرال پہنچی تھی۔ساس نے تڑک کر کہا...... آج سے اپنے ماں باپ کو بھول جاؤ۔جب وہ ہماری مانگیں پوری کرینگے تب میں آگے کی سوچونگی...... مالتی نے خوشبو اور خوشیوں کی تمنا کی تھی۔یہاں تو پھولوں کے بدلے پتھر برس پڑے تھے۔ساس نے زندگی کا ہر پل عذاب بنا دیا تھا۔

سریندر یوں بھی خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ماں کے سامنے بولنے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ساس کے ظلم اور بے رحمیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔سریندر نے آنکھیں موندلیں۔مالتی نے اپنے آنسو پی لئے۔ہونٹ سی لئے۔دل اندر ہی اندر آہیں بھرتا مگر زبان پر نا شکوہ نہ شکایت۔کس سے گلہ کرتی۔وہ اپنی قسمت ہی کو دوش دیتی تھی۔

اپنے سارے ارماں سینے میں دفن کر لیئے اور خاموشی سے ساس کے ظلم و ستم سہتی رہی کہ اب کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا۔

ادھر مالتی کے والدین بیٹی سے ملنے کو تڑپ رہے تھے۔ مالتی کے باپو کی صحت بگڑتی دیکھ ماں نے اپنا مکان بیچ کر مالتی کی لالچی اور بے رحم ساس کی جھولی بھرنے کا ارادہ کر لیا مگر زندگی کی جنگ لڑتے لڑتے مالتی کے پتا جی نے تھک کر دم توڑ دیا...... مالتی کی ماں کا سنسار اجڑ گیا۔ بیٹے کی کوئی خبر نہ تھی۔ اور بیٹی کی سنگدل ساس نے ظلم کی دیواریں اور اونچی کر دیں...... وقت گزرتا گیا سال بیت گیا اور رکشا بندھن کا دن پھر آ گیا۔

مالتی بے حد پریشان اور بے چین تھی۔ بھائی کی یاد رلا رہی تھی۔ وہ چپکے چپکے آنسو پونچھتی اور سوچتی۔ کہاں ہونگے میرے بھیا۔ جس حال میں بھی ہوں بھگوان تم ان کی رکشا کرنا۔ دن روتے روتے بیتا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا مگر مالتی کے دل میں آس کا دیا جل رہا تھا۔ نظر بار بار دروازے پر جا ٹکتی۔ بھائی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔...... اگلے رکشا بندھن پر جو مانگو گی وہی دونگا۔

سریندر اپنے کمرے میں تھے۔ مالتی دروازے کی طرف دیکھ کر رو پڑی تھی...... تب ہی ساس آدھمکیں ...... بڑے ہی تلخی بھرے لہجے میں بولیں...... بھائی کے انتظار میں ابھی تک تیری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ بار بار دروازہ تاک رہی ہے۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ مجھے لگتا ہے تیرا بھائی بھی جنگ میں مارا گیا...... تجھے تو خوش ہونا چاہیئے تیرا اکلوتا بھائی وطن کے لئے شہید ہو گیا۔ سنتے ہی مالتی کا تن بدن کانپ اٹھا۔ برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں۔ وہ چیخی...... ایسا نہیں ہو سکتا...... بس کریئے...... میرے بھائی کو بددعائیں نہ دیں۔ آپ نے مجھے بے دردی سے مارا میں نے اف نہ کی...... میرے پتا جی چلے گئے۔ آپ نے مجھے جانے نہیں دیا۔ میں نے وہ دکھ بھی سہہ لیا۔ ہر وقت گالیاں۔ جلی کٹی باتیں کہیں میں نے کچھ جواب نہ دیا...... آپ میری جان لے لیں مگر میرے بھیا کے لئے کچھ نہ کہیں۔ میں برداشت نہیں کر پاؤنگی۔ ساس شعلہ جوالہ بنی مالتی کی طرف لپکیں۔ اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر اس کو کھینچا اور دروازے کے باہر دھکا دے دیا......

شور سن کر سریندر اپنے کمرے سے باہر آیا...... تب ہی آواز آئی...... ٹھہریئے...... دروازہ بند نہ کریں ...... ساس گھبرا گئیں...... سریندر کا سر شرم سے جھک گیا۔

غصے کی شدت سے گوپال کا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنے ابلتے جذبات پر قابو کیا...... بولا...... میں ان برفیلی پہاڑیوں پر ہر پل موت کا سامنا کرتا رہا۔ من میں سوچتا رہا گھر میں میرا دوست میری بہن اور میری ماں کی حفاظت کر رہا ہو گا۔ میرے دوست کے گھر میں میری بہن راج کر رہی ہو گی۔ رانی بنی بیٹھی ہو گی مگر افسوس تم میرے خاندان کے صرف دو افراد کو تحفظ نہ دے سکے۔ تمہارے گھر میں انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ اس اندھیری رات میں تم نے اپنی عزت کو بے گھر کر دیا۔ اپنی عزت کو سڑک پر پھینک دیا۔ تم کیسے مرد ہو...... اپنے وعدے اپنی ذمے داریاں بھول گئے۔ ذرا سوچو اگر آج میں یہاں نہ ہوتا تو میری بہن جواب تمہاری عزت اور شان ہے اس کا کیا حشر ہوتا۔ مالتی کی طرف دیکھ کر گرجا...... چلو مالتی ...... اب تم یہاں ایک منٹ بھی اور نہیں رہ سکتی ہو گھر چلو۔ ابھی تمہارا بھائی زندہ ہے۔ تمہاری دیکھ بھال کر سکتا ہے اور آخری سانس تک کرے گا۔

سریندر نے جھکے سر کے ساتھ ہاتھ بھی جوڑ لئے ...... بولے...... میرے دوست کیا اپنے دوست کو معاف نہیں کرو گے۔ میری مجبوری تم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا۔ تم جانتے ہو یہ میری سوتیلی ماں ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اس نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر کہا...... یہ تمہارا گھر ہے اور تم اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہو...... مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ تمہارے بغیر میں بالکل اکیلا ہوں۔ مجھے قطعی علم نہ تھا کہ تمہارے ساتھ اتنا برا سلوک ہو رہا ہے۔ تمہیں بھی اپنے حقوق کے لئے لڑنا چاہیئے تھا۔ مجھے بتانا تھا۔ خاموشی سے سارے دکھ سہتی رہیں...... میں تو صبح کا گیارات کو گھر لوٹتا ہوں۔ خیر تھوڑی نوک جھوک تو ہر ساس بہو میں چلتی ہی رہتی ہے مگر...... یہ...... اس نے گوپال سے کہا...... آؤ...... اندر...... آؤ...... پہلی بار اپنی بہن کے گھر آئے ہو...... مٹھائی کھا کر ہی جاؤ گے...... مالتی نے بھائی کو راکھی باندھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی۔ سریندر نے گوپال کو مٹھائی کھلائی۔ گوپال نے اپنی جیب سے پچھلے سال کی راکھی نکال کر مالتی کو دکھا کر کہا تمہاری اس راکھی نے ہی میری رکشا کی ہے موت کے پنجوں سے نکل کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ یاد ہے میں نے کہا تھا جو بھی مانگو گی میں ضرور دونگا۔ مالتی ہنس کر بولی...... بس اتنا کرو...... میری ساس اور اپنے دوست کو دل سے معاف کر دو...... میں نے اپنے سسرال والوں کو ہمیشہ اونچی نظر سے دیکھا ہے میرے دل میں ان کے لئے بہت اونچا مقام ہے۔ بس تم بھی ان کو کبھی نیچی نظر سے گردن جھکا کر نہیں دیکھنا۔ تم صحیح سلامت واپس آ گئے میرے لئے یہی سب سے بڑی دولت ہے۔

ماتا جی اپنے کمرے میں کھڑی مالتی کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تو سر خود بخود ندامت کے بوجھ سے جھک گیا۔ وہ باہر آئیں۔ مالتی کو سینے سے لگا کر بولیں ...... بیٹی مجھے معاف کر دو۔ بڑے زور آور ہیں تمہارے یہ رنگین دھاگے۔ مجھے بھی انہیں دھاگوں سے باندھ لو۔ ایسے باندھنا کے پھر کبھی نہ ٹوٹیں۔

تھوڑی دیر بعد گوپال۔ سریندر اور مالتی تینوں گوپال کے گھر جا رہے تھے۔ ساس نے کہا۔ اپنی ماتا جی سے کہنا کل میں بھی ان سے ملنے جاؤنگی۔ دیر میں سہی پر جاؤنگی ضرور۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیں گی تو میں سوچ لونگی بھگوان نے بھی مجھے معاف کر دیا ہے۔

کون ہے۔ دہشت گرد۔

شہر کے مشہور سیٹھ دیالو جی کسی ضروری میٹنگ کے لئے باہر گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کی بیٹی اپنے دوستوں کے ساتھ کوٹھی کے بڑے سے حال میں اپنے جنم دن کا جشن منا رہی تھی۔ سیفٹی کے لئے گیٹ پر دو دربان حاضر تھے۔ تیز میوزک کی دھن پر سب بلند آواز سے گا رہے تھے۔ او...... بلما...... آجا...... مجھ میں سما جا ...... مجھے چین دلا جا...... بلما...... او۔ دھیمی دھیمی روشنی میں۔ شراب کے نشے میں چور...... جوانی اور عشق کے سرور میں جھومتے یہ جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے تن من کی سدھ بدھ بھلا بیٹھے تھے۔ فلموں میں لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے لباسوں سے چھلکی جوانی دیکھ بوڑھوں کے دل بے قابو ہو کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں مختصر لباسوں میں ان پری پیکروں کو اپنے اردگرد مستی سے ناچتے جھومتے دیکھ ان جوان لڑکوں کے دل ودماغ بھی ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ یہ لڑکی اس لڑکے کی باہوں میں تو کبھی وہ کسی اور کے سینے سے لپٹی کھل کھلا رہی تھی۔ بڑا رنگین سماں تھا۔

کسی نے برتھ ڈے گرل کو اپنی باہوں میں دبوچ کر اس کے حسین چہرے کو بار بار چوما اور اسے اوپر اچھال دیا۔ پاس والے لڑکے نے اس بے جا حرکت پر اعتراض کیا۔ بولا۔ یار...... ذرا آہستہ...... لڑکی کو باربی ڈول کی طرح اچھالنا زیبا نہیں دیتا۔ سیٹھ کی بیٹی ہے۔ اگر ذرا کھروچ بھی آ گئی تو غضب ہو جائے گا۔ لڑکے نے ہنس کر کہا۔ یار...... تو رنگ میں بھنگ نہ ڈال۔ مے خانہ ہے۔ یہاں سب جائز ہے۔ ان جنت کی حوروں کو فرشتوں کی پارسائی نہیں بھائی۔ یہ انہیں چھوڑ چھاڑ کر ہم مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے زمین پر اتر آئی ہیں۔ تو چپ رہ اور مزے لوٹ۔ سب نے تالیاں بجا کر گانا شروع کیا...... تم جیو ہزاروں سال...... سال...... یک کے بعد دیگرے سب نے برتھ ڈے گرل کو بوسے دیئے۔ کسی نے کہا...... یار تم سدا سلامت رہو اور اسی طرح محفلیں سجاتی رہو تا کہ ہم سب مل کر زندگی کا لطف اٹھاتے رہیں۔ مستی بھرے ماحول میں کسی کو اپنی خبر نہیں تھی......

ٹن...... ٹن...... گھڑی نے دو بجائے۔ ایک انجانی آواز نے سب کو بوکھلا دیا۔ بے غیرتو بے شرموں بند کرو یہ بے ہودہ ناچ گانے۔ تم نے دیش کو نرک بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی دھڑ دھڑ...... گولیوں کی آواز سن کر سب پر دہشت چھا گئی۔ پل میں شراب اور جوانی کا نشہ اتر گیا۔ کسی نے بٹن دبایا روشنی میں اپنے دو ساتھیوں کو خون میں لت پت زمین پر مرا پڑا دیکھ سب نے ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھا۔ پولس افسر کو دیکھ سب کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

"کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا" کس نے گولی چلائی؟ سب ایک ساتھ منمنائے۔ سر ہم نہیں جانتے ٹھیک ہے۔ پتہ تو ہم لگا ہی لینگے اور قاتل کو پھانسی کے تختے پر پہنچا کر ہی دم لینگے۔ ایم پی کا بیٹا جو اپنے کو بڑا تمیس مار خان سمجھتا تھا اور سب پر بڑا رعب جھاڑتا تھا اپنے دونوں ہاتھ رگڑتا ہوا دھیمے سے بولا......

ضرور کوئی سر پھرا ہو گا جسے نئی نسل سے شکایت ہو گی۔ کہتے ہیں کہ نئی نسل کے بھولوں کو گھر واپس بلاؤ۔

لڑکے کی جسارت پر پولس افسر کا پارہ اور چڑھ گیا...... وہ دہاڑا...... ان رئیسوں کی بگڑی اولادوں کو فوراً بس میں بھر کر سرکار کے خصوصی مہمان خانے لے جاؤ۔ سب کی عالی درجے کی مہمان نوازی کرو۔ کوئی کثر باقی نہ رہنے پائے۔ ٹارچر روم کا نام سن کر سب کے چہروں پر ایسی زردی پھیلی جیسے ان کی رگوں میں خون کی گردش بند ہوگئی ہو۔ سب نے ہاتھ جوڑ ڈالے۔ لڑکیوں نے سسک سسک کر رونا شروع کردیا۔ پیر ایسے کانپے کہ کھڑا ہونا دشوار ہوگیا۔

غم میں ڈوبے سیٹھ جی سکتے۔ آنسو بہاتے لڑکھڑاتے ہال میں داخل ہوئے پولس افسر کے بگڑے تیور دیکھ کر گھبرائے تو بہت لیکن پھر اپنے آپ کو سمجھایا...... یہ وقت ہوش کھونے کا نہیں کسی طرح اس بلا کو ٹالنے کا ہے۔ فوراً ہی افسر کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اپنی پگڑی اور نوٹوں کی گڈیاں پولس افسر کے قدموں میں رکھ کر دھیمی آواز میں بولے...... اصلی مجرم میں ہوں۔ غلطی میں نے کی اور سزا میری بیٹی کو ملی۔ ہم ہندوستانی بڑی تیزی سے ویسٹرن کلچر کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ بچے جو سنیما میں دیکھتے ہیں اسے ہی اپناتے ہیں۔ پہلے اسطرح کے ناچ گانے اور ناچنے والوں کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر آج کل اس کا الٹا ہو رہا ہے۔ لڑکی کی صورت شکل جیسی بھی ہو وہ جتنا کم کپڑے پہنے گی اتنی ہی زیادہ خوبصورت سمجھی جائے گی۔ میں لٹ گیا۔ غارت ہوگیا...... اگر...... پولس افسر منھ سے تو کچھ نہ بولا...... مڑا...... اور جیوں ہی دروازے کی طرف بڑھا مایا ناگ نے پھنکارا...... قدم ٹھہر گئے پہلی نظر نوٹوں کی گڈی پر ٹھہری۔ پھر سیٹھ کو دیکھ کر ذرا سر کو ہلایا۔ اور دروازہ پار کر گیا سیٹھ کو اپنے اگر کا جواب ملا تو دل کو تھوڑی تسلی ہوگئی......

دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی تھیں۔ سب کے ٹھکانوں کا پتہ کھاتے میں درج کرنے کی کاروائی بھی مکمل ہو چکی تھی اور اب سب کو بس میں بھر کر تھانے لے جارہے تھے۔ ہال میں سیٹھ جی اپنے غموں کے اندھیروں میں ڈوبے تنہا بیٹھے رہ گئے تھے۔ کبھی بیٹی کی موت پر آنسو بہاتے تو کبھی اتنی بڑی رقم لٹ جانے کا غم۔ دل میں کھٹکا لگا تھا اگر بات کھلتے کھلتے کالے دھندوں تک پہنچی تو...... ایک دھندا ہوتا تو سیٹھ جی سنبھال لیتے۔ انہوں نے تو چاروں طرف ایسے جال بچھا لئے تھے کے اب رہائی ملنا دشوار ہوگیا۔ پولس افسروں کی مٹھیاں گرم کرتے رہے۔ وکیلوں کی جھولیاں بھرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کورٹ کی تاریخیں بدلتی رہیں اور سیٹھ جی کی نیندیں اڑتی رہیں۔ مگر دولت اور شہرت کی بھوک کم نہ ہوئی۔ ان کے کالے دھندوں کا کاروبار جاری رہا۔

اس دنیا میں اچھی یا بری کسی شے کو ثبات نہیں۔ آخر سیٹھ جی کے پاپوں کی ہنڈیا پھوٹ ہی گئی...... دن دہاڑے بیچ چوراہے پر ایک بدھوا نے سیٹھ جی کی گاڑی روک کر ان کے سینے کو گولیوں سے چھید دیا۔ چیخ چیخ کر بولی۔ پچھلی رات سیٹھ نے میرے وجود کو چھلنی کر ڈالا تھا۔ اب اس کی نظر میری معصوم ۱۲ سالہ بیٹی پر ہے۔ اگر یہ زندہ رہتا تو یہ میری معصوم بچی کا بھی وہی حال کرتا جو رات میرا کیا تھا۔ میں جیل میں مروں یا پھانسی کے تختے پر۔ مجھے پرواہ نہیں۔ مجھے ان بے بس اور بے سہارا یتیم بچوں اور بدھواؤں کی زندگی کی فکر ہے جو سیٹھ کے آشرم میں روزانہ دار پر چڑھائے جاتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ بیٹی کی موت کا صدمہ اسے بدل دے گا مگر انسان بدلتے ہیں حیوان نہیں۔ لوگ اسے سیٹھ دیالو کہتے تھے۔ اصل میں یہ انسان کے روپ میں درندہ تھا۔ دہشت گردی یہ درندے پھیلاتے ہیں اور دہشت گرد ہم غریب کہلاتے ہیں۔ اسے مار کر میں نے اس شہر کا ایک دہشت گرد مار ڈالا...... وہ

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے ۔ بے خوف ۔ سر اٹھا کر سپاہی کے پیچھے پیچھے چل دی ۔ سڑک پر لوگ دیر تک چلاتے رہے ۔ درگا ماتا کی جے ہو۔

کچھ دن ہی گذرے تھے ۔ بستی میں بھوک سے بلبلاتی لڑکی نے بھائی کو اپنی چوڑیاں دیتے ہوئے کہا...... انہیں بیچ کر ماں کے لئے دودھ لے آ...... بھائی بولا...... یہ پیتل کی ہیں ۔ میں نے سب کے در کھٹکھٹائے مگر کسی کو مجھ پر ذرا سی دیا نہ آئی ۔ اتنی بڑی بستی میں کوئی ہمارا ہمدرد نہیں رہا ۔ سب نے ایک ہی بات کہی ۔ باپ چور تھا تو ڈاکو ہوگا ۔ بیمار ماں کو چھوڑ کر میں شہر جا کر مزدوری بھی نہیں کر سکتا ۔ آج ہی ایک کام ملا ہے ۔ کچھ روپے ملنے کی آس ہوئی ہے ۔ اگر دیری ہوگئی تو سب چوپٹ ہو جائے گا ۔ بہن نے خوش ہو کر بولا...... پوری لگن اور ایمانداری سے کام کرنا ۔...... باپو کی طرح...... ہاں...... ہاں کرونگا ۔ ضرور کرونگا ۔ اس پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کچھ بھی کرونگا ۔ کام بڑی جوکھم کا ہے ۔ لوٹ کر بتاؤنگا ۔ رک کر بولا...... ماں کے لئے دوا...... دودھ اور تیرے لئے روٹی لے کر جلدی ہی واپس آؤنگا ۔ پہلے تم دونوں کو کھلاؤنگا پھر خود کھاؤنگا ۔ جب تک میں واپس نہ آجاؤں تو ماں کے پاس ہی بیٹھی رہنا ۔ ایک پل کے لئے بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑنا ۔ آج اس کی حالات زیادہ خراب ہے ۔ سمجھی نا ۔ تو ایک پل کے لئے بھی کوٹھری سے باہر نہ جانا ۔...... ہاں...... ہاں سمجھ گئی ۔ مگر آج تو یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہے ۔ میں اکیلی اس کالی رات میں کہاں جاؤنگی ۔ بھائی نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ سچ بھوک تو مجھے بھی بہت زور کی لگی ہے ۔ مگر میں کسی طرح برداشت کر رہا ہوں ۔ مجھ سے تیری اور ماں کی یہ بری حالت دیکھی نہیں جاتی ۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کر لے ۔ وہ جھولا لے کر آگے بڑھا ۔ پھر مڑا ۔ بہن کو دیکھ کر بولا ۔ باہر ہرگز ہرگز نہ جانا اندر سے کنڈی لگا لے ۔ بہن بیٹھی سوچتی رہی ۔ چوری مالک کے بیٹے نے کی اور میرے باپ پر جھوٹا چوری کا الزام لگا کر مالک نے اسے جیل بھجوا دیا ۔ جیل میں اسے بیدردی سے مارا پیٹا کاغذات پر دستخط کر کے جرم قبول کرنے کو کہا ۔ انکار کرنے پر اس کی جان ہی لے لی ۔ سارے ثبوت ہی مٹا ڈالے ۔ بھائی کو باپ کی جگہ نوکری بھی نہیں دی ۔ آفس کے بڑے بابو نے کہا دسویں پاس کر کے آنا ۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے کہا نقدی لے آ سرٹیفکیٹ میں دے دونگا ۔ جھوٹا ہی سہی تجھے تو نوکری مل جائے گی ۔ کوٹھری کے مالک نے کہا ۔ کرایہ دے ۔ اگر نہیں تو دو دن کے اندر اندر کوٹھری خالی کر دے ۔ ڈاکٹر نے مفت دوائی دینے سے انکار کر دیا ۔ کوئی ہم غریبوں کی فریاد سننے والا نہیں ۔ دو دن سے ہم تینوں بھوک سے تڑپ رہے ہیں ۔ اناج کا ایک دانہ بھی نصیب نہیں ہوا ۔ وہ روتی رہی اور ماں کے پاؤں دباتی رہی ......

اچانک ماں کا کمزور بدن کانپنے لگا ۔ سانس رک رک کر آنے لگی ۔ وہ گھبرا کر ڈاکٹر کے گھر کی جانب دوڑی ۔ سڑک پر زبردست دھماکہ ہوا ۔ زمین کانپ اٹھی ۔ سائیکل ۔ رکشا ۔ موٹر ۔ بس ۔ ٹرک سب جل رہے تھے ۔ شعلے بھڑک رہے تھے ۔

بھائی کھانا لے کر جب اپنی کوٹھری میں پہنچا تو ماں دم توڑ چکی تھی ۔ بہن کو پکارا جواب نہ ملنے پر وہ پاگلوں کی طرح چلاتا ۔ روتا ۔ اسی جگہ پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے بم دھماکہ ہوا تھا ۔ اس کے دماغ میں بھی دھماکے ہو رہے تھے ۔ جسم جلتا محسوس ہو رہا تھا ۔ ڈاکٹر کے گھر کے سامنے شعلے بھڑک رہے تھے ۔ آگ بجھانے کی کوشش جاری تھی ۔ وہ کھڑا موت کا تماشہ دیکھتا رہا ۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑیں تھیں ۔ ایک جلے ہاتھ میں پیتل کی چوڑیاں دیکھ وہ وہیں بیٹھ کر

سر پٹک پٹک کر زار وقطار روتا رہا۔ چلاتا رہا۔ میری بہن تو نے میری بات نہ مانی سپاہی کو اس کے حال زار پر ترس آیا۔ اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ یہ دہشت گرد انسان نہیں درندے ہوتے ہیں۔ دیکھ کتنا جانی اور مالی نقصان ہوا ہے۔ اگر کوئی دہشت گرد میرے ہاتھ آجائے تو میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر کتوں کو کھلا دونگا۔ اسے اسی طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا جس طرح یہ سب تڑپ تڑپ کر مرے ہیں۔ جا...... اپنے ...... گھر جا...... سارے ثبوت جمع کر کے سرکاری آفس لے جانا۔ تجھے پانچ لاکھ کا معاوضہ ملے گا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے بال کھینچتا ہوا پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا...... پانچ لاکھ...... پانچ لاکھ معاوضہ...... اپنی کوٹھری کی طرف دوڑا۔ سڑک پر جا رہا تھا لوگوں نے کہا۔ لگتا ہے اس کا کوئی قریبی رشتے دار اس حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ دکھ کی شدت سے اس کا دماغ پھر گیا ہے۔

کوٹھری میں اپنی مری ماں کے پیر پکڑ کر دھاڑیں مار مار کر رویا۔ اماں میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں بھوکا رہ کر بھی تیرے سکھائے اصولوں پر چلا۔ مگر کوئی اصول میرے کام نہیں آیا۔ کئی دروازوں پر دستک دی۔ کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ جب کوئی امید نہ بچی تب مجبوراً میں نے اپنے اصولوں کا سودا کر ڈالا۔ صرف روٹی کے ٹکڑوں کی خاطر میں بک گیا۔ غداروں نے مجھے خرید لیا۔ میں دور کھڑا اپنے ضمیر کی چتا جلتی دیکھتا رہا۔ اماں یہ بھوک انسان سے بڑے سے بڑا جرم کروا دیتی ہے۔ میری ماں تو نے مجھے جنم دیا۔ میں نے تجھ سے غداری کی۔ اپنی جنم بھومی اپنی دھرتی ماں سے غداری کی۔ حق تو یہ ہے کہ میں اپنا حق ادا نہ کر سکا۔ کاش تو نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا کوٹھری میں بہت زوردار دھماکہ ہوا تھا۔ ایک اور دہشت گرد اپنی ہی لگائی آگ میں بھسم ہو گیا تھا۔

رات کا ماتھا ابھی...... دھندلا ہی تھا بستی والے سو رہے تھے۔ بس ایک وہ پاگل جاگ رہا تھا۔ نا جانے کونسی بلا اس کے سر پڑی تھی۔ جو اس کا رات دن کا چین اڑا کر لے گئی تھی۔ پیڑ تلے بیٹھا کبھی اپنی سارنگی بجاتا اور کبھی گہری سوچوں میں ڈوبا نظر آتا۔ سوال کرو تو دو جملوں میں جواب دیتا۔ روٹی دو تو کھا لیتا۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ حالانکہ وہ بستی والوں کے لئے اجنبی تھا۔ مگر سب اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی ہر بات دھیان سے سنتے تھے۔

صبح ہوتے ہی بستی کی باہر والی سڑک پر نیتا جی کی جیپ کھڑی تھی۔ بھیڑ میں زیادہ ان کی رکھوالی کے لئے سپاہی موجود تھے۔ بھیڑ دیکھ پاگل چلایا۔ دوستو...... رات بہت گذر چکی ہے اور دن نکلنے والا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم سب اپنی نیند سے جاگو۔ آنکھیں کھولو۔ اور انہیں غور سے دیکھو اور پہچانو...... کیا یہی تمہارے سچے بہی خواہ ہیں۔ کل جیل میں تھے آج ہم غریبوں سے ووٹوں کی بھیک مانگنے چلے آئے ہیں۔ سوائے وعدوں کے یہ ہمیں اور کیا دے سکتے ہیں۔ کرسی سنبھالتے ہی انہیں سوائے اپنی جھولیاں بھرنے کے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ غریب کے حصے صرف جہالت۔ مفلسی اور زمانے بھر کی پھٹکار ہی آتی ہے۔ ہمیں تو صدا کیڑے مکوڑے کی طرح انہیں نالیوں اور غلاظت میں رہنا ہوگا۔ زمانہ بیت گیا مگر اس بستی کے رہنے والوں کی تقدیریں نہیں بدلیں۔ اور نا ہی بدلنے کی امید ہے کیونکہ ہمیں آدھا پیٹ کھانے کے ساتھ ٹھوکریں کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کب تک تمہاری عقلوں پر پردے پڑے رہینگے۔ کب تک جہالت اور غربت کی زنجیروں میں جکڑے رہو گے۔ توڑ ڈالو ان غلامی کی زنجیروں کو۔ اپنے

حقوق سمجھو اور انہیں حاصل کرنے کے لئے آوازیں بلند کرو۔ جدو جہد کرو۔ کیونکہ آزادی کبھی مفت میں نہیں ملتی۔
پاس کھڑے سپاہی نے پستول تان لی۔ چپ ہو جاو ورنہ گولی مار دونگا۔ پاگل بھی چلایا۔

ارے ہم ہی کب زندہ ہیں جو تو گولی مار کر ہمیں مار ڈالے گا۔ ہمیں تو غربت اور جہالت نے مار رکھا ہے۔ ہم اندھیروں کے مسافر ہیں۔ لوگ اجالے تلاش کرتے ہیں۔ ہم ایک ٹکڑے روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی نہ ملنے پر بھوکے ہی سو جاتے ہیں۔ پاس والے سپاہی نے ڈنڈا اٹھایا۔ دوسرے نے اپنا پستول دوبارہ دکھایا۔ بند کر اپنی بکواس ورنہ گولی آر پار ہوگی۔ وہ بھی غرایا۔ تم مجھے خاموش کر کے حقیقت نہیں چھپا سکتے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ آج نہیں تو کل تم جیسے کسی سپاہی کے ہاتھوں مارا ہی جاؤنگا۔ کیونکہ سچ بات پر زہر کا پیالہ ہی ملتا ہے۔ مگر میرے مرنے کے بعد میری آواز گونجتی رہے گی۔

بستی کے ایک بزرگ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ انہیں نہ مارو۔ یہ چور نہیں نا بد معاش یہ مصلحت اندیش ہیں۔ ہمیشہ گیان کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے بستی میں رہنے سے یہاں بہت بدلاؤ آگیا ہے۔ شور شرابا۔ ناچ رنگ۔ نشہ بازی۔ جھگڑے اور دنگے فسادوں میں کمی ہوگئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میل ملاپ سے رہو گے تو ترقی ہوگی آہستہ آہستہ لوگوں کی سوچیں بدل رہی ہیں۔ بستی کا ماحول بدل رہا تھا۔

نیتا جی کے دھواں دھار بھاشن کے بعد مٹھائی اور سموسے بانٹے گئے۔ ہر بار کی طرح نیتا جی بڑے بڑے وعدے کر کے چلے گئے۔ غریب بستی کے جاہل لوگوں کے دلوں میں امید کی لو جاگ اٹھی۔ پاگل نے ان کے روشن ہنستے چہرے دیکھ کر کہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے سپنے کب پورے ہونگے کبھی ہونگے بھی یا نہیں۔

بھیڑ میں سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ اور پاگل کے پاؤں چھو کر بولا سر آپ یہاں...... آپ اس گندی بستی میں کیا کر رہے ہیں۔ وہی جو صدیوں سے ادیب کرتے آئے ہیں۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

سر آپ تو امریکہ میں پڑھا رہے تھے...... ہاں...... پڑھا تو رہا تھا...... مگر وہاں رہتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے دیس کو میری زیادہ ضرورت ہے۔ میرے دیس میں غریبوں اور جاہلوں کی گنتی بہت زیادہ ہے۔ اکثر پولس والے بستی میں دہشت گردوں کی تلاش میں دندناتے پھرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں بھوک کے کھیت میں ہی دہشت گردی جیسے اونٹ کٹارے اگتے ہیں۔ گندگی کے ڈھیر پر کھیلنے والے بھوکے ننگے بچوں کے ہاتھوں میں قلم کتابیں کبھی نہیں آتیں۔ جنہیں بات تک کرنے کا شعور نہیں وہ بڑے ہو کر دھینگا مستی۔ چھینا۔ جھپٹی۔ دنگے۔ فساد ہی کرینگے۔ زور آوروں کو ان ناتواں کی کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھا کر ان کے ساتھ رعایت برتنی چاہیئے۔ انہیں لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ زندگی جینے کے ڈھنگ سکھائیں اس قابل بنائیں کہ یہ بھی اپنی زندگیاں خوشحالی سے بسر کر سکیں۔

آؤ ہم سب مل کر اپنے دیس کو آگے بڑھانے کا عزم کریں کیونکہ عزم انسان کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

☆☆☆

آخر کب تک

منگل کا بچپن دکھوں اور مشکلات میں بیتا تھا۔ سونیا اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ ایک پھونس کی بوسیدہ سی جھونپڑی اور ایک زمین کا ٹکڑا اس کا کل سرمایہ تھا۔ جو اس کے لئے باغ عدن سے کم نہ تھا۔ دونوں اپنے کھیت میں محنت ومشقت کرتے کرتے جب پست ہو جاتے تو پیڑوں کی گھنی چھاؤں تلے کچھ دیر آرام کرتے۔ چٹنی روٹی کھا کر دوبارہ کام میں لگ جاتے۔ ان کا اکلوتا بیٹا رگھو گاؤں والوں کی گائیں چرانے لے جاتا۔ جنگل سے لکڑیاں چن چن کر لاتا۔ تو رات کی روٹی نصیب ہوتی۔ وہ تینوں اپنی اس دنیا میں بیحد خوش اور آسودہ تھے۔ منگل کی ایک ہی آشا تھی کے رگھو بڑا ہو کر ماں کا ہاتھ بٹائے گا۔ وہ شہر جا کر محنت مزدوری کر کے جو روپیہ کمائے گا اس سے اپنی ٹوٹی جھونپڑی کو سنوارے گا۔ اور اپنی سونیا اور رگھو کے لئے کپڑے خریدے گا۔ یہی سوچتے سوچتے سالوں پر سال گذر گئے۔ اور رگھو بڑا ہو گیا۔

سورج ڈوبتے ہی گاؤں میں سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ منگل اور سونیا کھیت سے لوٹے...... منگل نے بیڑی سلگائی ہی تھی کہ سونیا کی چیخ سن کر باہر بھاگا۔ اس کو زمین پر پڑا دیکھ منگل کے ہوش وحواس اڑ گئے۔ جھاڑ پھونک والے دوڑے آئے۔ ٹونا ٹوٹکا کروادیا۔ سب گاؤں والوں نے مل کر اپنی دیوی دیوتاؤں کو پکارا پر سونیا کی بند آنکھیں نہیں کھلیں۔ منگل سینہ پیٹتا رہ گیا اور اس کی سونیا مٹی کا ڈھیر ہو گئی۔

غریب کسان کے پاس اپنے آنسو پونچھنے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔ منگل اور رگھو اپنے اپنے دکھ دلوں میں سمیٹے کھیت کی طرف چل پڑے۔ کھیت کی لہراتی ٹھنڈی ہواؤں کی مہکار۔ چڑیوں کی چہکار۔ سورج کی سنہری کرنیں۔ منگل کے دل کو ذرا بھی نہ بھائیں۔ اسے تو فضا میں سونیا کی پائلوں کی جھنکار ہی سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ ہر قدم پر یہی احساس کہ سونیا اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ لیکن افسوس پیچھے خوفناک خاموشی اور سامنے دور تلک سناٹا اور زندگی کی ناہموار سونی پگڈنڈی تھی۔ رات ہوتی تو جا کر دریا کے تٹ پر بیٹھا کشتیاں دیکھتا رہتا۔ اس کی زندگی کی ناؤ ڈوب ہی گئی تھی۔ دوست دیکھتے تو گھر لے آتے۔ سب کا مشورہ تھا کہ دوسری شادی کر کے گھر دوبارہ بسا لے۔ اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایک بار خوشیوں کے دیئے گل ہو جائیں تو دل میں اندھکار پھیل جاتا ہے۔ پھر اس اندھیری بستی میں کوئی نہیں بس سکتا......

رگھو کی شادی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ جب دکھ ناقابل برداشت ہو گیا تو منگل رگھو کو لے کر اس کی سسرال پہنچ گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بڑی درد انگیز آواز میں اپنا دکھڑا سنایا کہ میرا جیون تو سونا ہو ہی گیا ہے اس سے پہلے میری ہمت کی ڈور ٹوٹ جائے میں رگھو کا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بہو کو لینے آیا ہوں۔ سنتے ہی تارو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ کانتا تمہارے ہی گھر کا اجالا ہے۔ اس طرح بیٹی کو خالی کیسے وداع کر دوں۔ کل گاؤں والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو۔ منگل نے تارو کے دونوں ہاتھ تھام

کر کہا۔ دوست میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ساتھی ہوں۔ میں تمہیں ساہوکار کا غلام بننے نہیں دوں گا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ جو کچھ بھی میرا ہے وہ سب رگھو اور کانتا کا ہی ہے۔ ہم غریبوں کو دو وقت کی روٹی جٹانا مشکل ہے۔ یہ لین دین کا رواج ختم ہو تو سب کا ہی بھلا ہو۔ پھر کوئی لڑکی اپنے باپ کے آنگن میں بیٹھ کر آنسو نہیں بہائے گی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہاری بیٹی کو بہو نہیں اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ گاؤں والوں سے کہہ دینا میں زور زبردستی اپنی بہو کو لے گیا ہوں۔

کانتا کی پائلوں کی چھن چھن اور کانچ کی رنگین چوڑیوں کی کھن کھن نے منگل کی اداس کٹیا میں دوبارہ زندگی کے رنگ بھر دیئے۔ رگھو اور کانتا کی مسکراہٹیں منگل کے دل کے گہرے گھاؤ پر مرہم کا کام کر گئیں۔ دل کو تھوڑا سکون ملا ہی تھا کہ اچانک منگل کا بیل مر گیا۔ کسان کی زندگی دکھ بھری تو ہوتی ہی ہے لیکن منگل کا مقدر تو ایسا بگڑا تھا کہ وہ ایک کے بعد ایک زبردست چوٹ کھا رہا تھا۔ آخر اسے قرضہ لینے کے لئے ساہوکار کی دہلیز پر ماتھا ٹیکنا ہی پڑا۔ غریب کسان اصل کہاں سے دیتا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ سود ہی ادا نہ کر سکا۔ منگل کے سپنے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ٹوٹے پریوار کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی مہینے بیت گئے۔

اس بار تو قسمت نے ایسا زوردار دھکا مارا کے منگل کے ہاتھوں سے سب کچھ ہی پھسل گیا۔ وہ ساہوکار کے دام فریب سے نہ بچ سکا۔ ساہوکار نے منگل کا پشتینی کھیت جہاں منگل کا بچپن بیتا تھا۔ جوانی میں اس کے سارے خوابوں نے جنم لیا تھا اور اب اس کی زندگی کا آخری سہارا تھا۔ ظلم جبر کر کے جائز اور ناجائز طریقے سے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کھیت سے تو منگل کی زندگی کی ڈور بندھی تھی۔ ذرہ ذرہ میں اسے اپنے ماتا پتا اور سونیا کے چہرے نظر آتے تھے۔ اس دن منگل اپنے لہلہاتے کھیت میں دھاڑیں مار مار کر رویا۔ بہت تڑپا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شمشان میں سونیا کو دہکتی آگ کے شعلوں کے سپرد کر کے رویا تھا۔ جب کوئی امید کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہیں دی تو رگھو نے اپنے باپو کو سہارا دے کر اٹھایا۔ واپسی کی ڈگر بہت کٹھن اور تیرہ و تار تھی۔ ڈوبتے سورج کے ساتھ منگل کی ساری خوشیاں بھی ڈوب گئیں۔

کچھ دن منگل اور رگھو نے دوسرے کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے گذارا کیا، فصل کٹنے کے بعد کہیں کام نہیں ملا۔ جب گھر میں دو دن چولہا نہیں جلا تو بھوک اور مفلسی نے دوبارہ اس غریب کسان کو ساہوکار کی چوکھٹ پر لا کھڑا کیا۔ ساہوکار نے قرضہ دینے سے تو انکار کر دیا۔ البتہ اسے بھٹے پر کام کرنے کو کہا۔ یہ سنتے ہی منگل کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ گاؤں چھوڑا تو ساہوکار کٹیا ہی ہڑپ لے گا۔ وہ اندر ہی اندر لرز گیا۔ لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ پیٹ کی آگ تو کسی طرح بجھانی تھی۔ اس نے ساہوکار کے حکم کے سامنے سر خم کر دیا۔

کالی رات کے اندھیرے میں کئی گھنٹے ہچکولے کھاتا ٹرک ایک جھونپڑی کے سامنے رکا اور تینوں کو اتار کر ڈرائیور بنا کچھ بولے آگے بڑھ گیا۔ پاس والی جھونپڑی سے کسی کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ وہاں جتنے بھی لوگ تھے سب کے بدن پر دھول اٹی ہوئی تھی۔ چہروں پر غضب کی اداسی اور مردنی چھائی دیکھ کر منگل دہل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ٹرک پر اینٹیں لادی گئیں اور ٹرک

آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ عورتیں سر پر مٹی لادے اور کچھ پانی بھر بھر کر لا رہی تھیں۔ بچے پاؤں سے مٹی گوندھ رہے تھے۔ دولڑکوں کے پیر سے خون بہتا دیکھ منگل نے من ہی من میں ساہوکار کو کوسا۔ ارے ظالم کم سے کم ان بچوں پر تو ترس کھایا ہوتا۔ تو ان معصوموں کا بچپن برباد کر رہا ہے۔ ارے پرماتما سے ڈر۔ جو دونوں جہاں کا مالک ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ایک دن تجھے تیرے اعمال کی سزا ضرور ملے گی۔ اور اس وقت تیری طاقت یہ دولت تیرے کچھ کام نہیں آئے گی۔ یہ نہ بھول انتقام لینا اس کا کام ہے بدلہ وہ ہی دے گا۔

منگل انہیں خیالوں میں غرق تھا پیچھے سے آواز آئی مالک کا چمچہ دیکھ رہا ہے۔ جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ یہاں آرام کرنا جرم ہے۔ اور اس جرم کی سزا بھی سخت ہے۔ رات کو خالی پیٹ سونا پڑتا ہے۔ منگل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دبلے پتلے مردہ بدن کو دیکھ کر پہلے تو پہچانا نہیں...... ارے تم رامو...... تم یہاں...... وہاں گاؤں میں سب تمہیں کھوج کھوج کر ہار گئے۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی۔ بولے مرگیا ہوگا۔ کیا تم رات میں چلا رہے تھے۔ ہاں بھائی میں ہی تھا۔ درد سے پورا شریر اکڑ گیا تھا۔ یہاں ہماری فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ یہاں جو بھی آیا زندہ نہیں لوٹا۔ جائے بھی کہاں نہ کھیت رہے نہ جھونپڑی۔ ساہوکار نے سب چھین کر یہاں اس جہنم میں مرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ اب تو یہاں سے جنازہ ہی اٹھے گا۔ سورج کی تپش اور بھٹے کی آگ سے سب کے چہرے جھلس گئے تھے۔ رگھو کا دن تو کام میں گذر جاتا۔ رات میں سوچتا رہتا...... اب تو ہمارا وطن آزاد ہے۔ کب آزاد ہندوستان کی حالت سدھرے گی۔ آخر کب تک ہم غریبوں کی سانسوں پر ان امیروں کا پہرہ لگا رہے گا۔ یہ بھی کوئی جینا ہے۔ میں یہ غلامی کی زندگی ہرگز نہیں جی سکتا۔ میں غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالونگا۔ اور اس ظالم ساہوکار کے چنگل سے سب کو آزادی مل جائے گی۔ جوان خون بغاوت کرنے پر آمادہ ہوگیا۔...... یہاں سے بھاگ جا...... اس سے پہلے کہ تو بھی بھوک اور پیاس سے ان کی طرح لاغر و کمزور ہو جائے...... چلا جا...... بھاگ جا...... بھاگ جا......

اس مستحکم ارادے کے ساتھ اندھیری رات کو وہ وہاں سے چل پڑا۔ بڑی تیزی سے اس کے قدم ایک نا معلوم منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ بھاگتا گیا۔ پھر رک کر سانس لی۔ پھر دوڑا۔ رگھو نے ریل گاڑی کبھی دیکھی نہیں تھیں۔ بس سنا تھا کہ ریل گاڑی لوگوں کو بڑے بڑے شہروں تک لے جاتی ہے۔ خاموش سنسان جنگل میں چھک چھک کرتی ریل گاڑی کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ اور تیز رفتار سے روشنی کی سمت دوڑا۔ گاڑی رکی رگھو کود کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سیٹی بجی۔ ریل گاڑی رات کے اندھیروں کو چیرتی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اور رگھو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ باپو اور کانتا کی یادیں رلانے لگیں۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اپنے دل کو سمجھایا۔ اگر آج اندھیرا ہے تو کل اجالا ہی اجالا ہوگا۔ تاب یقین ہوتو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ ساری زنجیریں غریبی کی کٹ جائینگی۔ اس کے دل میں ایک خوشی کی لہر پھیل گئی۔ گاؤں کا سیدھا سادھا نادان لڑکا دل میں ایک آرزو۔ ایک امنگ لئے اس خوفناک بے درد دنیا میں جا رہا تھا۔ جہاں غریبوں کی زندگیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جہاں غریب کو چونٹی کی مانند پاؤں تلے روندیا جاتا ہے۔ مسل دیا جاتا ہے......

رگھو نے گاڑی میں کئی لڑکوں۔ عورتوں۔ بچوں کو بھیک مانگتے دیکھا۔ جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ اور بھوک اور پیاس کی شدت اور اس کے ساتھ غم کی لہروں کے زور سے وہ ٹوٹنے لگا تھا۔ کمزوری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ دماغ بھی شل ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا وہ دھیرے دھیرے گہرے کنوئیں میں اترتا جارہا تھا......

منگل کی نیند کھل گئی۔ ایسا لگا کہیں کوئی دیوار گر پڑی ہو۔ رگھو کو پکارا کوئی جواب نہ پا کر وہ پاگلوں کی طرح چلاتا رہا۔ اور دوڑتا رہا۔ جب بالکل بے جان سا ہو گیا تو ایک دم ہی اسے کانتا کا خیال آیا۔ وہ واپس دوڑ آیا۔ کانتا اپنا سر پیٹ رہی تھی۔ بس رگھو کا ہی تو سہارا تھا۔ وہی تو اس کی جان وایمان تھا۔ وہ رو رو کر اپنے باپو سے کہہ رہی تھی۔ انہیں بچالو۔ ورنہ میں مر جاؤنگی۔ بیٹی کو یوں بلکتے دیکھ منگل کے ٹوٹے دل کے سارے شیشے اسے اندر ہی اندر چھیدنے لگے۔ اس نے کانتا کو زمین سے اٹھایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ میری بچی پرماتما کا نام لے۔ ایک دن وہ ہم غریبوں کی بھی سنے گا۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ مرنے کی بات نہ کر۔ مجھے بیٹے کی خبر نہیں کہاں ہے اگر میری بیٹی بھی مجھے چھوڑ گئی تو میں کیسے جیوں گا۔ ہمت کر بیٹا۔ ہمت کر۔ رگھو ضرور آئے گا اور ہم سب کو یہاں سے لے جائے گا۔

سب نے کانتا اور منگل کو گھیر لیا۔ سب ہی رگھو کے لئے پریشان ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں جل تھل تھیں۔ بھلا وہاں کس میں اتنی جرات اور ہمت تھی جو جاگیرے حکم کے بنا ایک قدم بھی اٹھا سکے۔ آج بڑی انہونی سی ہو گئی تھی۔ غصے کی شدت سے جاگیرے کا سر پھٹا جارہا تھا۔ آنکھوں سے قہر ابل رہا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا منگل اور کانتا کے پاس آپہنچا۔ سچ سچ بتادے کہاں ہے تیرا لڑکا۔ ورنہ......اس نے اپنا ڈنڈا اوپر اٹھایا ہی تھا کہ شیر خان جو واقعی اپنی جوانی میں شیر ببر کی مانند تھا اور اب ساہوکار کے جال میں پھنس کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی رہ گیا تھا آگے بڑھ کر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ جاگیرے تم بھی ایک بیٹا کھو چکے ہو۔ اولاد کا غم جانتے ہو۔ کیوں ایک غمزدہ باپ سے سوال کرتے ہو۔ پیچھے سے آواز آئی۔ خدا کے قہر سے ڈر جاگیرے وہ ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اس آواز میں ایسا درد تھا کہ جاگیرے سہم کر رہ گیا......

جب رگھو کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا......صاف شفاف کپڑوں میں ملبوس لوگوں کو تیزی سے ادھر ادھر چلتے پھرتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے اس نے سوچا......کسی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ مسکراتا چہرہ دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ بھگوان نیچے اتر آئے ہیں......ڈرو نہیں ڈاکٹر انور بولے۔ تم گاڑی میں بے ہوش پائے گئے تھے۔ اب ہسپتال میں ہو......کیا نام ہے تمہارا......ڈاکٹر کے لہجے سے ہمدردی ٹپک رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی ایک بڑے آدمی نے رگھو کو انسان سمجھ کر اس سے بات کی تھی وہ بھی کمال دلیری سے بولا......بابو جی میرا نام رگھو ہے......مجھے فاقے کھینچتے کھینچتے کئی دن ہو گئے ہیں پر میں نے قسم کھائی ہے نہ ہی بھیک مانگوں گا اور نہ چوری کرونگا۔ رگھو کو کھانا دینے کا حکم صادر کر کے ڈاکٹر انور آگے بڑھ گئے۔

جب رگھو صحت یاب ہو گیا تو ڈاکٹر نے اسے جانے کو کہا......رگھو نے ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ کر فریاد کی......بابو جی میں بے گھر ہوں اور بے حد غریب بھی۔ یہاں کسی کو جانتا بھی نہیں۔ میں کہاں جاؤں گا۔ رگھو کی باتوں میں کچھ ایسا ضرور تھا جو ڈاکٹر کو متاثر کر گئیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ رگھو اچھا لڑکا ہے۔ وہ تھے بھی بڑے حلیم اور فروتن دل۔ انہیں رگھو کی مفلسی پر ترس آگیا۔ ان کے دوست آصف کو ایک مالی کی ضرورت تھی سو رگھو کو آصف کے گھر پہنچا دیا گیا۔

رگھو نے محنت اور جانفشانی سے کام کر کے سب کے دل جیت لئے۔امی جی کی بات تو وہ ایسے مانتا جیسے وہ اس کی سگی ماں ہو۔ایک دن رام داس نے رگھو کا راستہ روک کر کہا۔یار تو ہماری ذات کا ہو کر ہم سے ہی دور بھاگتا ہے۔رگھو سٹپٹا گیا۔بولا۔میں تمہیں جانتا بھی نہیں اور تم نے میری ذات پات کا بھی پتا لگا لیا۔رام داس نے ہنس کر کہا۔تم ابھی بہت بھولے ہو۔نئے نئے شہر میں آئے ہو۔دھیرے دھیرے سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔یار شہر میں صرف دو ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ایک ذات تو ان امیر لوگوں کی ہے جنہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ اور اپنی زور آوری پر غرور ہے۔اور دوسری ذات ہماری ہے۔یعنی ان کے غلاموں کی۔ہم بدقسمت کمزور حالات کی چکی میں پسے ہوئے لوگ اپنی مفلسی کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں پھر ان کی ملکیت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ہمارے معصوم بچے ان کی دکانوں کارخانوں ہوٹلوں اور گھروں میں دن رات محنت کرتے ہیں۔صرف تھوڑے سے پیسوں اور دو وقت کی روٹی کے لئے۔یہ ہماری غریبی کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔احمق تو ہم لوگ ہیں۔محنت ہم کرتے ہیں تجوریاں یہ بھرتے ہیں۔جب تک غریب کے جسم میں ذرا سی بھی قوت باقی رہتی ہے وہ ان کے اشاروں پر ناچتا ہے۔اور جیوں ہی جسمانی طور پر کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے تو وہ اسے بے جان اشیاء کی طرح باہر پھینک دیتے ہیں علاج نہیں کرواتے جب کہ اپنے پالتو کتے کے علاج پر ہزاروں روپئے برباد کر دیتے ہیں۔جانتے ہو کیوں ایسا ہو رہا ہے۔کیونکہ یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں ایک مرے گا تو اس کی جگہ بھرنے کو دس ننگے بھوکے صف میں تیار کھڑے ہیں۔یاد رکھ ایک دن تیرا بھی یہی حال ہوگا۔ساہوکار کے ہاتھ دی ہوئی سختیاں تلخیاں اور ساری اذیتیں رگھو کیسے بھول سکتا تھا۔فوراً ہی بولا۔ہاں بھائی کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو لیکن سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔میرے مالک بہت اچھے آدمی ہیں۔غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔اور امی جی تو دیوی ہے دیوی۔انہوں نے مجھے وچن دیا ہے کہ وہ میری مدد ضرور کرینگی۔اور جلد از جلد مجھے گاؤں بھجوا دے گی۔یہ کہہ کر رگھو آگے بڑھ گیا۔گاؤں کا بھولا بھالا لڑکا رام داس کی باتوں کا مفہوم نہ سمجھ پایا۔جو کچھ یاد رہا جا کر امی جی کو بتایا۔انہوں نے بھی رام داس کی بات پر زیادہ غور سے نہیں سوچا۔بس رگھو کو رام داس سے دور رہنے کی تلقین دی۔

ایک دن رگھو کو رام داس گھر کے سامنے ہی مل گیا۔ارے تو ابھی تک اپنے گاؤں نہیں گیا۔تیری دیوی جیسی امی جی کے وچن کا کیا ہوا۔تیرے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔وہ تجھے بہلا پھسلا کر جھوٹے وعدے اور دلاسے دے کر اپنا کام نکال رہی ہیں۔ان زر پرست لوگوں کی زبانوں کا یقین کبھی نہیں کرنا۔ان کے گھروں میں دولت کی فراوانی ہے۔تجوریاں بھری ہیں۔لیکن ان کی دولت میں ہم غریبوں کا حصہ نہیں ہے۔اس لئے ہمیں اپنا حصہ ان سے چھین کر لینا پڑتا ہے۔لڑ جھگڑ کر۔اب تو بھی گاؤں جانے کے سپنے دیکھنے چھوڑ دے۔رگھو اسے کیا بتاتا کہ وہ شہر کس مقصد سے آیا ہے۔وہ آگے بڑھ گیا

جب کئی دن رام داس نظر نہ آیا تو رگھو خوش ہو گیا کہ چلو بلا ٹلی۔رگھو گھر کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ جانے کس طرف سے رام داس جن کی طرح برآمد ہوا۔بڑا گھبرایا سا دکھائی دے رہا تھا۔اس نے رگھو کا ہاتھ پکڑا اور بھاگتے ہوئے کہا تیری ماتا جی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ڈاکٹر بلانا ضروری ہے۔رگھو نے پوچھا بھی میری امی جی کو کیا ہو گیا ہے۔کچھ جواب نہیں ملا۔رام داس اسے ایک کمرے میں لے گیا۔اگر ایک اور سوال کیا تو تجھے اور تیری امی جان دونوں کو ختم کر دونگا۔تیرے گاؤں میں آگ لگا دونگا۔رگھو کے تو برے حال ہو گئے۔کانپتی تھرتھراتی آواز میں پھر سوال کیا۔کیوں بھائی میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔مجھے چھوڑ دو......رحم کرو......رام داس نے کہا چھوڑ دونگا۔ضرور چھوڑ دونگا۔تو یہ شربت پی

اور آرام کریں میں تیرے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔

رگھو سڑک پر بیہوش پڑا تھا۔ کچھ ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا سب طرف دھواں ہی دھواں چھایا ہے چاروں طرف آگ لگی ہے۔ اس کا گاؤں جل رہا ہے۔ بچاؤ...... بچاؤ...... پانی...... پانی...... گاؤں والوں کی درد بھری چیخیں سنائیں دیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا...... رگھو پوری قوت سے چلایا...... آگ...... آگ...... میرا گاؤں جل رہا ہے...... اس کی کمزور آواز حلق میں ہی گم ہوگئی۔ اس کے دماغ پر ایسا دھند چھایا ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی صحیح طور سے سوچ نہیں پا رہا تھا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے بالکل ہی نڈھال ہوگیا تھا۔ سر اٹھانا چاہا پر وہ بھی نہ کر سکا۔ ہوٹل کے سامنے بھیڑ جمع ہوتے دیکھ کر وہاں کے دو لڑکوں نے اٹھا کر اسے ہوٹل کے پیچھے ڈال دیا...... اسے پانی دیا...... کھانا کھا کر بھی وہ اٹھ نہ سکا۔

دوسرے دن رگھو کے چہرے پر سورج کی کرنیں پڑیں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ پورے ہوش و حواس میں تو تھا۔ لیکن اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے رام داس کا خوفناک چہرہ لہرایا تو وہ چلا اٹھا...... نہیں مجھے مت مارو...... فوراً ہی ہوٹل کا لڑکا دوڑا آیا...... رگھو نے اس سے پوچھا...... میں کہاں ہوں...... یہ کون سی جگہ ہے...... وہ بولا...... ارے یہ مدراس ہے۔ لگتا ہے تو نیا آیا ہے اس شہر میں...... تم چلا رہے تھے۔ کیوں کیا ہوا۔ رگھو نے کچھ جواب نہ دیا...... ہوٹل میں کام کرے گا۔ سن کر رگھو لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے ہولیا کہ پیٹ بھرنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

رگھو شدید رنج والم میں بھی دن بھر کام کرتا۔ سونے کو آنکھیں بند کرتا تو نیند نہ آتی۔ یادیں اسے گاؤں میں لے جاتیں۔ وہ اپنے بابو کو ڈھونڈھتا۔ انہیں وہاں نہ پا کر اینٹوں کے بھٹے کی تلاش کرتا۔ پر کوئی نشان ہی نہ ملتا۔ وہ یہ سارا قصہ کسی ہمدرد کو سنانا چاہتا تھا۔

ایک دن حسب معمول رگھو ہوٹل میں میز صاف کر رہا تھا کہ گوپال بابو کی نظر اس پڑی۔ انہوں نے فوراً آصف کو مدراس آنے کے لئے فون کیا۔ رگھو کو دیکھ آصف کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن رگھو اپنے مالک کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا کہ اب اسے ساری مصیبتوں سے رہائی مل جائے گی لیکن ان کی آتشی آنکھیں اور ان کے پیچھے ہتھکڑی لئے سپاہی کو دیکھ شدت خوف سے کانپنے لگا۔ وہ وہیں منجمند ہو کر رہ گیا۔ آگے قدم کیا اٹھاتا اس کی تو سانس ہی اٹک کر رہ گئی۔ جب مالک اس کے قریب گئے تو ان کے دونوں پاؤں پکڑ کر رو رو کر بولا۔ مالک مجھے امی سے ملوا دیں وہ چلاتا رہا۔ مالک میری عرض سنو۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ امی جی کو میرا پورا حال معلوم ہے۔ وہ چلاتا رہا اور سپاہی اپنا کام کرتے رہے۔ پولس کی حراست میں وہ الہ آباد لایا گیا۔ شدید درد و کرب کا اظہار کرتے ہوئے پھر سپاہی سے عرض کی کہ صرف ایک بار امی جی کے درشن کروا دو۔ وہ ہی مجھے بچا سکتی ہیں۔

سپاہی نے ایک زور کا دھکا دے کر جیل کی کوٹھری میں دھکیل دیا۔ زیادہ ہوشیاری مت دکھا۔ بالکل چپ رہ۔ ورنہ مار مار کر تیری کھال ادھیڑ دونگا۔ سلاخوں کے پیچھے بیڑیوں ہتھکڑیوں میں جکڑا رگھو سمجھ گیا کہ وہ کسی ایسے خطرناک جال میں پھنسایا گیا ہے جہاں سے اب وہ زندہ کبھی نہیں نکل پائے گا۔ اسے اپنی زندگی کی آس و امید نہ رہی۔ اگلا ہر قدم اسے موت کی طرف لے جائے گا۔ باپو اور کانتا اور ان سب ساتھیوں کا کیا ہوگا۔ اس سوچ نے اسے بے قرار کر دیا...... اس کا سپنا ٹوٹ گیا تھا۔

آصف خان اپنے ابو رحمت خان کو بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رگھو کی گرفتاری کا حال سنا رہے تھے۔ اور

رحمت خان اپنے بیٹے کو بڑے غور سے دیکھ کر بولے۔ یہ خبر ہے تو بڑی اچھی مگر لڑکے کا جرم تو ثابت ہونے دو پھر اسے مجرم ٹھہرانا۔ تم ان معاملات کو نہیں سمجھتے۔ تم بزنس والے تو ہر ایک کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہو۔ میری عمر وکالت کرتے گزر گئی۔ میں لوگوں کے چہرے پڑھتا ہوں۔ ان کی ہر بولی یعنی جھوٹ یا سچ سمجھتا ہوں۔ ان کی آنکھوں میں اتنی گہرائی سے جھانکتا ہوں کہ ان کے دل کا حال تک پڑھ لیتا ہوں۔ اس لڑکے کو پورا پورا انصاف ملنا چاہیئے۔ اور اگر اس نے یہ سنگین جرم کیا ہے تو اسے سزا بھی سنگین ہی ملے گی۔ نہ معلوم کیوں میرا دل اس لڑکے کے لئے دکھتا ہے۔ تم گوپال سے کہہ دینا کہ اس بچے کا خیال رکھے۔

سرکاری وکیل ہونے کے ناطے گوپال کو رگھو کے مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔ رگھو کے چہرے اور جسم پر کالے داغ دیکھ کر سپاہی سے تلخ لہجے میں بولا۔ مجرم بھی انسان ہوتے ہیں۔ اس لڑکے کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا اور تم نے اس پر ظلموں کی بارش شروع کر دی۔ پھر رگھو کی طرف رجوع کیا۔ رگھو نے گوپال بابو کو سارا حال ترتیب سے سنایا۔ ساہوکار کے ظلم وستم کی کہانی دہرائی رام داس کے ساتھ ہوئی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ پھر گوپال بابو کے پاؤں پکڑ کر سوال کیا۔ بابو جی میں یہاں کیوں ہوں؟ میرا جرم کیا ہے؟ گوپال بابو نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا تم نے سنگین جرم کیا ہے۔ امی جی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور سارا مال لے کر رفو چکر ہو گئے۔ سنتے ہی رگھو کے تو حواس گم ہوئے۔ دکھ و درد کی سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ گوپال پھر بولے تم نے امی جی کے دوپٹے سے ان کا گلہ گھونٹ دیا۔ رگھو چیخ چیخ کر بلک بلک کر ایسا رویا جیسے کوئی اپنی سگی ماں کے مرنے پر روتا ہے۔ جب کچھ سنبھلا تو بولا بابو جی جانور بھی اپنی ماں کو نہیں مارتا میں تو انسان ہوں۔ شہروں میں ایسا ہوتا ہوگا۔ ہم گاؤں والے تو اپنے ماتا پیتا کو دیوی دیوتاؤں کی طرح پوجتے ہیں۔ مجھے ماتا جی نے وہ سب کچھ دیا جو مجھے درکار تھا۔ میں تو ان کا خادم تھا لیکن ان کے آنچل تلے مجھے ماں کا پیار ملا۔ میں اپنے ان ہاتھوں سے اس ممتا کے آنچل کو کیسے تار تار کرتا تھا۔ رگھو کی آواز میں ایسا درد گھلا کہ گوپال کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ وہ اسے بڑی دیر تک بڑے تاسف اور حیرانی سے تکتا رہا۔ حسب عادت سپاہی پھر چیخا۔ مجرم ہمیشہ اپنے آپ کو بے گناہ ہی کہتا ہے۔ تو نے وہ عظیم جرم کیا ہے۔ جس کی سزا صرف پھانسی ہے۔ سچ بولے گا تو وکیل بابو تجھے پھانسی کے پھندے سے بچا لیں گے۔ رگھو رنج وغم سے چور چور ہو چکا تھا۔ بڑی افسردہ آواز میں بولا...... بابو جی ماتا جی کے سایہ تلے مجھے ایک آس بندھی تھی۔ گاؤں واپس جانے کی آس۔ وہ سایہ ہی نہیں رہا تو آج آس بھی ٹوٹ گئی۔ سچ کہتا ہوں جھوٹ نہیں بولتا میری قسمت میں زندگی بھر کی جیل لکھی ہو یا پھانسی کا پھندا...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... کچھ فرق نہیں پڑتا...... اب جو ہو سو ہو......

گاؤں کی مضبوط لڑکی اپنے دکھ بڑی ہمت سے جھیل رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر سسکتی رہتی پر اپنے باپو کے سامنے آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے نہیں دیتی۔ رات میں چپکے چپکے رو رو کر سو جاتی۔ اداسیوں سے بھرا دوسرا دن بھی آتا اور بیت جاتا۔ اسی طرح انتظار کرتے کرتے کتنی ہی مضطرب راتیں اور بیقرار دن بیت گئے۔ اس کا رگھو نہیں لوٹا۔ پھر کانتا کو اپنی زندگی کی تمنا بھی نہیں رہی۔

منگل کے تو چپ سی لگ گئی تھی۔ کوئی سوال بھی کرتا تو وہ بس آنکھوں سے آنسو ٹپکا دیتا۔ بیٹے کی جدائی نے آنکھوں میں کانٹے بو دیئے تھے۔ اسے ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد ظالموں سے بھری اس ناراست زمین پر اس کی بیٹی اکیلے کیسے جی سکے گی۔ ان کی نظروں میں ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کی کوئی عزت وقدر ہی

نہیں ہے۔

رگھو اپنی زندگی کی آس تو کھو ہی چکا تھا۔ بس باپو اور کانتا اور گاؤں والوں کا خیال آتا تو اس کے دل میں درد وغم کی لہر اٹھتی اور اسے بیقرار اور بے چین کر دیتی۔ ایک دن گوپال بابو جب رگھو کا بیان سن کر باہر جانے لگے تو رگھو نے ان کے پاؤں میں سر رکھ دیا...... بولا...... بابو میرے گاؤں میں سیاہ ظلمات اور درد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ساہوکار اور اس کے لوگوں نے وسیع تباہی پھیلا رکھی ہے اور کوئی نہیں جوان لوگوں کی مدد کرے۔ ہم ٹھکرائے ہوئے غریب محتاج ضرور ہیں پر ہم محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے والے لوگ ہیں۔ چور اور خونی نہیں۔ بابو جی جب انسان سپنے دیکھتا ہے تو اڑنے کے لئے پر بھی نکل آتے ہے۔ پر سپنا تو سپنا ہی ہوتا ہے۔ ٹوٹ جاتا ہے اور پر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے بھی ساہوکار کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کا سپنا دیکھا تھا۔ ٹوٹ گیا میرا سپنا بابو جی۔ دنیا والوں نے پر کاٹ ڈالے۔ اور حاکموں نے بیڑیاں ڈال دیں۔ بدقسمتی نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ حادثات اور واقعات کا شکار بنایا گیا۔ بابو جی میں ایک آزاد پنچھی کی طرح جینے کا قصد کر کے ایک کٹھن سفر طے کر کے آصف صاحب کے گھر تک پہنچا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ مجھ جیسے غریب اور بے سہارا لڑکے میں وہ سب کرنے کی توفیق نہیں تھی جو میں کرنا چاہتا تھا۔ ساہوکار نے جو گاؤں میں قیامت مچا رکھی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پھر کیوں کسی حاکم کی نظر ہم غریبوں کی طرف نہیں اٹھتی۔ بابو جی آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ وکیل ہیں۔ خدا نے آپ کو اتنی توفیق دی ہے کہ گرتے ہوؤں کو سہارا دے کر اٹھائیں۔ بابو سب مجھے خونی سمجھتے ہیں۔ اگر آپ نے دیری کر دی تو وہ سب کے سب بھوکے پیاسے مر جائینگے۔

شاید یہی رگھو کی دعاؤں کی مقبولیت کا دن تھا۔ تب ہی تو اس کے منہ سے نکلے ایک ایک حرف کی ایسی تاثیر ہوئی کہ گوپال بابو کے دل میں اس غریب لڑکے کے لئے رحم کے ساتھ ساتھ ڈھیروں پیار بھی امڈ آیا۔ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بارعب اور پر تحکم لہجے میں کہا۔ میں پوری کوشش کرونگا شرط یہ ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔ رگھو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ایشور تو دل کے سارے بھید جانتا ہے۔ اس سے کچھ چھپا نہیں ہے۔ آپ تو میرے بھگوان ہیں۔ وکیل صاحب کے چہرے پر پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ ایسی جادو بھری تھی کہ رگھو کی تڑپتی روح تک روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ دل میں پھر سے وہی امید جاگ اٹھی کہ اس کا سپنا ضرور پورا ہوگا۔ میں نہ بھی رہا تو کیا۔۔ میرے گاؤں میں امن اور شانتی ہوگی۔ میلے لگیں گے۔ ہولی کھیلی جائے گی۔ لال۔ پیلا۔ ہرا رنگ۔ دوالی منائی جائے گی۔ گھر گھر دیئے جلائے جائیں گے۔ کچھ دیر کے لئے وہ اپنی بچپن کی دنیا میں کھو گیا۔

گوپال بابو جیل سے نکلے۔ سیدھے آصف سے ملنے گئے۔ دونوں کی پرانی دوستی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ چائے کی پیالی منہ سے لگا کر بغور آصف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا...... تمہارا رگھو کے بارے میں کیا خیال ہے۔ آصف بولے...... میں گھر میں رہتا ہی کتنی دیر ہوں۔ زیادہ وقت تو ملک سے باہر ہی رہتا ہوں۔ امی کا کہنا تھا لڑکا بہت ایماندار۔ وفادار اور محنتی ہے۔ اس کے دل میں محبت اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ بھوک سے بڑا کوئی عذاب نہیں۔ غریبی اور مفلسی انسان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ گوپال نے فوراً ہی دوسرا سوال داغا۔ کسی رام داس نامی لڑکے کو جانتے ہو...... نہیں...... یار...... ٹھیک ہے نہیں جانتے تو جلد جان جاؤ گے۔ یہ کام ایک لڑکے کا نہیں ہے۔ یہ ان بے روزگار ان پڑھ غریب لڑکوں کا ہے جن کے سروں پر بڑی طاقتور ہستیوں کا سایہ ہمیشہ رہتا

ہے۔آج کل اس قسم کے حادثے عام ہورہے ہیں۔آج تمہارے گھر ہوا کل میرا گھر ہوسکتا ہے۔شہر میں کوئی گھر محفوظ نہیں۔

بہت سارے دن گزر گئے گوپال بابو لوٹ کر نہیں آئے تو جیل کی کوٹھری میں ناامیدی کی کالی گھٹائیں چھا گئیں اور رگھو کے دل میں آنسوؤں کی تیز بارش برس پڑی۔امی جی کا مہربان چہرہ آنکھوں میں گھومنے لگا۔میں کوشش کرونگا۔گوپال بابو کی آواز بار بار اس کے دماغ میں لہرانے لگی۔رات کے وحشت ناک سناٹے میں کسی کے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کے ٹکرانے کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ ڈالا۔لو پھر کسی غریب بے سہارا کی موت کا پیغام آیا ......رگھو جہنم میں پڑا تھا۔اس کے اندر جہنم بھڑک اٹھا۔سپاہی نے بڑے خشک انداز میں رگھو کی طرف دیکھا۔صاف کپڑے دیتے ہوئے کہا...... کپڑے بدل کر تیار ہوجاؤ...... آج تجھے کورٹ جانا ہے۔آج تیری قسمت کا فیصلہ سنایا جائے گا۔...... پھانسی ...... رگھو کو ایسا محسوس ہوا جیسے قیامت قریب آگئی ہو...... شکست یعنی گاؤں والوں کی موت...... آخری وقت اپنے تو یاد آتے ہی ہیں...... رگھو کو وہ سب چلتی پھرتی لاشیں دکھائی دینے لگیں جو شاید آج بھی بھوک اور پیاس اور گرمی کی شدت سے جھلس رہی ہونگی...... باپو میں ہار گیا...... میرے دل کا ارمان پورا نہ ہوسکا۔دکھ سے ٹوٹا ہوا...... بکھرا ہوا رگھو کپڑے دیکھ کر دیر تک روتا رہا۔

کورٹ میں بیگانے چہرے دیکھ کر رگھو کا دل گھبرایا گیا۔اپنے مالک وکیل رحمت خان کو دیکھا تو بے ساختہ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ سلام کرنے کو اوپر اٹھائے۔اس کا بس چلتا تو اپنے سارے بند توڑ ڈالتا اور دوڑ کر اپنے مالک کے قدم چوم لیتا۔پاؤں میں زور کی جنبش بھی ہوئی...... لیکن...... افسوس وہ ہل بھی نہ سکا۔

کھٹ......کھٹ...... جج صاحب تشریف لا رہے تھے۔سب کھڑے ہوگئے۔رگھو کا دل زور زور سے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔پھر وکیلوں کی بحث شروع ہوئی گوپال بابو کھڑے ہوکر بولے یہ صاف ستھرے من کا گاؤں کا سیدھا سادا لڑکا صرف دل میں ایک خواہش ایک جذبہ لے کر شہر آیا تھا کہ محنت کرکے روپیہ کمائے گا۔اور کسی طرح اپنے ساتھیوں کو ساہوکار کی غلامی سے رہائی دلوائے گا۔

غریب اگر احمق ہو تو اس کا حال اس لڑکے کی طرح کی ہوتا ہے۔غدار۔مجرم اور قاتل ٹھہرایا جاتا ہے۔ہر انسان نے اس لڑکے کی غریبی اور کم عقلی کا فائدہ اٹھایا۔یہ لڑکا احمق اور نادان ہے لیکن اس کے ساتھ ایماندار۔وفادار اور سادہ دل بھی ہے۔اس کے اخلاق نے گھر کے سب لوگوں کے دلوں میں جگہ کرلی تھی۔اخلاق ہی تو وہ خوشبو ہے جو سب کو متاثر کرتی ہے۔اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ امی جی نے اس کے غم کی داستان سنی اور وعدہ کیا کہ اسے گاؤں واپس بھیج دیں گی......اس کو کبھی شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھا کیوں...... کیونکہ ہر انسان کے اعمال کا دارومدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔اس لڑکے کی نیت میں فریب اور دھوکہ نہیں تھا۔امی جی ایک سوشل ورکر تھیں۔وہ اس کی مصیبتوں کو سمجھتی بھیں۔مجھے یقین ہے اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو رگھو کا مقصد ضرور پورا ہوتا۔یہ گناہ اس معصوم کے سر نہ لادیں ورنہ وہ جو سب کا خالق ہے اس کے خون کا بدلہ ہم سے لے گا۔آپ لوگ غور سے سوچیں۔کیا یہ بھیانک جرم ایک رگھو جیسا نادان اور احمق لڑکا کرسکتا ہے۔کورٹ میں شور وغل مچ گیا اور رگھو کے دکھی اور بے سکون دل کو تھوڑی سی راحت ضرور ملی تھی۔

جج صاحب نے رگھو سے سوال کیا...... تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔کوئی گواہ ہے تمہارا...... رگھو نے سوچا جب مرنا ہی ہے تو کیوں نا دل کا سارا غبار آج سب کے سامنے نکال دوں۔وہ بڑے ٹھوس اور مضبوط لہجے میں بولا۔حضور

......میں گاؤں کا غریب کسان...... میرے پاس کھانے کو نہیں گواہ خریدنے کے لئے روپے کہاں سے لاتا۔ ہم غریب لوگ امیروں کی نظروں میں ذبح ہونے والے جانور کے برابر سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تو ساہوکار نے غریب کسانوں کی زندگیاں جہنم بنا رکھی ہیں۔ میں بھی بھٹے پر تھا۔ جہاں دو دن قیام کرنا مشکل تھا۔ میں تو غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا قصد کر کے وہاں سے بھاگا تھا۔ پر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ امی جی ہی نہ رہیں اور مجھ بدنصیب کے سر ان کے خون کا الزام لگا دیا گیا۔

ایک غریب کسان کی زندگی کی وقعت ہی کیا ہے۔ مجھے پھانسی لگ جانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ میرے مرنے سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ میرے لئے تو کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہیں کیونکہ میرا باپو اور میری بیوی اور میرے ساتھی اب تک اس بھٹے کی آگ میں بھسم ہو چکے ہونگے۔ ہمارے لیڈر ووٹ لینے آتے ہیں تو ہزاروں وعدے کرتے ہیں۔ اسکول بنائیں گے۔ اسپتال کھولیں گے۔ ہر طور سے کسانوں کی مدد کریں گے۔ لیکن لوٹ کر ہمارا حال بھی پوچھنے نہیں آتے۔ لیکن ایک ہے جو سب کا انصاف کرتا ہے۔ ہم غریب بھی اس کی مخلوق ہے۔ ہماری اتنی بساط کہاں جو کسی سے انتقام لے سکیں۔ لیکن وہ جو سب کا مالک ہے ہمارا انتقام ضرور لے گا۔ ہم پر ظلم اور سختیاں تو ازل سے ہوتی رہی ہیں۔ اور ہمیشہ ہی ہوتی رہیں گی۔ ہائے میں کیسا بدبخت آدمی ہوں کہ اپنے بھائیوں کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اب میں اپنے خون سے ان کی آزادی خریدونگا۔ جب تک جیتا ہوں آپ کے اختیار میں ہوں۔ آپ کو قانونی تقاضہ تو پورا کرنا ہی ہوگا۔ مجھے تو پھانسی لگے گی ہی تب میرا خون میری گواہی دے گا۔ حضور مرنے والے کی آخری خواہش ہمیشہ پوری کی جاتی ہے۔ میری آخری خواہش ہے کہ آپ لوگ میرے گاؤں والوں کو اس ظالم ساہوکار کی بنائی جہنم سے آزاد کرا دیں رگھو کا بیان سن کر کورٹ میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ رگھو کو بیحد گھٹن کا احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی گلہ دبوچ رہا ہو۔

پھر کورٹ میں شور مچ گیا۔ ایسا بہادر اور پر اعتماد لڑکا خونی نہیں ہو سکتا۔ رگھو نے سامنے نظر کی اپنے باپو اور کانتا کو اجلے کپڑوں میں دیکھ کر اسے خود اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ ان کو دوبارہ دیکھنے ان سے ملنے کی امید تو وہ کھو چکا تھا۔ اس کے بے قرار دل کو قرار آیا تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ منگل نے اپنے لاڈلے کو ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھا تو مارے گھبراہٹ کے بوکھلا گیا۔ دل میں غم کی ایک لہر اتر آئی۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

سپاہیوں کے ساتھ ساہوکار جی اور رام داس کو اندر آتے دیکھ رگھو خاموش نہ رہ سکا۔ وہ چلایا حضور یہی ہے رام داس اور وہ ہیں ہمارے ساہوکار جی۔ بھگوان داس جو بڑے نیک اور ایماندار آدمی سمجھے جاتے تھے۔ انھیں ہتھکڑیوں میں دیکھ سب ششدر و حیران رہ گئے۔ کورٹ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

گوپال بابو نے کہا آپ نے ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے کس آسانی سے ہم سبھوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے۔ آپ تو ناصح تھے۔ ہم سب کو نصیحتیں دیتے تھے کہ آپس میں محبت رکھنا ہی معقول عبادت ہے۔ اور غریبوں کو ستانا سب سے عظیم گناہ ہے۔ آپ نے تو غریبوں کی مشکلیں دور کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے سب کو بہلاتے رہے اور غریبوں کے نام سے اپنے پیٹ کی خدمت کرتے رہیں آپ کتنے ہی گھروں کی خوشیاں نگل گئے۔ کتنے گھر اجاڑ دیئے۔ کتنوں کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ کہاں ہیں۔ رامو اور شیر خان۔ دولت کی ہوس نے آپ کو درندہ بنا دیا۔ لالچی انسان درندوں سے بھی زیادہ ظلم اور بربیت پھیلاتا ہے۔ کورٹ میں خاموشی طاری ہو گئی۔

جج صاحب جو نہ کبھی کسی غریب کی رعایت کرتے تھے اور نہ ہی بڑے آدمی کا لحاظ کرتے تھے۔ ہمیشہ راستی سے انصاف کرتے تھے۔ لیکن آج اپنے دوست بھگوان داس کے چہرے پر پھٹکار برستی اور شرم سے گردن جھکی دیکھ مارے صدمے کے ان کے منھ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ انہیں اپنے کرسی کا بھرم تو رکھنا ہی تھا۔ مشکل سے انہوں سے بھگوان داس کی طرف اپنی نگاہیں مرکوز کر کے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آپ اتنی بڑی جائداد کے تنہا مالک اور مختار ہیں۔ دولت کی ہوس اور حصول زر کے لئے اپنے آپ کو اتنا ارزاں کر دیا کہ آج دوستوں کے سامنے آنکھیں اٹھانے کے لائق بھی نہ رہے۔ دولت کی ہوس میں آپ نے خود کو تو غارت کیا ہی ساتھ میں اپنے خاندان والوں کو ذلت کی آگ میں جلنے کو چھوڑ دیا۔ اب یہ آگ بجھائے نہ بجھے گی۔ ذلت کی چنگاریاں آپ کی آئندہ نسل کو بھی سلگاتی رہیں گی۔ آپ نے اپنے دوستوں کا اعتماد بھی کرچی کرچی کر دیا۔ وہ سارے جذبات اور احساسات سے عاری بولے ہی گئے۔ دولت کی لالچ میں آپ نے اپنے آپ کو انسانی سطح سے اتنا زیادہ نیچے گرا دیا کہ لوگ آپ کو درندہ کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسے زور آوروں کو چاہیئے کے ناتوانوں کی مدد کریں نہ کہ اپنی خوشی کی خاطر ان سے انکی چھوٹی چھوٹی چاہتیں اور خوشیاں چھین لیں۔ امدادی اداروں کو بہت آزادی اور اہمیت دی جا رہی ہے۔ ان اداروں پر سخت نظر رکھی جائے۔ تاکہ مستقبل میں کوئی شخص اپنی من مانی نہ کر سکے۔

زنجیروں کے دہانے کھلتے ہی رگھو دوڑ کر گیا اور گوپال بابو کے پاؤں پکڑ کر بولا...... بابو جی مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ مجھ جیسے غریب اور بے سہارا لڑکے کو انصاف ملے گا۔ سنا تھا شہر کے بڑے افسر رشوت خور۔ بے ایمان اور بڑے ہی سخت دل ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ مجھے تو جو بھی ملے سب ہی مہربان دل ملے۔ ابھی بھی اس ظالم دنیا میں دیالو اور سچے لوگ موجود ہیں جن کے سائے تلے ہم غریب لوگ زندہ رہ سکتے ہیں۔

گوپال بابو نے رگھو کو اوپر اٹھایا۔ اس کے کندھے تھپکتے ہوئے بولے۔ تم جیسے بہادر حوصلہ مند لڑکے اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ جو کام پوری لگن محنت ایمانداری اور خلوص سے شروع کیا جائے اس میں تو کامیاب ہونا ہی ہوتا ہے۔ تم نے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کام شروع کیا تھا۔ تمہاری کامیابی صرف تمہارے لئے ہی نہیں ہم سب کیلئے باعث فخر ہے کہ ایک گاؤں کے بے سہارا لڑکے نے اپنی جان کی پروانہ کرکے کتنی اور جانیں بچا لیں۔

اس وطن کی مٹی کو تم جیسے جوانوں کی ضرورت ہے جو آگ بجھائیں نہ کہ رام داس کی طرح اپنی بھلائی کے لئے دوسروں کے گھر جلا دے۔ رگھو نے اپنے مالک کے پاؤں پکڑ لئے۔ غم کی شدت سے اس کا گلہ بند ہو گیا۔ بس آنسو تھے جو موسلا دھار بارش کی طرح بہتے جا رہے تھے۔

منگل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مالک آپ نے میرے بیٹے کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ بیگم صاحبہ نے میرے بیٹے کو اتنی زیادہ محبت دی جس کے قرض اتارے نہیں اتریں گے۔ میرے اور میرے گاؤں والوں پر آپ لوگوں نے بہت سارے احسانات کئے۔ اور ہم سب مل کر بھی ان احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ ایک اور کرم ہم پر کر دیں۔ بابو شیر خان نے گاؤں والوں کی خاطر اپنی جان دے دی۔ شیر خان کی بوڑھی ماتا جی جو پورے گاؤں کی ماتا جی کہلاتی تھیں اپنے بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی تھیں۔ دن رات ندی کے تٹ پر بیٹھی اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہتی تھیں۔ ایک رات وہیں ڈھے گئیں۔

ساہوکار نے میری اور شیر خان کی زمین پر پکا گھر بنالیا ہے۔ بابو جی مجھے اس گھر کی ضرورت نہیں میں اس کا کیا کرونگا کیونکہ میں تو پھونس کی کٹیا میں رہنے کا عادی ہوں۔ شیر خان کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں...... ہمارے یہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ آپ لوگ دیا کر کے اس گھر میں اسکول کھلوادیں تاکہ میرے گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے بچے وہاں پڑھ سکیں۔ گاؤں کے بچوں کو بھی پڑھنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔

منگل کا ایک ایک حرف رحمت خان اور گوپال بابو کو متاثر کر گیا۔ رحمت صاحب فوراً ہی بولے تم جو چاہو گے وہ ضرور ہوگا۔ رحمت خان صاحب جو رگھو کو بیحد پسند کرتے تھے بولے میں شروع سے جانتا تھا کہ رگھو جیسا سچا اور فرمانبردار لڑکا ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنے کارخانے میں ایسے ہی لڑکوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو رگھو۔ یہاں ہی رہ کر کام کرسکتا ہے۔ ان کے انداز میں اتنا اپناپن تھا کہ منگل نے فوراً ہی رگھو اور کانتا کو آگے بڑھا کر کہا...... مالک یہ آپ ہی کے بچے ہیں۔

کانتا جو بڑی دیر سے سب دیکھ رہی تھی اور سن رہی تھی پر سمجھی کچھ بھی نہ تھی۔ اس نے رگھو کو اپنے اتنے کھڑا دیکھا تو بے اختیار آنکھیں رگھو کی طرف اٹھ گئیں۔ نگاہوں کے تصادم پر وہ ہلکی سی مسکرائی تھی۔ اس حیا آمیز لڑکی کی مسکراہٹ کی دلکشی کہہ رہی تھی کہ اس کے من میں پھولوں کی برسات اتر آئی تھی......

☆☆☆

ایک اہم سوال

یادیں تو یادیں ہوتی ہیں۔ بن بلائے مہمانوں کی طرح چلی آتی ہیں اور پھر جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ کبھی ہنساتی ہیں تو کبھی رلاتی ہیں۔ نرملا کی بچپن کی یادیں بھی بے حد پیاری اور میٹھی میٹھی تھیں۔ جب بھی آتیں اسے رلا جاتیں...... نرملا کو پریشان دیکھ کر اس کے بابا پریشان ہو جاتے۔ جب وہ تھوڑی بڑی ہوئی تب بابا نے تفصیل سے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ آزادی۔ بٹوارہ۔ پاکستان۔ سرحد اس کے چھوٹے سے ذہن میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ رو کر بولی ...... بابا آپ نے میری سہیلیوں کو روکا کیوں نہیں۔ بابا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ بھاری آواز میں سنجیدگی سے بولے۔ اس برے وقت میں کون کس کو روک سکتا تھا۔

کچھ سوچ بچار کے بعد نرملا بولی...... بابا ہم ان سے ملنے جائینگے۔ بابا دھیرے سے بولے تم بڑی ہو جاؤ پھر سوچیں گے۔ بابا اپنی لاڈلی کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ ان کی باتیں سن کر نرملا کو یقین ہو گیا وہ اپنی بچھڑی دوستوں سے اب کبھی نہیں مل پائے گی۔

تہوار آتے اور چلے جاتے۔ ہر دیوالی...... عید اور جنم دن پر نرملا کے دل میں خوشی اور غموں کا ملا جلا ایک عجیب سا احساس ہوتا۔ دل غم سے بھر جاتا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ کتنے ہی سال گذر گئے وہ اپنا بچپن نہ بھلا سکی۔ وہ گم صم سی ہو جاتی اور گزری میٹھی یادوں میں کھو جاتی۔

جب تھوڑی اور بڑی ہوئی تب بابا نے اس کو آزادی کا قصہ سنایا...... بولے جانتی ہو دلی ہمارے ملک کی راجدھانی ہے۔ یہ وہ قدیم شہر دلی ہے جسے بادشاہوں نے کئی بار ایک بیوہ کی طرح اجاڑا اور بار بار ایک نئی نویلی دلہن کی طرح سجایا اور سنوارا۔ پھر شدید بے چینی اور ظلم کا دور آیا۔ انگریز ہماری سرزمین کے مالک بن بیٹھے۔ وہ تو اس حسن و جمال کی پری پر نثار ہو گئے۔ انہوں نے اسے اور سنوارا اور سجایا...... اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے۔ دنیا اس کی خوبصورتی پر رشک کرتی تھی۔ یہ حسن کی شہزادی ان گوروں کے ہاتھوں میں گرفتار خاموشی سے چپکے چپکے سسک سسک کر آنسو بہاتی رہی۔ ان کے دیوانوں نے جب جب اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی انگریزوں نے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ ان کو نیست و نابود کر دیا۔ مگر دہلی کے پرستاروں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور دیوانہ وار دہلی کے غم غلط کرنے میں جٹے رہے۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہندوستانی تو یہ بھول گئے تھے کہ آزاد پرند کس طرح کھلی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ جوں جوں گوروں کے ظلم و ستم بڑھتے گئے ہندوستانیوں کے حوصلے اور جرأت میں کئی گنا اضافہ ہوتا گیا۔ آزادی کی چنگاری تو بھڑک ہی اٹھی تھی۔ پوری ہندوستانی قوم بیدار ہو چکی تھی۔ آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آتش فشاں کبھی بھی پھٹ سکتا تھا۔ ہر وطن پرست کی آنکھوں میں آزادی کے خواب تھے۔ دلوں میں سرفروشی کا جوش و خروش امڈ رہا تھا۔ پھر ان دلیر اور وفادار وطن کے سپاہیوں کو کون شکست دے سکتا تھا۔

نرملا انتہائی غور و خوض سے بابا کی باتیں سنتی رہی۔ آج وہ سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ بڑی ہی دھیمی آواز میں بولی ...... بابا پھر کیا ہوا...... بابا بولے پھر وہی ہوا جو ایک ظالم بادشاہ اپنے غلاموں کے ساتھ کرتا ہے۔ وطن کے وفادار سپاہی سرکش اور غدار کہلائے۔ جس نے بھی برطانوی طاقت کے خلاف آواز اٹھائی وہ بڑی بے دردی سے مارے پیٹے گئے۔

جیل کی کال کوٹھریوں میں ڈال دیئے گئے۔ انگریزوں نے انہیں بے انتہا اذیت پہنچائی۔ پھر وہ چہرے وہ آوازیں ان کوٹھریوں کی چار دیواروں میں گم ہوگئیں۔ دلیر آزادی پسند ارباب وفا کا ایک ہی نعرہ تھا...... ہم کو آزادی چاہیئے۔ لاتعداد وطن پر مر مٹنے والوں نے ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ ان پر جھوٹی سازشوں کے الزام لگا لگا کر سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ نہ وہ ڈرے نہ غمگین ہوئے۔ انہوں نے تو ہنستے ہنستے موت کو گلے لگالیا۔ بے شمار وطن پرستوں کو پھانسی لگادی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پھانسی لگانے کیلئے رسی کم پڑ گئی۔ بقیہ غداروں کو بھالوں اور تلواروں سے چھید ڈالا۔ لاکھوں کے سینے بندوق کی گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ جن ہرے بھرے درختوں کے نیچے ان جوانوں کا بچپن بیتا تھا انہیں درختوں کی ڈالیوں پر ان کی لاشیں جھولتی رہیں......

ہندوستان کی زمین پر کہرام مچ گیا...... ملک بڑی آفتوں اور مصیبتوں میں گھرا تھا...... سب سے برا حال تو ان بدبختوں کا ہوا جن کے نصیب میں جلا وطنی ملی...... وہ بدنصیب تو اپنے وطن کی ہوا میں آخری سانس لینے سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ جو مجرم اور غدار پکڑے گئے انہوں نے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ ہنستے ہنستے اپنے جرموں کا اقبال کیا...... ہندوستان ہمارا ہے...... بندے ماترم کہتے کہتے دم توڑ دیا...... نثار ہو گئے وطن پر...... سب کچھ وطن کی آزادی اور بہبودی کے لئے قربان کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنی جانوں تک سے دریغ نہیں کیا ان گنت عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ بچے یتیم ہو گئے۔ لاکھوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ نرملا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

بابا کے سرخ چہرے پر درد و کرب کے آثار عیاں تھے۔ کچھ وقفے کے بعد بولے...... ہندوستان کی فضا اداس اور غمگین تھی...... ملک کے اوپر موت اور خطرے کا جھنڈا لہرا رہا تھا...... وطن کے دانشور رہنما فکر مند تھے کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ اس جنگ میں عورتوں نے بھی بہت بڑا رول ادا کیا۔ اس طویل جنگ آزادی کی جدوجہد میں پوری کی پوری ہندوستانی قوم یعنی کہ ہندو...... مسلم...... سکھ...... عیسائی...... امیر اور غریب سب ہی شامل تھے۔ سب کا ایک ہی نعرہ تھا...... دور ہٹو...... یہ ہندوستان ہمارا ہے...... لوگ کوڑے کھاتے رہے مگر نعرے بند نہیں ہوئے۔ انگریزوں کے ظلم اور سختیاں بڑھتی گئیں...... لیکن ہندوستانیوں کے فولادی ارادے نہیں بدلے...... وہ بھی اپنی ضد پر ڈٹے رہے...... شہیدوں کی فہرست روز بروز بڑھتی گئی۔ جیلیں بھرتی گئیں۔ اب ہندوستانیوں کو روکنا مشکل تھا۔ انگریزوں کے ظلم کی شدت دیکھ لوگ ڈرے نہیں۔ پوری قوم سمجھ گئی تھی کہ انگریز ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں اور دشمن کو وطن سے باہر نکالنا ہی ہوگا۔

ایک مبارک دن وہ روشن سورج طلوع ہوا جس کی سنہری کرنوں نے آزاد ہندوستان کو جگمگا دیا۔ نسیم سحر اٹھلاتی آئی اور ہماری سرزمین کو آزادی کی مہک سے معطر کر گئی۔ شہیدوں کے خون نے زمین سے پکارا ۔اے وطن پرستو! تم نے اس کو ممکن کر دکھایا جسے ساری دنیا ناممکن سمجھتی تھی۔ اب یہ مقدس زمین صرف تمہاری ہے۔ اٹھو اے قوم کے وفادار دلیر سپاہیو اپنے وطن کو آنے والے خطروں سے بچاؤ۔ اپنے وطن کی نگرانی کرو...... وطن کے دانشور سیاسی رہنماؤ اٹھو اور وطن کی باگ ڈور سنبھالو۔ نرملا اتنا سب کچھ سن کر بولی...... آزادی کے بعد تو سب کو مل کر خوشیاں منانی چاہیئے تھیں...... سب لوگ چلے کیوں گئے...... بابا بولے بتاتا ہوں...... یہ

بھی ایک پر درد لمبی کہانی ہے......

آزادی ملی......وطن پر ترنگا لہرایا......بے شمار خوشیاں بھی ساتھ لائی......اور ایک ایسا پیچیدہ سوال بھی ساتھ لائی......جس کے جواب میں ہمارے عزیز وطن کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ گلستان لٹ گیا......پھول مرجھا گئے......بلبلوں کے دل بے چین و بیقرار ہو اٹھے۔اس چمن کے پرندے تو برسوں سے ساتھ ساتھ رہنے کے عادی تھے......سب ایک ہی تو تھے......لیکن فرقہ پرستی کا بیج بو کر اس چمن کو اجاڑ دیا......اب نئے آشیانے بنانے کے لئے ایک ایک تنکا بٹورنے کا وقت ہی کہاں تھا۔وہ بے سروساماں اپنے گھر چھوڑ کر نئے گھونسلے بنانے نکل پڑے......

یہ کیسی سازش تھی......یہ کیسی بربادی تھی......چاروں طرف آگ......قتل عام......چیخ پکار......دوزخ جیسا سماں تھا......بٹوارہ ہوا......سرحدیں بنیں......ایک نئے ملک کا جنم ہوا......کل تک جو قوم ایک تھی اور کندھے سے کندھا ملا کر آزادی کی جنگ میں برابری سے لڑ رہی تھی......جس قوم کا ہر شخص اس وطن کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار تھا......ایسی بدگمانی ہوئی کہ ساری قوم میں دراڑیں پڑ گئیں۔ایسی دراڑیں جو جلد ہی گہری کھائیاں بن گئیں۔اب ان کھائیوں کو پار کرنا ناممکن ہے۔کل تک جن کی خوشیاں اور غم ایک تھے وہ ایک دوسرے کی جان کے خواہاں ہو گئے۔پورے وطن میں قتل اور خون کی بارش ہو رہی تھی۔بوڑھے۔جوان۔عورتیں۔بچے جو سامنے آیا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔آسمان پر آگ اور دھوئیں کے بادل چھا گئے۔

دو دوستوں کے درمیان اعتبار کا رشتہ ٹوٹ جائے تو۔دوستی میں زلزلہ آجاتا ہے۔دوستی اور پیار کی دیواریں گرنے لگتی ہیں۔یہاں تو یہ عالم تھا کسی کو کسی پر بھروسا ہی نہیں رہا تھا۔دونوں فرقوں کے درمیان دوستی محبت اور پیار کا رشتہ کانچ کی طرح ٹوٹ گیا۔ساری قوم بکھر گئی۔دلوں میں بے اعتمادی اور بے اعتقادی کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ہندوستان کے مقدر پر آسمان رو پڑا۔زمین لرز اٹھی......اتنا قتل و غارت دیکھ کر بھی ان ظالم بیدرد انگریزوں کے دلوں میں جنبش بھی نہ ہوئی......کیوں ہوتی......ان کی نظروں میں ہندوستانیوں کی زندگیوں کی نہ کچھ قدر و قیمت تھی اور نا ہی احترام تھا......کیسے ہوتا......ہم تو برسوں سے ان کے غلام تھے۔کسی کی ماتحتی میں رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔جو سر اٹھا کر چل نہ سکے اس کی بھی کوئی زندگی ہے۔ساری دنیا نے ہندوستان کی بربادی کا تماشہ دیکھا لیکن سب چپ چاپ خاموش تھے۔بولتے بولتے بابا خاموش ہو گئے۔ان کی آنکھیں لال ہو گئیں اور دو آنسو ٹپ ٹپ گرے۔

نرملا اس رات بہت دیر تک جاگتی رہی۔اس اداس اور بے نور صبح کے لئے سوچتی رہی جب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔سب کے گھر اجڑے پڑے تھے۔موہنی کا گھر بھی دہشت گردوں نے پھونک ڈالا تھا۔ماں کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔بابا افسردہ اور خاموش تھے۔اس دن گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔برسوں کے ساتھی پلوں میں ایسے بچھڑے کہ دل بے قابو ہو کر رو پڑا تھا۔

آہستہ آہستہ سال بیتے۔نرملا کی آنکھوں میں پچاس سال پہلے کا ہر منظر اترنے لگا تھا......زندگی تو اپنی راہ پر چل ہی رہی تھی لیکن آج بھی اس کو بچپن کی دوستیاں یاد آتی ہیں......وہ پہلی جیسی خوشیاں اب کہاں تھیں۔ان کے چہرے۔نام......آج بھی دل و دماغ میں گھومتے ہیں۔شبنم کو کیسے بھلا دوں۔دو دن پہلے ہی تو میری گڑیا کی شادی اس کے گڈے کے ساتھ ہوئی تھی......سب نے مل کر شادی کے گانے بھی تو گائے تھے۔باقاعدہ بارات آئی تھی۔دعوتیں ہوئی تھیں۔

موہنی نے ڈھولک بجائی تھی۔ نرملا آہستہ آہستہ وہی گانا گنگنانے لگی۔ چھوڑ بابل کے گھر مجھے...... آنکھوں سے آنسو نکل کر چہرے پر بہتے رہے۔ موہنی تم بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ شبنم تم اپنی بہو کو ساتھ لے گئیں۔ جاتے وقت مجھ سے ملنے کا بھی خیال نہ آیا تم کو...... کیسے آتا...... نہ جانے اس وقت تم پر کیا بیت رہی ہوگی...... ثریا...... عذرا...... رضیہ...... کہاں ہو تم سب...... میری تو ایک ہی دعا ہے تم لوگ جہاں بھی رہو شاد رہو...... آباد رہو...... خدا تم سبھوں کو دنیا کی ہر نعمت سے بھرپور رکھے جیسے یہاں تھیں۔ بچپن کی یادیں تمہیں بھی آتی ہونگی...... خوب ستاتی ہونگی...... نئے ماحول میں...... نئی جگہ میں ہزار مشکلات کا سامنا بھی کیا ہوگا۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا...... تو کتنا اچھا ہوتا...... ہم سب ساتھ ساتھ ہوتے۔

جب جب ساون آتا ہے میں جا کر جھولے دیکھ کر رو پڑتی ہوں۔ وہ جھولے آج بھی تم سبھی کو یاد کرتے ہیں...... دیکھوں وہ آم کے پیڑ...... پھل سے لدے ہوئے ہیں...... مجھے ان آموں میں اب وہ مٹھاس نہیں لگتی...... یاد ہے ہم سب پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر آم کھاتے تھے...... اماں آوازوں پر آوازیں دیتی تھیں...... ارے یہ شریروں کی ٹولی کہاں گئی۔ ارے بچیوں کھانا تو کھا جاؤ...... دادی اماں ہم سب کو بٹھا کر پیار سے کھانا کھلاتی تھیں۔ آلو پوری اور سوجی کا حلوا...... آج میں خود اپنے آپ سے سوال کر رہی ہوں...... کہاں گئی وہ شریروں کی ٹولی...... کہاں گئی وہ اماں کی رس بھری آواز...... وہ حلوا...... وہ پوری......

تم سب کہاں گئیں میرا بچپن بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اب بھی اس حویلی میں تم لوگوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔...... تمہاری محبت کی مہک آج بھی آتی ہے۔...... بس تم دکھائی نہیں دیتی ہو...... کہیں دور جا کر چھپ گئی ہو...... میں آج بھی حویلی کے پٹ کھولے اپنی سہیلیوں کا انتظار کر رہی ہوں......

پروین اماں سے کہنا میرے عید کے جوڑے اور سامان بھیج دیں۔...... میں ہر عید پر انتظار کرتی ہوں...... شاید تم تھالی لئے دروازے پر آجاؤ...... تمہیں تو میرا پتہ یاد ہوگا...... تم چاہو بھی تو مجھے بھلا نہ پاؤ گی کہ بچپن کی یادیں تو وہ قیمتی خزانہ ہوتی ہیں جنہیں ہم دل کے کسی گوشے میں زندگی بھر کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔ میں ہر سال تمہارے نام کی مٹھائی کی تھالی سجاتی ہوں...... تمہاری دیوالی کی مٹھائی اور جوڑے کہاں بھیجوں...... دیئے جلاتی ہوں تو ان کی روشنی میں تم لوگوں کے چہرے نظر آتے ہیں...... ہنستے ہوئے...... مسکراتے ہوئے...... یہی تو میں چاہتی ہوں کہ تم خوش رہو...... کس سے پوچھوں اپنی سکھیوں کا پتہ...... کون جانے کہاں جا کر بس گئی ہو...... سرحدوں پر تو دونوں طرف کڑے پہرے لگے ہیں...... ہمارے دلوں پر پہرے نہ لگا سکے......

خدا نے ہر انسان کو اپنی شبیہ پر بنایا ہے۔ جب سب کا خالق ایک ہی ہے تو پھر مذہبوں کا سہارا لے کر کیوں دنیا کا امن وچین لوٹا جا رہا ہے۔ ہر مذہب اچھی اچھی باتیں سکھاتا ہے۔ بس خدا تک پہنچنے کے راستے جدا جدا ہیں۔ پھر مذہبوں کا اختلاف انسان کو انسان کا دشمن کیوں بنا دیتا ہے۔ خدا نے یہ دنیا جو جنت سے کم نہیں ہم انسانوں کے بنائی ہے۔ اور ہم انسان اس جنت کو دوزخ بنا رہے ہیں۔ ایسا کیوں اور کب تک ہوتا رہے گا۔ یہ فرقہ پرستی کب ختم ہوگی۔ کب خوشیاں لوٹ کر آئیں گی۔ بچپن کی یادیں دل سے نکلتی ہی نہیں کہ وہی یادیں تو سب سے پیاری ہوتی ہیں۔ لیکن بکھرے ٹوٹے افسردہ جذبات کو الفاظ دینا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ کون سمجھے گا میرے دل کی بات...... دل کا حال تو دل ہی جانے...... وہ روتی رہی اور سوچتی رہی اب آگے کیا ہوگا......

پچاس سال بیت گئے۔ان بیتے سالوں میں لوگ چاند کی سیر بھی کر آئے۔ہم کہاں تک پہنچے ہیں۔ہمارے غریب تو آج بھی ظلم اور مفلسی کی چکی میں پس رہے ہیں۔غریب بھی ایک محفوظ اور باوقار زندگی گذارنے کا حق دار ہے۔ کیا سب کو یہ سارے حقوق ملتے ہیں۔

آج بھی کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں صاف شفاف پانی پینے کو نہیں ملتا...... کتنے ہی سروں پر چھت نہیں جو سڑکوں پر بس گئے ہیں۔ننگے۔بھوکے بچے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔کتنے ہی بے روزگار جوانوں نے بھیک مانگنا اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ بیماروں کو علاج نہیں ملتا۔دودھ میں ملاوٹ۔کب ملک کے لوگوں کو کھانا اور مکان نصیب ہوں گے۔ہر بچے کو تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔ہم لوگ تو آج بھی جہالت اور مفلسی کے جال میں پھنسے ہیں۔ایک پختہ قوم کو صحت منداور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

اب ہمارے سامنے ایک اہم سوال ہے۔کیا ہم بھی اور ملکوں کی طرح ترقی کے راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ہمارے ملک کی تہذیب وتمدن برسوں پرانی ہے پھر کیوں آج ہم دنیا کی نظروں میں جاہل سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔اگر ان غریبوں کی طرف توجہ نہ دی تو ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

وطن کی باگ ڈور سنبھالنے والوں نے بڑی بڑی تقریریں کی تھیں۔وعدے کئے تھے۔سب کو یقین دلایا تھا کہ آزاد ہندوستان میں نہ کوئی مالک ہوگا نہ کوئی غلام۔سب برابر ہونگے۔ہر ایک کو اس کے بنیادی حقوق دیئے جائیں گے۔کیا ہمارے سیاسی رہنما یہ سوچتے ہیں کہ عوام کے خواب پورے ہو گئے۔خواب تو صرف ان کے پورے ہوئے ہیں جن کے پاس دولت ہے۔جو اپنی دولت سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔کیا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں......

اونچے طبقے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ اپنے وطن کو جہالت اور پس ماندگی سے رہائی دلوائے۔غریبوں کو سہارا دے کر قوم کو آگے بڑھائے۔ہمیں ایک ایسے مضبوط مرکز کی ضرورت ہے جو عوام کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو سمجھے۔ان کے بڑھتے مسائل حل کرنے میں ان کی پوری پوری امداد کرے۔آپسی اختلاف چھوڑ کر ملک کی بہبودی اور ترقی کی طرف دھیان دے۔ہم سب کو یہ یاد رکھنا ہے کہ یہ آزادی ہم نے لاکھوں شہیدوں کے خون اور قربانی کے بدلے پائی ہے۔کیا ہم نے اپنے ملک کے لئے کچھ قربانی دی ہے۔

اگر نہیں...... تو آگے بڑھئے اور ایک غریب بچے کا ہاتھ تھام کر اسے غربت اور جہالت اور بھوک کے گہرے سمندر سے باہر کھینچ لائیے...... یہ نہ بھولئے جس ملک کے لوگ قربانیاں دینا جانتے ہیں وہ ملک کبھی کسی ملک سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔اس ملک کے لوگ روز بہ روز ترقی کے راستے پر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔آپسی تفرقے بھلا کر صرف یہ یاد رکھئے کہ ہم سب ہندوستانی ہیں اور یہ عظیم ملک ہندوستان ہمارا ہے۔

آیئے ہم سب مل کر اس عظیم ملک کو عظیم تر بنائیں...... یہ تب ہی ہوگا جب ہر ایک کو ایک سوال کا جواب مل جائے گا......اور وہ سوال ہے......کیا میں نے اپنی منزل پالی ہے......اگر ہاں تو آپ خوش نصیب ہیں...... خدا کرے آپ ہمیشہ چراغ بن کر اس وطن کو روشن کرتے رہیں......اس سفر میں آپ کے ساتھ اور بھی کئی نوجوان تھے جو اچانک بڑھتے بڑھتے رک گئے ہیں......وہ تھکے نہیں ہیں...... لیکن ان کے آگے بڑھنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی

ہے......

ان کی مجبوری ہے......ان کی مفلسی اور غریبی......جو ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتی بلکہ پیچھے ڈھکیل رہی ہے...... پیچھے مڑ کر تو دیکھئے اور مدد کے لئے ہاتھ بڑھائیے......یقین کریں آپ کی روشنی سے ایک نہیں سو چراغ جل اٹھیں گے......اور آپ کا یہ وطن جگمگا اٹھے گا......

☆☆☆

آؤ......تم ہمارے اپنے ہو

دنیا کا ہر شریف اور عزت دار باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بچہ اس کی ہی طرح ایک مثالی زندگی بسر کرے۔اپنے حلقے میں جانا پہچانا جائے۔مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی بچے ایسے ایسے سنگین جرم کر ڈالتے ہیں کہ ان کے بچپن کے سنگی ساتھی۔دوست احباب تو کیا سگے رشتے دار بھی ان سے دور بھاگ جاتے ہیں۔

مجرم خود تو مجرموں کی بستی میں ایک کال کوٹھری میں قید رہ کر اپنے گناہ کی سزا کاٹتا ہے۔جہاں موت اور زندگی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا پھر آگے نہ کوئی منزل اور نا ہی منزل کی تمنا۔بس اندھیرا......گپ اندھیرا ہی اندھیرا......وہ اپنے شریف اور عزت دار والدین کی جیتی جاگتی زندہ لاشوں کو دکھوں اور ندامت کے تپتے بھاڑ میں جھونک جاتا ہے......جہاں یہ بدنصیب لوگ لمحہ بہ لمحہ۔آہستہ آہستہ اس لاوا میں جلتے اور سلگتے دھیرے دھیرے راکھ ہو جاتے ہیں۔

اس ظالم زمانے کے ظالم اور بے درد لوگ اس راکھ کے ڈھیر کو بار بار کرید کر ان مجبوروں کی روحوں کو تڑپاتے رہتے ہیں۔ان نصیبوں کے ماروں کو نہ زمین پر چین اور نا ہی مر کر قرار ملتا ہے۔

آیئے ایک ایسے ہی بدنصیب باپ کی سچی کہانی سنیئے......

دکھ میں رچی ہوا......سردبیزار آنسو ٹپکاتا ماحول......سڑک پر دور تک لوگوں کی بھیڑ......ہر چہرہ اداس......ہر آنکھ سوالی......اندر کورٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا......یوں لگتا تھا فیصلہ سننے کے لئے گاؤں کے گاؤں لڈ پڑے تھے۔سانحہ بھی تو بڑا عجیب تھا......

کورٹ روم میں مکمل خاموشی تھی۔دل دہلا دینے والا سناٹا جو ہر بھیانک طوفان سے پہلے آسمان وزمین کو گھیر لیتا ہے۔نہ کوئی سسکی نہ کوئی ہچکی......سب کی نظریں سامنے کھڑے دونوں نوجوان مجرموں پر لگی تھیں۔جن کے زرد چہرے شرم وحیا کے بوجھ سے جھک گئے تھے۔ان کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں ان کے جرم کی سنگینی کا اعلان کر رہی تھیں۔

یہ تھے ماسٹر سورج سنگھ کی آنکھوں کے تارے۔پریم لتا کے جگر پارے اور پریما جیسی پیار کرنے والی بہن کے دلارے۔بڑا ہی دکھ بھرا منظر تھا......سب کو بیقراری سے جج صاحب کے آنے کا انتظار تھا۔جلد آئیں اور فیصلہ سنائیں

اس بھیڑ میں زیادہ تو ماسٹر کے شاگرد تھے۔کچھ ان کے سنگی ساتھی تھے جن کے ساتھ برسوں پرانے مراسم تھے۔اور کچھ تھے ان دونوں مجرموں کے بچپن کے یار دوست۔یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی کہ سنگین جرم کی سزا سنگین ہی ہوتی ہے یہ سب کے سب ان دونوں مجرموں کے لئے دعائے خیر مانگ رہے تھے۔اب بھی امید تھی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ آفت کی گھڑی ٹل جائے۔یا اس منحوس گھڑی کے آنے سے پہلے قیامت ہی کیوں نہ آجائے اور ماسٹر جی جیسے نیک اور مخلص انسان کو اس عمر میں یہ عظیم دکھ تو نہ جھیلنا پڑے۔پر قسمت کی مار سے کون بچ سکا ہے۔

ماسٹر جی کی ہستی گاؤں والوں کے لئے سب سے اہم تھی......وہ اپنی زندگی میں کبھی ناکام اور لاجواب نہیں ہوئے تھے۔ان کی موروثی زمین کے پاس ہی سرکاری اسکول تھا......سالوں سال سے وہ اس کے کرتا دھرتا تھے۔وہ اس پرانی نسل کے آدمی تھے جسے اپنا کم دوسروں کے مفاد کا زیادہ خیال رہتا ہے۔وہ کہتے تھے کہ ملک کا مستقبل ہمارے وطن کے ننھے منے بچوں کی مٹھیوں میں بند ہے۔بچوں کی ترقی یعنی دیس کی ترقی۔یہی وطن کے محافظ ہونگے۔لیکن یہ کیا

غضب ہو گیا تھا۔ چراغ تلے اندھیرا۔ ان کے اپنے بیٹے اپنے چھوٹے بھائی کو تحفظ نہ دے سکے تھے...... گناہ عظیم تو بیٹوں نے کیا تھا لیکن باپ اپنے کو اس درجہ شکست خوردہ محسوس کر رہے تھے کہ ان میں نظر اٹھانے کی بھی تاب نہ تھی......

سناٹے میں جج صاحب کی آواز گونجی تھی...... سزا سنا دی گئی تھی...... فیصلے نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ماسٹر جی نے اس سانحہ کے بعد زندگی کی تمنا ہی چھوڑ دی تھی...... وہ بیچارے تو منوں مٹی تلے سسک رہے تھے...... وہ سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھے رہ گئے تھے...... جانتے تھے یہ تو ہونا ہی تھا...... ماں کی ممتا اور بہن کی محبت سر عام تڑپ اٹھی تھی......

رونق سنگھ جو اپنے کو بڑا سورما سمجھتا تھا جس نے اس کالی رات کو اپنے سگے بھائی پر جنگلی درندے کی طرح وار کیا تھا۔ اسے بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا آج اپنی موت کا پروانہ سنتے ہی ایک بے حد ناتوان اور بے بس بچے کی طرح رو رو کر اپنی ماں کو یکلخت گھورے جا رہا تھا۔ اس لحیم شحیم آدمی کی ساری کی ساری بہادری ایک پل میں کافور ہو گئی تھی......

بیس سال کی جیل با مشقت سنتے ہی چندن سنگھ جیسا کٹھور دل انسان لرز اٹھا...... اس کے لرزتے پاؤں اس کے لمبے چوڑے کانپتے وجود کا بوجھ نہ اٹھا سکے...... وہ وہی کٹگھرے میں ڈھے گیا۔ ماں کی فلک شگاف چیخ سب کے جگر چیر گئی...... بیٹی خود بے حال تھی پر کسی طرح ماں کو تھام رکھا تھا۔ ماں کا سر بیٹی کے کاندھے پر ٹک گیا تھا...... اماں ...... او ماں...... جب کچھ جواب نہ ملا تو خوفزدہ لڑکی پوری طاقت سے چیخی۔ کورٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ دونوں مجرموں کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جنبش ہوئی۔ بہن نے اپنا دوسرا لرزتا ہاتھ بلند کیا۔ اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا۔ لوگ پانی لے آئے تھے۔ اماں کے چہرے پر پانی چھڑک رہے تھے۔ پنکھا جھل رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی...... بی بی جلدی اماں کو باہر لے آؤ۔ یہ صدمہ نا قابل برداشت ہے۔ جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی انسان پر اس سے زیادہ کربناک گھڑی نازل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تھا اس بدبخت بہن کا منگیتر جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی...... مگر پہلے ہی موڑ پر ساتھ چھوڑ دیا تھا...... اس بے گناہ لڑکی کو اپنے بھائیوں کے گناہوں کی سزا زندگی بھر جھیلنی ہو گی...... اس کا منگیتر تماشائی بن کر اپنے باپ سے چھپ چھپا کر کورٹ میں فیصلہ سننے تو آ گیا تھا لیکن پریما کے دکھ بانٹنے کی ہمت اس میں نہ تھی...... پریما کو ہوش ہی کہاں تھا جو کچھ سنتی...... وہ کسی طرح ایک ہاتھ سے ماں کو سنبھالے ہوئے تھی اور اس کی آنسو ٹپکاتی آنکھیں بھائیوں پر ٹکی تھیں......

سپاہی اس کے جان سے پیارے بھائیوں کو لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے...... وہ دونوں مڑے...... بلکتی بہن کا دل خوف اور درد کی شدت سے زور زور سے دھڑکنے لگا...... ایک دلدوز چیخ نکل پڑی۔ بہن ایسی تڑپ کر روئی کہ سب کانپ اٹھے۔ بے انتہا درد کی شدت سے دونوں سپاہیوں کے بھی قدم ٹھہر گئے۔ بھائیوں نے پلٹ کر اپنی بلکتی بہن اور سسکتی ماں کو دیکھا...... بہن کے تھرتھراتے سوکھے ہونٹوں نے جنبش تو کی تھی...... پر اس کے دونوں بھائی بہتے آنسوؤں کے ساتھ سپاہیوں کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔ انسان بھی عجیب شئے ہے...... ایسے المناک ظلم ڈھاتے سمے ایک پل کے لئے بھی انجام کی نہیں سوچتا...... اگر یہ دونوں بھائی ذرا سا اپنے بھائی پر رحم کرتے تو آج ان کی معصوم بہن۔ مجبور ماں اور ایک شریف انسان جوان کا باپ ہے اس طرح غم سے چور چور نہ ہوتے...... بھری دنیا میں ایسے ذلیل و خوار نہ ہوتے......

ماسٹر سورج سنگھ کی چھوٹی سی دنیا تو اس دن ہی تہس نہس ہو گئی تھی جس دن ان بیٹوں نے یہ ظالمانہ فعل کیا تھا...... آج انہیں اپنے ارد گرد کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا...... اندر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا...... سینے میں ایک الاؤ

دہک رہا تھا...... دل و جان سے دھواں ہی دھواں اٹھ رہا تھا۔

مغموم چہرے کورٹ روم سے جا رہے تھے۔رہ گئے تھے بس اس بدنصیب پریوار کے تین لوگ۔ جو سانسیں تو لے رہے تھے مگر ان کے جسم بالکل بے جان ہو چکے تھے...... یہاں تک کہ ان کی روحیں تک مر چکی تھیں۔

بابو جی دن ڈھلنے کو ہے...... کورٹ بند ہو چکا ہے...... یہ کورٹ کا چوکیدار تھا...... ماسٹر جی کے ہوش و حواس بجا ہوتے تو کچھ سنتے...... وہ جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہے...... اندر کی مسلسل زبردست شکست و ریخت نے انہیں اس درجے ناتواں کر دیا تھا کہ آج ان میں ہلنے کا دم ہی نہ بچا تھا...... دوسری آواز پر کھڑے ہونے کی کوشش میں ناکام رہے...... اپنے لرزتے بدن کو سنبھال نہ پائے...... پاؤں ڈگمگا رہے تھے...... پاس کھڑے امر سنگھ نے انہیں سہارا دیا۔ یہ بدنصیب باپ جو اس سانحہ سے پہلے بڑی مضبوط شخصیت کے مالک تھے آج اس بری طرح ٹوٹ کر بکھر گئے تھے کہ اپنے آپ کو کسی طرح سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اپنے مردہ جسم کو گھسیٹتے ہوئے سڑک تک پہنچے تھے۔ پھر یکایک رک کر خود سے سرگوشی کی...... کدھر جاؤں جہاں چین سے مر سکوں۔ اس سیاہی میں کوئی راستہ بجھائی نہیں دیتا۔ اس گھر کیسے جاؤں جس کے در و دیوار پر میرے ہی خون کے ٹپکنے کے نشان ہیں۔ جہاں اب ایک شمع تک روشن نہیں۔ جہاں سب شمعیں گل ہو چکی ہیں...... اماں اور ان کی بیٹی دونوں رک رک کے لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آ رہی تھیں...... امر سنگھ نے ماسٹر جی کو اپنی ٹیکسی میں بٹھایا...... ماں اور بیٹی بھی ہوش و حواس سے عاری۔ بے دم۔ بے جان سی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں...... جب گاڑی امر سنگھ کے دروازے پر رکی تو اماں خالی خالی برستی آنکھوں سے گھر کا دروازہ تاکتی رہ گئیں...... چاچی اندر چلیئے...... سریندر کی آواز پر چونک کر دیکھا...... نظریں نیچے کیئے بے خبر۔ بے جان تینوں آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل پڑے......

امر سنگھ نے انہیں اندر کر کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور سریندر سے کہا...... بچوں سے جدائی کا غم تو سب کو ہوتا ہے پر ایسی جدائی...... اس غم کا اندازہ لگانا کسی انسان کے بس میں کہاں...... انہیں اکیلا چھوڑ دو...... ان تینوں کے لئے یہ گھڑی سب سے کٹھن گھڑی ہے۔ ہمدردی اور دلاسا کام نہ آئے گا۔ ان کے دکھوں کا مداوا کوئی انسان تو کیا خدا بھی نہیں کر سکتا...... وقت کے پاس بھی ان کے زخموں کا مرہم نہیں...... جیوں جیوں وقت گزرے گا ان کے دل کے زخم ناسور بن جائیں گے۔ جب اپنی ہی اولاد دھوکا دے۔ اس بے دردی سے تار تار کر دے تو انسان صرف موت کی تمنا کرتا ہے۔ چاہنے سے موت آ تو نہیں جاتی...... جینا مرنا اپنے بس میں کہاں ہوتا ہے۔ بے کس اور بے بس انسان مر مر کر جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بس تم ایک بات یاد رکھنا ان کی نیکیاں بھلائی نہیں جا سکتیں...... ہم ان کے اوپر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ ان کے احسانوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا تو گاؤں کے ہر جوان اور بوڑھے کا فرض ہے......

اور یوں غموں میں ڈوبے دن گذرنے لگے...... ماسٹر جی تو جیسے بے زبان ہی ہو گئے تھے...... ایک دن میں نے کہا۔ بابو جی...... مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کریں گے...... میں بھی تو آپ کا ہی بیٹا ہوں...... سن کر بڑے پریشان ہو کر بولے...... میرا بیٹا...... ایسا پھر کبھی نہ کہنا...... میرے بیٹے تو لعین اور دوزخی ہیں۔ خود دوزخی بنے اور مجھے بھکاری بنا گئے دنیا کی نظروں میں حقیر کر گئے...... مجھ جیسے پھوٹے نصیبوں والے کا بیٹا کہہ کر اپنے کو دنیا کی نظروں میں حقیر نہ کر...... یہ کہتے ہوئے بے انتہا آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ گئے...... کچھ وقفہ کے بعد بولے...... جواہر کو بلا لاؤ...... جواہر وکیل تھا......

جواہر آیا تو اس کا چہرہ بھی نہ دیکھا بس زمین تاکتے رہے...... کچھ سوچتے رہے...... پھر بولے خدا کسی باپ کی

زندگی میں ایسا مقام نہ لائے جو اپنے بیٹے کے لئے ایسی اپیل کرے...... پھر لمبی چپ سادھ لی۔ کیا چاہتے ہیں آپ ...... جواہر نے بڑے آہستہ سے سوال کیا...... وہ بولے...... کر پاؤ گے...... اگر کر پاؤ تو کہوں...... میرے بس میں ہوگا تو آپ کا حکم کبھی نہیں ٹالوں گا...... جواہر نے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی...... ماسٹر جی سر جھکائے بیٹھے رہے...... چہرے پر بے انتہا دکھ اور پریشانی پھیلی تھی ...... ان کے اوسان ٹھکانے نہیں لگ رہے تھے۔ بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ کیسے بولوں...... یہ بات کرتے بھی جان جاتی ہے۔ بڑا افسردہ لہجہ تھا۔ پھر کچھ دیر چپ بیٹھے رہے...... نظریں جھکی رہیں...... آنسو ٹپکتے رہے...... بولے "چندن سنگھ کو پھانسی"...... میں اور جواہر دونوں سہم گئے...... کچھ دیر لگی ہمیں سنبھلنے میں...... جواہر بامشکل ایک ہی لفظ بول سکا...... پھانسی...... ماسٹر جی بہت ہی آہستہ آواز میں بولے...... ہاں...... پھانسی۔ میں جانتا تھا جواہر تقریباً پندرہ سالوں سے وکالت کر رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ایک باپ بیٹے کے لئے سزائے موت کی درخواست کر رہا تھا۔ ہم دونوں تو ہکا بکا ماسٹر جی کے جھکے وجود کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

پھر کافی دیر کے بعد بولے جس کا خون اس حد تک سفید ہو جائے کہ اپنے سگے بھائی کو ہلاک کر دے وہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایک خونی کو چھوڑ دو تو وہ دس اور خون کرتا ہے تم کیا سوچتے ہو بیس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر اس کی خو بدل جائے گی...... جیل کی صعوبتیں اسے اور سخت دل بنا دے گی۔ بچہ گمراہ ہو جائے تو اسے کسی طرح راہ راست پر لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اسے سدھارا جا سکتا ہے...... اگر قاتل بن جائے۔ تو اس جیسے سفاک اور بے ضمیر شخص کو اس دنیا سے مٹا دینا ہی بہتر ہے...... نہ جانے نفرت کے گڑھے کس نے کھودے۔ نہ جانے دونوں کب سے سازش بنا رہے تھے۔ اگر اس رات کندن کی جگہ میں ہوتا تو وہ میرے ساتھ بھی وہی کرتے جو بھائی کے ساتھ کیا...... کیونکہ ایک بار دل و دماغ پر شیطان سوار ہو جائے تو انسان وہ کر بیٹھتا ہے جو واجب نہیں ہوتا۔ میری ساری محنت خاک میں مل گئی...... میر یدی ہوئی تربیت ان کی سفاک طبیعت پر غالب نہ آ سکی۔ اب تم یہ نہ سوچنا کہ چندن مجھے پیارا نہیں رہا۔ کوئی باپ اپنی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتا چاہے وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو۔

اماں نے سنا تو دکھ اور رنج کی شدت سے بے قابو ہو گئیں...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ زور سے بولیں...... ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں...... ایسے درندہ صفت انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔

میں کہتی ہوں جی سب تو تباہ ہو چکا ہے جو تھوڑا بچا ہے اسے تو سمیٹ لو...... رو رو کر بولیں...... اب سمیٹنے کو کچھ نہیں بچا...... راکھ...... صرف راکھ ہی راکھ ہے...... اسے بٹور لوں...... نہیں...... نہیں اماں کا سینہ درد سے پھٹا جا رہا تھا ...... پھر گڑگڑائیں...... ایک تو چلا گیا...... ان دونوں کو کسی طرح بچا لو......

انہیں بچا لوں جنہوں نے ہمیں غم...... دکھ...... رسوائی اور ذلالت دی...... ہماری عزت خاک میں ملا دی ...... ہمارے پیار کو پاؤں تلے روند ڈالا...... ایسے ظالم بڑے بھائی نکلے...... چھوٹی بہن کی زندگی کا بھی خیال نہ آیا انہیں ...... اس کی قسمت بھی پلٹ ڈالی...... بہن کی منگنی ٹوٹ گئی...... اسے بھی برباد کر گئے...... کون اپنائے گا خونی بھائیوں کی بہن کو...... کیا بنے گا اس کا...... میری بچی کا بھی گلا گھونٹ گئے...... ذرا سوچو ہمارے بعد وہ اکیلی کس طرح دنیا والوں کا مقابلہ کرے گی...... ہار کر ایک دن وہ بھی اپنی جان لے لے گی...... عورتوں کو صرف رونا آتا ہے سو تم روؤ۔ کیونکہ تم اس بات

کو نہیں سمجھ سکتی ہو......اور میں تمہاری طرح جذباتی نہیں ہو سکتا۔میں مرد ہوں اور مجھے فیصلہ کرنا آتا ہے۔

"ایسا نہ کہیں جی"......اماں نے ماسٹر جی کے پاؤں پکڑ لئے......آپ اپنی یہ ضد چھوڑ دیں۔ماسٹر جی نے اماں کو الگ کر کے کہا......دونوں اس جرم میں برابر کے شریک ہیں......دونوں سخت ترین سزا کے حقدار ہیں۔جرم ایک ہے تو سزا بھی ایک ہی ہونا چاہیئے......دونوں کو سزائے موت......

ایک مجبور ماں پر دیا کرو......غلطی تو ہماری تھی جی......میں نے کہا بھی تھا اپنا گھر۔اپنے بچوں کے بیچ سے نکل کر نہ جاؤ۔ماسٹر جی بولے انسان مجبور ہو کر اپنے گھر کی دہلیز پار کرتا ہے۔اور مجھ جیسا کسان جو اپنی مٹی کو صبح وشام چومے اس کے لئے اپنے لہلہاتے کھیت چھوڑنا بڑا مشکل تھا۔مگر غریبی نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔میری زمین تین لڑکوں کے لئے کافی نہ تھی......ہم پشتوں سے صرف کاشتکاری کرتے آئے ہیں۔کسان کے پاس زمین ہی نہ ہوگی تو کاشت کہاں سے کرے گا......میرے پتا نے مجھے آٹھویں تک پڑھایا......سو گاؤں کے اسکول میں پڑھاتا رہا......چھٹی جماعت تک پڑھے لڑکے شہر بھی جاتے تو ٹھیلا ہی گھسیٹتے......دو کمروں کے گھر میں اتنی گنجائش کہاں کہ تین بیٹوں کے پریوارا کھٹے رہ سکے......میں نے سوچا شہر کی کمائی سے دو کمرے اور بنالوں گا......کچھ کھیت کی زمین خریدوں گا......لیکن مقدر میں تو دکھ لکھے تھے......قسمت نے ایسا پلٹا کھایا......وہ آگے بول نہ سکے......پھر خاموش بیٹھے رہے......کچھ دیر بعد بولے......کسانوں کی حالت کب اچھی رہی ہے۔نہ ساہوکار مدد کرتا ہے اور نہ ہی سرکار......ہم غریبی میں جوجھ رہے ہیں......پریشان ہو کر پڑوسی اپنے پڑوسی کی زمین پر قابو کر لیتا ہے اور خون خرابا چلتا ہی رہتا ہے۔میرے بیٹے تو بڑے بے صبرے نکلے......زمین کی لالچ میں بھائی کو مار ڈالا......سوچا تھا زمین کے اس ٹکڑے میں دونوں کی حصے داری برابر کی ہوگی۔پر میرا سب کچھ اجڑ گیا......میں کسانوں کی معاشی زبوں حالی کے لئے حکومت کو ذمے دار ٹھہراؤں گا......کسان کو پیٹ بھر کھانا نہیں......جسم پر کپڑے نہیں......بچوں کے لئے اسکول نہیں......اگر کسی گاؤں میں اسکول ہے بھی تو ماسٹر نہیں......مجھے اسکول سے تھوڑے پیسے مل جاتے تھے تو کسی طرح گزارا ہو جاتا تھا......بڑی خواہش تھی اپنے بچوں کو شہر بھیج کر آگے پڑھانے کی مگر کتابوں......فیس اور بس کے کرائے کے لئے روپے کہاں سے لاتا......سرکار سے مدد کی کوئی امید ہی نہیں......کبھی قحط نے مارا کبھی ساہوکار نے۔اور اب......سوچتا ہوں جو ہم پر گزرنی ہے ایک بار ہی گذر جائے......بیس سال......بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے......

ماں کا تڑپتا دل رو کر بولا......جب تک سانس باقی ہے ملنے کی آس بھی رہے گی جی......میں ماں ہوں جی......میری عرض بھی مجبوری ہے......ہماری طرف دیکھ کر بولیں......دونوں کا جرم ایک ہے تو سزا کیوں فرق فرق ہو......ایک کو پھانسی اور دوسرے کو ۲۰ سال کی جیل......رونق کو پھانسی کیوں......دونوں کو جیل کیوں نہیں......میں بھی اپیل کروں گی کہ ایک جرم تو سزا بھی ایک......ماسٹر کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولیں،آپ کی ہر بات کو میں نے ہمیشہ پتھر کی لکیر سمجھا......لیکن آج آپ ایک ماں کے ضبط کا امتحان لے رہے ہیں......اس لئے میں آپ کے خلاف بات کرنے کی جرات کر رہی ہوں......مجھے معاف کر دینا جی۔

دونوں نے اپیل کی......ماسٹر جی کو پورا یقین تھا ان کی مانگ پوری ہوگی......باپ بیٹے کے لئے پھانسی مانگ رہا تھا......کورٹ والے سن کر دنگ رہ گئے تھے......جرم نہایت سنگین تھا......لیکن ایک ماں کی عبادت قبول ہو گئی تھی......ماں کی دعاؤں نے بیٹے کو پھانسی کے پھندے سے بچا لیا تھا......

فیصلہ سن کر ایک سرد آہ بھر کر بولیں......۲۰ سال کے بعد ہی سہی ایک دن دونوں کو جیل سے رہائی تو ملے گی ......ہمارا فرض تھا اپنے گھر کے ٹمٹماتے دیئے کو بجھنے سے بچانے کا......

ماسٹر جی بولے یہ تمہارے دو ٹمٹماتے دیئے کب تک آندھیوں کا مقابلہ کرتے رہیں گے......دار درسن کی سختیاں جھیلنا آسان نہیں ہوتا......جتنی جلدی یہ دیئے بجھ جاتے بہتر ہوتا......انہیں جیل کی ساری آفتوں بلاؤں اور مصیبتوں سے رہائی مل جاتی......یہ کہہ کر ماسٹر جی کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپکنے لگے......چہرہ دکھ کی شدت سے زرد پڑ گیا تھا......

پھر چند لمحے سکوت کے بعد بڑی پر درد آواز نکلی......جیل میں اپنا کوئی نہیں ہوتا......کوئی ہمدرد نہیں ہوتا ......پولس والے بے حد ظالم اور ستم گر ہوتے ہیں......قیدیوں پر بے انتہا ظلم وستم ڈھاتے ہیں......جیل کے اندر روزمرہ کی زندگی کے معاملات اتنے سخت ہوتے ہیں کہ قیدی خود اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں......لمبے بیس سال کے ہر لمحے پولس کے قابو میں رہنا بڑا مشکل ہوگا......قیدی کے جسم کا پور پور پولس والوں کی تحویل میں ہوتا ہے......بیس سال کی ہر آتی جاتی سانس پر سپاہیوں کا قابو......نہ رات کو چین نہ دن اپنے......سپاہی کو جب ذرا غصہ آیا قیدی کی کھال ہنٹر سے ادھیڑ ڈالے......ڈنڈے برسا کر ہڈیاں توڑ ڈالے......تمہارے بیٹوں جیسے خونخوار درندوں پر تو بے حد کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ جسمانی ایذا رسوائی اور ذلت سہنا ہی ہوگا......جسم وروح کو اس حد تک زخمی کرتے ہیں کہ قیدی زندگی سے عاجز آ کر موت کو پکارتا ہے۔

رونق اور چندن میرے ہی تو بیٹے ہیں......دونوں میرے اندر بسے ہیں......میری رگ رگ میں......میں باپ ہوں ان کا......تم کیا سوچتی ہو کہ ان کے بغیر میرا جینا آسان ہو جاتا......باپ ہوں باپ......ان کے زخم میرے زخم ......ان کا درد میرا درد......اس لئے تو کہتا ہوں یہ ٹمٹماتے دیئے جلدی بجھ جائیں تو......اور دونوں مجھ سے پہلے اس دنیا سے اٹھ جائیں تو......صبر کے بندھ ٹوٹ گئے......ماسٹر جی ایک بچے کی طرح بلک کر روئے۔ اماں اور بہن الگ سینہ کوبی اور ماتم کر رہی تھیں......بربادی کا یہ عالم دیکھ کر میں اور جواہر بھی رو پڑے......کچھ دیر کے بعد اماں بولیں......آئیں گے جی۔ دونوں ضرور جیل سے رہا ہو کر آئیں گے......

ماسٹر جی بڑی ہی افسردگی بھرے لہجے میں بولے......کبھی سوچا رہائی کے بعد کیا ہوگا......وہ دونوں کسی ڈاکوؤں کے گروہ کے تو ہیں نہیں کہ جیل سے نکل کر ان میں جا ملیں......اور ان کے ساتھی انہیں سینے سے لگالیں......ان کا خوشی خوشی استقبال کریں......واپس تو اپنے گاؤں ہی آنا ہوگا......جیسا آج ہے ویسا تب نہیں ہوگا......آج سارے گاؤں والے ہمارے اس درد والم میں ساتھ ہیں......بیس سال بعد ناں یہ سنگی ساتھی ہونگے اور ناہی ہم دونوں......آج کے بچے جو تمہارے بیٹوں کے نام سنتے ہی خوفزدہ ہو کر اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے ہیں وہ بڑے ہو جائیں گے۔ وہ ان دونوں سے ڈریں گے نہیں......بلکہ ان سے نفرت کریں گے......آج جوان کے دوست ہیں وہ انہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے......انہیں دھتکار دیں گے......انہیں ذلیل کریں گے......انہیں تحقیر کی نظر سے دیکھیں گے......مائیں اپنے بچوں سے کہیں گی اندر آؤ......ان دونوں بھائیوں کے قریب نہ جانا وہ دونوں خونی ہیں......جس گلی جائیں گے لوگ انگلیاں اٹھا کر کہیں گے وہ جا رہے ہیں دونوں خونی بھائی جنہوں نے اپنے سگے بھائی کو قتل کر ڈالا تھا......زمانہ ان پر ہنسے گا......انہیں ٹھکرائے گا......مجھے بس یہی بات ڈراتی ہے کہ کوئی ان سے یہ کہنے والا نہ ہوگا......"آؤ......تم ہمارے اپنے ہو" کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی......سب کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

☆☆☆

سمجھوتے

بچپن میں انجلی بے حد پیاری اور شوخ سی لڑکی تھی۔ عام بچوں سے کہیں زیادہ عقلمند اور ذہین۔ ایم۔ بی۔ اے پاس کیا اور اچھی کمپنی میں آفیسر کی نوکری ملی ہی تھی کہ اس کے پاپا کو ہلکا سا دل کا دورہ پڑ گیا۔ رام چندرن کو ایک دم دونوں بیٹیوں کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ مجبوراً انجلی کو پاپا کی خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑا اور نوکری کرنے کا ارمان پورا نہ ہو سکا

رام چندرن نے اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے لڑکے تو کئی دیکھے پر کہیں بات نہ بنی...... سب کا خیال تھا سرکاری افسر سونے کی کھان ہوتا ہے۔ سو جہیز کی لمبی فہرست پہلے ہی پیش کی جاتی...... رام چندرن جہیز کے خلاف تھے...... وہ بے حد ایماندار افسر تھے سو ان کے پاس دینے کے لئے کچھ زیادہ تھا بھی نہیں......

کلب میں ان کی ملاقات اپنے پرانے دوست رتن جوہر سے ہوئی...... رتن جوہر کو بھی اپنے اکلوتے بیٹے جواہر کے لئے انجلی جیسی اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی کی تلاش تھی۔ انہوں نے دیکھتے ہی انجلی کو پسند کر لیا...... رام چندرن نے کئی دوستوں سے تفتیش کی۔ دوستوں نے بھی تعریفوں کے پل باندھے...... جواہر کا ناک نقشہ تو تھا ہی اچھا اور بات چیت کرنے سے لگتا بھی بہت شریف تھا...... پھر دوست کا بیٹا تھا...... رام چندرن کو لڑکا بھا گیا...... سوچا لوگ لالچی نہیں ہیں۔ میری بیٹی اس گھر میں راج کرے گی...... ہاں کر دی......

دوست ہونے کے ناطے رتن جوہر نے جہیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا...... سوچا جب رام چندرن بیٹی دے رہا ہے تو رواج کے مطابق جہیز میں زیورات اور موٹی رقم تو دے گا ہی...... اگر خود جہیز کا ذکر کیا بھی تو دوستوں کی نظروں میں گر جاؤں گا...... ادھر رام چندرن نے سوچا کہ دوست دوست ہوتا ہے...... میرے کاندھوں پر جہیز کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں میری بیٹی کو پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا اور لین دین کی بات ہی نہیں کی......

پیار محبت کی چھت تلے پلی بڑھی انجلی دل میں ہزاروں ارمان لئے اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ایک نئی۔ انوکھی۔ پیار بھری دنیا بسانے جب امریکہ پہنچی تو وہاں کا حال دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ سنگیتا نے اپنے شوہر سے تو کچھ نہیں کہا...... نئی نویلی دلہن پر دھمک پڑی...... ایک معمولی سے سرکاری افسر کی بیٹی کو اوپر سے نیچے تک کچھ ایسی تحصیلی نظروں سے دیکھ کر ناک سکوڑی کہ انجلی کے تو ہوش ہی اڑ گئے...... وہ بری طرح نروس ہو گئی...... اس نے پر امید نظروں سے جواہر کی طرف دیکھا جو سارا ماجرا دیکھ تو رہا تھا لیکن بالکل بیگانہ سا بنا کھڑا تھا...... نیا مقام...... نئے لوگ...... ظالم ساس...... اپنوں سے ہزاروں میل کی دوری اور شوہر کی آنکھوں سے ٹپکتی بیگانگی...... ایک نئی بہو کے لئے موت کے پیغام سے کم نہ تھی...... لیکن انجلی نے اپنے آپ کو سمجھایا...... آگے بڑھ...... یہ تو ابتدا ہے...... اسے اپنی بے کسی پر رونا آ گیا...... آنسو تو اس نے کسی طرح روک لئے مگر دل کے ہر کونے سے ایک ہی صدا نکلی...... انجلی تیرے نصیب کھوٹے ہیں...... تیرے مقدر میں پھولوں کی سیج نہیں صرف کانٹے آئے ہیں...... تو پڑھی لکھی ہے...... ایک ایک کر کے چن لے ان خاروں کو...... سسر جی اسے خود پسند کر کے لائے تھے...... انجلی کو امید تھی وہ ضرور اس کا ساتھ دیں گے...... اس نے نگاہیں اس جانب اٹھائیں جہاں کچھ دیر پہلے ہی سسر کھڑے تھے...... نہ جانے وہ کب چپکے سے وہاں سے کھسک چکے تھے...... انہیں آس پاس نہ دیکھ کر انجلی بے حد خوفزدہ ہو گئی......

ساس اب بھی اسے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور رہی تھیں...... کوئی اور لڑکی ہوتی تو دہشت کے

مارے بے ہوش ہو کر گر پڑتی...... مگر انجلی اپنی ساس کا چہرہ گھورتی رہی...... ماں نے بیٹے کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا اور جواہر نے کرخت لہجے میں کہا...... اب آگے بھی بڑھو گی یا یہیں کھڑی ماں کا منہ تاکتی رہو گی...... میرے باپ کے گھر میں تمہاری پذیرائی کے لئے باندیاں نہیں ہیں...... اٹھاؤ اپنا بیگ اور اندر جاؤ...... خود اپنی ماں کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

ساس کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی...... تیرے باپ نے فون پر بتایا تھا لڑکی بے حد خوبصورت اور خوب سیرت ہے۔ اسے خوبصورتی کہتے ہیں...... صورت تو ہم نے دیکھ لی...... خوب سیرتی بکھیرنے کا ٹائم تو میں اسے دوں گی نہیں...... تو زندگی بھر اس کی سیرت دیکھ دیکھ جینا...... یہی کنگال رہ گئی تھی تیرے نصیب میں...... نا جانے کس فقیر کی لڑکی اٹھا لائے...... نا ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہے...... نا ہی زیورات اور نہ ہی کیش...... کل پہلی فلائٹ سے تو اسے لے کر شکاگو چلا جا...... میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی...... ساس کی باتوں نے انجلی کو سہادیا...... وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی...... انجلی تجھے ہر حال میں جینا تو پڑے گا ہی...... ورنہ تیرے پاپا...... آنکھوں میں آنسو بھرے اس نے سوچا...... کیا خوب خاطر تواضع کی ہے نئی بہو کی...... نہ منہ دکھائی...... نہ پھول...... نہ مٹھائی...... کیا ہو گیا ہے ہندوستانیوں کو...... دوسرے ملک میں آتے ہی اپنے رسم ورواج بھول جاتے ہیں...... ہندوستانیوں کی دوستی تو دنیا میں مشہور ہے...... یہاں کے ہندوستانی اس طرح دوستی نبھاتے ہیں...... دوست کی بیٹی کو قدم قدم پر رسوا اور ذلیل کر کے...... شرم اور ندامت کے احساس سے اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں......

صبح گھر سے باہر قدم اٹھاتے ہوئے سوچنے لگی...... کل جب گھر میں داخل ہوئی تھی تو ساسو جی نے گالیوں کی بوچھار کر دی...... چرن تک چھونے نہیں دیئے...... کم سے کم آج کچھ نہیں تو تھوڑا سا آشیرواد تو دے ہی سکتی تھیں...... بھلا بزرگوں کے آشیرواد کے بغیر بھی کوئی خوش رہا ہے...... وہ اداس اداس سی...... سہمی سہمی سی جواہر کے پیچھے چل دی شکاگو پہنچی...... گھر کی دہلیز پر اس کا دل تیز رفتار سے دھک دھک کرنے لگا...... سوچنے لگی، ہر لڑکی کی طرح میں نے بھی بڑے سندر سندر سپنے دیکھے تھے...... ان لوگوں نے مل کر بے دردی سے میرے سارے سپنے روند ڈالے۔ یہاں تو کوئی بھی میرا اپنا نہیں۔ کوئی ہمدرد نہیں۔ جواہر راجا کی طرح آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ اس شاہ راہ پر ایک باندی کی طرح کھڑی رہ گئی تھی۔ جہاں پھولوں کی بجائے اس کے ٹوٹے سپنے زمین پر بکھرے تھے۔ اس نے پہلا قدم اٹھایا خود اپنے سے ہم کلام ہوئی۔ انجلی اب تو انہیں سوکھی مرجھائی پتیوں پر چلتے جانا ہوگا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتی گئی......

جواہر آنکھیں بند کرے صوفے پر دراز تھا...... وہ گم صم سی اس سے ذرا دوری پر کھڑی رہ گئی تھی۔ بالکل بے جان سی۔ ایک بت کی طرح...... وہ چونکی تو اس کی آواز پر...... میں بہت تھک گیا ہوں...... مجھے چائے کی ضرورت ہے...... بے جان بت میں ذرا سی حرکت ہوئی...... ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو...... کچن سامنے ہے...... اس کا لہجہ خلوص اور محبت سے بیگانہ تھا...... جیسی ماں ویسا ہی بیٹا...... انجلی سوچ کر کانپ اٹھی...... اپنا ڈوپٹہ سنبھالتے ہوئے آگے قدم بڑھایا...... آگ سے بھرا لہجہ...... پہلے اپنے اس دس گز لمبے ڈوپٹے کو اتار پھینکو...... اب انجلی کی بھی قوت برداشت جواب دے چکی تھی...... بولی کچھ نہیں مگر جواہر کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہ گئی...... کہنا چاہ رہی تھی...... تھکی ہاری تو میں بھی ہوں...... ہے کوئی یہاں میری فکر کرنے والا...... وہ زور سے چیخا...... انجلی کی سوچوں کا تار ٹوٹا...... وہ کہہ رہا تھا...... اس ملک میں ہر انسان ہر وقت بھاگتا دوڑتا ہی نظر آتا ہے...... خراماں خراماں ٹہلنے سے یہاں زندگی بسر نہیں ہو گی...... ذرا جلدی جلدی قدم اٹھاؤ...... وہ ایسے آگے بڑھی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو......

انجلی کا دل چاہا...... ایک پیالی چائے اپنے لئے بھی بنالے مگر ہمت نہ ہوئی...... ٹرے میں چائے اور بسکٹ لے کر آئی تو اس کا دوپٹہ اس کے کاندھوں پر تھا...... جواہر نے چائے کی طرف نہ دیکھتے ہوئے پہلے اس کا ڈوپٹہ کھینچا...... وہ گرتے گرتے بچی...... بڑی کروی آواز میں بولا...... ایک بات ذہن نشین کرلو میں ایک بات دو دفعہ کہنے کا عادی نہیں ...... جب خود چائے پی چکا تو اسے حکم دیا...... اب تم جاؤ...... جا کر چائے پیو......

چائے پینے کے بعد انجلی کے اوسان بحال ہوئے...... وقت کسی طرح گذر رہا تھا...... جواہر کبھی کچھ حکم کرتا کبھی ڈانٹ پلاتا...... اس نے انجلی کو ایک پل بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا...... خود بیٹھا ادھر ادھر فون کرتا رہا اور اپنی بد قسمتی کا رونا روتا رہا......

رات ہوئی تو ایک کمرے میں اس کے ساتھ کے خیال سے ہی انجلی کا دل دہل گیا...... نہ جانے ظالم کیسا سلوک کرے گا...... سوچنے لگی...... شادی تو پیار اور محبت کا رشتہ ہے...... دو دلوں کا بندھن...... جہاں پیار نہیں...... دل میں کوئی احساس نہیں...... پھر کیسا بندھن اور کیسا ملن...... اور کیسی سہاگ رات...... فضا بڑی ہی سوگوار تھی...... انجلی کی آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا...... اس نے باہر جھانکا...... اسے یوں لگا ساری دنیا ہی سرمئی دھوئیں سے ڈھکی ہوئی ہے...... اوہ اتنی کالی رات...... بالکل میری قسمت جیسی سیاہ...... انسان کے اندر مایوسی اور اداسی بسیرا کرلے تو دنیا اندھیرا لگنے لگتی ہے...... ماحول بھی آنسو برسانے لگتا ہے...... سارے رنج سارے دکھ انسان کے اندر ہوتے ہیں...... کہیں دور سے میوزک کی سریلی آواز آئی تو وہ اپنی بدبختی پر بری طرح رو پڑی۔

جواہر دھم دھم کرتا آیا اور دھڑ سے بستر پر جا گرا...... جواہر کی آنکھوں میں لالی دیکھ کر وہ ڈر گئی...... کچھ دیر بعد جواہر نے سر اٹھا کر انجلی کو دیکھا...... ہنسا...... بڑے حقارت آمیز لہجے میں کہا...... تم میرے خوابوں کی تعبیر نہیں ہو...... پھر بھرا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا...... پیوگی...... آج تو پینی ہی پڑے گی...... تھوڑی سی پیوگی تو سرور آجائے گا...... یہاں تو سب عورتیں پیتی ہیں ...... جیسا دیس ویسا بھیس...... دھیرے دھیرے تمہیں بدلنا ہوگا...... انجلی کو غصہ آگیا...... وہ زور سے بولی...... جب سے میں تم سے ملی ہوں تم میری توہین کر رہے ہو اور میں برداشت کر رہی ہوں...... لیکن یہ ہرگز نہیں ہوگا...... نہ میں کبھی شراب پیوں گی اور ناہی میں بدلوں گی...... میں ہندوستانی ہوں اور ہمیشہ ہندوستانی ہی رہوں گی...... میں اپنا کلچر کبھی نہیں چھوڑ سکتی ......

جواہر نے پھر چنگاریاں برسائیں...... مجھے تو موڈرن انڈین بیوی چاہیے تھی...... ملیں تم...... اٹھارویں صدی کی بوڑھی۔ نارنگ نا روپ اور...... زور سے اس کا ہاتھ کھینچا اور بولا...... اگر تم میری پسند ہوتی تو آج اس کمرے کی فضا ہی کچھ اور ہوتی...... میں تمہارے ناز اٹھاتا...... تمہیں اتنا پیار دیتا...... کہ تم سنبھال نا پاتیں...... جو چیز دل کو بھا جائے اسے چھونے اور چومنے کو دل کرتا ہے...... اگر ایسا نا ہو تو...... پھر ساری عمر فرض نبھائے جاتے ہیں...... وہ انجلی کو جلی کٹی سناتا رہا اور اپنے شوہر ہونے کا حق بھی ادا کرتا رہا...... انجلی سوچتی رہی دنیا کی سب سے بدبخت اور بے توقیر نئی دلہن میں ہی ہوں ...... باقی رات انجلی کی پلک سے پلک نہ لگی...... بس سوچتی رہی کیسے کٹے گی زندگی ایسے بے حس انسان کے ساتھ۔

دوسرے دن کالج جانے سے پہلے بولا...... وہ فون دیکھ رہی ہو...... تمہارے لئے نہیں ہے۔ اپنے باپ کو فون کرنے کی کوشش نہ کرنا...... بھول جاؤ سب کو...... آج سے آئندہ تم ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھوگی...... اس کے جانے کے بعد انجلی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی...... اسے پاگل پن کے دورے تو نہیں پڑتے۔ صرف یہ نہیں اس کا پورا خاندان ہی پاگل معلوم ہوتا ہے۔

شام کو دیر سے لوٹا...... مزاج کچھ بحال تھا...... آتے ہی بولا...... کیسا لگا اکیلے...... ایسا کرو تم بھی ایک نوکری

کھوج لو...... میری پڑھائی نہ معلوم اور کتنے سال چلے...... میں تمہارا بھار نہیں اٹھا سکتا...... سچ تو یہ ہے کہ تمہیں گھر کا اور میری پڑھائی کا خرچہ اٹھانا ہوگا...... سکل سے ہی نوکری کی کھوج شروع کردو...... ورنہ بھوکا مرنا پڑے گا اور مجھے بھوکے رہنے کی عادت نہیں۔

انجلی کو اپنے کل کی بہت فکر تھی...... وہ جواہر پر بالکل بھروسہ نہیں کر سکتی تھی...... آسانی سے بڑی عمدہ نوکری مل گئی...... جواہر جو چاہتا تھا وہ ہو گیا تھا...... پھر بھی ذرا ذرا بات پر انجلی کو مارتا کوٹتا اور الٹی سیدھی تو روز ہی سناتا تھا۔ ایک دن دفتر سے لوٹی تو دیکھا جواہر کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ مارے خوف کے انجلی کا پورا وجود دہل گیا...... سوچ رہی تھی اب کون سا طوفان آ گیا...... جواہر نے پیچھے جا کر اسے بال پکڑ کر کھینچا...... وہ زمین پر گر پڑی تو بڑی بے دردی سے اسے مارا...... جب مارتے مارتے تھک گیا تو چلا کر بولا...... کس کی اجازت سے تم نے اپنا الگ اکاؤنٹ کھولا...... اور اتنے ڈھیر سارے ڈالرز کہاں سے آئے...... انجلی کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم پر گہری چوٹیں بھی آئی تھیں...... وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ اس اکاؤنٹ کو بند کر کے ایک نیا اکاؤنٹ میرے ساتھ کھولو...... ورنہ میں تمہاری وہ حالت کروں گا کہ تم خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پاؤ گی......

انجلی نے بھی تڑک کر جواب دیا...... تم چاہو تو میری جان لے سکتے ہو لیکن میں وہی کروں گی جو میں ٹھیک سمجھوں گی۔ یہ ڈالرز میرے ہیں۔ میرے پاپا کی محنت کی کمائی ہے...... ان پر تمہارا کوئی حق نہیں...... اور اگر آئندہ میرے اوپر ہاتھ اٹھایا تو میں...... وہ باہر نکل گئی...... جواہر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا...... پہلے تو اس نے جلدی جلدی زمین پر گرا خون صاف کیا...... پھر اپنی حالت سدھاری...... وہ زور سے بڑبڑایا...... چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں میں اس کے پروں کو مسل ڈالوں گا...... تب ہی اس کا دوست علی شاہ گھر میں داخل ہوا۔ اب کس کے پروں کو مسلنے کا پروگرام بنا رہے ہو...... یار میں کہتا ہوں غصہ کرنا چھوڑ دو...... غصہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ بہت پچھتانا پڑتا ہے...... جواہر ایک دم مسکرایا...... کچھ نہیں یار...... بس یوں ہی......

بھابھی کہاں ہیں...... میں ذرا جلدی میں ہوں...... زرینہ نے یہ کھانا بھیجا ہے۔ جواہر بوکھلا سا گیا...... تمہاری بھابھی ابھی تو یہاں یہیں تھی...... جیسے ہی علی شاہ باہر گیا جواہر نے سکون کی سانس لی۔ اگر یہ ذرا دیر پہلے آ جاتا تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔

جیسے ہی علی شاہ باہر گیا جواہر نے سارا قصہ اپنی ماں کو سنایا۔ ماں نے کہا لڑکی ہوشیار ہے۔ تیرے لئے سونے کی چڑیا ثابت ہوئی ہے۔ وہ کمائے گی اور تو پڑھائی مکمل کرے گا۔ ماں نے مشورہ دیا مار پیٹ کم کر۔ بس دھمکانا ہی کافی ہے۔ یہاں عورتوں پر تشدد کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ تجھے کسی مصیبت میں ڈال دے۔ اچھی ماں کی طرح بیٹے سے یوں نہ کہا تیری بیوی ہے بیوی کی قدر کر......

انجلی کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ جسم کا ایک ایک حصہ درد سے بے حال تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی صلاح دی اس حادثے کی رپورٹ پولس میں درج کرواؤ۔ انجلی نے انکار کر دیا۔ بولی میرا اپنا یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ایسا کوئی بھی قدم اٹھایا اور اسے خبر لگ گئی تو میری زندگی اور بھی اجیرن کر دے گا۔ چھوڑ دو اس کو۔ ڈاکٹر بولی۔ نہیں نہیں...... ڈاکٹر طلاق دوں گی تو بچہ مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ میں کتنا بھی دکھ اٹھا لوں...... مگر بچہ...... ڈاکٹر میں اپنا بچہ خود پالنا چاہتی ہوں۔ اس کے ہاتھوں میں اگر بچہ سونپا تو یہ سخت دل آدمی میرے بچے کے ساتھ بھی بے رحمی سے پیش آئے گا...... ڈاکٹر نے بڑے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ کمائی ہو...... پھر اس کے جور و ستم کیوں سہتی ہو۔ انجلی نے مسکرا کر کہا سہتی ہوں تا کہ میرے پاپا پر لوگ انگلیاں نا اٹھائیں۔

رام چندرن نے کئی فون کیے پر انہیں کبھی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ جب انجلی کی کوئی خبر نہیں ملی تو پھر رتن جوہر کو فون لگایا...... پہلے تو جوہر نے بات کرنے سے انکار کر دیا...... پھر بڑی لاپرواہی سے بولے۔ یار بیٹی کے باپ ہو کر اتنا نہیں جانتے کہ شادی کے بعد لڑکی پرائی ہو جاتی ہے۔ اب اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ میرا بیٹا ہے اپنی بیوی کی دیکھ بھال کرنے کے لئے۔ وہ دونوں ٹھیک ٹھاک ہی ہوں گے۔ ہم اپنے بیٹے کی زندگی میں دخل اندازی کرنا درست نہیں سمجھتے۔ اسے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے کا حق ہے۔ سو تم بھی انہیں جینے دو...... اس کے بعد انجلی کے گھر والے بہت دل گرفتہ رہتے تھے۔ لیکن پھر سوچا بیٹی کے معاملات میں دخل اندازی کرنا واقعی ٹھیک نہیں۔

کئی مہینے اور گذر گئے۔ جب انجلی کی کوئی خبر نہیں ملی تو رام چندرن کے دل میں برے برے خیالات آنے لگے۔ ماں باپ کا رات دن کا چین لٹ گیا۔ رام چندرن نے امریکہ جانے کی ٹھان لی۔ بیوی نے سمجھایا۔ بڑی مشکل سے ایک بیٹی کو پار لگایا ہے۔ دوسری گھر میں بیٹھی ہے۔ اب اس کی فکر کرو۔ رام چندرن نے ایک نہ سنی۔ اپنے آموں کا باغ بیچ کر امریکہ چلے گئے۔

رام چندرن کو سامنے کھڑا دیکھ رتن جوہر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا...... تم...... یار فون تو کر دیا ہوتا...... رام چندرن بولے...... تمہارے پاس فون پر بات کرنے کا وقت ہی کہاں ہے۔ یہ بتاؤ میری بیٹی کہاں ہے اور کیسی ہے۔ رتن جوہر بڑی بے رخی سے بولے۔ اس دیش میں بچے سولہ سال کی عمر میں اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ماں باپ کے پاس اتنا وقت نہیں جو بچوں کے پیچھے پیچھے بھاگیں۔ سب اپنی اپنی زندگیاں جیتے ہیں۔ اچھی ہو یا بری۔ رام چندرن کچھ سوچ کر بولے۔ میں تو سوچتا تھا تم نے صرف اپنا دیس بدلا ہے اپنے سنسکار نہیں۔ یہاں کے لوگ جو بھی کرتے ہوں۔ ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ یہ بتاؤ تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کیا......

رتن جوہر کے پاس کہنے کو تھا ہی کیا...... بولے تمہاری بیٹی بڑی ہے ننھی منی تو نہیں...... اگر اسے کوئی دکھ ......کوئی تکلیف ہوتی تو تم سے ضرور کہتی...... وہ اپنی زندگی میں مگن ہے۔ تم ناحق پریشان ہو رہے ہو...... رتن جوہر کی گول مول باتوں سے باپ کے دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ رام چندرن رکے نہیں...... شگاگو پہنچ گئے۔

یہ تو خیر ہوئی جب رام چندرن بیٹی کے گھر پہنچے تو جواہر گھر میں نہیں تھا۔ انجلی پاپا کو دیکھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائی ......ان کی باہوں میں سمیٹ کر سوچنے لگی روؤں یا مسکاؤں...... کہیں میرا غم پاپا کی جان کا روگ نا بن جائے۔ اس نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے...... پاپا میں تو ٹھیک ہوں...... آپ اتنی دور...... باپ بولے...... نہ آتا تو کیا کرتا...... وہاں ہم سب تمہارے لئے بے حد فکر مند تھے...... سسرال والوں کی محبت میں ماں باپ کو بھول گئی...... نہ اپنی خبر دی اور نا ہی ہماری خیر خبر پوچھی۔ وہ بولی آپ کے دوست اور ان کے گھر کے سب لوگ اتنے اچھے ہیں کہ ان کے سامنے کسی کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

انجلی نے اپنی پریشانیوں پر پردہ ڈال کر مسکرانے کی کوشش کی...... کچھ کہنا چاہتی تھی...... باپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا...... بیٹا تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا...... پھر آج کیوں حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں تمہاری اس مصنوعی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے غم محسوس کر رہا ہوں...... ساری کہانی تو تمہارے چہرے پر لکھی ہے۔ تیری آنکھوں میں پھیلی اداسی کہہ رہی ہے میری بچی خوش نہیں ہے۔ جوہر نے تو میرے ساتھ بُرا برتاؤ کیا...... نہیں معلوم تجھے کتنا ذلیل کیا ہوگا۔ دوست سے یہ امید نہ تھی مجھے۔

انجلی اور کتنا صبر کرتی۔ آخر صبر کے باندھ ٹوٹ ہی گئے۔ وہ اپنے پاپا کے سینے سے لپٹ کر سسک سسک کر

رو پڑی۔...... پھر جب دل ذرا ہلکا ہوا تو بولی...... پاپا یہی میرے نصیب میں لکھا تھا...... شادی کے بعد ہر لڑکی کو کچھ مشکلات کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے...... لیکن مجھے اتنی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اب مقدر کے لکھے کو بدلا تو نہیں جا سکتا۔ میں یہ رشتہ نبھانے کی پوری کوشش کر رہی ہوں۔ اور کرتی رہوں گی۔ آپ نے ہی تو مجھے یہ سکھایا ہے کہ ڈٹ کر ہر مصیبت کا سامنا کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے ایک دن میرے نصیب بھی بدل جائیں۔

بیٹا رتن جوہر میرا دوست تھا۔ دوست دغا دے گا یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ دشمن تو مارتا ہی ہے لیکن جب دوست ڈستا ہے تو بری طرح تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ باپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تمہارے سسر کہتے ہیں شادی کے بعد تم ہماری نہیں رہیں۔ اور ہمیں تمہاری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹا بھلا کوئی اپنی اولاد کی فکر کرنا چھوڑ سکتا ہے۔ انجلی نے پاپا کو تسلی دی۔

پاپا زندگی کتنی بھی تلخ کیوں نہ ہو۔ ہر انسان کو زندگی پیاری لگتی ہے۔ کوئی بھی مر نہیں جاتا۔ زندگی کی تاریکیوں میں امیدوں کے ٹمٹماتے چراغ کی دھیمی سی روشنی ہی انسان کو مایوسی کے ساگر میں ڈوبنے سے بچا لیتی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی امید کے سہارے ہی جیتا رہتا ہے۔ میرے دل میں بھی امید کی ننھی سی کرن پھوٹی ہے۔ بس اسی کے سہارے جی رہی ہوں۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات اور ہے۔ میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ وہ ننھی سی جان مجھے سہارا دے گی۔ جواہر کے آنے سے باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سسر جی کے چرن چھوئے۔ خوب خاطر تواضع کی۔ مہمان نوازی میں کمی نہیں چھوڑی۔ دوسرے دن بڑے بھاری دل کے ساتھ رام چندرن واپس چلے گئے......

دونوں ائیر پورٹ سے واپس لوٹے ہی تھے۔ جواہر چلایا۔ اس بوڑھے نے دوبارہ میرے گھر میں قدم رکھا تو میں...... انجلی باپ کی بے عزتی گوارا نہ کر سکی...... زیادہ اکڑو نہیں...... کیا کر لو گے تم...... یہ نہ بھولو یہ گھر اس بوڑھے کی ہی وجہ سے ہے۔ تمہارا عیش و آرام سب کچھ میرے بوڑھے باپ کی بدولت ہی ہے۔ کل تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بننے کا جو سپنا دیکھ رہے ہو نا...... وہ بھی ان کی وجہ سے ہی ہو گا۔ جانتے ہو کیوں۔ اگر یہ مجھے عالی تعلیم نہ دیتے تو آج میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہوتی۔ بند کرو اپنی یہ بکواس۔ سکھا پڑھا گیا ہے تمہارا باپ۔ جو تمہاری زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ زیادہ چلی تو زباں ہی کاٹ کر پھینک دوں گا۔ انجلی خاموش ہو گئی۔ سوچنے لگی بچپن میں ماں باپ نے اسے بڑوں کا احترام کرنا بھی نہیں سکھایا۔

وقت کا چکر اسی طرح چلتا رہا۔ انجلی دفتر اور گھر کے بیچ بھاگتی دوڑتی رہی۔ جواہر کے مکے اور گالیاں کھاتی رہی۔ اور آخر وہ مبارک دن آ ہی گیا جس کا انجلی کو بڑی بے تابی اور بے قراری سے انتظار تھا۔ جواہر نے بچی کو دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے ناک بھوں سکوڑ کر کچھ کہنا چاہا ہی تھا۔ انجلی بول پڑی۔ ہمارے سر پر آسمان تو نہیں آ گرا۔ لڑکی ہی تو پیدا ہوئی ہے۔ سنا ہے پہلی لڑکی ڈھیروں خوشیاں اور لکشمی لے کر آتی ہے۔ وہ بڑی حقارت کی ہنسی ہنسا اور بولا...... لکشمی...... یہ تو خود ایک اور جی کا جنجال ہے۔ ایک تم ہو...... چلتی پھرتی بدنصیبی...... جو میرے گلے زبردستی ڈال دی گئی اور اب...... یہ ایک اور...... مجھے نہیں چاہیئے دے دو اسے کسی کو...... یہ سن کر انجلی کو اپنی ہی سدھ بدھ نہ رہی...... جواب کیا دیتی...... کتنی بے بس اور خوفزدہ تھی وہ ہی جانتی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی اور جواہر کی نظریں ملیں...... جواہر کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ انجلی نے اپنا چہرہ گھما لیا......

انجلی کو یہ تو یقین تھا ہی کہ جواہر کو اس سے سخت نفرت ہے اور وہ اس کی صورت سے بھی بیزار ہے۔ صرف ڈالرز

کے لالچ میں اسے برداشت کر رہا ہے۔ اب یہ بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے بھی پیار نہیں کرتا۔ انجلی اپنی بیٹی میں مگن تھی۔ اور باپ کو بچی کی قطعی پروا نہیں تھی۔

کچھ بدنصیب لوگوں کے نصیب میں خوشیاں بڑی مشکل سے آتی بھی ہیں تو زیادہ دن نہیں ٹھہرتیں۔ جواہر کا رویہ اور بھی بے ڈھنگا ہوتا جا رہا تھا۔ دو دن سے گھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اچھا برا۔ تھا تو اس کی بیٹی کا باپ۔ دو دن سے اس کا ذہن سوچوں کا جال بن رہا تھا۔ لوٹا تو ایک امریکن لڑکی کے گلے میں باہیں ڈالے۔ دونوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے آتے ہی بولا اب تمہیں میری ضرورت نہیں۔ تم اپنی لڑکی پالو۔ میں اب کرسٹی کے ساتھ رہوں گا اسی گھر میں۔ ایک قہر آلود نظر انجلی پر ڈالی اور کمرے کا رخ کیا......

اس منظر کی تاب نہ لا کر انجلی چیخ پڑی۔ یہ میرا گھر ہے، ہوٹل نہیں۔ تم دونوں اس گھر میں نہیں رہ سکتے آج تک میں نے تمہاری ہر ضرورت پوری کی آئندہ نہیں کروں گی۔ اور اپنی بیٹی کی ذمہ داری تو تمہیں اٹھانی ہی ہوگی۔ انجلی نے کرسٹی سے سوال کیا۔ کیا تم جواہر کی بیٹی کو ماں کا پیار دے سکو گی۔ اس کی پرورش کر سکو گی۔ ......اوہ......نو......نیور......مجھے بچے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ کرسٹی نے جواہر سے سوال کیا...... یہ سب کیا ہے۔ تم تو کہتے تھے تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ یہ بچہ کہاں سے آ گیا۔ جواہر نشے کی حالت میں بھی سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ انجلی پر جھپٹا اور منہ پر طمانچے برسانے لگا۔ کرسٹی چیخی۔......بند کرو......جواہر تم بہت ظالم آدمی ہو......تم کو شرم نہیں آتی ایک کمزور عورت پر ہاتھ اٹھاتے......بند کرو......ورنہ میں پولس کو انفارم کر دوں گی۔ وہ دروازے کی طرف دوڑی اور بائے بائے کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

انجلی کے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بچی اٹھائی اور اپنی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر کو انجلی سے بہت ہمدردی تھی۔ اس نے فوراً ہی پولس اسٹیشن فون کیا۔ پولس افسر کے لئے یہ کوئی نیا واقعہ تو تھا نہیں......بولا......انڈین لڑکیاں اپنے شوہر سے مار بھی کھاتی ہیں لیکن چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ ہو سکتا ہے اک دن وہ تمہیں اور تمہاری بچی دونوں کو جان سے مار ڈالے۔ یہ سن کر انجلی ڈر گئی۔ اس نے جواہر کو چھوڑنے کا وعدہ کر لیا۔ کسی طرح تارا کو بچانا ہوگا۔

گھر کی چار دیواری سے بات باہر نکلی تو جواہر کے دوستوں نے اسے بہت سمجھایا کہ گھر اجڑ جائے گا۔ اجڑے خاندانوں کے بچے بھی کبھی ٹھیک سے آباد نہیں ہو پاتے۔ اپنے گھر کو اجڑنے سے بچالو۔ غلطی کی ہے تم نے اپنی غلطی مان کر جا کر انجلی کو منالو۔ سارے تم اسے روز مارتے پیٹتے رہے۔ ایک بار تم بھی تو اسے منانے کے لئے جاؤ۔ وہ نہیں مانا۔ بولا میں عورت کے سامنے نہیں جھک سکتا۔

امریکہ میں طلاق دینا کوئی بڑی مشکل بات نہ تھی۔ کورٹ میں جواہر نے کہا میں اپنی بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے میری بیٹی چاہیئے۔ وہ میرے ساتھ رہے گی۔ آخر فیصلہ وہی ہوا جو جواہر چاہتا تھا۔ بڑے حوصلے والی تھی انجلی لیکن فیصلہ سنتے ہی کورٹ میں بیہوش ہو کر گر پڑی......

اب آگے انجلی کے لئے سوائے ایک لمبی اندھیری سرنگ کے اور کچھ نہ تھا۔ اس ملک میں انجلی کا اپنا کوئی بھی نہ تھا اور تارا جو اس کی جان تھی اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ جواہر کے قدموں سے لپٹ گئی۔ جواہر تارا مجھے دے دو۔ بہت چھوٹی ہے میری بیٹی۔ اسے تو ابھی ٹھیک سے بولنا بھی نہیں آتا۔ وہ تم سے ڈرتی ہے۔ تمہیں جانتی تک نہیں۔ آج تک تم نے اسے چھوا تک نہیں۔ تم اسے کیسے پال سکو گے۔ اسے ابھی اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ یقین کرو جب تم کہو گے میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گی۔ پر ابھی......انجلی نے اپنا دامن پھیلا کر اپنی بیٹی کی بھیک مانگی لیکن کٹھور باپ کا دل نہیں پسیجا۔ وہ بے انتہائی لاپروائی سے بولا......تم یہ گھر اور اس گھر کی ہر شے ہندوستان لے جا سکتی ہو۔ بس تارا نہیں جائے گی۔

انجلی نے اسے یاد دلایا کہ گھر اور اس کی ہر شے وہ جواہر کو دے دیگی اگر وہ اسے تارا...... وہ روتی رہی...... بلکتی ہی رہ گئی اور جواہر تارا کو لے کر چلا گیا۔

اپنی بچی سے دور انجلی کی وہ پہلی رات قیامت کی رات تھی۔ وہ ایک ایک پل مر مر کر جی تھی۔ جسم ہی تو باقی رہ گیا تھا ماں کی جان تو وہ ظالم لے گیا تھا۔ اس مردہ جسم کا بوجھ میں کب تک ڈھوتی رہوں گی۔ پاپا کا خیال آتے ہی ہندوستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جہاز چھٹنے کے کچھ دیر پہلے کانپتے ہاتھوں سے انجلی نے جواہر کا فون نمبر لگایا۔ فون بجتا رہا۔ تارا کے رونے کی آواز سن کر انجلی کے ہواس باختہ ہونے لگے تھے۔ دل چار ہا تھا ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دے۔ پلٹ جائے اس اندھیری دنیا میں جہاں ایک ننھی سی روشنی کی لو تو جل رہی ہے۔ اٹھا کر لگا لے اپنی تارا کو سینے سے...... اے...... ہلو...... کیوں بار بار مجھے پریشان کرتی ہو۔ اب کیا چاہتی ہو...... جواہر...... میں جو چاہتی ہوں تم مجھے نہیں دو گے۔ میں اپنی بیٹی تمہیں سونپ کر جا رہی ہوں۔...... پیار سے رکھنا میری بیٹی کو...... معلوم نہیں قسمت میں اور کتنے دکھ لکھے ہیں...... معلوم نہیں پھر کبھی اسے دیکھ پاؤں گی یا نہیں...... جواہر وہ رو رہی ہے...... وہ بھوکی ہے...... آگے آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔...... انجلی کے سارے خواب جل کر راکھ تو پہلے ہی ہو چکے تھے...... آج اس کی ساری خوشیاں معدوم ہو گئی تھیں۔...... وہ اتنی درد بھری آواز سے زور سے روئی کہ جواہر جیسے پتھر دل انسان کا دل دہل گیا...... دھیرے سے بولا...... میں کوشش کروں گا...... تارا کی آواز اور تیز ہو گئی تھی۔

انجلی سامان لے کر جہاز کی طرف بڑھ گئی...... دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا...... آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انجلی کو اپنا آپا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ راستے میں اس پر جو بیتی اس کا ہی دل جانتا تھا۔ اپنی بچی سے جتنی دور ہوتی جا رہی تھی دل اتنا ہی خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ روتی۔ تڑپتی۔ آخر باپ کی دہلیز تک پہنچ ہی گئی۔

انجلی کا اجڑا حال دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ ماں کے دل پر ایسی ضرب لگی جیسے کسی نے چھنی سے چھید دیا...... تو اکیلی...... اور پھر سر پٹک کر رونے لگی...... آپ تو کہتے تھے وہاں سب ٹھیک ہے۔ باپ کی آنکھوں میں کرب اتر آیا۔ جگنو اپنی دیدی سے لپٹ گئی...... چاروں دیر تک روتے رہے اور انجلی کی داستان غم سنتے رہے۔

اچانک ہی جگنو اٹھی...... میری دیدی بہت بہادر ہے کہ وہ آتش فشاں سے نکل کر اپنوں سے آملی ہے۔ نہ جانے کتنی اس آگ میں جل کر خاک ہو گئی ہیں۔ دیدی نے اپنی زندگی کی سب سے مشکل گھڑی کا سامنا اکیلے کیا۔ دیدی اب تو سب آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے۔ اس وقت ہمیں حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔

انجلی پھر رو پڑی...... پاپا میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں دوہائی دیتی رہی پر اس ظالم نے میری ایک نہ سنی...... اماں مجھے کس قصور کی سزا مل رہی ہے...... ماں نے بلکتی بیٹی کو سینے سے لگا لیا...... رام چندرن بولے...... جانتا ہوں، میں سب جانتا ہوں بیٹا...... میں ان کے حال چال دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ خوشیوں کی منزل تیرے نصیب میں نہیں ہے۔ صبر کر لے...... انجلی دھیرے سے بولی...... ایک بے بس عورت صبر کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ آخر درد کی بھی کوئی سیما ہوتی ہے۔ برداشت سے باہر ہو جائے تو طاقتور سے طاقتور انسان بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بیٹی کا دکھ ایک مجبور باپ کے سارے بدن کو تار تار کئے دے رہا تھا۔ آخر درد آنسو بن کر بہہ نکلا...... دھیرے سے بولے تارا سے دوری کا غم برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ زیادہ غم انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ اور آگے بھی تمہیں بڑی مشکل راہوں سے گذرنا ہوگا۔ سنبھالو اپنے آپ کو......

کئی مہینے بیت گئے......انجلی گھر کی چار دیواروں میں قید ہو کر رہ گئی۔ ہر وقت اداس رہتی۔ رشتے دار آتے۔ بجائے ہمدردی کے ایسی کٹیلی بات کہہ جاتے کہ وہ رو رو پڑتی۔ سب نے اسے ہی دوش دیا......ماں سے بولی دوسروں کے دیئے دکھ تو برداشت کر لئے اپنوں کے دیئے زخم کیسے برداشت کروں۔......میری زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اب ہولناک تنہائیوں سے مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے۔ مجھ بدنصیب سے تو موت بھی روٹھ گئی ہے۔

ماں نے کہا......بولنے دے سب کو......ہم جانتے ہے تیرا کوئی دوش نہیں......اپنے بیتے کل کو اپنے آنے والے کل کی خاطر بھلا دے۔......زندگی یوں تو نہیں کٹے گی......تنہا اور اداس......تنہائی سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ باہر نکل اس چار دیواری سے۔ کوئی نوکری کر لے......بیٹا تیرا دل بھی لگا رہے گا......ایسے تو گھٹ گھٹ کر مر جائے گی......تو ہوشیار ہے۔ قابل ہے......زندگی بہت لمبی ہے اور تجھے آگے بڑھنا ہے۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ رشتے دار بھی رشتوں کی قدر کم اور پوزیشن کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ پوزیشن ہوگی......تب یہی رشتے دار تیرے آگے پیچھے دوڑیں گے......

انجلی پھر رو پڑی......کیسے بھول جاؤں اپنی بچی کو......اماں یہ درد گھٹتا ہی نہیں......دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میرے اندر کی پیاسی ممتا تڑپ رہی ہے۔ تارا کو دیکھنے کو دل ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔ اس کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے......اماں......میں کیا کروں......ماں بولیں......بس صبر کر......میرا دل کہتا ہے واپسی کا سفر ضرور ہوگا۔ ایک دن تیری تارا تجھے ضرور ملے گی......

انجلی نے اپنی بیٹی کی خاطر بے انتہا ذلت اور دکھ اٹھائے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی زندگی کی یہ جنگ عظیم ہار گئی تھی۔ اب اس میں ایک اور نئی جنگ کا آغاز کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ماں کی نصیحت پر چلنے کی جرات نہ تھی ......بیٹی کی یادوں نے انجلی کو بے حد مجروح کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس دہلیز کے پار اسے ہر قدم پر احساس دلایا جائے گا کہ وہ ایک ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ جس کی دنیا میں کوئی قدر اور عزت نہیں

گھر میں اداسی کی طغیانی بڑھتی دیکھ انجلی کے پاپا اس سے بولے......بیٹا گھر کی ان سونی دیواروں سے کب تک سر ٹکراتی رہو گی۔ اگر کوئی کسی کو پہاڑ کی چوٹی سے کھائی میں ڈھکیل دیتا ہے تو وہ گھائل جب تک اس میں جان باقی رہتی ہے کھائی سے اوپر آنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ہاتھ پیر مارتا ہے۔ تمہاری زیست کا مقصد سدا رونا تو نہیں......زندگی سب سے قیمتی شے ہے۔ اسے برباد نہیں ہونے دو......مصلحت کا یہی تقاضہ ہے کہ تم اپنے غموں کو بھلا کر اب آگے بڑھو......کل صبح آٹھ بجے تیار رہنا......تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا......ایک امریکن فرم ہے۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ انجلی کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی پاپا حکم صادر کر کے باہر نکل گئے تھے......

اس طرح انجلی نے اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کیا......امریکن فرم کا مالک ہندوستان آتا رہتا تھا......ہر ایک کی زبانی انجلی کی تعریف سن کر جوزف کو بھی انجلی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا......سادی سی ساڑی میں وہ بہت گریس فل لگ رہی تھی۔ جوزف نے سوچا یہ اسمارٹ لڑکی ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں بھی ضرور بن سکے گی......وہ اس کو آتے جاتے دیکھتا رہتا......ایک دن اس کے کمرے میں پہنچ گیا......انجلی اپنے باس کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گی......جوزف نے انجلی کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا......کچھ دیر جب چپ بیٹھا رہا تو انجلی ہی نے سوال کیا......سر......آپ کو مجھ سے کوئی کام

ہے......وہ بولا......ہاں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... مجھے ہندوستانی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت محنتی اور نیک ہوتی ہیں......انجلی تو سن کر سن ہی پڑ گئی......شادی اور وہ بھی ایک امریکن کے ساتھ......اس نے فوراً انکار کر دیا ......بولی میں جانتی ہوں آپ مجھے نوکری سے نکال دو گے پر میں شادی نہیں کر سکتی......

جوزف جانتا تھا ہمارے ملک میں شادی باپ کی رضامندی سے ہی ہوتی ہے......سو بولا......میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گا......اس سے پہلے انجلی کچھ اور کہتی جوزف جا چکا تھا......

رام چندرن اس شادی کے لئے راضی نہیں ہوئے۔ ماں نے کہا کیا امریکن آدمی نہیں ہوتے......اس ہندوستانی نے ہماری بیٹی کو اتنے ڈھیر سارے دکھ دیئے۔ یہ مانگ رہا ہے......اچھی طرح رکھے گا......یہاں سے دور چلی جائے گی تو رشتے داروں کی جلی کٹی سے بھی نجات مل جائے گی......انجلی بولی اور میری بیٹی کا کیا ہوگا......جوزف نے وعدہ کیا کہ وہ کورٹ تک جائے گا......اور تارا کو واپس لے آئے گا......میری پہلی بیوی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ سب کا کہنا تھا ہماری جوڑی کمال کی ہے۔ ویسی کوئی دوسری نہیں......مگر وہ عورت کیا جسے بچے کی چاہت نہ ہو۔ بچوں سے پیار نہ ہو۔ وہ بچے نہیں چاہتی تھی۔ اور مجھے بچے بہت پیارے لگتے ہیں۔ وہ گھر اچھا لگتا ہے جس میں بچے کھیلتے کودتے دکھائی دیں......بچوں کے بغیر گھر سونا لگتا ہے۔ سنسان میرے گھر کی دیواریں تمہیں اور تارا کو پکار رہی ہیں......

بڑے آدمی کی بڑی بڑی باتوں پر اکثر لوگ یقین کر لیتے ہیں۔ انجلی نے بھی سوچا تارا کے بغیر میری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ اسے پانے کے لئے میں کچھ بھی کر گذروں گی......رام چندرن اندر سے بے چین اور گھبرائے ہوئے لگتے تھے......لیکن آخر میں وہ بھی راضی ہو گئے۔ شاید بیٹی کا دکھ کم ہو جائے۔ شاید تارا مل جائے۔ امید ہی پر تو دنیا قائم ہے انہوں نے بھی سوچا۔

شادی کے بعد انجلی کو لے کر جوزف ہونگ کونگ چلا گیا جہاں جوزف کا بہت بڑا کاروبار تھا......جوزف نے انجلی کی جھولی دنیا کے بیش قیمت تحفوں سے بھر دی لیکن انجلی کے دل کو آسودگی نہ ہوئی۔ اسے تو اپنی تارا چاہیئے تھی......اور جوزف نے جو وعدہ کیا تھا پھر اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ایک سال کے اندر انجلی کے بیٹی پیدا ہو گئی۔ جوزف خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ بار بار بچی کو چھو کر کہتا میں اپنی بیٹی کی ماں کو بہت چاہتا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم صرف میری بیٹی کو پیار کرو ......اس رات وہ بہت پریشان رہی۔ تارا کی یاد ستاتی رہی۔

ایک دن جوزف نے کہہ ہی دیا......انجلی اب تم تارا کو بھول جاؤ......وہ جہاں ہے اسے وہی رہنے دو......اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ ہو سکتا ہے میں تارا کو وہ پیار نہ دے سکوں جو اس کا اپنا باپ اس کو دے سکتا ہے۔ اب تمہارا اپنا خاندان ہے......ہماری بیٹی ہے......جوزف کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ لیکن وہ کہنا چاہ رہی تھی تارا بھی تو میری بیٹی ہی ہے ......اور تمہارے وعدے کا کیا ہوا......اگر تم وعدہ نہ کرتے کہ میری تارا مجھے واپس دلواؤ گے تو میں تم سے کبھی شادی نہیں کرتی ......گود میں بچی رو پڑی......جوزف ایک دم پاس آ گیا......کیا ہوا میری بیٹی کو......کیوں رو رہی ہے......جوزف جس طرح اپنی بیٹی پر جان چھڑکتا تھا......انجلی سمجھ گئی اب وہ کبھی تارا سے نہیں مل پائے گی......انجلی کے دست و پا شکستہ ہو گئے۔ انجلی کے اندر سے ایک آہ نکلی جسے سننے والا کوئی نہ تھا۔ عورتوں کے دکھ مرد کب سمجھ پاتے ہیں......انجلی نے بغور جوزف کی آنکھوں میں دیکھا لیکن ان میں اپنے لئے کچھ نہ پایا......

انجلی چھپ چھپ کر روتی...... ممی...... پاپا نے بھی جوزف کی بات کی تائید کی تھی...... پاپا فون پر کہہ رہے تھے بیٹا ...... سب مرد خود غرض ہوتے ہیں...... پاپا...... وہ رو کر بولی تھی جوزف نے مجھے یقین دلایا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر وہ میرا ساتھ دے گا...... اس نے تو پہلے ہی موڑ پر دغا دے دی...... آگے میں اس پر کیسے اعتبار کر سکتی ہوں...... میں کیسے تارا کو بھلا دوں ...... آپ مجھے نہ بھلا پائے تھے...... میں تو بڑی تھی...... تارا تو اتنی چھوٹی ہے...... باپ کا دل بہت رنجور تھا...... بولے انہیں نشیب و فراز کا دوسرا نام زندگی ہے...... دنیا کی اس خود غرض بستی میں ایک وہ ہی تو ہے، جو تمہیں دل سے چاہتا ہے...... زندگی میں تو سمجھوتے کرنے ہوتے ہیں۔ مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے لیکن اب ضد چھوڑ دو۔ ضد کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔

سالوں بیت گئے...... جوزف اور انجلی کے دونوں بچے مونا اور رونی بڑے ہو گئے تھے...... انجلی نے لاکھ جتن کر ڈالے لیکن تارا کی یاد دل سے نہ نکال سکی...... افسردگی تھی جو روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی...... اس کے دل کے اندر کا سناٹا اور بڑھتا جا رہا تھا...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج کچھ انہونی ہونے جا رہی ہے۔ کتنی دیر سے گھنٹی بج رہی تھی پر اسے تو اپنا ہی ہوش نہ تھا...... گھنٹی بند ہو چکی تھی...... انجلی کا دل بے حد بے چین ہو اٹھا...... وہ کھڑی ہو گئی تھی اور اسی وقت فون کی گھنٹی دوبارہ بجی...... فون اٹھایا...... نہ ہلو...... نہ...... اماں...... دل کے گہرے سناٹوں میں طوفان برپا ہو گیا...... سارا جسم تھر تھر کانپ اٹھا...... اماں...... میں جانتی ہوں...... ادھر میں ہوں اور ادھر آپ ہیں اپنی بیٹی سے بات نہیں کریں گی ...... آپ مجھ سے خفا تو ہو ہی نہیں سکتیں...... شاید خفا تو آپ اپنے آپ سے ہیں ہم دونوں ہی بے قصور ہیں...... میں تو معصوم چھوٹی سی بچی تھی اور آپ مجبور...... اماں...... میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ صرف مجھے ایک بار اپنے سینے سے لگا کر اپنا ممتا سے بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیں...... ایک بار میری پیشانی چوم کر کہہ دیں تارا تو میری بیٹی ہے۔ میں ترس رہی ہوں ماں کی ممتا کے لئے۔ آج تک مجھے کسی نے پیار نہیں کیا کسی نے نہیں کہا تو میری بیٹی ہے۔ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے...... مجھے تو نہ ماں کا پیار ملا نہ باپ کا...... صرف ایک بار مجھے اپنی باہوں میں بھر لو...... آپ سے دوری کا دکھ میرے لئے نا قابل برداشت ہے...... تارا رونے لگی تھی...... ماں اس کی سسکیاں سن رہی تھی۔

تارا کا ایک ایک لفظ ماں کے دل میں پیوست ہو گیا...... وہ بھی تو یہ سننے کے لئے بیقرار رہتی تھی۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی...... جوزف اور اس کے دو بچے...... تارا...... میری بیٹی...... میں اس دن بھی مجبور تھی اور آج بھی مجبور ہوں۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا...... تارا نے سوال کیا...... کیوں نہیں ہو سکتا...... ماں کے ہوتے ہوئے میں ماں کی ممتا کے لئے کیوں ترسوں...... مجھ سے میرے حق کیوں چھین لئے گئے...... اماں آپ نے مجھے بھری دنیا میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا۔

انجلی سنتی رہی اور بیٹی فریاد کرتی رہی...... اور ایک مجبور اور بدنصیب ماں کر بھی کیا سکتی تھی...... انجلی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی جان جسم سے نکلتی جا رہی ہے...... بڑی مشکل سے بول پائی تھی...... تارا...... یہ سوچ لو تمہاری اماں اس دنیا میں نہیں ہے...... آئندہ فون نہ کرنا...... پھر انجلی کو ہوش نہیں رہا......

انجلی کو ہوش ico میں آیا تھا...... پاس کھڑے ڈاکٹر جوزف سے کہہ رہے تھے انجلی کے دل پر کوئی زبردست دھکا لگا ہے...... آگے دھیان رکھنا...... انجلی کی حالت کمزور تھی...... دو دن ہوئے تھے گھر آئے کہ جوزف کو ہسپتال جانا پڑا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ کافی عرصے سے بیمار تھا لیکن وقت کی کمی اور بزنس کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکا تھا...... کینسر کی جڑیں پورے لنگ میں پھیل چکی تھیں...... مونا اور رونی کے ہاتھوں میں بزنس کے سارے

کاغذات دے کر انجلی اور جوزف امریکہ علاج کے لئے چلے گئے......

آہستہ آہستہ موت جوزف کی طرف بڑھتی آ رہی تھی...... علاج جتنا بھی بہترین ہو موت کے شکنجے سے کوئی نہیں بچ سکا...... ایک دن انجلی نے ڈاکٹر کو مصروف دیکھ کر کہا...... تم تھکتی نہیں ہو...... دن رات ہسپتال میں کام میں جتی رہتی ہو...... تمہارے گھر والے برا نہیں مانتے...... ڈاکٹر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا...... میرا گھر تو یہی ہے۔ میرے مریض مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ جہاں پیار کرنے والے ہوتے ہیں وہیں گھر ہوتا ہے...... اس ہسپتال کے باہر میرا اپنا کوئی نہیں...... بس یہ ہسپتال ہی میری دنیا ہے۔ مسٹر جوزف کی دیکھ بھال کرنے میں مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔ میرے اپنے پاپا نہیں رہے...... مسٹر جوزف میرے باپ کی طرح ہیں۔ ڈاکٹر نے انجلی سے کہا...... کئی دن ہو گئے آپ بھی تو آرام کرنے اپنے گھر نہیں گئیں۔ آپ جا کر گھر میں تھوڑی دیر آرام کریں۔ میں مسٹر جوزف کا پورا خیال رکھوں گی...... نہیں ڈاکٹر...... میں جانا نہیں چاہتی...... مسٹر جوزف کی حالت بگڑتی جا رہی ہے...... انجلی نے گلوگیر آواز میں کہا......

دوسری رات مسٹر جوزف کی حالت بہت ہی بگڑ گئی...... سانسیں رک رک کر آنے لگیں...... انہوں نے اپنے چہرے سے آکسیجن ماسک ہٹا کر ڈاکٹر سے کہا...... کاش میرے پاس تم جیسی ایک لڑکی ہوتی...... ڈاکٹر کے آنسو جو اتنے دنوں سے آنکھوں میں تیرتے رہتے تھے بہہ نکلے...... مسٹر جوزف کے پاس جھکی ان کی پیشانی چوم کر بولی میں آپ کی ہی بیٹی ہوں...... مسٹر جوزف کی سانسیں بند ہو گئیں...... انجلی رو پڑی سسک کر بولی...... میں اکیلی رہ گئی......

اسی وقت ڈاکٹر نے بھی اپنا ماسک چہرے سے اتارا...... اوپر...... دیکھا...... اماں...... آپ اکیلی نہیں ہیں...... میں ہوں آپ کے ساتھ...... آپ کی بیٹی تارا...... سب کچھ بھول کر انجلی نے تارا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسے چومتی رہی اور آنسو بہتے رہے...... دھیرے سے بولی...... سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ فریبی اور دھوکے باز...... اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح سے عورت کو اپنے بس میں کر کے اس کی خوشیوں کو پامال کرتے ہیں۔ جوزف نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کورٹ تک جائے گا۔ اور تمہیں واپس لے آئے گا۔ تمہیں پانے کے لالچ میں میں نے جوزف سے شادی کی...... لیکن ہر مرد کی طرح اس نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا۔ جس ماں سے اس کا دودھ پیتا معصوم بچہ چھین لیا جائے اس سے زیادہ بدنصیب اور مسکین اور کون عورت ہو سکتی ہے۔

میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا...... ایک شوہر نے ہر قدم پر ذلیل و خوار کیا...... پھر طلاق دے کر میری بچی مجھ سے چھین لی۔ دوسرے شوہر نے دولت اور شہرت تو دی پر وعدہ خلافی بھی کی۔ میری بچی سے مجھے دور رکھا۔ تمہیں بھلانے کا حکم دیا...... زندگی کے یہ بائیس سال میں نے رو رو کر کاٹے ہیں...... اب تم مل گئی ہو...... مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ نا دولت نا شہرت...... بیٹی میں غم اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں...... اماں دکھ درد تو میں نے بھی بہت اٹھائے ہیں......

تارا نے مضبوطی سے اپنی ماں کو تھام کر کہا جو دوسروں کو سخت درد اور تکلیف دیتے ہیں ان کے لئے عذاب کی سزا ہوتی ہے۔ پاپا کو بھی کینسر کھا گیا...... اور...... لوگ آ گئے تھے مسٹر جوزف کی باڈی لے جانے کے لئے۔

ماں نے کہا بھول جا اس درد کو...... آگے دیکھ...... تارا بولی اماں اس ہسپتال کے باہر ایک چھوٹا سا گھر ہے...... آپ کا اور آپ کی بیٹی کا...... آیئے اب چلیں

☆☆☆

گوہر نایاب

رادھا کو زار وقطار روتا دیکھ میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ میں دور سے ہی چیخا...... کیا ہوا۔ سب خیریت تو ہے۔ اس نے میرے سوال کا جواب نہ دے کر ٹیلی فون میز پر رکھا اور چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ ایک دم ہی میرا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچا تو اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھتے ہی میرا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا ...... ارے بھئی...... اب کونسی آفت آن پڑی جو تم ٹسوے بہائے جارہی ہو...... کچھ بولو تو سہی۔ میں نرمی سے گویا ہوا۔

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بامشکل کہہ پائی...... وہ...... وہ۔ کامنا...... اس کے رندھے گلے سے آواز ہی نہ نکلی اور میرے اندر سن سی پھیل گئی۔ میں اس کے سامنے بہادر بننے کی کوشش کررہا تھا مگر سچ تو یہ تھا میں اندر ہی اندر اپنی بیٹی کے لئے بے حد فکر منداور اس کا حال جاننے کے لئے بے قرار تھا۔ میرے دل نے کئی راتوں سے آرام نہیں پایا تھا۔ اکلوتی بیٹی کی جدائی نے ہم دونوں کے دلوں کا چین وقرار چھین لیا تھا اور اس وقت رادھا کے دھواں دھار بہتے آنسوؤں نے میری پریشانی میں اضافہ کردیا تھا...... میں نے پھر سوال کیا...... ٹھیک تو ہے نا ہماری بیٹی...... ہاں ٹھیک ہے اور بہت خوش بھی ہے وہ بڑی نرمی سے بولی...... میں فوراً ہنس دیا اور بولا...... تو پھر یہ منہ بسورے کیوں بیٹھی ہو۔ خوش لہجے میں بولو کہ ہماری بیٹی خوش وخرم ہے۔ رادھا کے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے رادھا کی دلجوئی کی...... دیکھو بیگم...... رویا نہ کرو...... تمہارے آنسو مجھے بے قرار کردیتے ہیں۔ کچھ تو رحم کرو میری بیٹی پر اور اب آنسو بند...... تم ادھر رو ؤگی تو کامنا ادھر خوش نہ رہ پائے گی۔ تمہاری بیٹی کوئی انوکھی تو سسرال گئی نہیں ہے۔ تم بھی اپنی سسرال گئی تھیں۔ مجھے تو آج بھی اس سہانی رات کا ایک ایک پل یاد ہے۔ تم بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں اور خوش بھی نظر آرہی تھیں۔ بیٹی کو سسرال گئے ابھی جمعہ جمعہ سات دن نہیں ہوئے اور ادھر اس کی اماں نے واویلا مچا رکھا ہے۔ مت بھولو شوہر کا گھر ہی لڑکی کا اصلی گھر ہوتا ہے...... لڑکیاں تو امانت ہوتی ہیں والدین کے گھر پر...... انہیں تو جانا ہی ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کامنا کو پاکر کشن بہت خوش اور مطمئن ہے۔ وہ اپنی اس بڑی سی کوٹھی میں بالکل ہی تنہا رہ گیا تھا۔ اس کی ماں کی موت کے بعد اس کے باپ کے پاؤں گھر میں تو کیا ایک ملک میں نہیں ٹکتے۔ آج لندن تو کل نیویارک۔ سچ ہے ساتھی کے بنا یہ خوبصورت جنت نما دنیا خشک اور بنجر لگنے لگتی ہے۔

ہم دونوں محو گفتگو تھے نیلم اور بھارتی دروازے پر کھڑی اندر آنے کا انتظار کررہی تھیں۔ بھارتی کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر میں گھبرایا کہ نہ جانے اب اس غریب پر کونسی نئی قیامت ٹوٹی ہے...... آؤ...... آؤ...... اندر آؤ اور سنبھالو اپنی میڈم کو۔ میں نے خوش لہجے میں پکارا......

نیلم بولی...... سرآپ جیسے روشن ذہن کے لوگ مجھے تو اکا دکا ہی نظر آتے ہیں۔ میں نے فخریہ لہجے میں گردن اکڑ کر کہا۔ اگر دنیا میں ایک تہائی مرد بھی میرے ہم خیال اور ہم مزاج ہوتے تو واقعی یہ دنیا جنت سے کم نہ ہوتی۔ اتنے غم نہ ہوتے۔ اتنے آنسو نہ ہوتے۔ نہ جانے کب اس دنیا کے دکھ کم ہوں گے۔ بھارتی نے کہا سر...... ہر چیز کا ایک موقع اور ہر

کام کا وقت ہوتا ہے۔ مرنے کا ایک وقت۔ خوشیوں کا ایک وقت۔ مگر عورت کی ساری زندگی ہی دکھوں کے درمیان کٹ جاتی ہے۔ اگر مرد عورت کو بے اعتباری۔ ذلت اور رسوائی نہ بخشتا تو عورت پر راج کیسے کرتا۔ میں ہوں نا بربادی کی زندہ مثال آپ کے سامنے۔ اس کا لہجہ غصہ اور غم سے بھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی بھی اتر آئی تھی۔ مجھے اس کے حال زار پر ترس آیا اور فوراً اسے داد دی۔ مانتا ہوں کہ تمہیں گہری ضرب لگی ہے لیکن آخر میں جیت تمہاری ہی ہوگی کیونکہ تم نے سمجھداری اور تدبیر سے کام لیا۔ تب ہی تو موت سے نکل کر زندگی کی طرف لوٹ آئی ہو۔

شیام چائے کی ٹرالی چھوڑ گیا تھا۔ بادل بہت زور سے گرج رہے تھے۔ جھم جھم بارش بھی ہو رہی تھی۔ پلیز نیلم ایک پیالی چائے تو بناؤ۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میری بیگم نے فرمائش کی۔

میں سر کے درد کی دوائی لے کر پلٹا تو بھارتی کہہ رہی تھی۔ جو مجھ پر گذر رہی ہے وہ کوئی نہیں جانتا۔ برباد ہوگئی میں۔ کیا میں ساری زندگی اسی طرح سولی پر لٹکی رہوں گی۔ اسی وقت برستے آسمان سے زور سے بجلی کڑکی۔ ہم سب دہل گئے۔ میں تو بھارتی کی بات سن کر دہلا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ بھارتی سولی پر لٹکے رہنا تمہاری مجبوری ہے۔ ایک بیٹی کی ماں جو ہو خدانخواستہ اگر سولی پر تمہارا دم نکل گیا تو تمہاری معصوم بچی خونخوار درندوں سے بھری اس دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ تمہارے بعد کون اس کی رکشا کرے گا۔ ماں کی ممتا سارے دکھ اٹھانے پر مجبور ہوتی ہے۔ مردوں کے ظلم کی بھینٹ کتنی ہی لڑکیاں چڑھ چکی ہیں نہ جانے کیوں مرد بھول جاتا ہے کہ خدا نے یہ انمول تحفہ صرف مرد کو عطا کیا ہے۔ میری بات سنتے ہی نیلم بولی۔ انمول تحفہ...... انمول تحفہ تو بڑا سنبھال کر رکھا جاتا ہے پھر مرد نے اس انمول تحفے کی قدر کیوں نہیں کی۔

بھارتی نون اسٹاپ شروع ہوگئی۔ عورت ازل سے مرد کی ہمسفر ہے۔ اس کی اولاد کی ماں۔ اپنے بھائیوں کے دلوں کی راحت۔ باپ کی آنکھوں کا تارا۔ پھر بھی مردوں نے عورت کی بے قدری کی۔ اسے حقیر سمجھا۔ ازل سے ہی مرد عورت کو احمق جاہل ناقص اور نیچا سمجھتا آیا ہے۔ عورتوں کو دکھ اٹھاتے اٹھاتے صدیاں بیت گئی ہیں۔ اور حالات اب بھی سدھرتے نظر نہیں آتے۔ یوں لگتا ہے عورتوں کی زبوں حالی کی داستانیں یوں ہی صدیاں چلتی رہیں گی ان کا اختتام کبھی نہیں ہوگا۔ غصہ اور صدمے میں ڈوبی وہ دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ باہر آسمان پر بادلوں کی گھن گرج پھر سنائی دی۔ اور ساتھ ہی بارش نے بھی زور پکڑا۔ اب اس موسلا دھار بارش میں وہ دونوں باہر جا ہی نہیں سکتی تھیں۔ سو میں نے ماحول کا تناؤ کم کرنے اور بھارتی کا موڈ بدلنے کی غرض سے کہا۔ ایک زمانہ تھا جب بلرام تمہیں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ پھر اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ تم دونوں کے درمیان ایسی دوریاں حائل ہوگئیں۔ جنہوں نے کھائی کی صورت اختیار کر لی اور تم دونوں بھی ضد میں اپنی اپنی جگہ جم کر کھڑے ہو۔ ادھر تم ادھر بلرام۔ مگر یاد رکھو ذرا قدم ڈگمگائے تو تم دونوں تو کھڈ میں گرو گے ہی ساتھ میں اپنی معصوم بیٹی کی زندگی بھی تباہ کر دو گے۔

وہ ایک دم چونک کر بولی...... نہیں...... سر ایسا نہ کہیں...... بیٹی کی خاطر...... میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن وہ بھی تو ذرا سا آگے بڑھے...... میں مسکرایا اور بولا...... ارے...... تم ہی تھوڑی سی جھک جاؤ۔ ایک بچی کی ماں بن گئیں اور ابھی تک مرد کی خصلت سے واقف نہیں ہوئیں۔ یہ مرد جب محبت کرتا ہے۔ تو ٹوٹ کر کرتا ہے۔ اپنا سب کچھ اپنی محبوبہ پر قربان کر دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنی انا کے جال سے باہر نہیں نکل پاتا۔ بس اسی موڑ پر آ کر سب معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔

جب بنانے والے نے یہ خوبصورت دنیا پہلے مرد کے حوالے کی تو وہ ساری خوبصورت کائنات پا کر بھی خوش نہ ہوا۔ خدا سے کوئی راز چھپا نہ تھا۔ مرد کا اداس چہرہ دیکھتے ہی خدا اس کی اداسی کا سبب بھانپ گیا اور فوراً ہی مرد کے لئے ایک ساتھی کی تخلیق کی۔ کائنات کی ساری رنگینیاں اور رعنائیوں سے بھری اپنی اس نئی تخلیق کو دیکھ کر خدا خود نازاں تھا۔ جب خدا ہی حیران رہ گیا تھا تو بھلا سوچو بیچارے مرد کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا کی نئی حسین کاریگری کو دیکھتے ہی مرد کے ہوش ہی اڑ گئے ہوں گے۔ نہ معلوم کس طرح اس کے ہوش و حواس بجا ہوئے ہوں گے۔ خیر خدا نے وہ نئی خوبصورت چیز مرد کے سپرد کی۔ مرد نے اسے بڑے اہتمام لے رکھا۔ بڑے سنبھال کر۔ اس کے ناز ونخرے اٹھانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ مگر جلد ہی اس سے بیزار ہو گیا۔ اور بیزاری بھی اس شدت کی ہوئی کہ وہ سات دن کے بعد ہی اس سے نجات پانے کا مصمم ارادہ کر کے خدا کے دربار میں جا پہنچا۔ دست بستہ عرض کی۔ میرے مالک میں اکیلا ہی ٹھیک تھا۔ میں اس کے ناز ونخرے اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں مگر یہ کسی حال خوش نہیں رہتی۔ اپنی ہی کہہ جاتی ہے۔ میری ایک نہیں سنتی۔ میں خاموش رہتا ہوں پھر بھی یہ واویلا مچائے رکھتی ہے۔ میں اس سے عاجز آچکا ہوں۔ میرے آقا تو مجھے اس سے چھٹکارا دلا دے۔ واپس لے لے اسے۔ خدا نے کہا ٹھیک ہے۔ تو جا...... اسے چھوڑ جا۔

مرد اپنی جنت نما دنیا میں لوٹ کر پھر مگن ہو گیا...... مگر یہ آزادی اسے راس نہ آئی...... جلد ہی اپنی تنہائی سے بیزار ہو کر پھر خدا کے حضور جا کر گڑ گڑایا۔ میرے آقا۔ اب نہ سورج میں پہلی والی وہ چمک رہی نہ چاند کی چاندنی میں وہ سرور۔ نہ ہی شبنم کے قطروں پر وہ پہلی جیسی ٹھنڈک۔ نہ باد صبا میں وہ مہک۔ نہ پھولوں میں وہ رنگت۔ ساری کائنات پھیکی سی پڑ گئی ہے۔ یوں لگتا ہے مالک اس کے دم سے تیری دنیا میں بہار تھی۔ اب تو سب کچھ خشک اور بنجر سا لگتا ہے۔

اس کا پھول جیسا ملائم بدن چھونے سے مجھے راحت اور سکون ملتا تھا۔ اس کا جمال میرے دل و دماغ کو مسرور کرتا تھا۔ اس کے بدن کی خوشبو آج بھی میری سانسوں میں بسی ہے۔ اور خیالوں میں وہ حیا کی ڈالی لچک رہی ہے۔ اس کی صورت کی طرح اس کی باتیں بھی بڑی دل آویز تھیں جنہیں سن کر میرا دل شاداں ہوتا تھا۔ ناچتے وقت جب وہ سریلی آواز میں گاتی تھی اور مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی تھی تو میری آنکھیں آسودہ ہو جاتی تھیں۔ اس کی شیریں کلامی میرے کانوں کو بڑی بھلی لگتی تھی۔ میرے کان اس کی سریلی آواز سننے کو ترس گئے ہیں۔ اس کے ہی وجود سے تیری پوری کائنات میں دلکشی تھی۔ اس کے بنا تیری بنائی یہ حسین دنیا بے رنگ و بو ہے۔ اب نہ فضا میں وہ خنکی رہی اور نا ہی کوئی دلکشی۔ اس کے بغیر میں بالکل تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ اب میرے لئے اکیلا رہنا دشوار ہو گیا ہے۔ خدا نے کہا لے جا اسے۔ اسے میں نے خاص طور سے صرف تیرے لئے بنایا ہے۔ یہ میری طرف سے تیرے لئے انمول تحفہ ہے۔

تین دن کے بعد مرد اپنے ساتھی کے ساتھ خدا کے دربار میں پھر حاضر ہوا۔ مالک...... میں اکیلا ہی ٹھیک تھا۔ تیرے دیے اس انمول تحفے نے میری جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ بجائے باعث راحت اور تسکین کے یہ میرے لئے باعث مصیبت بن گئی ہے۔ بے حساب بولتی ہے اور بات بات پر مجھ سے الجھتی ہے۔ مجھے ایک پل کے لئے اکیلا نہیں چھوڑتی۔ چاہتی ہے کہ میں ہر پل ہر گھڑی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہوں اور اس کے نخرے اٹھاؤں۔ پاس رہتا ہوں تو جھگڑتی ہے۔ اور اس حد تک جھگڑتی ہے کہ میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں اس کے لہجے کی تلخی اور کرواہٹ سے میں بیزار ہو چکا ہوں۔ اس کے قریب ہوتے ہوئے نہ ہی میں کچھ سوچ سکتا ہوں اور نہ ہی کچھ کر سکتا ہوں۔ میرے مالک مجھ پر رحم کر

اور اسے واپس لے لے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

خدا جو مستقبل کا جاننے والا ہے۔ بولا۔ میں اسے واپس نہیں لوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں تو اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ لے جا اسے اور اپنے معاملے اپنے آپ نمٹا۔ یہ بیش قیمت تحفہ عورت کہلائی جسے خدا نے مرد کو بخشا تا کہ مرد اور عورت دونوں مل کر خوش رہیں آباد رہیں۔ ہماری بیٹی کی زندگی بھی اب کروٹ لے چکی ہے۔ اب اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ انہیں اپنے معاملے خود نمٹانے دو۔ تم بس اس کے لئے دعا کرو کہ وہ سکھ اور چین سے رہے۔ دعا مانگو مگر اس طرح رو دھو کر نہیں۔ میں نے نرم لہجے میں رادھا سے کہا۔

نیلم پھر بولی...... افسوس صد افسوس خدا کی بنائی شے کو انسان نے جاہل اور ناقص سمجھا۔ عورت کی تذلیل کی اور بیچاری عورت صرف دو وقت کی روٹی اور سر پر مرد کے سایے کی خاطر ساری زندگی مرد کے ساتھ سمجھوتا ہی کرتی آ رہی ہے۔ بھارتی جو ہمیشہ کی طرح اپنی ماضی کی یادوں میں گھری بیٹھی تھی فوراً بولی۔ آج کا مرد عورت کو سایہ بھی نہ دے سکا۔ آج کل سسرال میں لڑکیوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں ہو رہی ہیں وہ روز منظر عام پر آ رہی ہیں۔ میڈم اسی وجہ سے دہشت زدہ ہیں۔ ماں تو ہر دم ہی اپنی بیٹی کی خوشیوں اور بہتری کی دعائیں مانگتی ہے مگر بیٹی کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ دنیا کے کونے کونے میں لڑکے کی پیدائش پر جشن مناتے ہیں اور لڑکی کی پیدائش پر سینہ کوبی کرتے ہیں۔ مائیں بھی بیٹوں کی زیادہ قدر کرتی ہیں۔ کچھ بھی تو بدلتا نظر نہیں آتا۔

میں نے کہا بدلتے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلی تو ہمارے معاشرے میں بھی آ رہی ہے۔ پہلے واقعی لڑکیوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی تھی۔ بچیوں کو مار ڈالتے تھے۔ بدھواؤں کو ستی کر دیا جاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔

نیلم اونچی آواز میں بولی...... اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے سر...... مگر کم...... پہلے بدھواں کی دوسری شادی کا رواج نہیں تھا۔ ستی کر دیتے تھے تو لڑکی دکھ بھری زندگی سے نجات تو مل جاتی تھی۔ میری دیدی کو تو اس کے سسرال والے تل تل کر کے جلا رہے ہیں۔ سسرال والے اپنے قہر میں ڈوبے نشتروں کا زہر ان کے لہو میں اتار رہے ہیں۔ انہیں اپنے مرے بیٹے کی پینشن چاہیئے سو وہ لوگ میری دیدی سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ دیدی عالیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ کالج میں پڑھا کر خود اپنی کفالت کر سکتی ہے مگر نہیں۔ وہ لوگ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر سروج نے گھر چھوڑا تو وہ ہمارا خاندان تہس نہس کر دیں گے۔ بیٹے پر قبضہ کر رکھا ہے کے ہمارے بیٹے کی واحد نشانی ہے۔ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ کر بھی سکتے ہیں۔ میری دیدی کے نصیب میں تو اب عمر بھر کا غم ہی غم رہ گیا ہے۔ پاپا دیدی کی دوسری شادی کرانا چاہتے ہیں۔ انہیں دوبارہ آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر مجبور ہیں۔ دیدی کو تو ہمارے گھر آنے کی بھی اجازت نہیں۔ نہ جانے ان لوگوں کے قہر کی ڈور کب ٹوٹے گی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہمارے یہاں تو پڑھے لکھے جاہلوں نے عورتوں کی زندگیاں عذاب بنا دی ہیں۔ ہم سب ہاتھ باندھے دیدی کی بربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ وکیل ہوتے ہوئے بھی میرے ڈیڈی زبان نہیں کھول سکتے۔

میں نے کہا معاشرے سے کوئی برائی جڑ سے اکھاڑ کر باہر پھینکی نہیں جا سکتی۔ مغربی ممالک میں اب عورتوں کی قدر ہونے لگی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انگلینڈ فرانس جیسے ملکوں میں بھی عورتوں کا حال برا تھا۔ سترھویں صدی تک وہاں بھی عورت کو کمزور اور کم عقل سمجھتے تھے۔ ان کا بھی کہنا تھا کہ عورت کوئی کام پوری ذمہ داری اور صحیح طریقے سے انجام دے

ہی نہیں سکتی پھرایسی بے عقل کو پڑھانے کا فائدہ ہی کیا۔

ازل سے ہی عورت کا حال بڑا دردناک رہا ہے۔ بیٹی کو پیدا ہوتے سے ہی گاڑ دیتے تھے۔ بعد میں خاندان کے مفاد کے لئے لڑکیوں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ جانوروں کی طرح بیٹیوں کی بھی بولی لگتی تھی۔ اور اونچی رقم دینے والوں کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی تھی۔ جو لڑکی بچ جاتی تھی اسے باپ کے گھر میں بہت محنت ومشقت کرنا پڑتی تھی۔ اسے سب کے آخر پر بچا کچھا کھانا ملتا تھا۔ ان مظلوموں کے آنسوؤں کا افسانہ سننے والا کوئی نہ تھا۔ عورتوں کے لئے نہ کوئی مصنف تھا۔ اور نہ ہی عدالت گاہ۔ گھر کے مرد جو سزا تجویز کرتے تھے وہی حق سمجھی جاتی تھی۔ میں نے قدیمی احمقانہ رویہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ستی کرنا ہمارے رواج میں نہ تھا۔ ملک مصر میں بادشاہوں کے ساتھ ان کی زندہ رانیاں۔ مہارانیاں نوکرانیاں اور نوکر مع سازوسامان کے دفن کئے جاتے تھے۔ تاکہ دوسرے جہاں میں بھی وہ سب مل کر بادشاہوں کی خدمت بجالائیں۔ ہندوستان میں مردے جلانے کا رواج تھا۔ سو بدھواؤں کو شوہر کی چتا پر بٹھا کر جلایا جانے لگا۔ راجستھان بنگال اور مشرقی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں عورتیں ستی کی جانے لگیں۔ کچھ قوموں اور علاقوں میں یہ پرتھا بالکل ہی نہیں تھی۔ مغل بادشاہوں نے اس پرتھا کو روکنے کی کوشش تو کی مگر ناکام رہے۔ پھر 1829 میں راجا رام موہن رائے نے اس پرتھا کو بند کیا۔ ختم تو وہ بھی نہ کر سکے۔ ہاں کم ضرور ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

جب 1929 میں راجستھان کے گاؤں میں لڑکی ستی ہوئی تو اس کے رشتے داروں اور گاؤں والوں نے اس کے اس فعل کو خوب سراہا۔ 1998 میں جب ایک عورت اپنے شوہر کی چتا پر گر گئی تو کسی نے اسے نہیں سراہا اور سب نے اسے خودکشی کہا۔ ستی نہیں۔

ستی ہونے والی لڑکی کا بہت بڑا احترام ہوتا تھا۔ اس کے ستی ہونے پر اس کی یاد میں یادگاہ بنائی جاتی تھی۔ سنا ہے کچھ مرد بھی اپنی بیویوں کی چتا پر ستی ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بیٹوں کی چتا پر ستی ہو جاتی تھیں۔

نیلم بولی ...... ان دنوں میں لڑکی کا بیاہ بہت ہی کم عمر میں کر دیا جاتا تھا۔ علاج کم تھے بیماریاں زیادہ۔ بدھواؤں کی دوسری شادی نہیں کی جاتی تھی۔ اگر ستی نہ کرتے تو لڑکی کو کولھو کے بیل کی طرح کھٹاتے اور جب وہ کام کرتے کرتے کمزور اور لاغر ہو جاتی تو نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔

میں نے کہا ان کمزور اور لاغر عورتوں کا بڑا برا حشر کرتے تھے۔ جب میرے تیس سالہ ماموں کی شادی ہوئی تو میں چھوٹا تھا۔ شاید دس سال کا ہوں گا۔ میری نئی مامی یا تو میری ہم عمر تھیں یا شاید ایک سال چھوٹی تھیں۔ نئی دلہن اور دلہا کے سواگت کی بڑی دھوم دھام سے تیاریاں کی گئی تھیں مگر جب دلہن اپنی سسرال پہنچی تو وہ گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی جب وہ اٹھ کر چلنے کے قابل نہ ہوئیں۔ تو میری اماں نے کہا۔ بچی ہے۔ چھوڑ دو اسے۔ اتنی چھوٹی بچی دنیا کے ریت رواج کیا سمجھے گی۔ انہیں گود میں اٹھا کر اندر لے جایا گیا تھا۔ دوسرے دن ان کے کمرے سے زور زور سے رونے کی آوازیں سن کر جب اماں ان کے کمرے گئیں تو وہ بھاگنے کو تیار کھڑی تھیں۔ رو رو کر مجھے بولیں مجھے اپنی اماں کے پاس جانا ہے۔ جب کسی سے نہیں سنبھلیں تو اماں نے مجھے اندر بھیجا۔ مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں اور اپنی جھولی میں سے گڑیا نکال کر بولیں۔ بابو دادا۔ میری گڑیا کی بھی تو پچھلے ہفتے میں نے شادی کی تھی۔ وہ تو میرے پاس ہے۔ پھر میری اماں

نے مجھے اپنے سے اتنی دور کیوں بھیجا ہے۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کھانے کی تھالی آگے بڑھا کر کہا۔ تم بھوکی ہوں گی کچھ کھالو۔ تو بولی...... مجھے پیڑ سے آم توڑ کر کھانا ہیں اور جھولا بھی جھولنا ہے۔ چلو ہم دونوں کھیلتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک دم خوشی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

اماں بتاتی تھیں کہ جلد ہی انہوں نے سارے ریتی رواج سیکھ لئے۔ ان پڑھ تھیں مگر تھیں بہت سمجھدار اور سلیقہ مند۔ بڑوں کو عزت اور چھوٹوں کو پیار کرنے والی۔ کمال کا کھانا پکاتی تھیں۔ سارا پریوار ان کا گرویدہ ہوگیا تھا بھئی گرویدہ تو ہونا ہی تھا تھیں بھی تو میری نانی جی کے لاڈلے کماؤ پوت کی لاڈلی بیوی...... وہ مثال درست ہی ہے جس کا ہنڈیا ڈوئی اس کا سب کوئی......

میرے ماموں جان ان پر جان چھڑکتے تھے۔ بے حد خوبصورت اور سشیل تھیں۔ جیسی صورت ویسی ہی دلکش سیرت والی۔ وہ تھیں بھی چاہے جانے کے لائق۔ ہم سب ملتے تھے خوب جمتی تھی۔ میرے ماموں جان جیسے خوش دل۔ خوش لباس لوگ کم ہی ہوتے تھے۔ وکیل تھے خوب کماتے بھی تھے۔ نہ جانے کس کی نظر بد نے انہیں کھالیا۔ ماموں کی موت کا مجھے بے حد دکھ ہوا تھا۔ میری تو ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ برسوں بعد ہی جب گھر لوٹا تو اماں سے مامی کا حال پوچھا تو اماں رو پڑیں۔ میں نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔ کہ جوان بھائی کی موت کا غم بڑا بھاری ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔

میں اپنی ماں کے ساتھ مندر کمبل بانٹنے گیا تھا۔ مندر کے سامنے قطار میں بیٹھی بدھوائیں رام نام جپ رہی تھیں۔ میں جھک کر کمبل دے رہا تھا۔ اور اماں سے بات بھی کر رہا تھا۔ آخر میں وہ میری بات سن کر چونکی تھیں۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور پھر میرے ساتھ کھڑی ماں کی طرف نظریں اٹھائیں اور اپنے آگے بڑھے ہاتھ پیچھے کر لئے۔ میں رک کر انتظار کر رہا تھا کہ وہ ہاتھ بڑھائیں۔ میری اماں نے جھک کر انہیں دیکھا اور پھر اماں وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی روتی رہیں۔ میں دیکھ کر سخت حیران تھا کہ آخر اس لمبے سے گھونگھٹ میں کون ہوسکتا ہے جو میری ماں اس حد تک افسردہ ہیں۔ ان دنوں میں بدھوا عورت اپنا منھ ڈھانک کر رہتی تھی کہ بدھوا کی صورت منحوس سمجھی جاتی تھی۔ اماں بے بسی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے بولیں کیشو کی بیگم جی ہے۔ تیری مامی۔ کچھ دیر تو میں ہکا بکا سا کھڑا دیکھتا ہی رہا پھر میں نے جھک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ میں تب بھی انہیں پہچان نہیں سکا۔ وہ بولیں۔ بابو دادا۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں آپ کی آواز پہچان گئی تھی۔ آپ بھی مجھے بھول گئے سب رشتے داروں کی طرح...... وہ آم کا باغ۔ وہ جھولا۔ وہ لڑنا جھگڑنا...... وہ بچپن کے دن بھی کتنے پیارے تھے سب کہتے تھے نئی دلہن کی مسکان بڑی میٹھی ہے۔ وہی میٹھی میٹھی مسکان ان کے چہرے پر ابھری۔ بھلے ہی وہ مجھ سے عمر میں چھوٹی تھیں میں نے ان کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے فوراً ہی جھک کر ان کے چرنوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ رشتے میں مجھ سے بڑی تھیں رشتے کا مان تو رکھنا ہی تھا...... میرے ماموں بڑے شوقین اور دلدار تھے۔ وہ مامی کو بیگم جی ہی پکارتے تھے۔ اپنے پیارے ماموں جان کی چہیتی لاڈلی بیگم جی کو بھکارن کی روپ میں دیکھ کر میرے دل و دماغ کا عجب حال ہو رہا تھا۔ دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا یا پھر یقین کرنے کو دل کسی حال راضی نہیں ہو رہا تھا۔ بڑا زعم تھا ہمیں اپنی ننھال پر۔ یقین کرتا تو اونچے برہمن پریوار سے ہونے کا بھرم ہی ٹوٹ جاتا۔ سننا جھٹلایا جاسکتا ہے مگر آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سارا بھرم

چور چور ہو گیا۔

میں انہیں ان کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ مگر تب کی بات ہی اور تھی۔ اس زمانے میں ہم دونوں کم عمر اور کم عقل تھے۔ نہ رشتوں کی پہچان تھیں۔ اور نا ہی دنیاداری کی سمجھ بوجھ۔ بچپن کے کئی منظر میری آنکھوں میں آسمائے تھے۔ وہ اب بھی روئے جا رہی تھیں۔ میں کش مکش میں تھا کیا بولوں۔ وہی ہمیشہ کی طرح۔ پارو کی بچی۔ رونا بند کر۔ میں سوچ سکا کہہ نہ سکا۔ اماں ان کے ٹھکانے کا اتا پتا پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے بے یقینی بھرے لہجے میں کہا۔ کیا آپ چلیں گی میرے گھر۔ میں نے کہاں ضرور چلیں گے۔ وہ بولیں آج تک کوئی میرا اپنا مجھے ڈھونڈنے نہیں آیا۔ دکھ اور بے اعتباری ان کے حرف حرف سے ٹپک رہی تھی۔ فوراً انہوں نے لمبا گھونگھٹ اپنے چہرے پر ڈالا اور آگے بڑھ گئیں۔ میں اور اماں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ مڑ مڑ کر ہم دونوں کو دیکھتی رہیں۔ ان کے بدن کے ساتھ ساتھ شاید ان کی دماغی حالت بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ ہماری یہ اچانک ملاقات اور ہمارا ان کے گھر جانا شاید ان کے لئے ناقابل یقین تھا۔ محبت ایک یقین اور ایک اعتبار ہوتا ہے۔ ایک مدت سے جس نے محبت کے دو لفظ نہ سنے ہوں وہ کس طرح کسی کے کہے الفاظ پر یقین کر سکتا ہے۔ محبت کی کمی سے ہی انسان کے اندر یقین اور اعتبار کی دیواریں گر جاتی ہیں۔

شام ڈھلنے والی تھی۔ اندھکار چھانے لگا تھا۔ مندر کے پیچھے ہی ایک چوکور احاطے میں کئی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی تھیں۔ بیچ دالان میں ایک ہینڈ پمپ تھا۔ وہ کونے والی کوٹھری کے سامنے رکیں۔ اپنے آنچل سے بندھی چابی سے تالا کھولا۔ اندر کا حلیہ دیکھ میں حق دق تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مٹی کے تیل کی کپّی جلائی۔ مدھم سی روشنی نے کوٹھری میں اجالا کر دیا۔ وہ تو کال کوٹھری سے بھی بدتر تھی۔ ایک کونے میں سونے کے لئے چٹائی۔ دوسرے کونے میں پانی کا چھوٹا سا مٹی کا گھڑا۔ پاس میں ایک ایلونیم کی تھالی اور ایک گلاس۔ کچھ دور پر ایک پرانی دھرانی ٹوٹی پھوٹی بالٹی۔ اس دھیمی روشنی میں اگر کچھ اور بھی تھا تو مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں اس درجہ شرمسار تھا کہ کچھ دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اماں بھی سن سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ شرم وحیا کے بوجھ سے ہم دونوں کے سر جھک گئے تھے۔ میرے ماموں جان کی چہیتی بیگم جی کو یوں خاک بسر کرتے دیکھ میرا تن من سلگ اٹھا تھا۔ دل میں شرارے سے اٹھنے لگے تھے۔ میں جاننا چاہتا تھا کس نے ایک مسکین اور ناتواں کے ساتھ یہ بدسلوکی کی ہے۔ ان بے دردوں کے خلاف قانونی کاروائی کرنا چاہیئے۔

میری اماں اور وہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔ اور میں اپنی اماں کے دل کی پریشانی اور الجھن سمجھ رہا تھا۔ وہ ذہنی اور قلبی کرب میں مبتلا بے بسی سے ہاتھ رگڑے جا رہی تھیں۔ مامی کھڑی کانپ رہی تھیں۔ پھر ان کے پاؤں میں لرزش ہوئی۔ ان دونوں کی مجبوریاں۔ دکھ اور درد دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔

میں نے اماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دینی چاہی۔ مامی کو سہارے کی ضرورت تھی۔ سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر میں نے ان کے بکھرے بکھرے لرزتے وجود کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر کہا۔ جو خطا اماں کے بزرگوں نے کی اس کا ازالہ اماں کے بیٹے کریں گے۔ جلتے ہوئے دل پر یقین کی ٹھنڈی پھوار برسی تو وہ ذرا سنبھلیں۔ ان کا ہاتھ تھام کر میں آگے بڑھا۔ چلئے اماں میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔

کسی کو اعتماد دینا آسان کام نہیں ہوتا اور خاص طور سے ایک ایسی شکستہ حال بے سایہ عورت کو جس نے اپنوں کے ہاتھوں دھوکا کھایا تھا۔ اسی پریوار کی میری اماں بھی تو تھیں تو پھر وہ کیسے یقین کر لیتیں۔ وہ ہل کر نہ دیں اور اپنا ہاتھ

چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔اماں کے چہرے کا رنگ بھی بدلا۔یک بیگ وہ فکر مند نظر آنے لگیں۔
میرے فادر کے حکم کے بغیر تو گھر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔وہ بولیں۔بابو جی۔وہ میرے فادر کو بابو جی کہتی تھیں۔میں کس بوتے پر اپنا یہ گھر چھوڑ دوں۔میں نے کہا آپ بابو جی کے نہیں اپنی نند کے گھر جا رہی ہیں۔تب اماں کی بھی ہمت بندھی بولیں۔پارو جو دکھ تمہیں میرے اپنوں نے دیے ہیں ان کی دوا اب میرے بیٹے کریں گے۔انہوں نے میری طرف پر یقین نظروں سے دیکھا مگر چہرے پر اب بھی اداسی اور ویرانی کے سایے باقی تھے۔اماں بولیں۔جب جب میں نے تمہارے بارے میں بڑی بھابھی سے پوچھا انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیا۔جھوٹ بولنا دشوار نہیں ہوتا مگر جھوٹ نبھانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔میں شرمندہ ہوں کہ میرے اپنوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر کی لاج وعزت کو سڑک پر لا بٹھایا۔جو ہو چکا اسے مٹایا تو نہیں جا سکتا مگر اسے بھلانے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ہو سکے تو اس حادثے کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔اب میرے باپ کے پریوار کی عزت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔وہ بولیں۔آپ کے بھائی کی موت کے بعد میں ان سب کے لئے غیر ہو گئی تھی مگر وہ پریوار میرا بھی ہے اور مجھے اپنے پریوار کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔یقین کریں یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں کس خاندان کی ہوں۔
میرے فادر اپنی زندگی بھر کا سارا اثاثہ برما میں لٹا کر خالی ہاتھ صرف جان بچا کر ہندوستان لوٹے تھے۔ساری شان وشوکت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔اور اب ہم ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے۔میں نے دروازہ پر دستک دی تو چھوٹی بہن ہاتھ میں لال ٹین لے کر دروازہ کھولنے آئی۔مامی کو دیکھتے ہی پر مسرت لہجے میں سوال کیا۔کیا نوکرانی لائی ہو۔مجھے کام وام کرنے کی عادت نہیں۔برتن اور کپڑے دھو دھو کر میرے ہاتھ زخمی ہو گئے ہیں۔میں نے کہا......راستہ تو دو ہمیں اندر تو آنے دو۔
اس زمانے میں عورتیں گھر کے مردوں کے سامنے نہیں آتی تھیں سو مامی کو پیچھے کے دراںڈے میں بٹھایا گیا۔بدھوائیں رات میں کھانا نہیں کھاتیں۔سو انہیں دودھ اور پھل کھلائے گئے۔انہوں نے چائے کی فرمائش کی فوراً ملنے پر خوشی سے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
رات سب سو چکے تھے۔میرے دماغ میں وہی سوال گونج رہا تھا۔یہ کیسے اور کیونکر ہوا۔میں نے انہیں بیٹھے دیکھا تو آہستہ آہستہ دبے پاؤں ان کے پاس جا پہنچا۔وہ مجھے دیکھ کر گھبرائی نہیں ہولے سے مسکرائیں۔میں کچھ فاصلے پر چٹائی پر بیٹھ گیا۔وہ کتاب بند کر کے بولیں۔میرے آنے سے آپ سب کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔میں نے کہا اضافہ......کیسا......اضافہ......اپنوں کے آنے سے پریشانیاں کم ہوتی ہیں بڑھتی نہیں۔آپ میرے سب سے پیارے ماموں جان کی لاڈلی بیگم جی ہیں۔ان کی آنکھیں یوں چمکیں جیسے غیر متوقع طور پر کوئی خزانہ مل گیا ہو۔آپ پورے حق سے اس میں گھر رہیئے۔مہمان کی طرح نہیں نا ہی غیر کی طرح۔جیسے اور سب رہتے ہیں۔ان کی طرح۔ان کی چمکتی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ڈھلکے تو میں نے کہا اب آپ کے رونے کے دن ختم ہو چکے ہیں۔اور آنسو نہیں۔میں نے فوراً سوال کیا۔وہ کون سخت دل شخص تھا جس نے آپ کو دوزخ کی آگ میں جھونک ڈالا تھا۔وہ بولیں ایک ہوتا تو نام بتاؤں سب کا یہی فیصلہ تھا۔میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا......لیکن کیوں......وہ بولیں کیونکہ مصیبتوں میں گھری عورت اپنے آپ کو ہمیشہ تنہا ہی پاتی ہے۔مردوں کی اس دنیا میں مجبور بے سایہ عورت کو کوئی سہارا نہیں دیتا۔بانجھ عورت دنیا کی سب سے

غریب اور منحوس عورت ہوتی ہے۔ باپ اور بھائی لاپتہ تھے۔ ڈھاکہ سے کوئی خبر ہی نہیں آتی تھی۔ پھر خدا نے سر سے شوہر کا سایہ بھی چھین لیا۔ ایک بیٹی ہی ہوتی۔ دور ہی ہوتی۔ ہوتی تو۔ میری ہم راز اور غمگسار۔ عورت ہو یا مرد سب کی فطرت سدا ایسی رہی ہے کہ مجبور اور بے سہارا عورت کو اپنے قابو میں رکھو۔ مجبور عورت پر نہ مرد مہربان ہوتا ہے نا ہی عورت ترس کھاتی ہے۔ سب اسے اپنی کنیز سمجھتے ہیں۔ اپنی زر خرید جائیداد۔

جب تک وہ تھے مجھے کوئی ڈر کوئی خطرہ نہ تھا۔ ان کی رحلت کے بعد مجھے اپنا آپا غیر محفوظ سا لگنے لگا تھا۔ ایک پل میں ہی ساری خوشیوں پر گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ وہ بڑی اداسی بھری شام تھی جب میں تنہا اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھی تھی۔ میرے لئے پورا گھر اجڑا بکھرا اور ٹوٹا پھوٹا ہو گیا تھا۔ ان کے آنسو میرے دل پر گھاؤ ڈال رہے تھے۔ میں نے کہا کسی نے آپ کا دکھ نہیں بانٹا۔ آپ کو تسلی نہیں دی۔ وہ بولیں۔ تسلی۔ ارے تسلی تو انسانوں کو دی جاتی ہے۔ عورتوں کی گنتی تو ڈھور ڈنگروں میں ہوتی تھی۔ میری قدر تو ان ڈنگروں سے بھی کم تھی۔ بدھوا۔ بانجھ عورت جو تھی۔ اندنوں۔ بیٹوں کی مائیں گھر میں حکومت کرتی تھیں۔ بیٹے اپنی ساری کمائی ماں کی ہتھیلی پر رکھتے تھے۔ میرے پاس نہ کوئی سہارا تھا نہ دولت۔

کئی دن اور کئی رات میں تنہا تڑپتی رہی۔ جب سارے رسم ورواج پورے ہو گئے اور لوگوں کا آنا جانا ختم ہو گیا تو ایک دن بڑی بھابھی نے دروازے پر تنک کر کہا۔ پارو۔ کب تک سوگ مناتی رہے گی۔ زندگی رونے دھونے سے نہیں گذرتی، دیور جی کی کمائی ان کے ساتھ گئی۔ آج برتن دھونے والی نہیں آئی اور اب آئے گی بھی نہیں۔ میں اکیلا کتنا سنبھالوں گی۔ ان کے لہجے نے مجھے تھرا دیا۔ وہ بہت تنگ مزاج تھیں۔ سارے خاندان میں مشہور تھیں کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں اس کے بعد گھر کے سارے قانون بدل گئے۔ سب ہی مجھے حکم پر حکم۔ حکم پر حکم دیتے گئے۔ میں سب کی فرمائشیں پوری کرتی گئی۔ مجھے یہ بھرم تھا کہ جب تک میرے دونوں ہاتھ سلامت ہیں اور میرے جسم میں ان سب کے حکم بجالانے کی طاقت ہے میں اس گھر کی چھت کے سایہ میں محفوظ رہوں گی۔ دن کام میں گذر جاتا تھا۔ رات گذارنی مشکل ہو جاتی تھی۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے میں اٹھتی تھی اور رات کو سب کے سونے کے بعد ہی مجھے لیٹنا نصیب ہوتا تھا۔

ایک دن سر میں تیز درد ہونے کی وجہ سے میں اٹھ نہ سکی۔ کوئی میرا حال تک پوچھنے نا آیا۔ بھابھی کی آواز آئی۔ یہاں سستی اور کاہلی نہیں چلے گی۔ زندہ ہے یا مر گئی۔ تو نے تو کھٹیا ہی پکڑ لی۔ جس گھر میں محبتوں کا جادو پھیلا رہتا تھا۔ یکا یک ویران سا ہو گیا تھا۔ پھر اماں بولیں۔ ارے اس کے سر پر سے مصیبتوں کا سیلاب گذرا ہے۔ کیوں ہمیشہ زبان سے آگ ہی برساتی رہتی ہے۔ رحم کر اس بے بس پر۔ دکھی ہے۔ اس پر ظلم نہ کر۔ دکھ سے بیچاری نچڑ کر رہ گئی ہے۔ صورت تو دیکھ اس کی۔ مردنی چھا گئی ہے صورت پر۔ دن بھر بیل کی طرح کھٹ کھٹ کر۔ ذرا تو اسے سنبھلنے دے جب اچھی ہو جائے گی خود ہی کام پر لگ جائے گی۔ اماں میری ڈھال تھیں پھر وہ ڈھال بھی نہ رہی۔

ساس سسر کی موت کے بعد بھابھی کے مزاج میں سختی اور بڑھ گئی۔ میں ہر وقت اسی پریشانی کے عالم میں رہتی تھی کہ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ پھر سب کچھ غلط ہی ہونے لگا۔ میں کچھ بھی صحیح طریقے سے نہیں کر سکتی تھی۔ نفرت کرنے والوں کے درمیان انسان جی نہیں سکتا۔ میری ساس یعنی آپ کی نانی جی بہت رحم دل اور نرم گفتار عورت تھیں۔ وہ ہمیشہ میری طرفداری کرتی تھیں۔ اگر وہ زندہ رہتیں تو میرا یہ حشر کبھی نہ ہوتا۔ زندہ رہنے کے لئے جیسے ہوا۔ پانی اور روشنی کی

ضرورت ہوتی ہے اسی طرح محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ سب کی محبت پا کر ان چند ہی گھنٹوں میں بالکل بدل گئی ہوں۔ آپ سب کے پیار اور توجہ نے ہی تو میرے مردہ وجود کو نئی طاقت نئی زندگی بخشی ہے۔ محبت ایک یقین اور ایک اعتبار ہوتی ہے۔ کوئی پیار کے دو بول بولنے والا نہ ہو تو انسان کے اندر یقین اور اعتماد کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ بنیاد ہلنے پر تو بڑی سے بڑی مضبوط عمارت ڈھے جاتی ہے۔ پھر مجھ جیسی بے سہارا۔ لاوارث اور کمزور عورت کب تک اپنے کو سنبھال رکھتی۔ اپنی ساری کوششوں کے باوجود بھی میں ہارنے لگی تھی۔ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی تھی۔

میں اسی گمان میں رہی کہ ان لوگوں کی الگ الگ فرمائش پوری کرنے میں انہیں اپنا اتنا عادی کرلوں گی کہ یہ لوگ میرے بنا رہ ہی نہیں پائیں گے۔ ہر گام پر مجھے ہی پکاریں گے۔ میری محنت اور مشقت دیکھ کر ان کے دلوں میں کچھ نرمی تو آئے گی ہی اور ان کی نظروں میں میری قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔ مگر افسوس۔ میری یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔ میں محنت کرتی گئی۔ دل و جان سے ان لوگوں کی خدمت کرتی گئی اور وہ بے رحم لوگ مجھے پاؤں تلے روندتے چلے گئے۔

ایک دن بخار ہونے کی وجہ سے میں صبح اٹھ نہ سکی۔ سارے گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔ چھوٹا نہ بڑا کوئی بھی میرا حال پوچھنے نہیں آیا۔ بھابھی کی کڑک آواز آئی۔ کب تک کھٹیا توڑتی رہے گی۔ گھر کا کام کیا تیری ماں آ کر کرے گی۔ ان کے کوسنے تو دن رات سنتی تھی۔ مگر ان کا یہ زہر میں ڈوبا نشتر میرے دل میں ہی پیوست ہو گیا تھا۔ ماں کی یاد نے دل کا کونہ کونہ لرزا دیا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرا پریوار صحیح سلامت ہے بھی یا نہیں۔ اگر سلامت ہے تو کہاں بھٹک رہا ہے۔ ہندوستان میں یا پاکستان میں۔ ڈھاکہ سے کوئی خبر ہی نہیں ملتی تھی۔ دل ایسا ڈوبا کہ پھر سنبھل ہی نہ سکا۔ میرے اندر کی رہی سہی طاقت بھی شل ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بھوکی پیاسی کسی بنجر ویرانے میں تنہا بھٹک رہی ہوں اور دور دور تک اس تپتے صحرا میں میرا کوئی ہمدرد اور مددگار نہیں ہے۔ دیدی نے میری روح کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ دکھ سے بھرا لہجہ تھا اس کا۔

پریوار کا ہر چھوٹا بڑا مجھے زخمی کرتا رہا اور میں صرف دو روٹی اور سر پر چھت کی خاطر ان لوگوں کی نفرتوں کے وار سہتی رہی۔ مجھے یہ تو یقین ہو چلا تھا کہ میری ساری محنت اور ریاضت اکارت ہو گئی تھی اور یہ لوگ بدلنے والے نہیں۔ سارے پریوار کی ذمہ داری میرے سر کر دی گئی تھی مگر افسوس میرا کوئی ذمہ دار نہیں تھا۔ اس دن کے بعد میری بے کلی اور بڑھ گئی تھی۔ سوچتی رہتی اگر میرا کمزور اور نحیف جسم یہ ساری ذمہ داریاں نہ اٹھا سکے گا تب میرا کیا حشر ہوگا۔ ماضی اور حال اس قدر بھیانک تھا۔ مستقبل کی ہولناکی کا خیال ہی مجھے تھرا دیتا۔ خوف۔ دہشت۔ گھبراہٹ جیسے بے شمار جذبوں نے ایک ساتھ میرے کمزور وجود پر حملہ کر ڈالا۔ میں خوف کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی کہ دیدی کی آواز سنتی تو کانپ جاتی۔ دروازے پر آہٹ ہوتی تو ڈر جاتی۔

خلاف توقع دیدی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر میرا دم اٹک گیا تھا۔ میرے قریب آ کر نہایت نرمی سے بولیں میں مندر جا رہی ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو۔ ان کی آواز کی نرمی نے مجھے باور کر دیا کہ میری محنت کام کر گئی دیر سے ہی سہی۔ میرے جسم کے خون کا آخری قطرہ نچوڑنے کے بعد ہی سہی۔ یہ بدلی تو۔ میرا دل خوش ہو گیا۔

آخر ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک باندی کی طرح اس پورے پریوار کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جب میرا بدن بالکل کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ ہڈی ہڈی رہ گئی تھی تب ان سب طاقتوروں کی نظروں میں میرے دھان پان جیسے بدن کا بوجھ

بھاری لگنے لگا۔ میری ہڈیوں کے پنجر کا بوجھ اتارنے کے لئے وہ میرے مرنے کے دن تک کا بھی انتظار نہ کر سکے۔ میری موت سے پہلے ہی مندر لے جانے کے بہانے میرے لاغر جسم سے نجات حاصل کر لی۔

مندر سے باہر نکلی تو دیدی کو اپنے قریب نہ پا کر میں بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میری نظریں دیدی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک بے حد ڈراؤنے کیم شحیم آدمی نے میرے قریب آ کر کہا۔ میرے ساتھ آؤ تمہاری دیدی تمہیں بلا رہی ہیں۔ اس کے لہجے کی سختی نے میرے ناتواں بدن کو لرزا دیا تھا۔ بنا چوں چرا کئے میں اس کے پیچھے ہولی۔ پچاس روپے تھما کر وہ شخص غائب ہو گیا تھا۔

کچھ پل میں نے دیدی کی راہ دیکھی جب وہ نہیں آئیں تو دہشت اور گھبراہٹ کی شدت سے میں تھر تھر کانپ اٹھی تھی۔ ایک ہیبت ناک اندھکار اور ہولناک سناٹا میرے اندر چھا گیا تھا۔ باہر سورج کے ڈوب جانے سے زمین پر بھی چار سو سیاہ گھور اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس گھور اندھیرے کو دیکھتی رہی اور دیدی کو پکارتی چل گئی۔ خوف کی شدت سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

حالانکہ اعتماد اور بھروسے کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے پھر بھی سناٹوں کے خوفناک صحرا میں مجھے وہ سب یاد آنے لگے جن کی فرمائش پوری کرتے کرتے میرا دن بیت جاتا تھا۔ اس آنگن کی یاد رلانے لگی۔ جہاں ایک دن میری ڈولی اتری تھی۔ وہ مٹی کا چولہا، دھوئیں سے کالی دیوار، وہ آم کا باغ، وہ جھولا، وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو کبھی میرا تھا ہی نہیں۔ میں ان کے ساتھ کے لئے تڑپ رہی تھی۔ جنہوں نے مجھے کبھی چاہا ہی نہیں تھا۔ کبھی میری ذرا سی پروا بھی نہیں کی تھی۔ جنہوں نے میری اچھائیوں کا کیا خوب صلہ دیا تھا۔

ان سب کو نہ یاد کرتی تو کسے یاد کرتی۔ ان کے سوائے اس بھری دنیا میں میرا اور کوئی تھا بھی تو نہیں۔ وہی سب تو میرے اپنے تھے۔ اور اپنوں سے بچھڑنا عذاب اور ان سے دوری قیامت ہوتی ہے۔ وہ شام میری زندگی کی سب سے بے رحم شام تھی۔ اور تنہائی کی وہ پہلی رات اس سنسان وحشت کے صحرا میں سب سے خوفناک رات۔ شدت خوف سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ شاید میں بیہوش ہو گئی تھی۔

کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو مجھے لگا کہ کوئی نیا خواب دیکھ رہی ہوں ذرا ہوش سنبھلے تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نئی صبح تھی مگر حقیقت نہایت ہی خوف ناک تھی۔ میری ہی جیسی سفید پوش عورتیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔

ان سب کا اجڑا اجڑا سا حلیہ۔ کمزور لاغر بے جان سے بدن، مایوس، مایوس ویران ویران سے زرد چہرے اور اداس اداس سی مردنی چھائی آنکھیں اعلان کر رہی تھیں۔ جیسے وہ سب کی سب مثلِ مردہ تھیں۔ ان کے اندر زندگی کا احساس مر چکا تھا۔ اور ان کے دل و دماغ دونوں ہی ہر خیال اور ہر احساس سے خالی ہو چکے تھے۔ ایک میری ہی نہیں وہاں تو ہر آنکھ آنسوؤں سے بھری تھی۔

کچھ تو بیچاری افلاس کی ماری تھیں اور کچھ لاوارث۔ اور باقی کی کہانیاں میری جیسی ہی تھیں۔ ان کے پریوار کے بے حس۔ بے رحم اور خود غرض مردوں نے انہیں گھر سے نکال کر بے سہارا کر کے۔ جیتی جاگتی عورتوں کے اس شمشان گھاٹ میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ جہاں سائیں سائیں کرتا سناٹا ہو۔ تاریکی اور اداسی، تنہائی اور آنسو ہی آنسو ہوں اور زندگی کی ذرا سی بھی رمق نہ ہو وہی مقام تو شمشان گھاٹ کہلاتا ہے۔

اس چاردیواری کے باہر والے ہر شمشان گھاٹ میں لکڑی، آگ، شعلے، دھواں اور نوحہ گر تو ہوتے ہیں مگر زندہ عورتوں کے اس شمشان گھاٹ میں نہ آگ ہے نہ شعلے، بس دھواں ہے۔ درد کا دھواں، دکھ اور غموں کا دھواں، وہاں ہر عورت چنگاری کی طرح آہستہ آہستہ سلگتی رہتی ہے اور جب راکھ ہو جاتی ہے تو اس کے اپنوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اس کے لئے نہ کوئی دو آنسو بہاتا اور نہ ہی کوئی اس کی راکھ بٹورنے آتا ہے بے نام، گمنام اس دنیا سے چلی جاتی ہے۔

سانس بند ہوتے ہی کوٹھری سے ایک میت اٹھتی ہے اور دوسرے ہی دن جیتی جاگتی میت آجاتی ہے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ کیونکہ مردوں کے بنائے قانون بدلے ہی نہیں جاسکتے۔

جب ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ آس کے سارے پرندے اڑ چکے تھے۔ میرے اندر جینے کی امنگ دم توڑ چکی تھی۔ میں اس درجہ پست ہو چکی تھی کہ خود اپنی ذات سے بے خبر ہو گئی تھی۔ صبر کر چکی تھی کہ اب یہاں ہی مرنا ہوگا تب آپ اور دیدی زندگی کا ایک نیا پیغام لے کر آگئے۔ اور میرا سخت رنج راحت میں بدل گیا۔ مجھے اس نیستی کے گڈھ سے رہائی دلوا کر آپ نے میری جان پر بڑا کرم کیا ہے۔ رات تو کسی طرح ڈھل جاتی تھی۔ مگر دن کاٹنا دشوار ہو جاتا تھا۔ کسی کے سامنے ہاتھ پسارنا آسان تو نہیں ہوتا۔

وہ رک رک کر بول رہی تھیں۔ آخری الفاظ کہتے کہتے ان کے لہجے میں ان کے اندر کا گہرا درد اور دکھ چھلک اٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی۔ اور ان کے زرد چہرے پر ویرانی ہی ویرانی بکھری تھی۔ ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ میں ان کی بدلتی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں پانی کا گلاس تھمایا۔ اور ہمدردی بھرے لہجے میں دلاسا دیا۔ آپ نے اتنی سی چھوٹی عمر میں اتنے بڑے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ اب وہ سب بھول کر خوش رہنے کی کوشش کریئے۔ آئندہ آپ کو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پسارنے ہوں گے۔ جو دوسروں پر ظلم ڈھاتا ہے وہ اپنے کیئے کی سزا ضرور پاتا ہے۔ وہ بولیں ان کے دیئے دکھ کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔ حالانکہ ان لوگوں کی وجہ سے ایک لمبا عرصہ بڑی اذیت میں گذارا ہے پھر بھی میں ان کی بھلائی چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ غیر ہی سمجھا۔ مجھے کبھی اپنا نہیں مانا مگر وہی سب میرے اپنے تھے۔ اور اپنوں سے کیا ناراضگی۔ میرے دل میں ان کے خلاف کوئی غصہ نہیں ہے۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہ تو پورا ہونا ہی تھا۔ میں نے انہیں معاف کیا۔ بھگوان نہ کرے کوئی دکھ انہیں چھو بھی سکے۔ میری دعا ہے ان پر کبھی کوئی بلا نازل نہ ہو۔ میں ان کے مزاج کا ٹھہراؤ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

میں نے کہا کسی مجبور انسان کو اندھیروں میں ڈھکیل دینا ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ جب کوئی کسی کو غارت کرتا ہے پھر وہ بھی غارت کیا جاتا ہے۔ وہ بولی...... نانا...... بابو دادا...... ایسا نا بولو...... میں چاہتی ہوں وہ سب خوش رہیں۔ انسان اس دنیا میں پیار کرنے آتا ہے۔ نفرت نہیں۔ دیدی کی آنکھوں میں ہمیشہ ہی میرے لئے نفرت تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے کبھی اتنی شدید نفرت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس جگہ دوبارہ جانے کا خیال ہی میرے لئے بہت خوفناک ہے۔ اس سانحے نے مجھے انتہائی دہشت زدہ کر دیا ہے۔ اگر دیدی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر کرے گی۔ میں نفرت کی آگ اور نہیں سہہ سکوں گی۔ میں نے کہا وہ ڈر اب آپ اپنے دل سے نکال دیں۔ ایسا اب کبھی نہیں ہوگا اور نہ ہی میں ایسا ہونے دوں گا۔

دل سے وہ ڈر نکالنا ہی تو میرے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ آپ یہ نہ سوچنا کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں۔ آپ سب

پر پورا بھروسہ ہے۔ مگر مجھے اپنے نصیبے پر بھروسہ نہیں۔ بڑی بری تقدیر ہے میری۔ میں اندر سے اس بری طرح زخمی ہو چکی ہوں کہ اتنی جلدی اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ گھاؤ بھرنے میں اور درد کم ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ آواز دھیمی تھی لیکن یقین اور اعتبار سے معمور لہجہ تھا۔

مجھے بچپن کا گذرا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ انہیں ان کے ذہنی دباؤ سے نکالنے اور انہیں سنبھالنے کی غرض سے میں نے وہی پرانے دوستانہ لہجے میں کہا۔ پارو سارے رشتے ناطوں سے پیارا ایک رشتہ اور ہوتا ہے۔ دوستی کا رشتہ۔ یہ نہ بھولو کہ ہم دونوں کی دوستی بہت پرانی ہے۔ یاد کرو اپنی سسرال کی وہ پہلی صبح جب تم زور زور سے رو رہی تھیں اور تم کو چپ کرانے کے لئے میں نے تمہیں پیڑ سے آم توڑ کر دیئے تھے۔ بھئی بچپن کی دوستی تو زندگی بھر کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اور تم اس سرمائے سے آج بھی مالا مال ہو۔ میرے ہوتے ہوئے تمہارے اوپر کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ خدا کے واسطے میرا یقین کرو اور اپنے دل سے سارے ڈر نکال دو۔

انہوں نے اپنے بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔ ان کی دھیمی سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ ان کے دل کے اندر جو دکھوں اور درد کا طوفان جاری تھا وہ تھم چکا تھا۔ ان کے چہرے پر وہی پرانی بچوں جیسی خوشی پھیل گئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ مجھے کل بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ مجھے جلدی اٹھنا ہوگا۔ اب باقی باتیں کل ہوں گی۔

وہ چائے کی بڑی رسیا تھیں۔ میں نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ایک پیالی گڑ اور ایلا یچی کی چائے لے آؤں۔ وہ ہنس کر بولیں اگر گلاس میں ملے گی تو مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ ان کے مزاج میں کچھ بے تکلفی تو آئی تھی۔

چائے کا گلاس اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولیں مدت کے بعد آج مجھے محسوس ہوا کہ میں بھی اس با عزت خاندان کی ممبر ہوں۔ بابو۔ دادا۔ آپ کو میری دکھ بھری کتھا سنا کر میرا دل تو ہلکا ہو گیا۔ آپ سے ایک عرض ہے کہ جو کچھ آپ نے سنا اس کا ذکر کسی اور سے نہ کرنا۔ بات گھر کی دیواروں سے باہر نکلی تو دور تلک جائے گی۔ اور دو خاندانوں کی عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ آپ اپنی اماں سے بھی کہنا کہ میرے اس دکھ بھرے ماضی کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ میری خاطر نہیں اپنے خاندان کی عزت بچانے کی خاطر کیونکہ اس خاندان کی عزت میری عزت ہے۔

ان کا ہمارے گھر آنا ہمارے خاندان کے لئے بڑا سود مند ثابت ہوا۔ میرے پتا جی سخت بیمار پڑ گئے۔ اور میری ماں ان کی دیکھ بھال اور خدمت گذاری میں مصروف ہو گئیں۔ اس آڑے موقع پر مامی نے پورے گھر کی ذمہ داری اٹھالی۔ میں تو پڑھنے ولایت چلا گیا تھا۔ گھر والے کہتے ہیں کہ مامی نے مرتے دم تک ہمارے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا۔ اور جب وہ سب کو بے حد عزیز ہو گئیں تو ایک رات چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بجلی کی زوردار کڑک کے ساتھ کال بیل بھی جھنجھنا اٹھی۔ ایک نہایت خوبصورت لڑکی کے ساتھ بلرام کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ مجھے یوں لگا کہ بجلی ہماری چھت پر آن گری ہو۔ بھارتی چونک کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شدید غصے اور غم کا شکار تھی۔

بلرام بنا کسی خوف و جھجک کے آگے بڑھتا ہی گیا۔ بھارتی کے قریب جا کر بولا۔ ان سے ملو...... یہ جوزفین ہے...... غصے میں بلبلاتی بھارتی کا ہاتھ تھام کر بولا...... کب تک ہم اپنی زندگی سے دور رہتے...... سولوٹ آئے آپ کے

پاس...... خالی ہاتھ نہیں آئے آپ کے لئے ایک گوہر نایاب بھی لائے ہیں۔ میں ششدر سا کھڑا دونوں کو گھورتا رہا اور سوچتا رہا عورت ہر روپ میں گوہر نایاب ہی تو ہے۔

بے حد تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ چیخی۔ چھوڑو میرا ہاتھ اور بند کرو اپنی بکواس۔ اب مجھے تمہاری ان فضول باتوں پر یقین رہا اور ناہی مجھے تم پر بھروسہ رہا۔ نہیں چاہیئے مجھے تمہارا کوئی بھی تحفہ۔ دو مہینے نہ میری خبر لی اور ناہی میری بچی کا حال دریافت کیا۔

ہونٹوں پر وہی پرانی شرارتی مسکراہٹ لئے وہ بولا۔ تمہیں اور اپنی بچی کو تو میں خود تمہارے ہی محفوظ ہاتھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ بڑا دعوٰی ابھرتی تھیں اپنی وفاداری اور محبت کا۔ بس دو مہینے کی جدائی میں سب تار تار ہو گیا۔ سب بکھر گیا۔ نہیں بھارتی۔ یہ کسی حال ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے اپنے پیار پر پورا یقین اور بھروسہ ہے۔ میرے پیار کے رنگ اتنے ہلکے نہیں جو دو ماہ کی جدائی میں مٹ جائیں۔ ارے بھئی ہم دونوں تو جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ بھلا ہم ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہو سکتے ہیں۔ بلرام کے لہجے سے منوں پیار ٹپک رہا تھا۔

سچ کہتا ہوں۔ جوزفین کی تلاش میں میں اپنا آپا ہی بھول گیا تھا۔ دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ پورا جرمنی چھان ڈالا تب یہ ہیرا ہاتھ لگا۔ جوزفین کی تعریفیں سن کر بھارتی کے تیور اور بگڑ گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔

وہ پلٹا...... جوزفین کا ستا ہوا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولا...... ذرا پہچانو تو اس چہرے کو...... اس کی گندمی رنگت میں سونے کی دمک دیکھو اس کے سیاہ گھنگھرالے بالوں میں یہاں کی شاموں کی جھلک دیکھو...... سب نے جوزفین کو بغور دیکھا...... جب سب خاموش رہے تو بلرام بولا...... محبت کی کوئی قوم نہیں ہوتی اور ناہی یہ وہ شے ہے جو دولت سے خریدی جا سکے...... یہ تو وہ آفاقی شے ہے جو دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور دلوں ہی میں پلتی ہے اور جب دو دل ملتے ہیں تب اس پر بہار آتی ہے...... خوب پھولتی پھلتی ہے...... محبت کے رنگ نرالے ہیں...... جس پر اتر جائے وہ ہزاروں رنگوں میں رنگ جاتا ہے...... یہ نعمت جسے مل جائے وہ سرشار ہو جائے اور جسے نہ ملے وہ زندگی سے بیزار ہو جائے...... بالکل میری ماں کی طرح......

میری ماں بدنصیب عورت تھیں...... ان کے حصے میں درد اور کانٹے آئے تھے...... محبت کے پھول تو ان کے شوہر جوزفین کی ممی کے قدموں میں ڈال آئے تھے...... ساری عمر ایک پروانے کی طرح ان کی یاد میں جلتے رہے...... جل کر خاک ہو گئے لیکن اپنے لب نہ کھولے...... کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی تھی۔

اگر انکی ڈائری میرے ہاتھ نہ لگ جاتی تو شاید میں زندگی بھر اپنی اکلوتی بہن سے کبھی نہ مل پاتا...... ہماری مائیں دو تھیں مگر ہم دونوں کی رگوں میں ایک باپ کا خون گردش کر رہا ہے...... اور اولاد ماؤں کے نام سے نہیں باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہیں...... بڑا زوردار دھماکہ ہوا تھا...... سب نے جوزفین کی طرف دیکھا......

وہ کہہ رہی تھی...... وہاں میرا اپنا کوئی بھی تو نہ تھا...... یتیموں کا کوئی بھی کہیں بھی مددگار نہیں ہوتا...... انہیں اپنی بقاء کے لئے خود جدوجہد کرنی پڑتی ہے...... میں برسوں سے تنہائی کا بوجھ اٹھائے تنہا ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں...... مجھے کچھ نہ دو...... بس تھوڑا سا پیار...... اور سر پر تھوڑا سا اپنے پن کا سایہ دے دو...... میں اپنوں کی محبت سے محروم ہوں...... میں

نہیں جانتی پیار کیا ہوتا ہے...... مجھے تمہارے پیار کی اور تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے اپنوں کی ضرورت ہے......اس کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی......

جب بھارتی نہ بلی تو میں نے کہا...... بھارتی دل میں جب شک کے ناگ سر اٹھاتے ہیں تو دل کی فصلیں بڑی تیزی سے گرنا شروع ہو جاتی ہیں اور سب کچھ آن کی آن میں بکھر جاتا ہے......بلرام نے بھارتی کو اپنی باہوں میں تھام کر کہا تم میرا وہ انمول تحفہ ہو جو خدا نے صرف میرے لئے اس دنیا میں بھیجا ہے...... میری ایک بات مان لو......ممتا کی کوئی نسل نہیں ہوتی...... جوزفین کو قبول کرلو...... ہمارے گھر کے ماحول میں اسے وہ پیار مل جائے گا جو ہمارے بزرگوں نے اس سے چھین لیا تھا......وہ زمانے ایسے ہی تھے...... بچے اپنے والدین کے سامنے منہ نہیں کھولتے تھے اور خمیازہ جوزفین کی ممی جیسی کمزور ہستیوں کو بھگتنا پڑتا تھا......

جوزفین کی ممی کے ساتھ شادی کر کے جب میرے ڈیڈی اپنی ماں سے ملنے آئے تو اچانک ان کے پتا جی کو دل کا دورہ پڑا......وہ چل بسے اور میری دادی تڑپتی رہ گئیں...... میرے پتا جی اپنی بلکتی ماں سے بیچ نہ بول سکے......دادی نے شادی کی ضد کی اور ڈیڈی نے دادی کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا......پھر تو واپس جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا......

اب ہم دونوں کو مل کر جوزفین کے زخموں کا علاج کرنا ہوگا......دونوں آگے بڑھے......دونوں نے جوزفین کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا......اپنوں سے دوریاں عذاب ہوتی ہیں...... تم ہماری اپنی ہو......اور ہم تمہارے ہیں......جو کچھ بھی ہمارا ہے وہ سب تمہارا بھی ہے......

ماحول ہی بدل گیا تھا...... شیام بلا رہا تھا...... آیئے بھابھی کھانا تیار ہے ہم سب کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے......

دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی...... ماحول میں پیار کی جھنکار تھی...... محبت کی مہکار تھی...... ہر چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ تھی......

☆☆☆

ساتھیا سنبھال مجھے

جب انگریزوں نے ہندوستان کی سرزمین پر پیر جمائے تو ایک نئی قوم کا جنم ہوا۔ یہ نئی قوم اینگلو انڈین کہلائی۔ جب تک گورے ہمارے حاکم بنے رہے تب تک وہ سارے افراد جو اینگلو انڈین کہلاتے تھے۔ اور جن کی رگوں کے بہتے خون میں ذرا سی بھی انگریزی خون کی رمق تھی۔ سارے سانولے یا پھر یوں کہا جائے کالے ہندوستانیوں سے اونچے ہی سمجھے گئے۔

پھر بھلا اس قوم کے اونچے لوگوں کی نئی پود گھاس پھوس کے چھپر والے بانس اور گارے سے بنی کچی کوٹھریوں میں کس طرح سانسیں لیتی۔ ان خاص لوگوں کے خاص بچوں کی رہائش کے لئے اونچی چھت والے چونے اور اینٹوں کے کشادہ اور آرام دہ مکانوں کی تعمیر کی گئی۔ جب کہ ہندوستان میں اسکول نہیں تھے۔ ان بچوں کے لئے یوروپین اسکولوں کی نیو ڈالی گئی۔ ان کی تفریح اور موج مستی کے لئے یوروپین انسٹی ٹیوٹ کھولے گئے۔ جہاں انہیں انگریزی زبان اور انگریزی کلچر سے دو چار کیا گیا۔ یعنی یہ کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہندوستانی کلچر کو قتل کرنے کا پورا پورا اہتمام شروع کیا گیا۔

انگریزی حکوت کے عالی افسران کی اس نئی قوم کے ہر فرد پر خاص نظر عنایت تھی۔ ان کے ہائی اسٹینڈرڈ سے رہنے کے لئے...... انڈین پے اسکیل ناکافی سمجھا گیا اور فوراً ہی یوروپین پے اسکیل کی تشکیل ہوئی۔ انہیں ہندوستانی ورکز کے مقابلے میں ماہواری معاوضے بھی زیادہ دیئے گئے۔ پرموشن کے وقت ورکز کے ساتھ ناانصافی کی جاتی تھی۔ قابل ہندوستانیوں کو نظر انداز کر کے ان خوش نصیبوں کو آگے بڑھا دیا جاتا تھا۔ قدم قدم پر کالے ہندوستانیوں کو پسپا کر کے انہیں زیر کرنے کا یہ بھی ایک آسان طریقہ تھا۔

ہر کمپنی۔ ریلوے۔ پولس۔ کسٹم۔ کورٹ اور پورٹ یعنی کہ ہر خاص محکمہ کا عالی افسر یا تو انگریز یا پھر اینگلو انڈین ہوتا تھا۔ اس نئی قوم کے جوانوں نے کھیلوں کے میدان میں بھی خوب جوہر دکھائے۔ جب ہمارے دیس کی لڑکیوں کے لئے اسکول ہی نہیں تھے ان کی بڑی سی آزاد طبیعت خواتین نے کمپنیوں۔ آفسوں ہسپتالوں اور یوروپین اسکولوں میں اپنا لوہا منوایا۔

جن لوگوں کے اوپر حکومت کی طرف سے بے انتہا عنایتوں کی بارش ہو رہی تھی وہ بھلا کیوں نا مغرور ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نئی قوم کا ہر انسان ہر اصلی کالے اور سانولے ہندوستانی کو نیچی اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

انگریز تو ہندوستان کے مالک بن ہی بیٹھے تھے مگر انہیں بھی گمان ہوا کہ ہندوستان کی زمین پر ان کا بھی حق ہے اور ہر ہندوستانی ان کا زرخرید غلام ہے۔

وقت کا پہیہ کسی کو برباد اور کسی کو نہال کرتا اپنی رفتار سے گھومتا رہا اور یہ لوگ ہندوستان کی سرزمین پر جشن مناتے رہے۔ اور ہندوستانیوں کو اپنی زور آوریوں تلے روندتے رہے۔

لمبی اندھیری رات کے بعد جس مبارک سحر کا وہ نیر اعظم طلوع ہوا جس کی روشنی سے ہندوستان کی سرزمین کا ذرہ ذرہ کندن ہوا تھا اس پل ان کی قسمتوں کا چاند ڈوب گیا اور ان کے چاروں اور اندھیارا چھا گیا۔

جس سہانے پل ہندوستان کی فضا میں آزادی کا ترنگا لہرایا اسی پل اس خوش بخت قوم کی تقدیر کا تختہ الٹ گیا۔
اس مغرور قوم کے مغرور لوگ کالے دیس باسیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنی شان کے بعید سمجھتے تھے ان کا طبقہ ایسا الٹا کہ انہیں کالے ہندوستانیوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ بھلا غلاموں کے ساتھ حاکموں کا کیا کام تھا۔ انہیں برابری کا یہ توہین آمیز احساس بڑا ہی ناگوار گذرا۔

جو گورے ہمارے دیس کی دھجیاں اڑا کر چلے گئے تھے۔ وہی گورے ان کے باپ دادا تھے۔ بڑا ناز تھا اینگلو انڈین کو اپنی نسل پر اپنے خون پر۔ وہی گورے اپنے ان بیچارے وارثوں کو یتیم کر کے آزاد ہندوستانیوں کے حوالے کر گئے۔

اینگلو انڈین کو کبھی یہ گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن ایسا پانسا پلٹے گا کہ انگریزی حکومت کا سورج ہندوستان میں ڈوب جائے گا اور کالے ہندوستانیوں کے مقدر چمک اٹھیں گے اور ان بیچاروں سے سارے اختیارات چھین لئے جائیں گے اور ان کے عیش و عشرت اور شان و شوکت کا جنازہ اٹھ جائے گا۔

مختاری کے جاتے ہی بے سائیگی کا احساس ہوا تو خیال آیا کہ نا ہی ہم اس دیس کے ہیں اور نا ہی یہ دیس ہمارا ہے۔ نہ ہی مٹی ہماری ہے۔ اور نا ہی اس مٹی پر رہنے والے لوگ ہمارے ہیں۔

حالانکہ اس قوم کا جنم ہی ہندوستان میں ہوا تھا۔ مگر اس قوم کے لوگ اس زمین کو اپنی جنم بھومی ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ انہیں اپنی اس جنم بھومی سے ذرہ برابر بھی لگاؤ اور پیار نہیں تھا۔ یہ لوگ نئی مٹی نئی بھومی کی تلاش میں پر تولنے لگے۔ نیوزی لینڈ، برطانیہ، کینیڈا، اسٹریلیا، جس سے جہاں بن سکا وہاں جا کر بس گیا۔ جارج اور شیلا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اسٹریلیا آ کر بس گئے۔ جارج ریلوے افسر تھے۔ ہندوستان میں جارج اور اس کے خاندان کو دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں۔ اسٹریلیا میں انہیں دن میں تارے نظر آ گئے۔

جارج کی حالت ہندوستان کے غلاموں سے بھی بدتر ہو گئی۔ نہ اپنا ملک، نہ اپنی مٹی، اور نا ہی پیٹ پالنے کا انتظام، ریلوے کے اس بڑے افسر کو بامشکل تمام ایک فٹر کا جوب مل سکا۔ کئی سال بے انتہا مشکلات اور ذلت اٹھانے کے بعد زندگی ذرا معمول پر آ گئی۔ پہلی جیسی عزت اور شان تو ملی نہیں مگر جس زمین اور جس آسمان کی کھوج میں اپنی اصلی جنم بھومی چھوڑ آئے تھے وہ آخر مل ہی گیا۔

برسوں بعد جب میری اور شیلا کی ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔ کہ بھئی...... تمہیں تمہارا یہ نیا ملک کیسا لگا۔ وہ ہنس کر بولی جیسے ہی میں نے اپنا پہلا قدم اس ملک کی سرزمین پر رکھا میرا دل چہک کر بولا تھا کہ یہی دیس تیرا ہے۔ تیرا اپنا دیس۔ جس کی تجھے تلاش تھی۔ اب میں ہندوستان کبھی لوٹ کر نہ جاؤں گی۔

غصے کی ایک لہر میرے پورے بدن میں پھیل گئی۔ میں نے کہا نہایت بے وفا اور بے مروت انسان ہو تم۔ جس ملک میں تمہارا جنم ہوا۔ جہاں تم نے اپنی زندگی کے چالیس سال عیش ہی عیش کئے اب اس ملک سے یکا یک اتنی شدید نفرت ہو گئی۔ مت بھولو کہ تم اصلی گوری نہیں ہو تمہاری رگوں میں کچھ تو ہندوستانی خون بھی شامل ہے۔ بھئی مجھے تو اپنے ہندوستانی ہونے پر بے حد فخر ہے۔ برسوں سے یہاں رہ تو رہی ہوں مگر میرا دل اپنے دیس کی سڑکوں اور گلیوں میں ہی ڈولتا رہتا ہے۔

اس دیس کو جسے تم اپنا کہہ رہی ہو یہ بھی کالے لوگوں کا ہی دیس ہے۔ تمہارے گورے باپ داداؤں نے جیسے

ہندوستان پر قبضہ کرلیا تھا ویسے ہی ان بے سہارا لوگوں کو برباد کر کے ان کے ملک پر قبضہ کرلیا ہے۔ اگر کبھی یہاں سے نکلنا پڑے تو نئی مٹی کی تلاش میں پھر کہاں بھاگ کر جاؤ گی۔ میں نے بھی ایک زہر میں ڈوبا تیر مارا......

وہ بلبلا کر رہ گئی۔ بولی ایسی ڈراؤنی باتیں نہ کرو...... تم ہندوستانی ہو۔ جب چاہو اپنے دیس واپس لوٹ سکتی ہو میں تو بے وطن ہوں۔ کیا میرے نصیب میں ملکوں ملکوں بھٹکنا ہی لکھا ہے۔ بڑی مشکل سے یہاں پیر جمائے ہیں۔ اس کی نم آنکھیں دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی...... گھبراؤ نہیں...... اب یہی ملک تمہارا ہے۔ یہاں ہر قوم اور ہر رنگ کے لوگوں کو بلا بلا کر بسایا جا رہا ہے۔ یہاں کے زیادہ باشندے سفید ہیں۔ اور سفیدوں کو تم اپنا مائی باپ سمجھتی ہو پھر تمہیں کیا ڈر۔ گذرے ہوئے عیش کے دن لوٹ کر تو نہیں آئیں گے مگر زندگی آرام سے گزر جائے گی۔

میں اور شیلا اکثر ملتے رہتے تھے۔ جارج کو کوئی مہلک بیماری نہیں تھی۔ بوڑھا تھا بیچارا۔ اور بڑھاپے کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔ کم خوابی اور کم خوری سے اس کی دماغی اور جسمانی کمزوریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں شیلا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ کس طرح 78 سالہ عورت اپنے نحیف اور کمزور 95 سالہ ضدی اور غصہ ور شوہر کی خدمت پوری لگن اور محبت سے انجام دے رہی تھی۔

جارج میں افسریت کی خو آج بھی باقی تھی۔ ہر وقت شیلا پر حکم چلاتا رہتا تھا۔ نہایت ہی خود غرض اور بے صبرا انسان تھا وہ۔ شیلا کو ایک پل کے لئے بھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ ڈارلنگ ذرا پنکھا چلا دو۔ ذرا یہ بتی بجھا کر وہ بتی جلا دو۔ جا کر ذرا سب کے لئے کافی اور کیک تو لے آؤ۔ شیلا اس کا ہر حکم یوں بجالاتی جیسے وہ اس کی بیوی نہیں اس کی زرخرید لونڈی ہو۔ جو دیکھتا وہی جارج کی قسمت پر رشک کرتا اور کہتا بیوی ہو تو شیلا جیسی...... خدمت گذار...... وفادار...... دل و جان سے پیار کرنے والی......

میں یہ سمجھ نہ پائی کیوں جارج کا اکلوتا بیٹا اپنے باپ سے ملنے نہیں آتا، کیوں جارج کی بیٹی باپ کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گذارتی۔ خیر جو بھی تھا شیلا اپنے فرائض بخوبی انجام دیتی رہی اور موت کا فرشتہ جارج کے اردگرد چکر لگاتا رہا۔ آخر شیلا ہار گئی اور موت کا فرشتہ جارج کو لے گیا۔

جارج کی موت کی خبر ملتے ہی میں نے شیلا کو فون کیا تو وہ بولی۔ ابھی میں بے حد پریشان ہوں۔ میرا دل ودماغ ٹھکانے نہیں۔ تم مجھے فون نہیں کرنا۔ جب میری حالت سدھرے گی میں خود تمہیں فون کروں گی۔

میں کئی دن شیلا کے فون کی منتظر رہی۔ جب نہیں آیا تو میں خود اس کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا دیکھ میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی اس کے کمرے میں چلی گئی۔ اسے بڑے سکون سے ٹی۔وی دیکھتے مجھے حیرت ہوئی تھی۔ نہ گھر کی فضا میں کوئی سوگواری سسک۔ نہ شیلا کے چہرے پر غموں کا ہجوم، مجھے دیکھ وہ مسکرائی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں رنج وغم وملال کا ذرا سا شائبہ بھی نظر نہیں آیا۔

فون کی گھنٹی بج اٹھی اور شیلا فون پر بات کرنے لگی۔ میں حیران حیران سی اس کے برابر بیٹھی سوچتی رہی کہ سنا تھا یہاں کے رہنے والوں کے پاس اپنے پیاروں کا سوگ منانے تک کا وقت نہیں ہوتا آج دیکھ بھی لیا۔ شیلا نے 60 سالوں کی قربتوں کو دس دن میں ہی بھلا دیا تھا۔

اس نے فون رکھا اور میں اس پر برس پڑی۔ بھئی۔ تم نے ہمیں جارج کے فیونرل کی خبر کیوں نہیں دی۔ وہ بولی

۔کیسا فیونرل ۔نہ قبر بنی نہ فیونرل ہوا۔سن کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔میں نے کہا قبر نہیں بنی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کیونکہ آج کل اپنے عزیزوں کے جسد خاکی کو سپرد آگ کرنے کا رواج چل پڑا ہے۔مگر اس سے پہلے......وہ درمیان میں ہی بول اٹھی میں نے پہلے والا جھنجھٹ ہی نہیں رکھا تم دل تھام کر بیٹھو اور میرے آنسوؤں کا افسانہ سنو۔پھر فیصلہ کرنا جو کچھ میں نے کیا وہ غلط تھا یا صحیح......

میں جانتی تھی جارج زندہ گھر نہیں لوٹے گا۔سو میں نے اسے گھر میں ہی بائے بائے کر دیا تھا۔جس وقت ایمبولنس والے اسے پلنگ سے اٹھا کر ہسپتال لے جا رہے تھے میں نے اسے گڈ بائے کس (kiss) بھی کر دیا تھا۔وہ ناراض تو ہوا تھا مگر میں نے وہی کیا جو میں چاہتی تھی۔اور جس کا وہ مستحق تھا۔

میں نے پھر سوال کیا۔یہ تو بتاؤ کہ فیونرل کب ہوا۔وہ بولی۔دس تاریخ کو۔کس وقت ہوا وہ میں نہیں جانتی کیونکہ میں اور میری بیٹی اس کے فیونرل میں شریک ہونے نہیں گئے تھے۔نا ہی اس کا کوئی رشتہ دار جا سکا کیونکہ میں نے کسی کو انفارم ہی نہیں کیا۔میں نے جارج کا سب سے قیمتی سوٹ فیونرل پارلر بھیج دیا تھا جس نے مجھے جلا کر راکھ کر ڈالا۔اس کی راکھ بٹورنے میں کیوں جاتی۔پارلر والوں نے راکھ کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔میں سن کر ہکا بکا رہ گئی۔وہ آگے بولی

میری طرح اس کے دونوں بچے بھی اپنے باپ سے اس حد تک ناراض تھے کہ اس کا آخری دیدار تک کرنا نہیں چاہتے تھے۔جارج کے بیٹے نے امریکہ سے آنے سے انکار کر دیا اور بیٹی نے فیونرل پارلر تک جانے کی زحمت نہیں اٹھائی۔روٹھے بچوں کو منایا جا سکتا ہے مگر بچوں کے دلوں میں باپ کے لئے محبت اور احترام ہی نہ رہے اور نفرت پیدا ہو جائے تو اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔

جارج نے مجھ سے بے وفائی اور دغابازی تو کی ہی تھی اپنے بچوں کو نظر انداز کر کے۔ان کا حق چھین کر ان کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کی تھی۔جب باپ کا دل گھر کی چار دیواروں کے باہر ڈولتا پھرے تو گھر کی دیواریں ہل جاتی ہیں۔نیو ڈگمگا جاتی ہے۔پھر کچھ بھی نہیں بچتا۔کچھ بھی تو نہیں۔سب کچھ سمندر کی ریت کی طرح بکھر جاتا ہے۔ساری خوشیاں تند و تیز ہوائیں اڑا کر لے جاتی ہیں۔اور جن کی خاطر یہ سب ہوتا ہے وہ دور کھڑے ایک خاندان کے بکھرنے اور بربادی کا تماشہ دیکھ کر مسکراتے رہتے ہیں۔

دھوکہ بہر طور اخلاقاً اور قانوناً جرم ہی ہوتا ہے اور ہر مجرم سزا کا حقدار بھی ہوتا ہے۔خدا وہ وقت ضرور لاتا ہے کہ انسان اپنے کئے کی سزا پائے۔میرے پروردگار نے مجھے وہ موقع بھی دیا۔جس رشتے کو جارج 50 سال سے توڑنے اور میں جوڑنے میں کوشاں رہی اس رشتے کو میں نے جارج کی سانسیں بند ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی ایک پل میں توڑ ڈالا۔

اس سے زیادہ سخت سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جان کنی کی حالت میں انسان کا اپنا سگا اس کے ساتھ نہ ہو۔کوئی اس کا اپنا ہاتھ نہ تھامے۔اس کے لئے دو آنسو بہانے والا نہ ہو۔جاتے وقت ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا تھا کیا میں جارج کے ساتھ ہسپتال جاؤں گی تو میں نے انکار کر کے فوراً ہی جارج کا ہاتھ چھوڑا۔اس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا اور یاس بھری آواز میں کہا۔

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔کچھ دیر کے بعد ذرا سنبھلی تو بولی۔وہی کہا جو میں اس سے 50 سال سے کہتی آئی تھی اور اس نے ان سنی کر دی تھی۔وہ بولا تھا۔ساتھیا سنبھال مجھے۔میں نے

جارج کو بائے بائے کہا اور ایمبولینس آگے بڑھ گئی تھی۔ اس ایک پل میں مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے سارے دکھوں سے آزاد ہوں۔

پچاس سال جارج مجھے جلاتا رہا میں نے بھی اسے سپرد آگ کر دیا جو ہمارے یہاں رواںنہیں میں نے جارج کے جسد خاکی کو گاؤ تکیوں کے درمیان روئی کی سیج پر سلا کر پیوند خاک نہیں کیا۔ ایک ایسے شخص کا مزار کیوں بنے جس کے لئے کسی کے دل میں ذرا سا احترام اور عقیدت ہی نہ ہو۔ کون جاتا اس کی قبر پر پھول چڑھانے۔ جوانی کے عالم میں جو زور آور اور مغرور باپ اپنی طاقت کے بل پر جیتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اس کے بچے اس کا مان اور طاقت ہوتے ہیں اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بیٹا بوڑھاپے کی لاٹھی ہوتا ہے مگر لاٹھی کو بڑے جتن سے تیار کیا جاتا ہے۔ بیٹے کو ہر قدم پر باپ کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تب وہ باپ کا سہارا بنتا ہے۔ جارج کے پاس بچوں کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ اسے غیر عورتوں کے ساتھ موج مستی کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔

میں نے کہا جارج کی باتوں سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بے حد شفیق باپ تھا اس کے بچے اس کی زندگی تھے۔ تمہیں تو ہر سے ڈارلنگ ڈارلنگ کرتا رہتا تھا۔ وہ بولی ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور یہ بھی سنا ہو گا تم نے۔ سب کے سامنے ڈارلنگ ڈارلنگ اور اکیلے میں گالیاں ہی گالیاں۔ تم تو جانتی ہو بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ معذور ہو گیا تھا مگر دن بھر دہاڑتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کے ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ اپنا پاگل پن بند نہیں کرے گا تو اسے ہسپتال بھیج دیا جائے گا۔ اس کی دماغی حالت اس بری طرح بگڑی تھی کہ اسے ہسپتال میں بھرتی کیا گیا تھا۔ وہاں دس دن میں ہی اس کا دماغ درست ہو گیا اور وہ گھر لوٹ آیا۔ کچھ دن ٹھیک رہا۔ مگر اس قسم کے لوگ کبھی نہیں سدھرتے۔ پھر وہی بے ڈھنگی چال۔ وہی چیخ پکار، وہی گالی گلوچ، اس کی بدسلوکیاں، مکاریاں اور بدتمیزیاں سہتے سہتے میں تنگ آ گئی تھی۔ مجھے دن میں کئی بار گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتا تھا جب کہ جانتا تھا میرے سوائے کوئی اس کے قریب آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کہا تم اس سے سترہ سال چھوٹی تھی۔ عمر میں بیوی چھوٹی ہو تو شوہر اسے بڑے احتیاط سے آئینہ کی طرح سنبھال کر رکھتا ہے۔ اس زمانے میں بھی تمہاری قوم کی لڑکیاں اپنی پسند سے شادیاں کرتی تھیں۔ تم نے اپنے سے ڈبل عمر کے آدمی کو کیسے پسند کر لیا۔

وہ بولی جارج میرے گھر موٹر خریدنے آیا تھا۔ میرے ڈیڈی سے بہت انہماک سے گفتگو کر رہا تھا۔ ڈیڈی نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ ڈنر کھلا کر دم لیا۔ بھئی ریلوے افسر تھا۔ بڑی شان و عظمت تھی افسروں کی۔ اس کی شاندار شخصیت کا اثر بھی تھا کہ میرا ناداں دل دھڑک اٹھا تھا۔

میرے فادر کا 130 ایکٹر کا فارم تھا۔ بھائی نہیں تھا میرے پاس۔ جارج ہی میرے فادر کی مدد کرتا تھا۔ جارج کا خلوص اور محبت دیکھ کر میرے فادر نے بھی اسے پسند کر لیا۔ جارج نے مجھے پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ اب سوچتی ہوں وہ پیار نہیں تھا۔ وہ میری جوانی او خوبصورتی پر مرمٹا تھا۔ سچا پیار کرنے والے دکھ نہیں دیتے۔ سچا پیار کبھی مٹتا نہیں۔ محبت ابھرتی ہے کم نہیں ہوتی۔

اس نے اپنی محبت کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں کیا۔ میں الہڑ۔ نادان سی لڑکی تھی۔ اگر میرے دل کو بھی کچھ ہو گیا تھا تو کوئی انوکھی بات تو نہیں تھی۔ میری عمر کی سب لڑکیاں کسی نہ کسی کی محبت میں گرفتار تھیں۔ میں تو نادانی میں ماری گئی۔

مجھ سے کہا میرے گھر چلو تو سہی میں اپنی اس کانچ کی گڑیا کو بہت سنبھال کر رکھوں گا۔ میرے پاؤں اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بولا تھا تمہارے یہ خوبصورت پاؤں میرے گھر میں پڑیں تو سہی۔ میں زمانے بھر کی خوشیاں ان قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ جانتی ہو محبت ایک وسیع اور جامع جذبہ ہے۔ اسے جتنا پھیلاؤ اتنا ہی پھیلتی جاتی ہے۔ محبت کبھی نہ مرتی ہے نہ کم ہوتی ہے۔ جب ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے تب ہماری محبت میں اور بھی پختگی ہوگی۔ یقین کرو میں بوڑھا ہو جاؤں گا مگر میری محبت جوان رہے گی۔ اپنی آخری سانسوں تک ایسے ہی چاہوں گا جیسے آج چاہتا ہوں تمہارے لئے میری محبت کبھی کم نہیں ہوگی۔ تمہاری مسکراہٹ میں ستاروں کی جھل مل ہے۔ بس تم میرے سامنے بیٹھی یوں ہی مسکراتی رہنا۔ اس کے ہر ایک لفظ میں جادو تھا اور میں کم عقل تھی۔ اس کی ہر بات کا یقین کر بیٹھی تھی۔

اس کے گھر میں میں جدھر نظر اٹھاتی سرور ہی سرور تھا۔ جس راہ پر وہ چلتا میں اسے خوش نصیب سمجھ کر اس کے ہمراہ چلتی گئی۔ اور اس محبت بھرے ماحول میں جذب ہو گئی۔ اس کے قدموں میں سر جھکا دیا اور اسے اپنا خدا مان لیا۔ لیکن وہ نکلا آدمی۔ بے وفا، نادان مٹی کا بنا پتلا، ہر مرد کی طرح اس نے بھی عورت کو دل بہلانے والی ایک کانچ کی گڑیا ہی سمجھا۔

دس سال اس نے مجھے بڑے جتن سے سنبھال رکھا۔ بڑی قدر کرتا تھا میری۔ بچے اس کی جان تھے۔ جب سنا کہ اسے امریکہ جانا ہوگا۔ میرے توتے اڑ گئے۔ خیر اسے تو جانا ہی تھا۔ الوداعی گفتگو کرتے وقت بولا۔ میں جا رہا ہوں...... تم سے دور...... بہت دور...... مگر اکیلا نہیں جا رہا۔ اپنا سب سے قیمتی سرمایہ ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ تمہاری باتوں اور یادوں کا خزانہ۔ میں نے کہا امریکہ کے جادوئی ماحول میں اچھے اچھوں کے ہوش اڑ گئے۔ تم اپنے قدموں کا رخ ٹھیک رکھنا۔ انہیں یاد دلاتے رہنا کہ انہیں لوٹ کر دیس واپس جانا ہے۔ ذرا دھیان بھٹکا اور انسان نادانی کے عمیق کھڈ میں گر جاتا ہے پھر دکھوں کی ریل پیل شروع ہو جاتی ہے۔ وہ بولا میں نہیں بھٹکوں گا۔ تم مجھے بھٹکنے نہیں دو گی۔ میری جان۔ تم ہر پل، ہر لمحے سوتے جاگتے میرے ساتھ جو ہو گی۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا اور میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

وہ چلا گیا لیکن مجھے ہر پل یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوٹ آئے گا۔ مجھ سے دور نہیں رہ پائے گا۔ پھر یکا یک اکیلے میں یوں لگا کہ فلک کے سارے چراغ بجھ گئے ہوں۔ گھور اندھیرا چھا گیا ہو۔ میرے دھڑکتے دل نے میرا ساتھ دیا۔ ہر دھڑکن کہہ رہی تھی اداس نہ ہو۔ وہ تجھ سے دور نہیں دل کی آنکھوں سے دیکھ وہ ہے یہیں۔ تیرے آس پاس۔ اور اسی سوچ نے مجھے زندہ رکھا۔

وہ میرا آنگن سونا کر گیا تھا۔ لیکن جاتے وقت میری جھولی میں اعتبار اور امید کے قیمتی گوہر ڈال گیا تھا۔ میرے شام و سحر اس کی یادوں میں گذرتے۔ میں اس کے لوٹنے کے سپنے دیکھتی رہی۔ وہ لوٹا۔ میرے پاس آیا تو۔ لیکن۔ جہاں میں اس سے ملنے کی خوشی میں پاگل ہو رہی تھی۔ میرے انگ انگ سے مسرت برس رہی تھی۔ وہ ایسا کھڑا تھا جیسے وہ کوئی میرا انیا مہمان ہو۔ اس کی آنکھوں میں نہ وہ پیار و مستی کی لہر تھی نہ چہرے پر وہ پہلی سی مسکراہٹ جسے دیکھنے کی میں عادی تھی۔ ادھر میں اس سے بچھڑنے کا عذاب جھیل رہی تھی اور وہ نہ جانے وہاں کیا کر آیا تھا جو مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا وہ

میرے ساتھ تھا۔ مگر میرے پرانے جارج کو امریکہ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میں فکر مند تھی۔ از حد غمگین تھی مگر چپ ہی رہی کلب میں وہ عورتوں سے باتیں کرنے میں ایسا محو ہوا کہ میری یاد ہی بھول گیا۔ تب میرے ہوش بیدار ہوئے شک کا جال دماغ میں بن ہی گیا تھا۔ مگر ثبوت بنا بحث فضول تھی۔ گھر لوٹے۔ پھر وہی حال۔ نا ہی وہ پہلی جیسی باتیں تھیں نہ ہی پہلی جیسی راتیں۔ ساتھ میرے ہوتا مگر اس کا دھیان بھٹکتا رہتا۔ نہ جانے کس چیز کی کمی تھی۔ نہ جانے اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ میں تختہ دار پر لٹکی سانسیں لیتی رہی اور اپنی مصیبتوں کا حل سوچتی رہی۔

جارج آفس سے روز لیٹ آنے لگا۔ معلوم ہوا وہ روز ہیلن کے گھر جانے لگا ہے۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ میں یقین کرنا نہیں چاہتی تھی مگر یہ خبر سچ تھی کیونکہ جارج روز نئی کہانی گڑھتا تھا۔ میرے ٹوکنے پر بولا۔ اب میں شہرت اور ناموری کی بلندیوں پر ہوں تو یہ دنیا والے میری ترقی اور شہرت سے اور ہمارے پیار سے جلنے لگے ہیں۔ مجھے اپنے قریب کر کے بولا۔ دنیا والوں کی سنو گی تو ناحق دکھ پاؤ گی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ اس نے مجھ سے سوال کر کے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں کبھی تمہیں دھوکہ دے سکتا ہوں۔ کبھی تم سے بے وفائی کر سکتا ہوں۔ سچ بتاؤ تمہارا دل کیا کہتا ہے۔ امریکہ سے اس کی واپسی کے بعد میرا دل جو کہہ رہا تھا وہ میں اسے کیسے بتاتی۔ میں ہنس کر رہ گئی۔ کیونکہ جارج کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔ وہ ہر فن مولا تھا۔ الٹی سیدھی دلیلیں دے کر الٹا مجھے الجھن میں ڈال دیتا۔

میرے فادر کے فارم ہاؤس میں پھوس کا چھپر تھا۔ پتا نہیں اس میں آگ کیسے لگ گئی۔ آج سوچتی ہوں آگ لگی نہیں تھی لگائی گئی تھی۔ گاؤں والوں کو ہم سفیدوں سے نفرت تھی۔ ہماری امیری، ہمارے کلچر اور ہماری آزاد خیالی انہیں کھٹکتی تھی۔ تب ہی تو انہوں نے اس حادثے کے کچھ سالوں بعد میرے فادر کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں جب ہمارے گھر کا تنکا تنکا جل کر راکھ ہو گیا تھا اور میرے والدین بے سروساماں تھے۔ جارج نے اپنی نہایت شاندار وسیع وعریض کوٹھی میں ایک کمرہ بھی نہ دیا۔ جارج نے مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تب مجھے جارج کے بدلنے کا یقین ہو گیا۔

جارج اور ہیلن کے پیار کے قصے عام ہوئے تو میرے ہوش جاگ اٹھے۔ جارج نے پھر مجھے جھوٹی تسلیاں دے کر خاموش کرنا چاہا۔ نرم جواب قہر کو دور کرتا ہے۔ سو میں نے نرم لہجے میں کہا۔ سچ اور جھوٹ تو خدا جانتا ہے مگر یہ یاد رکھنا دغا کے ترازو سے خدا کو نفرت ہے۔ دھوکہ دینا ایک گھور پاپ ہے اور خدا دغا باز کو سزا ضرور دیتا ہے۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بڑے طیش میں باہر نکل گیا۔

میں نے کہا۔ تم نے ایسے فریبی انسان سے ناطہ کیوں جوڑے رکھا۔ وہ بولی۔ ساتھ تھا تو آبرو تھی۔ عزت تھی۔ چھوڑ کر خود کو دنیا کی نظروں میں بے آبرو کرتی اور بچوں کو بے گھر۔ بچوں کی پروان کے لئے ماں باپ کا ساتھ ضروری ہوتا ہے۔ میں خود زیادہ پڑھی نہیں تھی۔ میرے ہاتھوں میں نا ہی کوئی ہنر تھا۔ نا کوئی سند۔ اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالتی۔ فادر کے فارم میں سب کچھ تھا۔ مگر اسکول نہیں تھا۔ میرے بچے ہی میری زندگی کا اثاثہ تھے۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ بچوں کی پرورش، سو میں نے بھی قصد کر لیا، کہ جارج میرے اوپر کتنے ہی ظلم کے پہاڑ توڑے میں اپنے بچوں کی خاطر سہہ لوں گی۔

وہ غیر عورت کی دلداری کر کے میرا دل لہولہو کرتا رہا، میں دل میں آس لئے اس راہ پر کھڑی کہ جارج اس موڑ

سے میرے پاس لوٹ آئے گا۔ ٹوٹے بکھرے خاندانوں کے بچے بھی بکھر جاتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں اپنا پریوار سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھی۔

میری دلی مراد برآئی، ہم چاروں کو اسٹریلیاں کا ویزا مل گیا، میرا مردہ دل ایک بار پھر جی اٹھا، ہر آرزو کا پورا ہونا زندگی کا درست ہونا ہے، میں نئی زندگی کے سپنے دیکھنے لگی کہ ہم دونوں پھر سے بکھری باتوں کو دہرائیں گے۔ مل کر اپنی گذری راتوں کو جگائیں گے۔ مل کر پھر مسکرائیں گے، اپنے سارے رنج و غم ہندوستان کی مٹی میں دفن کر کے میں نے رخت سفر باندھا۔

ہوائی جہاز بادلوں میں اڑ رہا تھا۔ اور میرا دل ساتویں آسمان کی سیر کر رہا تھا، ایئر ہوسٹس نے جوس کا گلاس میری طرف بڑھایا، میں نے نظریں اٹھا کر ذرا سر کو خم کیا، زبردست جھٹکے کے ساتھ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اور میں سر کے بل دھڑام سے ساتویں آسمان سے اپنی سیٹ پر آ گری، گم صم بنا پلکیں جھپکائے ادھر ہی دیکھے جا رہی تھی، میری آہوں کے دھوؤں سے میری آنکھیں دھوندلی ہو گئی تھیں، ایئر ہوسٹس نے دوبارہ گلاس مری جانب بڑھایا تو مجھے ذرا ہوش آیا، میرے اندر بھٹی سلگ رہی تھی،، جی چاہا بھرا گلاس جارج کے چہرے پر دے ماروں، میں نے گھٹا گھٹ سارا گلاس ختم کر ڈالا، اسی وقت جارج نے میرا ہاتھ زور سے دبایا، میرا جی چاہا جارج کا گلا گھونٹ ڈالوں۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہا، پر ہائے۔ رے۔ بے بسی کچھ بھی نہ کر سکی، میری آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی، میرے آنسوؤں میں اور شدت آ گئی، ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں نظر ادھر ہی جا گری جہاں ہیلن اپنے شوہر اور دونوں بچوں کے ساتھ بیٹھی کھلکھلا رہی تھی،

ایک پل میں میری ساری حسرتوں ساری تمناؤں کا خون ہو گیا، چاند تاروں کی تمنا کس کو نہیں ہوتی، بہاروں کی تمنا لئے میں نے ایک بار پھر نئے سفر کا آغاز کیا تھا، مگر ہمراہی نے پھر ساتھ چھوڑ دیا، میں تنہا رہ گئی تھی۔ میں وہ تھکا مسافر تھی جو منزل کی تلاش میں آگے بڑھتا ہی جاتا ہے اور منزل اس سے دور ہٹتی جاتی ہے اس کے بعد سفر کا ایک ایک پل میرے لئے عذاب ہو گیا تھا۔

اس نئے ملک میں بے انتہا مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا تو کرنا پڑا مگر آہستہ آہستہ زندگی ذرا سنور گئی تھی، میں خدشوں سے گھری، سسکتے دل کے ساتھ جارج کا ساتھ دے رہی تھی، ہمارے درمیان گو کہ بہت فاصلے ہو چکے تھے پھر بھی میں ان فاصلوں کو پاٹنے کی امید میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ہیلن کی یہاں موجودگی ہر وقت میرے دل کو کھٹکتی رہتی تھی۔ یہ محبت بڑی نرالی چیز ہے انسان کو پابند کر دیتی ہے۔ اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

ایک گرم چلچلاتی دوپہر کو میں نے موٹر گراج سے آوازیں آتی سنیں تو میرے قدم خود بخود اس طرف بڑھتے گئے۔ جارج اور ہیلن اس درجہ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے میرے آنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی، وہ دونوں کہیں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پہلے دونوں بھونچکے رہ گئے پھر ہڑبڑا سے گئے، میری پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں، اور میرا بدن کانپ رہا تھا۔

میں نے کہا! کچھ تو تم دونوں اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ لو، میں اب خاموش نہیں رہوں گی، تم دونوں کو کورٹ تک لے جاؤں گی، میں نے ہیلن کا ہاتھ زور سے تھاما اور اسے اپنے گیٹ کے باہر لے آئی، سڑک پر دھکا دے کر کہا، یہاں سے دفع ہو جاؤ اور آئندہ جارج کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا ورنہ...... وہ مڑی اور چلی گئی، جارج غصہ میں بلبلاتا رہ گیا تھا۔

رات میں جارج نے میری نائٹی اوپر سے نیچے تک پھاڑ کر کہا۔ میری بلی اور مجھی سے میاؤں۔ یاد رکھو آئندہ یہ کیا جو آج کیا ہے تو تمہارے ساتھ اس سے بھی برا ہوگا، میری ماں ہندوستان سے آئی تھی، جارج ہم دونوں کو لمبی سیر کے لئے لے گیا۔ شام ہو چلی تھی، اندھیارا چھانے لگا تھا۔ جارج ہم دونوں کو گھر سے دور سڑک پر چھوڑ کر گھور لوٹ آیا جب اندھیرا گہرا ہوا تو میں گھبرائی اپنی بیٹی کو فون کیا اور وہ آ کر ہمیں لے گئی۔ میری بیٹی چاہتی تھی کہ پولس میں رپورٹ درج کی جائے مگر میں راضی نہیں ہوئی۔ بات گھر کے باہر نکلتی تو دور تک جاتی۔ بے عزتی تو ہماری ہی ہوتی۔ لوگ پہلے تو تھوڑی بہت ہمدردی دکھاتے پھر قصوروار عورتوں کو ہی ٹھہراتے۔

میری ماں ہندوستان واپس جانا چاہتی تھی۔ مگر دریں اثنا میرے فادر کا قتل ہو گیا۔ گاؤں والوں نے ہمارے فارم پر قبضہ کر لیا۔ بولے یہ زمین ہماری ہے۔ اس پر ہمارا حق ہے۔ گوروں کے والی وارثوں کا نہیں۔ ایک بار پھر میری ماں بے سروساماں رہ گئی تھی۔ جارج نے پھر منہ موڑ لیا۔ مجبوراً میری ماں کو بیٹی کے در پر دستک دینی پڑی جس کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔

امیدوں کے سارے جگنواڑ چکے تھے اور میں مایوسیوں کے اندھیروں میں تنہا بھٹک رہی تھی۔ جب مایوسی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو طوفان بن جاتی ہے۔ میرے اندر بھی طوفان برپا ہو گیا تھا۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا جب جارج نے میری زندگی اجیرن کر ہی دی ہے تو کیوں بھٹکتی پھروں کیونکہ نا اس طوفان کا اکیلے ہی ڈٹ کر مقابلہ کروں۔ میں نے جارج کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور میرا یہ فیصلہ میری ماں اور بیٹی کو ناگوار نہیں گذرا بلکہ انہوں نے میرے فیصلے کو یہ کہہ کر سراہا کہ مجھے بہت پہلے جارج سے علحدہ ہو جانا چاہیئے تھا۔

میں اپنی ماں کے ساتھ بینک گئی تھی ڈالرز نکالنے۔ نہ جانے میرے فیصلے کی خبر جارج کو کیسے لگ گئی۔ میں لائن میں کھڑی تھی۔ اس نے پیچھے سے آ کر میرا ہاتھ پکڑا۔ اور مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور اسی طرح اپنی کار تک لے گیا، دروازہ کھول کر کھڑا تھا، میں نے کہا، بہت ہو چکا۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ اور میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ جب میں ہل کر نہ دی تو اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا میں آئندہ وہی کروں گا جو تم چاہو گی پہلی بار اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ اور میں نے اس فریبی کا یقین بھی کر لیا۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میں خود اس سے دور ہونا نہیں چاہتی تھی۔

وہ مجھے لے گیا تھا کیونکہ اس کی صحت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ خوب جانتا تھا کہ میرے سوائے اور کوئی اس کے ساتھ دو دن بھی نہیں ٹک سکتا۔ اس کے تیور بگڑتے گئے اور وہ اپنے وعدے کے برعکس کرتا رہا۔

میں نے اپنی زندگی کے پچاس سال ایک اجاڑ اور بنجر سی رہگذر پر چل کر کاٹے ہیں میں نے صرف پیار چاہا تھا مگر آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔ وہ تھک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تھکن تھی۔ آہستہ سے بولی۔ میرا زخم خوردہ دل ابھی بھی کہتا ہے زندگی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جہاں محبت نہیں وہاں راحت نہیں۔ انسان اس دنیا میں نفرت نہیں محبت کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ میں نے اپنا درد بھرا افسانہ سنا کر تمہیں بھی افسردہ کر دیا۔ آگے ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ...... وہ مسکرائی...... کیونکہ میں نے جارج کو معاف کر دیا ہے...... اس کا مطمئن اور اطمینان سے بھرا انداز دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی...... وہ نہایت نرم دل اور رحم دل تھی...... میں نے اسے کبھی بگڑتے اور چڑچڑاتے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اپنے بہتے آنسوؤں کو روکا اور بولی تم نے بہت صبر اور تحمل سے کام لیا اور یہی تمہارا خاصا ہے۔ جو لوگ خود پیاسے رہ کر دوسروں کو پیار کا جام پلاتے رہتے ہیں وہ بڑے مہمان ہوتے ہیں۔ ☆☆☆

صرف ایک پیالی چائے

آخر وہ تھی کون......؟......پھٹی......ملگجی سی ساڑی میں پاؤں پسارے سربازار تماشہ بنا بیٹھی لمبی سڑک کو یوں تاک رہی تھی جیسے اسے کسی کا بے انتہا انتظار ہو اور وہ آنے ہی والا ہو......اس بے بس اور مجبور سی بوڑھی عورت کے حال زار پر مجھے ترس آیا......میں اس کی مدد کرنے کے لئے رکی لیکن لوگوں نے اسے گھیر لیا اور مجھے مجبوراً آگے بڑھنا پڑا۔

''وہ اب کبھی نہیں آئے گا'' انجانی بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی......میں کھڑی سوچتی رہی......اس بوڑھی کو کس کا انتظار ہے......کون ہے جو لوٹ کر نہیں آئے گا......اس سوال نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا......

صبح تیز تیز قدم اٹھاتی میں اپنے گھر کے گیٹ تک ہی پہنچی تھی......سنو......کسی نے مجھے پکارا......میں پلٹی......وہی الجھے سفید بال وہی آنسو بھری آنکھیں۔ وہی غمگین چہرہ، پچھلی رات وہ جتنی بے چین تھی آج اس سے کہیں زیادہ پریشان نظر آرہی تھی......بڑی افسردہ سی آواز میں بولی......صرف ایک پیالی چائے......میں فوراً ہی پلٹی......چائے لے کر آگے بڑھی ہی تھی کہ کرونا نے میرا راستہ روکا......چائے کی پیالی میرے ہاتھوں سے لے کر اونچی آواز میں بولی......ایک پیالی چائے دے کر کیوں اپنی جان پر وبال لینا چاہتی ہو......مجھے ان کی اس حرکت پر شدت سے غصہ آگیا......میں بھی چیخی......ماسی ایک مسکین اور غریب عورت کو ایک پیالی چائے دینے میں کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا......وہ ہل کرنہ دیں......بولیں یہ کام میرا ہے......تم آفس جاؤ......تمہیں دیر ہو رہی ہے......یہ لمبی کہانی پھر کبھی......ماسی کی ضد کے سامنے تو کسی کی بھی چلی نہیں تھی پھر بھلا میرا کس گنتی میں شمار تھا......میں پیر پٹختی آگے بڑھ گئی......

اندر کمار بے حد حلیم......شریف اور سادہ طبیعت کے انسان تھے......سب کو درس دیتے تھے کہ خدا نے جو بھی دولت انسان کو دی ہے جمع کرنے کے لئے نہیں بلکہ اچھے کاموں میں صرف کرنے کے واسطے دی ہے۔ وہ خود شو بزنس مین تھے۔ مشہور ہیرو ہیروئنز ان کے گھر کے چکر لگاتے تھے۔ اور آج کچھ بھی نہ بچا تھا۔ وہ اپنے تلخ دن بھولے نہیں تھے شاید اسی لئے وہ ہمیشہ دوسروں کے معاملات اور مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیشہ دوسروں کا سہارا ہی بنے رہے......

اندر کمار اپنے چاروں بیٹوں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ لوگ نہ ہی کبھی کسی سے الجھتے تھے اور نا ہی ظاہرا کسی کو ان لوگوں سے کوئی شکایت تھی۔ ان کی بیوی ساگریکا بھی بڑی نیک اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ شوہر کے ہر حکم پر سرخم کرنے والی۔ ان کے ساتھ ساتھ چلنے والی۔

ان کا گھر واقعی سکون اور آسودگی کا گہوارہ تھا۔ سارے جہاں کی نعمتیں انہیں حاصل تھیں۔ بس کمی تھی تو صرف ایک بیٹی کی۔ بیوی کو اداس دیکھ کر اندر کمار سمجھاتے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہیئے چار چار بلی پلائی بیٹیاں ملیں گی۔ ہم اپنی بہوؤں کو پیار کریں گے تو وہ بھی ہمیں پیار اور عزت دیں گی۔ وہ ہنس پڑتیں۔ ہاں ہاں میں اپنی بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح رکھوں گی۔

وہ اکثر کہتی تھیں۔ بیٹی تو ہے نہیں سو جہیز کی اب مجھے فکر نہیں۔ میرے سر پر جو پختہ چھت ہے وہ میرے چار مضبوط ستونوں پر ٹکی ہے۔ بس خدا انہیں سلامت رکھے۔ بیٹے تھے بھی ایک سے بڑھ کر ایک۔ قابلِ فخر۔ شہر کے بہترین انگریزی اسکولوں سے پڑھ کر اب کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ والدین انہیں تلقین دیتے کہ علم سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ یہ تو میوے سے بھرے درخت کی طرح ہے جتنا علم حاصل کرو گے وزن بڑھتا ہی جائے گا۔

ان کا تیسرا بیٹا انوراگ بے حد ذہین تو تھا ہی ساتھ میں وجاہت کا شاہکار بھی تھا۔ جو دیکھتا کہتا ایسے خوبرو جوان کو تو فلم کا ہیرو ہونا چاہیئے تھا۔ انوراگ کو فلمی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باپ بھی ڈرتے تھے کہ شو بزنس کی چمکتی دمکتی دنیا کبھی بھی گل ہو سکتی ہے انہوں نے کئی مشہور ہیروز کا زوال بھی دیکھا تھا۔ سو اندر کمار نے اپنے بیٹوں کو اس بھڑکیلی چمکیلی دنیا سے دور ہی رکھا تھا۔

اندر کمار کی زندگی بڑے آرام سے گذر رہی تھی۔ ایک گمنام ٹیلی فون کال نے ان کی دنیا زیر و زبر کر دی۔ کوئی انجانی آواز تھی۔ آپ کا بیٹا غلط راستے پر چل پڑا ہے۔ اس کے قدم بربادی کے اس اندھیرے گھنے بیابان کی طرف اٹھ رہے ہیں جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں آتا۔ وہ دہشت گردوں کے جھنڈ میں شامل ہو گیا ہے۔ اندر کمار کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ رواں رواں چیخ پڑا۔ دہشت گرد...... پر یہاں کوئی دہشت گرد نہیں ہے، ادھر سے جواب ملا، بیوقوف مت بنو یہ دنیا دہشت گردوں کی نگری ہے یہاں ہر معاشرے میں دہشت گردی کی جڑیں موجود ہیں۔ فون کٹ گیا تھا۔ ریسور دور جا گرا تھا۔ اندر کمار تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور چیخ رہے تھے۔ یہ جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔ میرا بیٹا ایسا ہر گز نہیں کر سکتا۔ میرا بیٹا ہر گز ہر گز دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ بھلا وہ ایسا کیوں کرے گا۔ ان کی چیخیں سن کر سب ہی دوڑے آئے۔

اسی وقت باہر سے بھیانک۔ ہولناک اور جگر گداز آوازیں سنائی دیں۔ ایسا ہنگامہ جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ سب باہر بھاگے۔ جوہر کی لہولہان لاش دیکھ کر اندر کمار کو اپنا آپا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ پل میں اس شاندار کوٹھی پر دکھ کی کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ جوہر کے دونوں بڑے بھائی بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اندر کمار گہری نیند میں سوئے اپنے جگر گوشے سے سوال کر رہے تھے۔ تو جو ہر وقت معصومیت سے ہنستا مسکراتا رہتا تھا کب اور کیسے بھٹک گیا۔ یہ کڑواہٹ کی بیل تیرے اندر کیسے پنپی۔ تو اس گھر کا اجالا تھا۔ ہم سب کی جان تھا۔ آج تیرے بغیر یہ گھر تاریک اور بے جان ہو گیا ہے۔ تو ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا۔ میں تجھے کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔ تو تو اپنی ماں کی آنکھ کا تارا تھا۔ ارے کم سے کم اس کا تو خیال کیا ہوتا۔ تیری ماں جب ہوش میں آئے گی تو میں اس سے کیا بتاؤں گا۔ یہی کہ ہمارا لختِ جگر دہشت گرد تھا۔ یہ سن کر وہ کیسے جی پائے گی اس جوان مرگ پر ہر ایک نوحہ اور ماتم منا رہا تھا۔ اس کی ہلاکت پر سب آنسو بہا رہے تھے۔ اور پریشان بھی تھے۔ کہ کس طرح ایک سیدھا سادھا لڑکا دہشت گرد بن گیا۔

کوئی کچھ کہتا۔ کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ پولیس افسران کا کہنا تھا کہ یہ دہشت پسندوں کی کاروائی نہیں ہے کیونکہ ہمارا علاقہ دہشت گردوں کی یلغاروں سے محفوظ ہے۔ یہاں مکمل امن و چین ہے۔ اندر کمار جیسے خوش نصیب آدمی کے اگر ہزار دوست ہیں تو دشمنوں کی بھی کمی نہیں ہو گی۔ یہ کسی ذاتی رنجش کا نتیجہ ہے۔ اندر کمار کے دل کو تھوڑا سکون مل گیا تھا۔

ایک مضبوط ستون کے گرتے ہی ساگریکا کے گھر کی بنیادوں کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ دیواریں اور در

ڈگمگا گئے تھے۔ ان کی مضبوط چھت میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اس ہولناک حادثے نے اندر کمار کو اندر سے چور چور کر ڈالا تھا۔ بیٹا کیا رخصت ہوا اپنے ساتھ سارا گھر ہی لے گیا۔ دے گیا تھا رسوائی۔ غم، دکھ، رنج، اس کوٹھی پر آندھیوں کا موسم آکر ٹک گیا تھا۔ پولیس کے سمجھانے کے باوجود بھی ہر انگلی اندر کمار کی طرف اٹھی تو ان کا اس دنیا میں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ کہاں جا کر منہ چھپائے کس کس کو سمجھائے کے میرا بیٹا وہ نہیں تھا جو تم سمجھتے ہو۔

اندر کمار جیسے اچھے لوگ کم جیتے ہیں لیکن عزت سے جیتے ہیں۔ ان کی تو رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ زور کی آندھی کا زبردست جھکڑ ساگریکا کی سر کے اوپر کی مضبوط چھت ہی اڑا لے گیا۔ دل کا پہلا دورہ پڑا اور اندر کمار اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ساگریکا کی دنیا تو پہلے ہی اجڑ چکی تھی اب تو جیسے خاک اڑ رہی تھی۔ دونوں بڑے بیٹے گوہر اور امبر ماں سے لپٹ لپٹ کر رو رو کر تسلیاں دے رہے تھے۔ یقین دلا رہے تھے کہ پاپا کے نہ ہونے سے وہ غیر محفوظ نہیں ہو گئیں۔ ہم ہیں آپ کی دیکھ بھال کرنے کے لئے۔ پر ماں کے کلیجے کو ذرا سی بھی ٹھنڈک نصیب نہ ہوئی۔ اندر کی بے چینی کسی طرح کم نہ ہوئی۔ آشیانے پر، بجلیاں کڑک رہی تھیں اور ماں دکھ اور درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔

کچھ دنوں تک تو تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ اندر کمار کی رنگین دنیا جو دولت کے محور پر گھوم رہی تھی بکھرتی دیکھ سارے کاروباری دوستوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ غائب ہوئے جو دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اور اندر کمار کے لاکھوں کے قرضدار تھے۔ تاعمر ساتھ دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اوروں نے بھی اپنی راہ لی۔

رنج و غم کے سفر میں کون کب تک ساتھ دیتا آخری سانس تک بیٹوں کی رہنمائی کرنے والے باپ ہی نہ رہے تو خاندان کی مضبوط جڑیں بھی ہلنے لگیں۔ خود غرض اور کاروبار کی اس دنیا میں بیٹوں کے پاس بھی اتنا وقت نہ نکلا جو ماں کے دکھ بانٹتے۔ ان کے زخموں کی دوا کرتے۔ سب ہی بیگانے ہو گئے۔ آخر ہوا وہی جس کا ساگریکا کو ڈر تھا۔ دکھوں کے ہجوم میں وہ بالکل تنہا رہ گئیں۔ کس کس سے گلہ کرتیں۔ یہاں تو اپنے بیٹے ہی اپنے نہ ہوئے۔

جس دوران اس گھر پر قیامتیں آ کر گزر رہی تھیں انوراگ جرمنی میں تھا۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو جب سارا جگ سو جاتا اسے نیند نہ آتی۔ گھر کی یاد ستاتی۔ آنکھوں میں چھوٹے بھائی کا کرنیں بکھیرتا چہرہ گھوم جاتا۔ وہ تو سب کا دوست تھا۔ سب کا پیارا۔ کیسے بے درد ہوں گے وہ ہاتھ جنہوں نے اس مہکتے گلاب کو مسل ڈالا۔ اور پاپا۔ ہائے وہ کیسے کیسے تڑپے ہوں گے۔ ماں سے ملنے کو اس کا دل تڑپ اٹھتا اور دیر تک آنسو نہ رکتے۔ وہ کئی کئی راتیں جاگ کر گذار دیتا۔

پڑھائی ختم ہوتے ہی اس نے رخت سفر باندھا۔ وہ اپنے گھر جلد از جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں اپنی ماں کی پیار بھری گود میں اس نے بچپن گذارا تھا۔ جہاں بھائیوں کی محبت اور پاپا کا شفقت بھرا سایہ تھا۔ اس کے اندر سے ایک سرد آہ نکلی۔ ہائے۔ اب وہاں نہ پاپا کا شفیق سایہ ہوگا اور نا ہی جوہر کی چہکتی مہکتی آواز۔ ماں اور دونوں بڑے بھائیوں دوستوں اور بچپن کے سنگی ساتھیوں سے ملنے کی آرزو نے اسے بیقرار کر دیا تھا۔ اور کرانتی۔ وہ بھی تو میری راہ تک رہی ہوگی۔ کیسی ہوگی وہ۔ پل بھر میں وہ محبت کے اس جہاں میں پہنچ گیا جہاں وہ اپنی چاہت کا دیا جلا آیا تھا۔ میرا انتظار کرنا۔ میں ابھی راستے میں ہوں۔ اور تم میری منزل ہو۔ لوٹ کر تمہارے پاس ہی آؤں گا۔ برسوں پہلے کہے الفاظ من ہی من میں دہرائے تو اسے ایسا لگا کہ کرانتی وہیں اس کے روبرو بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ وہ ہولے سے بولا۔ بس تھوڑا اور۔ انتظار۔ میرے ہمسفر، بصرف

کچھ دن اور۔

سراسیمہ سا انوراگ دہلیز پر کھڑا اپنی شاندار کوٹھی کی ویرانی کا منظر دیر تک دیکھتا رہا۔ یہاں تو آسماں اور زمین سب ہی بدل گیا تھا سارے جاہ وجلال کا خاتمہ یوں ہوگا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ابھی تو صرف رات کے گیارہ ہی بجے تھے۔ عجب حال تھا۔ نا پہلے جیسا شور وغل نا ہی وہ چہل پہل۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں غائب تھیں۔ یہاں تک کہ گھر کا دربان بھی غائب تھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہوگیا۔ بیتے دن یاد آئے جب یہ گھر ہر غم وفکر سے بے خبر تھا۔ یہ تو محبت کی پھلواری تھی۔ اس نے سوچا کہاں گیا وہ ہنستا گاتا روشن گھر، جانے والے اپنے ساتھ ساری خوشیاں ساری رونقیں بھی لے گئے اور پیچھے چھوڑ گئے یہ تاریکیاں۔ اداسیاں۔ محرومیاں

بہت سوچنے کے بعد اس نے بیل بجائی۔ کچھ انتظار کے بعد ایک بوڑھی عورت نے جالنے سے جھانک کر پوچھا۔ کون ہے۔ کہاں ہیں گھر کے سب لوگ، انوراگ نے سوال کیا۔ ماں جی اپنے کمرے میں ہیں وہ بولی جلدی دروازہ کھولو۔ وہ بیقراری سے چیخا۔ اندھیرے کوریڈور کی خاموشی نے اسے متوحش کر ڈالا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ گہرا سناٹا تھا جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔

ماں...... مدھم سی روشنی میں دبلے پتلے سوگوار سے تنہا وجود کو دیکھ کر اس کا جگر شق ہوگیا۔ اسے دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔ کہ تین تین ہونہار بیٹوں کی ماں یوں غموں میں ڈوبی تنہا گم صم سی بیٹھی تھیں۔ کتنے لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں کے لئے سوچتا ہوا دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ ماں کے قدموں میں بیٹھ کر اور سر ان کی گود میں رکھ کر وہ بلک بلک کر رو دیا۔ اب دونوں کے آنسو کہاں رکتے۔ ماں نے کئی بار ماتھا چوما۔ سر پر ہاتھ پھیر کر کہا یہ دکھ تو ہمیں زندگی بھر ہی رلاتا رہے گا۔ اب تسلی کر۔ چپ ہو جا۔ دل ذرا سنبھلا تو بولا۔ اماں یہ سب کیا ہوگیا۔ کس کی بد نگاہی ہمارے گھوارے کو کھا گئی۔

ماں نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ جب قسمت روٹھتی ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے سب اجڑ جاتا ہے۔ مجھے تو جواہر کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اچانک تیرے پاپا بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا تو گھر بار سب ہی لٹ گیا۔ غم کی شدت نے آگے بولنے نہ دیا۔

پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی۔ بڑا یاد کرتے تھے تجھے۔ میں بھی بہت تڑپی۔ سوچتی تھی تو بھی اوروں کی طرح وطن اور ماں کو بھول کر وہیں کا ہو کر رہ جائے۔ روز ہی تیرا انتظار کرتی تھی۔ اگر تو ہوتا تو۔ وہ پھر گم صم سی ہوگئیں۔ ماں کی ہر بات انوراگ کے دل وجگر کو خراش کر گئی۔ دھیرے سے بولا۔ اماں میں بھی کم نہیں تڑپا پر میرا لوٹنا ممکن نہیں تھا۔ جوہر کی موت کے بعد تو میں وہاں ایک پل بھی ٹکنا نہیں چاہتا تھا پر پاپا نے آنے کی اجازت ہی نہ دی۔ بولے جو اس پار چلے جاتے ہیں وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے تیرے آنے سے وہ لوٹ تو نہیں آئے گا۔ اگر تو آ گیا تو کبھی واپس نہیں جا پائے گا۔ تجھے آفتاب کی طرح چمکتے دیکھنے کا میرا خواب پورا نہ ہو سکے گا۔ میری قسم کھا کر وعدہ کر۔ تو کورس ختم کر کے ہی واپس گھر آئے گا۔ اماں ان کا حکم میں ٹال نہ سکا۔ وعدہ جو دیا تھا۔

انوراگ نے سخت پریشان ہو کر سوال کیا۔ اماں گھر کے باقی لوگ کہاں ہیں۔ آپ اکیلی کیوں ہیں۔ اماں کے آنسو پھر بہہ نکلے۔ درد بھرے لہجے میں بولیں۔ اکیلی ہوں۔ کیونکہ دنیا کا یہی دستور ہے۔ کڑے وقت میں اپنے

بھی اپنے نہیں ہوتے۔ مجھے اپنے بیٹوں سے بڑی توقعات تھیں۔ ہر ماں کی طرح میں بھی سوچتی تھی کہ...... پہلے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سب کچھ بدلتا گیا۔ میرے بیٹوں کے دل مجھ سے دور ہو گئے اور میری اذیت کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھر میں کوئی ہوتا ہی نہیں جس کو اپنے دل کا دکھ سناؤں۔ انوراگ نے ماں کو اپنی مضبوط باہوں میں سمیٹ کر کہا۔ اماں اب میں آ گیا ہوں اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ماں کے تڑپتے دل کو تھوڑی سی راحت ملی تو بہتے آنسو خود بخود سوکھ گئے۔

اپنے کمرے میں انوراگ کو لگا جیسے ساری فضا سوگواری نوحہ اور ماتم منا رہی ہے۔ پچھلے گذرے طوفان کے غبار کے نشان اب بھی نمایاں تھے۔ ماں کی بے بسی کے احساس اور اپنے اطراف پھیلے سناٹے اور تاریکی نے اسے مزید بے چین کر دیا۔ وہ کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ رات کے آخری پہر گوہر اور امبر گھر لوٹے تھے۔ اس کا دل چاہا بلند آواز میں اپنے دونوں بھائیوں سے سوال کرے کہ تم جو زمانے بھر کے دوست ہو۔ یوں بے فکر۔ بار احت شرفا بنے پھرتے ہو...... کیا تمہیں اپنی ماں کے دکھوں کا اندازہ ہے۔ تم کیسے بھول گئے کہ ماں کی ہستی سب سے عظیم ہوتی ہے۔ ماں کو دکھ دینے والے کو خدا کبھی معاف نہیں کرتا...... انوراگ کی یہ پہلی رات بڑی بے چین گذری۔

سب سو رہے تھے۔ اجالا ہونے سے پہلے ہی وہ گھر سے نکل پڑا...... کرانتی کی کو دیکھتے ہی اس کا منتشر ذہن ذرا سا ہلکا ہوا...... انوراگ نے یہ بھی نا پوچھا کہ اتنے ڈھیر سارے دن کیسے کٹے...... سادگی سے بولا...... مجھے تمہاری اور تمہارے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔ تمہارا پیار اور توجہ میری ماں کو دوبارہ خوشیاں دے سکتا ہے...... کرانتی اس کی بات سن کر بری طرح چونکی...... چائے کی پیالی ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی...... نظریں انوراگ کے چہرے پر جما کر بولیں یہ فیصلہ میرے لئے کرنا نہایت مشکل ہوگا...... پیار پر کسی کا زور نہیں ہوتا...... یہ تو بس ہو جاتا ہے...... تم اس چیز کا ذکر کر رہے ہو جو کبھی ممکن ہو ہی نہیں سکتی...... شادی دو خاندانوں کا جوڑ ہوتا ہے...... انوراگ...... میرا تو کوئی خاندان ہی نہیں میں تمہاری طرح کسی چمن کا پھول نہیں...... میں تمہاری محبت کے قابل نہیں تھی لیکن تم نے مجھے اتنی محبت دی کہ سمیٹنے کے لئے میرا دامن چھوٹا پڑ گیا...... نہیں...... انوراگ...... میں تم سے شادی نہیں کر سکتی......

انوراگ کا سپنوں اور ارمانوں سے بھرا دل جیسے تھم سا گیا...... کرانتی کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے بولا ...... میں یہ سب سننے نہیں آیا...... میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے صرف دو ہی خواب تھے...... پہلا تعلیم مکمل کرنا اور دوسرا تم...... تمہارا ساتھ...... کرانتی وقت بہت بیت چکا ہے...... مجھے تو ایسا لگتا ہے انتظار میں صدیاں بیت گئیں...... ہم دونوں مدتوں کے بعد ملے ہیں اور اب کبھی نہیں بچھڑیں گے۔ ہمارے خواب پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے......

کرانتی بولی...... آج میں سب کچھ کہنا چاہتی ہوں اور تمہیں میری بات سننا ہوگا...... میرے نانا جی ڈھاکہ کے رہنے والے تھے...... جب ہندوستان کا بٹوارا ہوا انہوں نے اپنی جنم بھومی چھوڑنے سے انکار کر دیا...... ان کا وہاں بہت بڑا کاروبار تھا...... دوست احباب تھے...... ماں بتاتی تھیں وہ سب لوگ وہاں بہت خوش تھے...... پھر چاروں طرف دہشت اور خوف کی فضا پھیلی...... حالات بگڑتے بگڑتے بہت خطرناک ہو گئے...... ایسا ہنگامہ اور شور برپا ہوا کہ زمین ہی تھرا گئی...... مار پیٹ اور خونریزی شروع ہو گئی...... رات کے اندھیروں میں سب وہاں سے بھاگے...... باڈر پر بھی آگ اور خون کا کھیل جاری تھا...... بہت سے ہلاک ہوئے...... عورتوں کا برا حال ہوا......

اب میں ان کی بربریت کا کیا ذکر کروں...... ماں کے خاندان کا ہر شخص مارا گیا...... ماں بے ہوش ہو گئی تھیں ......ان کو مردہ سمجھ کر خنجر نہیں بھونکا...... خنجر بھوک دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا...... میں تو نا ہوتی ...... بے نام ونشان ...... میری ماں کی زندگی کی کشتی مصیبتوں کے بھنور میں چکر لگا رہی تھی...... نا کوئی ساحل تھا نا کنارا...... میں ان کی کوکھ میں پل رہی تھی ......غریبی انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی...... ماں نے بھیک تک مانگی...... نہ سر پر چھت تھی نہ پیٹ میں کھانا...... ایک دن بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر اسی چوکھٹ پر بے ہوش پڑی تھیں اس گھر کے مہربان لوگوں کو ان پر ترس آ گیا...... یا یوں سمجھ لو خدا پھر سے مہربان ہو گیا...... میری ماں کو ایک بار پھر حقیقی ماں کا پیار میسر ہو گیا...... انہوں نے نا صرف میری ماں کو پناہ دی مجھے بھی اپنے آنچل میں چھپا کر سارے گرم وسرد موسموں سے محفوظ رکھا...... دنیا والے تو یہ جانتے ہیں کہ میں ان کے اکلوتے بیٹے کی نشانی ہوں جو انہیں دنوں میں ڈھاکہ میں ہلاک کیا گیا تھا...... یہ جو کچھ بھی تم دیکھ رہے ہو سب ان کا ہی تو ہے......اُن کی محبت اس بات کا ثبوت ہے کے دنیا میں جو کچھ بھی باقی ہے وہ صرف محبت کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہے...... نفرت۔ حسد۔ جنگ اور بم تو خدا کی اس خوبصورت کائنات کو بھسم کر رہے ہیں...... وہ تینوں تو غموں کے مارے چل بسے رہ گئی میں بدنصیب...... بالکل تنہا اور اکیلی...... وہ بری طرح رو پڑی......

کرانتی کا کرب ودکھ دیکھ کر انوراگ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا...... وہ تو دل میں انگنت آرزوئیں لے کر لوٹا تھا۔ کچھ ٹھہر کر بولا...... تمہاری داستان نے میرا دل دہلا دیا لیکن یہ میری خواہشوں کے چراغوں کو گل نہیں کر سکتی...... اس پورے قصے میں تمہارا تو کوئی جرم نہیں...... تم ناحق اپنے کو مجرم سمجھ کر پشیمان ہو رہی ہو...... اور عمر بھر پاتال میں رہنے کا تہیہ کر رہی ہو...... ہر انسان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے...... الگ ایک پہچان ہوتی ہے...... مجھے فخر ہے کہ تم...... تم ہو...... آج سماج میں تم خود اپنے حوالے سے...... پہچانی جاتی ہو۔ اس مقام پر ہو جہاں مفلس اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کی مدد کر رہی ہو ۔افسوس تو مجھے یہ ہو رہا ہے کہ اتنے سالوں کی رفاقت کے بعد بھی نا ہی تم مجھے پہچان سکیں اور نا ہی میری محبت کو سمجھ سکیں۔ یقین کرو دوریاں بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکیں...... وہ مسکرایا...... جب تک یہ آنکھیں برقرار رہیں گی صرف تم کو ہی دیکھیں گی...... تمہاری محبت سے دستبردار ہونے کا خیال ہی میرے لئے موت کا پیغام ہے...... بھئی مجھے میری زندگی بہت پیاری ہے...... میں اسے کسی حال گنوانا نہیں چاہتا میں جینا چاہتا ہوں۔ تمہارے لئے...... اپنی ماں کے لئے اور اپنے اس وطن کے لئے......سو خدا کے لئے آئندہ اس قصے کو بھی نہ دہرانا...... بھول جاؤ اس ماضی کو جو تمہیں بار بار رلاتا ہے...... کرانتی کے دل کے اندر سارے دیئے جل اٹھے......

یوں تو زندگی کا ہر لمحہ یادگار ہوتا ہے لیکن کرانتی کا دل چاہا یہ پل نہ بیتیں...... انوراگ ایک دم کھڑا ہو گیا، گھر پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا...... میں چلتا ہوں...... جلد ہی واپس آؤں گا...... کرانتی کی مسکراہٹوں نے اس کی ہر بات کی تصدیق کی...... جو بیٹھی خود اپنی خوش بختی پر رشک کرتی رہی......

دل میں یہ امید لئے کہ بھائی بڑے جوش وخروش سے اس کا استقبال کریں گے وہ گھر پہنچا...... یہ جان کر کہ گھر میں کوئی بھی اس کا منتظر نہ تھا...... دل کو بڑا جھٹکا لگا تھا...... گوہر اور امبر نے بڑی بے رخی سے اس کی جانب دیکھا۔ ......گوہر نے سوال کیا...... ارے تم کب آئے...... انوراگ کو بڑی بیگانگی کا احساس ہوا نا ہی بھائیوں نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگایا اور نا ں ہی باپ اور بھائی کے اندوہناک حادثوں کا ذکر کیا...... وہ خود آگے بڑھا اور بولا...... ماں نے بتایا تو

ہوگا...... میں تو رات ہی آ گیا تھا...... امبر بولا...... صبح آفس جانے کی جلدی میں کسی سے ملنے ملانے کا وقت ہی نہیں ملتا ...... سن کر انوراگ حیرت اور صدمے سے ہلکان ہو گیا...... ماں سے بھی ملنے کا وقت نہیں ان دونوں کے پاس......

اسے گوہر کے رویے پر بے حد ملال اور افسوس ہوا...... بڑے بھیا تو اصولوں کے پکے تھے...... ہمیشہ ماں سے کہتے تھے...... انوراگ مجھے بہت پیارا ہے اپنے آپ سے بھی زیادہ...... انہیں کیا ہو گیا...... یہ کیسے بدل گئے، گلے سے بھی نہیں لگایا...... وہ دونوں تو چلے گئے...... انوراگ نم آنکھیں لئے سوچتا رہا طوفان گھر تو تباہ کر ہی گیا اس کے تند جھونکے گھر سے محبت اور خلوص بھی اڑا کر لے گئے...... یہاں تو اب کچھ بھی باقی نہیں بچا...... جہاں پیار نہیں وہاں زندگی نہیں

انوراگ کا دل و دماغ غم اور فکر سے بوجھل تھا...... وہ نا ہی کسی سے ملنا چاہتا تھا اور نا ہی کلب جانے کے موڈ میں تھا...... پر اسے جانا پڑا...... برسوں بعد کلب کے دروازے پر کھڑا دیکھ اس کے دوستوں نے دھوم مچا دی...... سب نے یک بیک بے تحاشہ تالیاں بجا کر بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا...... اسے گھیر لیا...... یار کہاں جا کر چھپ گئے تھے...... یہاں تمہارے بنا ہر محفل سونی اور بے جان رہی...... اب ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے...... قہقہے لگ رہے تھے...... وہ سب سے یکے بعد دیگرے گلے ملتا ہوا بولا...... یار بچھڑ کر ملنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے...... وہاں جا کر احساس ہوا کہ دوستوں کی محبت اور صحبت کیا شے ہے۔ یوں احساس ہوتا تھا کہ میرا تو سب کچھ یہاں ہی رہ گیا ہو وہاں دنیا بھر کی نعمتیں دستیاب تھیں کمی تھی تو بس تم جیسے دوستوں کی...... اس ماحول کی...... نا یہ قہقہے تھے نا ہی یہ محبت بھری محفلیں...... تم جیسے اچھے دوست بھی بڑے نصیبوں سے ملتے ہیں۔ ورنہ کون کس کو یاد کرتا ہے۔ ہمارا وطن اتنا خوبصورت ہے۔ کس چیز کی کمی ہے یہاں...... سب کچھ ہی تو ہے میری سمجھ نہیں آتا کیوں ہم ہندوستانی صرف زیادہ دولتمند ہونے کے لالچ میں اپنے مقدر میں ساری زندگی کی جلاوطنی لکھ لیتے ہیں۔ جب کہ جانتے ہیں یہ دولت آنے جانے والی شے ہے۔ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ کہیں ٹکتی ہی نہیں...... وہاں میرے لئے تو ایک ایک دن کاٹنا دشوار ہو گیا تھا...... اس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ...... میری توبہ...... میں آئندہ اپنا شہر بھی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا...... جس کا گھر چھوٹے وہی بوجھے خانہ بدوشی کے دکھ ...... وہی جانے داغ ہجرت کیا ہے......

وہ دیکھ رہا تھا کہ گھر میں جوہر اور پاپا کی موت سے کسی کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا...... بھائیوں کی زندگی پہلے کی طرح برق رفتاری سے رواں دواں تھی...... سب ہی خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے...... بس ماں کی حالت نیم مردہ سی تھی ...... اس بیگانگی کے ماحول میں اداسی اور مایوسی اس پر حاوی ہوتی جاری تھی...... وہ ایک ایک قدم بڑی سوچ سمجھ کر اٹھا رہا تھا کہیں کسی کو کوئی شکایت نہ ہو جائے...... کوشش بھی کر رہا تھا کہ کسی طرح گھر میں پرانا جیسا چین و امن لوٹ آئے...... گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں......

اچانک گوہر کو بزنس کے کام سے جاپان جانا پڑا...... شوبھنا کی موٹر ٹکرائی، اطلاع ملتے ہی انوراگ ہسپتال پہنچا...... وہ پورے ہوش و حواس میں نہیں تھی...... کچھ سوئی کچھ جاگی سی کیفیت میں وہ جو کچھ کہہ رہی تھی سن کر انوراگ کو لگا جیسے پھانسی کا پھندا ناگہاں اس کے گلے میں آ پڑا ہو...... جی چاہا فوراً وہاں سے بھاگ جائے...... اس کے صاف شفاف دل میں اس قسم کے نیچ اور گھنونے جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی...... بے حد حیرانی اور پریشانی کے عالم میں وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے شوبھنا کو گھورتا ہی رہ گیا......

وہ بھائیوں کی نفرت کے اظہار کا عذاب سہہ ہی رہا تھا۔ اب ایسا کیوں...... اس کے ساتھ ہی کیوں یہ سب ہو رہا تھا...... امبر اور نیہار کا شہر میں نہیں تھے...... مجبوراً انوراگ کو ہسپتال میں رکنا پڑا تھا...... جب شوبھنا گھر لوٹی تو انوراگ کے اندر سے بہت احتیاط برتنے کا تقاضا ابھرا وہ شوبھنا سے دور دور ہی رہتا...... کبھی اچانک سامنے آجاتی تو وہ مکمل خاموشی اختیار کر لیتا...... اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا...... اس ہولناک طوفان کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر اس نے جلد از جلد شادی کرنے کا ارادہ کر لیا......

انوراگ الجھنوں میں گھرا...... فکروں اور اضطراب میں مبتلا تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا...... دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا...... سکوت کا پردہ چاک ہوتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا...... شوبھنا کو دیکھتے ہی دل دھک ہو گیا...... وہ ہولے ہولے آگے بڑھ رہی تھی...... اور اس کے ساتھ ساتھ انوراگ کی پریشانی اور حیرانی بڑھتی جا رہی تھی...... وہ قریب آئی تو نہایت حیران ہو کر بولا...... خیریت تو ہے...... آپ...... اس وقت یہاں کیسے...... اس کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی جبکہ شوبھنا کی مخمور نگاہیں محبت کا اعلان کر رہی تھی...... اسے کبھی یہ وہم وگمان بھی نہ ہوا تھا کہ اس کی بڑی بھاوج رات کے اس پہر اس طرح اس کے سامنے آئے گی...... شوبھنا خاموشی سے پاس والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر دھیرے سے انوراگ کا ہاتھ چھوا تو وہ بری طرح چونک کر اپنی جگہ سے ہٹ کر دور جا کر کھڑا ہوا...... شدت کا غصہ اور ایک عجیب سی شرمندگی سے انوراگ کا چہرہ سورخ ہو گیا...... شوبھنا بڑے شیریں لہجے میں بولی...... گھبرا گئے۔ ارے گھبراؤ نہیں ...... میں تو صرف یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ اتنی مدتوں کے بعد یہ دوریاں اور یہ خاموشی کی درار کیوں۔ تم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے...... میری دیکھ بھال کی...... اور......

انوراگ نے اسے بھابھی کہنے سے گریز کیا...... بولا...... احسان نہیں...... میں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف میرا فرض تھا میرے بڑے بھائی کی عدم موجودگی میں اگر ذرا سی کوتاہی ہو جاتی تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتے...... کیا آپ نہیں جانتیں کہ وہ آپ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اتنی زیادہ کہ آپ کے سوائے اور کوئی نظر نہیں آتا اپنی ماں بھی نہیں...... وہ نرم لہجے میں گویا ہوئی...... محبت...... اور مجھ سے...... بہر حال اچھا سلوک احسان ہی ہوتا ہے۔ انوراگ...... میں ہر وقت شگفتہ نظر آنے والی حقیقت میں بہت اکیلی ہوں...... بہت اندھیرا چھایا ہے میرے اندر، تمہیں دیکھنے کے بعد میرے اندر سب کچھ بدل گیا ہے...... میرا ساتھ دو...... انوراگ...... پلیز...... ورنہ یہ تاریکیاں یہ تنہائیاں مجھے نگل جائیں گی......

وہ اندر سے لاوا اگل رہی تھی اور انوراگ جلتے کوئلے کی طرح دہک اٹھا تھا...... محبت کے اس واضح اظہار نے انوراگ کے دل وجگر خاک کر دیئے تھے...... اس کا ذہن چیخنے لگا۔ یہ آپ کا قصور نہیں...... سارا قصور اس مغربی تہذیب کا ہے۔ جس کے پیچھے ہم سب آنکھیں بند کر کے بھاگے جا رہے ہیں۔ جو ہمارے سماج کو برباد کر رہی ہے۔ بے وفائی اور بے حیائی ہماری تہذیب کا حصہ بن گئی ہے۔ آپ کو اور نیہاریکا بھابھی کو بہت اونچا درجہ دے کر میں نے اپنے دل کی مسند پر بٹھایا تھا۔ لیکن آپ کے ناپاک خیالوں نے آپ کو اس اونچے مقام سے زمین پر لا گرایا ہے۔ سمجھایئے اپنے اس نادان دل کو جو بھٹک گیا ہے۔ گمراہ ہو گیا ہے۔ بجھا ڈالیئے اس چنگاری کو کہیں ایسا نہ ہو کہ شعلہ بھڑک اٹھے۔ اور جنگل کی آگ کی طرح ہمارے پورے خاندان کو پھونک ڈالے۔ اس کا دل چاہا شوبھنا کی چاہت ٹپکاتی آنکھوں کو پھوڑ ڈالے۔ وہ یہ سب سوچ تو سکا پر زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکا کیونکہ کچھ رشتے انسان کو بالکل بے بس کر دیتے ہیں۔ اس کے اندر آتش فشاں

پھٹ پڑا تھا......اس کی شرخ انگارہ آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔ سنبھلنے میں کچھ وقت لگا.......دھیمے مگر سخت لہجے میں بولا......ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں......آج آپ نے ایک بے حد خوبصورت رشتے کا خون کر ڈالا ہے......مجھے رشتوں کا احترام کرنا آتا ہے......بہتری اسی میں ہے کہ اس قصے کو یہیں ختم کر دیں......انوراگ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا ......میز پر رکھے کانچ کے گلاس پر گرفت مضبوط ہو گئی تھی......کانچ کے ٹکڑوں نے اس کا ہاتھ بری طرح زخمی کر دیا تھا ......خون بہنے لگا تھا......دل میں بھی خون ہی خون تھا......وہ بے بسی کے احساس سے بے دم سا ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا......شوبھنا اس کے اس انداز پر کھول کر رہ گئی تھی......شکست خوردہ......وہ ست قدم اٹھاتی باہر نکل گئی تھی

شوبھنا پہلی فتح ہی حاصل نہ کر پائی تو اس نے شدید ردعمل کا اظہار کیا......وہ زہریلے انداز میں گھورتی ہوئی طوفان کی طرح انوراگ کے قریب سے نکل جاتی......اور انوراگ سہم سہم جاتا......جانتا تھا کہ اب پورا خاندان مصیبتوں کے گھیرے میں آنے والا ہے۔ اور یہ نئی آفت خاندان کے لئے پچھلی ساری آفتوں سے بدتر ہو گی......یہ بحران پورے خاندان کو لے ڈوبے گا......ان موجودہ حالات نے انوراگ کو بڑی پریشانی اور پشیمانی میں ڈال دیا تھا......محبت کی جنگ میں ہاری پاگل عورت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بحران سے کس طرح نپٹے......

گوہر لوٹ آیا تھا۔ جب گوہر اور انوراگ کا آمنا سامنا ہوا تو گوہر نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ امبر بھی بڑا پرایا پرایا لگ رہا تھا۔ گھر میں بھیانک خاموشی پھیلی تھی۔ اور اس خاموشی میں انوراگ کو ہر پل آنے والے خطرے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کو اس نفرت اور شبہ کی فضا میں سانس تک لینا محال ہو رہا تھا۔

کچھ دن یوں ہی بیتے۔ چھٹی کا دن تھا۔ گوہر کی گرجتی آواز سن کر انوراگ بھی اپنے کمرے سے باہر آیا۔ دیکھا ماں کے کمرے میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ قریب جا کر سنا۔ وہاں تو اس کے حشر کا ساماں ہو رہا تھا۔ امبر نے نیہاریکا سے سوال کیا تھا۔ آج یہ قیامت کس سلسلے میں برپا ہوئی۔ انوراگ کو احساس ہوا کہ یہ جال سب نے مل کر بچھایا ہے۔

اس کے لئے سب سے مشکل کی گھڑی اب آئی تھی۔ کس طرح سب کا سامنا کرے گا۔ کیا کیا الزام لگائے جائیں گے۔ کیا سزا سنائی جائے گی۔ شاید سزائے موت سے بدتر سزا ہو۔ جب گوہر نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا تو اسکا دل پوری شدت سے چاہا کہ سب کچھ کہہ ڈالے۔ حقیقت سے آگاہ کر دے۔ لیکن حقیقت بڑی کڑوی تھی۔ اور بہت ہی تکلیف دہ بھی۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا۔ لیکن زبان کھولتے ہی گھر میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ساری وضاحتیں رائیگاں جائیں گی۔ وہ مجبور ہو گیا۔ ہونٹ سی لیے۔ کچھ بھی نہ بولا۔ بس سوچتا رہ گیا کہ زبان بند رکھنے میں ہی دانشمندی ہے۔

گوہر اس کی طرف لپکا۔ میں نے تمہارے لئے کیا کیا نا کیا......ہمیشہ تمہیں پیار کیا......تمہاری خوشیوں کا خیال رکھا......اپنی ہر پسندیدہ چیز تم کو دی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بدنیت ہو۔ اتنے گر جاؤ گے کہ۔ گوہر کے شک کو یقین میں بدلتا دیکھ انوراگ اندر ہی اندر بکھر گیا تھا۔ ماں نے فوراً ہی گوہر کے بڑھتے ہوئے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ دھیمی آواز میں بولیں۔ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ اس قہر کے بھڑکنے کا سبب کیا ہے۔ اس سے ایسا کونسا فعل سرزد ہو گیا ہے جو تم اتنے خفا ہو رہے ہو۔ یہ نہ بھولو یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں جب سے یہ واپس آیا ہے تم لوگ اسے دشمنوں کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو۔

گوہر دھاڑا۔آپ ہی اپنے لاڈلے سے پوچھئے۔یہ جس معاشرے اور ماحول میں اتنے سال گذار کر آیا ہے وہاں یہ سب ہوتا ہوگا جو اس نے کیا ہے۔نا بڑوں کی عزت نا رشتوں کا لحاظ۔ماں ہم گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ان الفاظ نے ماں کے اندر شور قیامت برپا کر دیا۔چہرہ سفید پڑ گیا۔گھبرا کر بولیں۔اب دنیا بھر کو بتانا چاہتے ہو کہ بھائیوں میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ایسا کیا کر دیا اس نے جو تم بسا بسایا گھر چھوڑ کر جا رہے ہو۔

شوبھنا بڑے بھولے پن سے فوراً بولی...... ماں کوئی تو مجبوری ہوگی ورنہ کوئی اپنا گھر یوں نہیں چھوڑتا۔ماں نے اندرونی اذیت سے بلبلا کر ایک قہر بھری نظر شوبھنا پر ڈال کر کہا۔تم تو خاموش ہی رہو بہو۔تم گھر میں رہتی ہی کتنی دیر ہو۔جو چھوڑنے کی بات کر رہی ہو۔تم لوگوں کے لئے یہ گھر نہیں سرائے ہے۔یوں کہوں کہ تم لوگ موقع کی تلاش میں تھے۔شوبھنا سر سے پیر تک جھلس گئی۔ناگن کی طرح پھنکاری۔اب اس گھر میں کوئی عورت محفوظ نہیں ہے۔یکا یک گہری خاموشی چھا گئی۔شوبھنا کے الفاظ نشتر بن کر انوراگ کے سینے میں اترتے چلے گئے۔اسے لگا شوبھنا نے اسے کسی اندھیرے غار میں ڈھکیل دیا ہے۔شوبھنا کی فاتحانہ مسکراہٹ میں انتقام کی بھی جھلک تھی۔جب کہ ماں کے چہرے پر بے یقینی کی۔شوبھنا نے ایک بڑی معنی خیز نظر انوراگ کی سمت ڈالی جس کا سر شرم و ندامت کے بوجھ سے جھک گیا تھا۔شوبھنا کو بے حد مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے ماں نے کہا۔بہو یہ نئی غلط فہمی کی جڑ کہاں سے پھوٹی۔اگر کوئی اور عیب اس کے سر لگا سکو تو وہ بھی لگا دو۔گھر تو تمہیں چھوڑنا ہی تھا۔خوب بہانا سوجھا۔کیوں ایک بے قصور کو مجرم ٹھہرا رہی ہو۔تم دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی ہو ایک ماں کے نہیں۔

انوراگ حیران تھا کیوں ساری بلائیں اس پر ہی نازل ہو رہی تھیں۔کوئی اور عورت ہوتی تو وہ خود قیامت کھڑی کر دیتا پر یہاں تو اس کے بڑے بھائی کی عزت کا سوال تھا۔ان کی ماں اور محبت کا سوال تھا۔یہی تو امتحان کی گھڑی تھی۔بڑے بھائی کی محبت اور مہربانیوں کا بدلہ چکانے کی گھڑی۔اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا تھا جنہیں اپنی بیوی کی وفا اور محبت پر بڑا ناز تھا۔وہ اپنے بھائی کی خوشیوں کی خاطر خود کو مٹا دے گا۔زہر کا یہ پیالہ اسے ہر حال میں پینا ہی ہوگا۔

ماں سمجھ گئی تھیں کہ انوراگ کی اس چپ میں ضرور کوئی بڑا بھید چھپا ہے۔بیٹوں سے پر سوز لہجے میں بولی۔بسے گھر میں پھوٹ پڑ جائے تو وہ گھر قائم نہیں رہ سکتا۔گوہر سے بولیں۔بڑا بیٹا تو گھر کا سربراہ سمجھا جاتا ہے۔میری نظروں میں تو تم سدا بچے ہی رہو گے لیکن اب شاید تم کو اپنی ماں کی نصیحت کی ضرورت نہیں رہی۔تم کرو گے تو وہی جو چاہتے ہو۔بیٹا ایسی بڑی غلطی نا کرنا۔جس کا بعد میں تم مداوا نہ کر سکو اور دنیا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

غم کی شدت سے ماں کا دل و جگر خون ہو گیا۔وہ زار زار رو رہی تھیں۔سب چپ سادھے کھڑے رہے۔انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔جب کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ کھولیں تو بس انوراگ تھا۔وہ ماں کی آغوش میں سما کر بے ساختہ رو پڑا تھا۔دونوں کو بڑا زبردست صدمہ پہنچا تھا۔انوراگ کی ہر خوشی پامال ہو گئی تھی۔اس کا دل تو یوں بھی اس کی تمناؤں کا گورستان بن کر رہ گیا تھا۔اس نے ایک اور گہری طویل قبر اپنے دل میں کھود کر اس راز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے دبا دیا۔

انوراگ کو اپنی ذلت کا احساس جینے نہیں دے رہا تھا۔پھر بھی اس کی دلی خواہش تھی کہ گھر میں جو بحران پیدا ہو گیا ہے کسی طرح ٹل جائے۔لیکن گوہر اور امبر اپنے اپنے گھروں میں منتقل ہو گئے۔انوراگ زخموں سے بھرا دل لیے گھر

کی دہلیز پر بالکل تنہا کھڑا رہ گیا۔ یہی تو اس کے اپنے تھے۔ اور اب ان سے بچھڑ کر یوں لگ رہا تھا جیسے سلسلہ حیات ہی ٹوٹ جائے گا۔ وہ سوچ سوچ کر حیران تھا۔ کیونکہ جب سے واپس آیا ہوں ٹھوکریں ہی کھا رہا ہوں۔ صرف ناکامیوں کا منہ دیکھ رہا ہوں کیوں بدنصیبی اس کا مقدر بن گئی ہے۔ کیوں...... آخر کیوں...... نا آتا اور نا ہی مصیبتوں کا یہ لامحدود سلسلہ شروع ہوتا۔ کھلی آنکھیں جلتی رہیں اور اس کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ وقت گزرتا گیا۔

وہ دن بڑے مشکل کے تھے۔ انوراگ کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلا تو دوستوں کے فون آنے شروع ہو گئے۔ کہاں ہو آج کل یار...... یہ کیسی مصروفیت ہے کہ دوستوں کو ہی بھول گئے۔ تمہارے بغیر کلب بے رونق ہو گیا ہے۔ اب آ بھی جاؤ...... وہ ہنس کر ٹال دیتا...... آؤں گا یار...... ضرور آؤں گا...... آج نہیں کل ضرور...... اور یوں ہفتے بیت گئے۔ اس نے اپنے آپ کو دنیا سے الگ کھینچ لیا۔ سب سے رابطہ توڑ لیا وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وقت کے ساتھ انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ جو برسوں کے یار تھے کلب میں بیٹھے انوراگ پر تہمتیں لگا رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ گلشن نے سنتے ہی غم و غصے کا اظہار کیا۔ غرا کر بولا یہ سارے افسانے سچ نہیں ہو سکتے۔ کل تک وہ تمہارا دوست تھا۔ سب کی نظروں میں بڑا مقبول تھا۔ آج تم سب لوگوں نے بھی اس پر الزاموں کی بوچھار کر دی۔ اس کے بارے میں ایسی ہولناک باتیں نہ کرو۔ کیونکہ وہ ایسا شرمناک اور معیوب فعل انجام دے ہی نہیں سکتا۔ اس جیسا خوبصورت اور خوب سیرت بندہ جس لڑکی کو چاہے اپنا سکتا ہے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے پاس ایسی فضول باتوں کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔

گلشن اٹھا اور سیدھا انوراگ کے گھر پہنچا۔ انوراگ اپنے مسئلوں کے درمیان گھرا آنکھیں موندے پلنگ پر دراز تھا۔ چہرے کے تاثرات کہہ رہے تھے کہ اس کے اندر بہت بے سکونی پھیلی ہوئی ہے۔ اندر زبردست شور وغل برپا ہے۔ جب دیر تک اس نے آنکھیں نہیں کھولیں تو گلشن نے کہا...... کیا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے...... ان چند ہفتوں میں تم تو بالکل بوڑھے ہو گئے ہو...... آنکھیں کھولو...... آنکھیں بند رکھنے سے مصیبتیں ٹل نہیں جاتیں...... کچھ بات کرو...... بولو کچھ تو بولو...... افواہیں پھیلانا تو لوگوں کا کام ہے۔ بولنے والوں کو بولنے دو......

یہ سنتے ہی انوراگ نے آنکھیں کھول کر گلشن کی طرف مایوس کن نظروں سے دیکھ کر کہا...... دنیا والے کیا سمجھے پیر پرائی...... جس کا دل ٹوٹے وہی جانے ہے...... زخم جدائی کا درد کیا ہوتا ہے۔ سب جانتے ہو تو پوچھتے کیوں ہو...... گلشن نے کہا پوچھنا ضروری ہے۔ دوست کی مجبوری سمجھتا ہوں۔ تمہارا دوست تو ہوں ہی اور اس خاندان کا ہمدرد بھی ہوں...... یار دوستوں کے ساتھ غم بانٹنے سے غم کم ہو جاتا ہے۔ وہ بولا۔ نہیں یار یہ درد لا دوا ہے۔ یہ غم کم نہیں ہو سکتا۔ بھائیوں کی باتوں نے میرے دل کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ مجھے غم تو اپنے بھائیوں کی بے اعتقادی اور بدگمانی پر ہے۔ ہم بھائی ایک دوسرے سے زنجیر کی طرح جڑے تھے۔ ایک ہی جھٹکے میں ساری کڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ میں تو صرف ان کی محبت کا طلبگار تھا۔ اس باہمی جھگڑے نے میرے پیروں میں بزدلی کی بیڑیاں ڈال دی ہیں...... انہوں نے ماں کی بھی نہ سنی...... سب کچھ اجڑ گیا...... اس گھر کی خوشیاں لٹ گئیں...... انوراگ کی آواز بہت بوجھل ہو گئی تھی۔

گلشن مسکرایا...... اپنے بزرگوں کی روایت پر نہ چلنا ہی تو آج کل کی ریت ہے۔ تم خواہ مخواہ لوہے کی بھٹی میں جل رہے ہو...... جو ہو گیا سو ہو گیا...... اب سنبھالو اپنے آپ کو...... بھائیوں کے جانے سے تمہاری دنیا تو ختم نہیں

ہو جائے گی۔تم ہمیشہ مجھے تقویت بخشتے تھے۔آج تمہارا وہ زور...... وہ ہمت کہاں گئی...... حوصلہ قائم رکھو...... میرا اپنا خیال ہے گھاٹے میں تو تمہارے بھائی رہے۔تمہارے ساتھ تمہاری ماں ہیں جو تمہاری دھڑکنوں کو محسوس کر سکتی ہیں۔تمہارا درد سمجھتی ہیں۔میری طرف دیکھو ہزار غم اور میں تنہا......کوئی نہیں جو میرے اندر بسے دکھوں کو محسوس کرے......یار یہ زندگی مسئلوں کا انبار ہے اور تم تو پہلے ہی مسئلے پر گھبرا گئے۔کوئی کام شروع کرو۔کتنے آفر آئے پڑے ہیں۔باہر نکلو اس چار دیواری سے ورنہ گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے۔گلشن ڈھیروں مشورے دے کر چلا گیا۔انوراگ اسے کیسے بتاتا کہ اس کے اپنوں نے اس کے دل میں جو نشتر چبھویا ہے وہ اس کی روح میں بھی شگاف کر گیا ہے۔بھائیوں کی سنگدلی۔دوستوں کی بے وفائی دیکھ کر اب زندگی کی بھی تمنا نہیں رہی۔دنیا میں شاید ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکل سکتا تھا لیکن اس کے سنگین مسئلے کا حل کوئی نہیں ہے۔وہ متواتر اس جہنم کی آگ میں جلتا ہی رہے گا۔جب تک کہ......

بیٹے خود غرض......لاپروا......غیر ذمے دار جیسے بھی تھے آنکھوں کے سامنے تھے تو ماں کے دل کو تسلی تھی۔وہ بڑے صدمے سہہ چکی تھیں لیکن بیٹوں کی جدائی کا غم سہنے کی ان میں شکتی نہ تھی۔ہر آہٹ پر ان کے ہی آنے کا گمان ہوتا۔ جب دونوں سامنے آئے تو حیران اور متعجب ہو کر انہیں دیکھتی ہی گئیں۔گوہر فوراً بولا......اماں میں آپ کو لینے آیا ہوں ......ایک ناکارہ شخص کی خاطر جس نے ہمارے خاندان کی عظمت خاک میں ملا دی آپ یہاں اکیلی کیوں رہیں۔اور تکلیف اٹھائیں۔ماں کے اندر چھپا جوالہ مکھی پھٹ پڑا۔

سلگتے لہجے میں بولیں......تم دونوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو ہوا......دیر ہی میں سہی ......اتنا تو یاد رہا کہ تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔اکیلی تو میں اس وقت بھی تھی جب تم دونوں بھائی اس چھت کے نیچے رہتے تھے۔ان دنوں کسی نے بھی میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں کی۔بڑی بے قدری کی تم نے اپنی ماں کی۔کوئی میرا پرسان حال نہ تھا۔جن برے حالات سے میں گذری ہوں اس کے بعد میں کس طرح تمہارے اوپر یقین کر لوں۔انوراگ پر الزام لگانے سے پہلے اپنے گریبانوں میں جھانک کر تو دیکھا ہوتا۔دولت کی ہوس نے تمہاری آنکھوں کو اندھا اور تمہارے دلوں کو سخت کر دیا ہے۔ ارے یہ دولت کا کھیل تو دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے۔کبھی ایک جگہ نہیں ٹکتی۔دولت سے پیار کرنے والے ہمیشہ انسانیت پر ظلم کرتے آئے ہیں۔اس دولت کی خاطر ہی تم دونوں کو اپنے بھائی سے بے انتہا عداوت ہے۔تمہاری لگائی آگ میں وہ آج تک تڑپ رہا ہے لیکن اس نے آہ تک نہ کی۔اگر ذرا سا بھی رحم تمہارے دلوں میں ہوتا تو ایک بے قصور کو مجرم قرار نہ دیتے۔تمہارے پاپا نے تم دونوں کے لئے جو کچھ مقرر کیا تھا تم دونوں اس سے بہت زیادہ لے چکے ہو۔ساری بزنس پر قبضہ کر لیا ہے۔اب اس کوٹھی سے بھی اسے باہر نکالنے کا مشورہ لے کر آئے ہو۔میرے جیتے جی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ۔انوراگ کا حصہ اسے ضرور ملے گا۔

ماں نے بیٹوں کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا تو دونوں شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ماں کا ضبط بھی جواب دے چکا تھا۔پتھر لہجے میں بولیں۔اس گھر سے میری ارتھی اٹھے گی......ماں کے دل میں مندمل نہ ہونے والے گھاؤں پر ایک اور گہری ضرب پڑی تھی۔درد کی ٹیسوں کے ساتھ ساتھ ان کی دبی دبی سسکیاں بھی تیز ہو گئی تھیں۔سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے اندر کے درد کو دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔جب سینے میں شدید قسم کا درد اٹھا تو وہ چیخ اٹھیں۔انوراگ پاس ہی بیٹھا۔فوراً اماں کو ہسپتال لے گیا۔

اب ایک ماں ہی تو تھیں۔ یہ خوف کہ ان کے بغیر وہ تنہا۔ بے یار و مددگار رہ جائے گا اسے بدحواس کئے دے رہا تھا۔ ماں بیہوش تھیں۔ اس نے گوہر کا فون نمبر لگایا۔ گوہر بھائی میں انوراگ بول رہا ہوں۔ وہ غصے میں چیخے۔ کیوں۔ رات میں ہماری نیندیں حرام کر رہے ہو...... جو کچھ کر چکے ہو کیا...... گوہر بھائی میری بات تو سنیں۔ میں ہسپتال سے بول رہا ہوں۔ ماں...... کی حالت خراب ہے...... ادھر سے جواب ملا...... وہ تو ہونا ہی تھا...... اور ایک دم انوراگ کو خیال آیا کہ اب وہ اپنی ماں کے لئے بھی بوجھ بن گیا ہے۔

ماں کی جان تو کسی طرح بچ گئی تھی۔ لیکن غموں کا بھار ڈھوتے ڈھوتے ان کی ہڈیاں چور چور ہو گئی تھیں۔ بیٹوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

انوراگ کا تمام وقت سکوت اور خاموشی میں گذرنے لگا۔ اس کو اداس اور پریشان دیکھ کر ماں بولیں بیٹا تو بھی اب شادی کر لے۔ یہ اکیلے پن کا سناٹا تجھے جینے نہیں دے گا۔ اگر تیری کوئی پسند ہے تو بتا دے۔ وہ ماں کے اس مشورے پر چونکا...... اس نے تو سارے رشتے رابطے منقطع کر دیے تھے۔ لیکن ماں کو معلوم نہیں تھا کہ ایک بندھن ہے جسے وہ تمام تر کوششوں کے ختم نہیں کر پایا تھا۔

یادوں کے وہ سارے عکس جاگ اٹھے جنہیں اس نے سو جتن کر کے اپنے دل کے تہہ خانہ میں چھپا رکھے تھے۔ وہ بولا...... نہیں اماں...... میں اکیلا ہی ٹھیک ہوں...... ماں نے سمجھایا...... سب بھول جا...... میں جانتی ہوں سب جھوٹ ہے۔ سازش ہے۔ دشمنی ہے۔ وہ ماں سے کیسے کہتا کہ جھوٹ تو ہے لیکن ہر جرم کی سزا کسی نہ کسی کو بھگتنی ہوتی ہے۔

وہ بھی کیسے کیسے سندر سپنے سجائے لوٹا تھا۔ سارے کے سارے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ کتنی امیدیں لے کر گھر آیا تھا۔ قسمت میں مصیبتوں کا وسیع صحرا لکھا تھا۔ جس میں بھٹکتے بھٹکتے آبلہ پا ہو گیا ہوں۔ برباد ہو گیا میں۔ ساری آس ٹوٹ چکی ہے۔ خوشیاں میرے مقدر میں نہیں۔ انوراگ نے اپنے دل کی ہوا کسی کو نہ لگنے دی تھی۔ ڈرتا تھا کہیں کرانتی پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ جب سے آیا تھا قدم قدم پر نئی آفت کا سامنا کر رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک مسلسل ناخوشگوار حادثے پیش آنے کی وجہ سے وہ کرانتی سے ملنے نہیں جا سکا تھا۔ وہ اسے بھولا نہیں تھا۔ اس کے لئے ہمہ وقت پریشان اور فکر مند رہتا تھا۔ اب حالات بہت زیادہ سنگین ہو گئے تھے۔ شادی کا خیال آتا تو وہ اسے جھٹک دیتا تھا۔ نہیں۔ ابھی نہیں۔

انوراگ جلد لوٹنے کا وعدہ کر گیا تھا۔ کرانتی اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تو تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے کہ۔ جو کہتا ہے اسے پورا نہ کرے۔ وہ آئے گا ضرور۔ لیکن اس دفعہ وقت بہت زیادہ گزر چکا تھا۔ اور یہ سوچ کے نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے اسے ہلکان کر رہا تھا۔ کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ کرانتی کا اپنا کوئی دور و نزدیک تک نہ تھا جس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی۔ اور اب وہ بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ پھر کئی دن اور بیت گئے۔

اچانک ہی دل کی دھڑکنیں اس کی آمد کا پتا دینے لگیں۔ دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اور وہ واقعی ہی چلا آیا تھا۔ اچانک اسے سامنے دیکھ کر کرانتی کی تو جیسے جان لبوں پر آ گئی۔ وہ اسے حیرانی سے ساکت دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ مضبوط شخص آج بہت ٹوٹا ٹوٹا بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ وہ گھبرائی آواز میں بولی۔ میں تمہاری راہ تکتی رہی ذرا آہٹ ہوتی تو دل کہتا تم ہو۔ اور تم نے اتنی دیر میں خبر لی۔ اتنے عرصے کے بعد آئے ہو۔ بہت کمزور ہو گئے ہو۔ لگتا ہے جیسے برسوں کے بیمار ہو۔ کیا بات ہے انوراگ...... سچ سچ بتاؤ......

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا...... میں تو اچھا بھلا ہوں۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے۔ کرانتی بولی۔ کوئی بات ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ تمہارے چہرے پر آج خوف کے آثار کیوں ہیں۔ کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔ وہ پر سکون لہجے میں بولا۔ کوئی بات نہیں۔ جب کوئی بات نہیں تو تم اتنی فکرمند کیوں ہو رہی ہو۔ ہاں واقعی ایک عرصہ گذر گیا ۔میں آنہ سکا۔ جب سے ہندوستان لوٹا ہوں روز ایک نئی آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔ آج تم خفا ہو رہی ہو۔ ایک تم ہی تو میری ہو اگر تم بھی خفا ہوگئیں تو اس دنیا میں مجھ سے راضی کون رہے گا۔ انوراگ کے لہجے میں ایسا درد چھپا تھا کہ وہ سمجھ گئی ضرور کوئی بڑی مصیبت میں پھنسا ہے۔ کرانتی اس کا درد محسوس کر کے فوراً ہی بولی...... میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں سوائے تمہارے میرا ہے ہی کون۔ انوراگ کا دل چاہا وہ یوں ہی پیار بھری باتیں کرتی رہے اور اسے دیکھتی رہے اور یوں ہی عمر بیت جائے......

انوراگ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر خاموشی کے ایک مختصر سے وقفہ کے بعد بولا۔ جی تو چاہتا ہے تمہارے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں۔ کچھ تمہاری سنوں۔ کچھ اپنی سناؤں...... ایک بات کہوں...... مانو گی...... وہ اسے باتوں میں الجھا رہا تھا...... انوراگ میں نے کب تمہارا کہا ٹالا ہے۔ وہ مسکرا کر بولی تھی...... پھر کچھ پریشان ہو کر بولی...... مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالنا کسی ایسے امتحان میں جس میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ تم نے مجھے اتنی اونچی جگہ پر بٹھایا ہے کام بھی ایسا ہی بتانا جو تمہارے شایان شان ہو۔ انوراگ کو پا جانے سے زیادہ کھو جانے کے ڈر سے وہ لرز گئی۔

جب وہ دیر تک کچھ نہ بولا تو کرانتی مضبوط اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ جو کچھ تمہارے من میں ہے کہہ ڈالو۔ مجھ میں حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہے۔ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے اسے کبھی کسی کے احساس کا خیال نہیں ہوتا کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم کہہ نہ سکو اور میں سن نہ سکوں۔ وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ جو کچھ آج ہے شاید کل نہ ہو۔ میں پکارتی ہی رہ جاؤں اور تم میری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھ سکو۔ تم نے مجھے بے پناہ طاقت بہم پہنچائی ہے۔ تم مانگو تو میں جان بھی دے دوں ۔وہ بنا پلکیں جھپکائے سب کچھ کہہ گئی۔

حسب عادت انوراگ نے مسکرا کر کہا...... اتنی جلدی گھبرا گئیں...... ابھی تو نہ جانے ہم دونوں کو کتنے ہی امتحانوں سے گذرنا ہوگا...... تم ہماری جان ہو...... میری نظروں میں تمہاری زندگی سب سے اہم اور قیمتی ہے۔ اور میں اپنی آخری سانس تک اس کی حفاظت کروں گا۔ وہ اپنے اندر کا کرب چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن درد کی ایک لہر آنکھوں میں اتر آئی تھی اور آنکھوں تک آئے آنسو پینا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا...... ماں اکیلی ہیں...... میں چلتا ہوں...... کرانتی اس کے رویے پر دنگ رہ گئی...... بولی تم کچھ کہنا چاہتے تھے...... وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا...... اگلی دفعہ...... دم رخصت اسے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ کرانتی اسے جاتا دیکھ کر روہانسی ہو گئی۔ انوراگ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ آج اس نے اپنی سب سے کڑی منزل پالی تھی۔ لیکن کرانتی کے دل کا کرب انوراگ کے دل میں اتر گیا تھا۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

انوراگ اپنے ہی گھر میں دوزخ کے عذاب جھیل رہا تھا۔ غموں کی ترشی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی اس کی صحت بڑی تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی اور جسم کی توانائی کم ہوتی جا رہی تھی۔ کئی ڈاکٹر بلائے گئے لیکن کسی کے علاج سے افاقہ نہ ہوا۔ کیسے ہوتا۔ اس کے درد کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس تھی ہی نہیں۔ اسے تو اپنوں نے مارا تھا۔ معذور کر دیا تھا

اتنے بڑے بڑے جھٹکوں سے تو پربت بھی اکھڑ جاتے ہیں وہ تو انسان تھا اور کسی طرح سہہ رہا تھا۔ یہ دردلا دوا تھا۔

تمہیں دیکھ کر مجھے دہشت ہو رہی ہے۔ اس کی شکستہ حالی پر سخت رنج کا اظہار کرتے ہوئے گھبرائے لہجے میں گلشن نے کہا۔ میں مانتا ہوں بہت پشیمانی اور حیرانی کے حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن تم...... تم تو ایک دانا اور عقلمند شخص ہو۔ ٹوٹ کر حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے تم دیدہ و دانستہ موت کے کالے کوئیں میں کود رہے ہو۔ یہ زندگی تم جسے ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہو بار بار نہیں ملتی۔ اپنی ماں کی خاطر ہی سہی۔ اس قیمتی شئے کی قدر کرو۔ انوراگ قدرے مسکرا کر بولا...... یہ زندگی ایک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے۔ جسے تم قیمتی کہہ رہے ہو اسے ایک دن خاک میں ملنا ہی ہوگا یہ قیمتی شے ہوتی بڑی بے اعتبار ہے۔ نا جانے کب ساتھ چھوڑ دے۔ گلشن نے اسے گھڑکا۔ بند کرو یہ نا امیدی اور مایوسی کی باتیں۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ چونکا۔ یار تمہارا بدن تو بخار سے تپ رہا ہے۔ خدا کے واسطے کوشش کر کے اپنا اعتماد بحال کرو ورنہ یہ غم تمہیں لے ڈوبے گا۔ گلشن اسے ہر طور سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا پر انوراگ اب سمجھنے کی حد سے گذر چکا تھا۔ وہ اپنے اندر کی بے چینی دکھ اور درد کی شدت اور بے بسی کا ذکر کیسے کرتا کیسے کہتا میرا تن من تو کیا روح تک جل رہی ہے۔

وہ آزردگی سے بولا...... یار جب سے اس گھر سے خوشیاں رخصت ہوئی ہیں زندگی بڑی بے کیف ہوگئی ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ گلشن نے کہا اپنے کو ساری دنیا سے الگ کر کے تم نے اپنی زندگی کے سارے مقصد ہی ختم کر ڈالے۔ بے مقصد زندگی تو بے کیف ہوتی ہی ہے۔ میری بات مانو......شادی کر لو......زندگی میں رونق اور گھر میں خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔ سب کے منھ بھی بند ہو جائیں گے۔ تھوڑا حوصلہ رکھو اپنی جان کے خود دشمن نہ بنو۔

تیز بخار اور کمزوری کے عالم میں بھی انوراگ کے چہرے پر ایک مجروح سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگر تم سوچتے ہو شادی ہی میرے سارے مسئلوں کا حل ہے تو وہ بھی کر لوں گا۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ گلشن بولا۔ میرے بھائی۔ میرے ہمدم۔ لوگوں کی اس بھری دنیا میں ایک تم ہی تو میرے اپنے ہو۔ میرا کنبہ۔ قبیلہ سب کچھ تم ہی ہو۔ بس تم کو سدا خوش دیکھنے کے لئے مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ بولو کیا چاہتے ہو......

انوراگ بولا...... میں چاہتا ہوں تم بھی ایک ہنستی گاتی خوشحال زندگی گذارو...... پہلے شادی تمہاری ہوگی۔

گلشن ایک ثانیے سناٹے میں رہ گیا۔ سینے میں دفن گھاؤ لو دینے لگے۔ نہایت حیرانگی کے ساتھ بولا۔ یہ تم کہہ رہے ہو۔ تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا وجود دشمنی اور نفرت کی نشانی ہے۔ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ مجھے خود خبر نہیں۔ نہیں انوراگ میں شادی کبھی نہیں کر سکتا۔ میرے حصے کی ساری شمعیں تو میری پیدائش کے دن ہی گل ہوگئی تھیں۔

ایک پل کو بڑی تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ انوراگ اس کو بکھرتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ بولا میرا مقصد تمہارے زخموں کو کریدنے کا ہرگز نہ تھا۔ تم کب تک ان اندھیروں میں ڈوبے رہو گے۔ جو کچھ بھی انسان کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اسے پورا ہونا ہی ہوتا ہے۔ جس چیز پر بس نہیں اسے بھلانا ہی بہتر ہے۔

گلشن کی آواز میں دکھ کے ساتھ غصے کی بھی جھلک تھی۔ زور سے بولا...... کیا میں کبھی یہ بھلا سکتا ہوں کہ میرا باپ جس بھی قوم۔ مذہب اور سماج کا تھا وہ انسان نہیں درندہ تھا۔ یقین کرو مجھے اپنے وجود سے نفرت ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ آج بھی کشمیر میں کوئی محفوظ نہیں۔ جو میری ماں کے ساتھ ہوا تھا وہ آج بھی ہو رہا ہے۔ نہ جانے یہ آگ کب بجھے گی۔ وہ

چپ ہوگیا اور زمین تا کتا رہا۔

یار تم ایک حقیقت ہو۔ خدا کی بنائی ہوئی مخلوق۔ تم۔ میں اور یہ ساری دنیا اس ایک خالق کی بنائی ہوئی ہے۔ خدا کی بنائی کائنات سے نفرت...... اپنے دل سے نفرت کو نکال پھینکو۔ نفرت کی آگ انسان کو اندر ہی اندر جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ محبت ایک بڑی طاقت ہے۔ محبت ایک بہت خوبصورت جذبہ ہے۔ مہکتا ہوا...... انسان کے اندر کے سارے اندھیروں کو دور کر دیتا ہے۔ انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر انسان کے اندر محبت کا ایک جزیرہ ضرور موجود ہے۔ تمہارے اندر بھی ہے۔ تمہارے اندر سمائے اس جزیرے سے اٹھنے والی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کی مہک میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے پیار نہ ہوتا تو اس وقت تم میرے پاس نہ بیٹھے ہوتے۔ کلب میں عیش کر رہے ہوتے۔ اپنے اندر کے اس جزیرے میں کسی کو بسنے دو گے تب ہی تو تمہیں محبت کی چاشنی اور طاقت کا اندازہ ہوگا۔ تمہارے دل کی دھڑکنوں میں پیار کے رنگ سجیں گے۔ پھر دنیا کی ہر شے دمکتی نظر آئے گی۔ بند کر دو سارے کواڑ۔ سارے دریچے تا کہ آئندہ ماضی کی پرچھائیاں تمہارا پیچھا نہ کر سکیں۔ ہر انسان کے حصے میں اگر غم ہے تو خوشیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ رات کتنی بھی کالی ہو سحر ضرور ہوتی ہے۔ آؤ ہم دونوں مل کر کچھ دیر خوشیاں ڈھونڈھیں۔

انوراگ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد بولا...... ہاں میں تمہاری شادی کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی یہ تجویز پایہ عمل تک پہنچا کر ہی رہوں گا۔ تمہاری شادی تمہاری پسند کے مطابق ہی ہوگی۔ تمہاری شایان شان لڑکی ہی تمہاری جیون ساتھی ہوگی۔ گلشن اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹی بدلتے ہوئے بولا...... اور ...... اور...... ایسی لڑکی آئے گی کہاں سے...... میرے نصیب اتنے اچھے کہاں...... انوراگ بولا...... نصیب بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے...... تو ہاں تو کر...... لڑکی میں ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ گلشن مسکرایا...... یار زندگی بھر تو تیری سنتا آیا ہوں۔ ابھی تو آرام کر۔ وقت آنے پر سوچیں گے۔ انوراگ ہنسا۔ اب زیادہ سوچنے کا وقت نہیں رہا۔

انوراگ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اب اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ کوئی درد نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان تھیں۔ لیکن انوراگ اب اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں انسان کو کوئی دکھ کا احساس نہیں ہوتا...... انوراگ بیمار تھا...... جب راتوں پر راتیں...... دنوں پر دن بیت گئے وہ نہیں آیا تو کرانتی کی پریشانی فطری تھی۔ احساس محرومی نے اسے اداس اور مایوس کر دیا تھا۔ دل میں ملن کی تڑپ لئے وہ ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ وہ عجیب سی شام تھی۔ ویرانی اور مایوسی کے احساس نے کرانتی کے اندر ایک عجب سی گھٹن پیدا کر دی تھی۔ اس کے بے چین دل نے انوراگ کو پکارا۔ میری وفاؤں کا اتنا تو صلہ دو کہ ایک بار مجھے آکر گلے لگا لو...... کہیں ایسا نہ ہو انتظار کرتے کرتے میرا دم ہی نکل جائے

تب ہی فون کی گھنٹی سن کر وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی۔ انوراگ کی آواز سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ لیکن دل میں آرزوؤں کے تمام پھول کھل اٹھے تھے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... کرانتی نے بے چینی سے سوال کیا تھا ...... ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ میں تم سے ابھی اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے بے حد تسلی سے بھرپور لہجے پر کرانتی کے مایوس دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھیں تھیں۔ میں آرہی ہوں۔ کہہ کر اس نے فوراً ہی فون رکھا۔ اور مسرت سے جھومتی موٹر کی طرف دوڑی تھی۔

ماں کی موت کے بعد اس نے اپنے کو اکیلا اور تنہا ہی پایا تھا۔ پھر انوراگ کی محبت نے یقین دلایا تھا کہ وہ

ہمیشہ اس کے ساتھ ہے اور رہے گا۔ اور اب دل میں بے شمار حسرتیں اور تمنائیں لئے وہ اپنے محبوب سے ملنے چل پڑی تھی

صدمے درصدمے نے اس حسین انسان کو لاغر بنا دیا تھا۔ انوراگ کی طبیعت صبح سے ہی بہت بے چین تھی۔ اس کی حالت بگڑتی دیکھ کر ماں پر بے انتہا گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ کرانتی ایک مسروری کیفیت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن انوراگ کے مردہ سے بدن کو دیکھ کر دہشت کے مارے رک گئی تھی۔ آنکھوں میں جگمگاتے تارے ٹوٹ کر لہو کے آنسو بن کر بکھرنے لگے تھے۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی تھی۔

ماں ہوش و حواس سے عاری بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس برے حال میں بھی انوراگ کا چہرہ پر سکون تھا۔ کرانتی کو دیکھتے ہی بولا۔ میرے گھر پر ایسی بھیانک آندھی آئی تھی جس کے بگولے میں میں آج تک پھنسا ہوں۔ جو شخص آندھی اور طوفان کی زد میں ہو وہ کسی اور کو کیا تحفظ دے گا۔ میں حالات کے ہاتھوں مارا ہوا ایک ناکام شخص ہوں۔ سوچا تو بہت کچھ تھا لیکن۔ اب میرے پاس تھوڑا ہی وقت اور ہے۔ آج کچھ نہ کہنا۔ بس میری سنو۔ ایسا نہ ہو کہ میری بات ادھوری رہ جائے۔ جو بھی کہوں اسے میری آخری خواہش سمجھ کر قبول کرنا۔

ماں کی طرف دیکھ کر بولا...... اماں آپ ہمیشہ بیٹی کے پیار کے لئے ترستی رہی۔ یہ ہے آپ کی بیٹی۔ کرانتی آج سے میری ماں تمہاری ماں ہے۔ تب ہی گلشن کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے دروازے کی سمت دیکھ کر کہا۔ آؤ میرے بھائی۔ آؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار تھا۔ پھر کرانتی اور گلشن دونوں سے بولا۔ زندگی میں ہر انسان کو ہمیشہ ایک ہمدرد، رازدار اور ایک اچھے دوست کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرانتی کا ہاتھ گلشن کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا...... گلشن کے مانند نیک...... وفادار اور مخلص شخص میں نے دوسرا نہیں دیکھا۔ اگر میری ہستی وفا کرتی اور مجھے مہلت دیتی تو میں اپنے ہاتھوں سے...... انوراگ کے چہرے پر آسودہ سی خوشی ابھری تھی۔ اور اسی وقت کھانسی کا زبردست دورہ پڑا تھا۔

انوراگ کے منہ سے بھل بھل ڈھیروں خون بہنے لگا تھا۔ گلشن نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ نقاہت اس پر غالب ہوگئی تھی۔ آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ چہرے پر ابھری مسکراہٹ معدوم ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی کی آخری سانس کے ساتھ کرانتی کی آرزوؤں اور تمناؤں کی بارات بھی رخصت ہوگئی تھی۔ پہلو میں دل مردہ ہوگیا تھا۔ کرانتی پتھر کے بت کی طرح بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس وقت وہ بس سانس لیتا ہوا وجود تھی۔ اپنے آپ سے غافل، کیا سوچ کر آئی تھی اور کیا ہوگیا تھا۔ ہر بات یاد آ رہی تھی۔ ہر لمحہ پلٹ رہا تھا۔ دل کا نگر اجڑ گیا تھا۔ نا انوراگ نے آواز دی۔ نا گلے سے لگایا۔ نا ہی پلٹ کر دیکھا۔ کتنا کم۔ از حد مختصر ساتھ تھا دونوں کا۔ سینے میں ڈوبا دل سسک رہا تھا پر وہ اپنے درد و غم کو ضبط اور برداشت کر رہی تھی۔ یہ کیسا ستم ٹوٹا تھا کہ وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ سامنے وہ انجانا شخص تھا جس کے ہاتھوں میں انوراگ اسے سونپ گیا تھا۔ جواب اس کی زندگی کا مالک ہوگا۔ کرانتی یہ سارا ماجرا دیکھ کر حیران اور غمگین تھی مگر اپنی قسم کے سبب انکار نہ کر سکی تھی۔ لیکن اب دل کے قریب کوئی نہ تھا۔ دل کے تمام تقاضے ختم ہو چکے تھے۔ چاہتوں کے پھول بن کھلے ہی مرجھا کر گر پڑے تھے۔ اب تو کسی طرح زندگی کے تقاضے نبھانے ہوں گے۔ اس نے آج تک دکھ ہی دکھ دیکھے تھے۔ اب دکھوں کا یہ دریا بھی اسے اکیلے ہی عبور کرنا ہوگا شدت غم سے گھبرا کر کرانتی نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔

ماں کو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ اپنے لاڈلے کی لاش کو خون میں شرابور دیکھ ماں کے ذہن میں برسوں پہلے والی ڈراؤنی رات کی یادیں دھم دھم کرنے لگیں۔ جب ایک نئے ملک کا جنم ہوا تھا۔ پھر وہی ظلم کی بارش۔ وہی وحشت۔ وہی چیخ

پکار۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ زمین جہنم بن گئی تھی۔ خون کے دریا بہہ نکلے تھے۔ آدمی آدمی کا دشمن ہو گیا تھا۔ ہزاروں دم توڑ گئے تھے۔

وہ اپنے شوہر اندر کمار اور دونوں بیٹوں سمیت بھاگ رہی تھیں۔ جگہ جگہ پر لاشیں۔ خون کے چشمے پھوٹے تھے۔ اچانک بچے کے رونے کی آواز سن کر وہ رک گئی تھیں۔ ماں کے مردہ بازوؤں میں محفوظ بچہ بلک رہا تھا۔ معلوم نہیں ہندو تھا یا مسلمان۔ یہ عورت جو تھی ہندوستانی ضرور تھی۔ جو اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ اس بدنصیب عورت کو راستے ہی میں کسی ظالم نے قتل کر ڈالا تھا۔ پھر یہ خیال کہ ہم سب ہی تو ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے انسان ہیں۔ سب ہی مٹی کے پتلے ہیں۔ سب کی رگوں میں لال خون بہتا ہے۔ زیادہ سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ یہ جو بھی ہے۔ ہندو یا مسلمان اب میرا بچہ ہے۔ بچہ اٹھایا اور تیزی سے دوڑنے لگی تھیں۔ بیٹا میں نے تجھے جنم نہیں دیا تو کیا ہوا۔ تجھے میں نے اپنی اولادوں کی طرح پیار کیا تھا۔ تیرے اوپر بھی اتنی ہی ممتا نچھاور کی تھی جتنی گوہر۔ امبر اور جوہر پر۔ آج وہ ٹمٹماتا دیا بھی بجھ گیا تھا۔ جس نے اس بدنصیب ماں کے تاریک اندھیروں میں اجالا کر رکھا تھا۔

پھر ایک دم شوہر اور جوہر کا غم تازہ ہو گیا۔ ماں کی دکھ بھری آواز جیسے پاتال سے آتی سنائی دی تھی۔ تو بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیا۔ اسی وقت ماں کا ہاتھ کرانتی کے سر پر ٹھہر اتھا۔ کرانتی کے حواس پلٹے تھے۔ فوراً بولی۔ اماں آپ اکیلی نہیں ہیں۔ آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے۔ کچھ اس کی وحشت معدوم ہوئی تو نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔ گلشن ماں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ ہو گئی تھیں۔ حزن و ملال کا اثر چہرے پر عیاں تھا۔ بولا۔ اماں صبر کریں۔ صبر کرنے کے سوائے اب اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ خدا کی مرضی کے آگے کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ اپنے کو مسمار کر کے دوسروں کی خوشیوں کے قلعے مضبوط کرنے والے بڑے عظیم ہوتے ہیں۔ کاش یہ سب اس طرح نہ ہوتا جیسا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ بھی اشک بار تھا۔ وہ آگے بولنے کے قابل نہ رہا تھا۔ دکھ اس پر حاوی ہو گیا تھا۔

دوسرے دن کرونا یہ قصہ سنا کر ایسی غائب ہوئی کہ ہم نے سوچا اپنے بیٹے کے گھر چلی گئی۔ اس رات میں جاگتی ہی رہی۔ کیا سارے حق مردوں کو ہی حاصل ہیں۔ باپ جب چاہے اپنی شفقتوں سے محروم کر دے۔ شوہر جب چاہے طلاق دے دے۔ بھائی شادی کر کے اپنا گھر بسا کر سب کو بھلا دے اور بیٹے۔ بیٹوں کی محرومی نے اس بوڑھی عورت کو لاوارث بنا دیا تھا۔ جو عورت اپنے وارثوں کے ہوتے ہوئے۔ محبت سے محروم رہے وہ لاوارث ہی سمجھی جائے گی۔ کیا عورت ایک مرد کی چھتری کے بغیر جینا نہیں سیکھ سکتی۔ کیوں عورت کبھی بھی۔ کہیں بھی محفوظ نہیں رہتی۔ کئی سوال تھے۔ جو مجھے پریشان کر رہے تھے۔

پھر کئی ہفتوں کے بعد کرونا سیدھی میرے کمرے میں آن وارد ہوئی۔ وہ نہایت پریشان اور رنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ایک طویل سانس لے کر بے حد افسردہ اور غمگین لہجے میں بولی۔ رانی وہ لمبی کہانی ختم ہو گئی۔ میں نے چونک کر کہا کون سی کہانی۔ وہی ایک پیالہ چائے والی۔ وہ غموں سے چور اور تکالیف سے بالکل نڈھال ہو چکی تھیں۔ اپنوں کی بے اعتنائی کا غم لئے چلی گئیں۔

ماں اور بیٹے پر گزرنے والے آلام و مصائب کا ذکر کرتے وہ آنسو بہا رہی تھی۔ ایسا ماتم منا رہی تھی جیسے کوئی اپنی ماں کے لئے کرتا ہے۔ پھر رک رک کر بولی جب گلشن نے ان کی چتا میں آگ لگائی تو سارے لوگوں نے دانتوں تلے

انگلیاں دبا لیں۔ ماں کے ساتھ جارحانہ سلوک کر کے خدا کے گنہگار تو بنے ہی۔...... دونوں بھائی دنیا والوں کی نظروں میں بھی بے قدر ہو گئے...... انوراگ کی موت کے صدمے نے ماں کے دل پر بڑا ہی گہرا زخم چھوڑا تھا...... اس کی موت کے بعد ہی ان کی ذہنی حالت بگڑتی گئی...... کبھی وہ بالکل صحیح الدماغ رہتیں تو کبھی بہکی بہکی باتیں کرتی تھیں...... آخر میں تو بالکل پاگل جیسی ہو گئی تھیں۔ وقت بے وقت گھر سے نکل پڑتی تھیں...... محلے والے ان کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر بیٹوں سے ڈرتے تھے...... جو بھی مدد کے لئے آگے بڑھتا تھا بیٹے ان سے جھگڑتے تھے...... ان کی بے عزتی کرتے تھے...... میں گوہر اور امبر بابو کی ایک نہ سنتی تھی...... برابر ان کے گھر جاتی رہی اور جتنی خدمت کر سکی کرتی رہی...... میں ان کی محبت ان کی مہربانیاں بھلا نہیں سکتی...... جب ہم بنگلہ دیش سے آئے تھے وہی ہمارا واحد سہارا تھیں...... جب بہت رو رو کر ان کا دل کچھ ہلکا ہوا تو بولیں...... آؤ میرے ساتھ......

میں چپ چاپ کرونا کے ساتھ چل دی...... میں اس گھر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی...... موٹر میں آتے جاتے کئی بار اس راستے سے گذری تھی...... اور اس وشال کوٹھی کے خستہ ٹوٹے پھوٹے کواڑ اور کھڑکیاں اور بے رنگ دیواریں دیکھ کر افسوس کرتی تھی کہ کہاں چلے گئے اس محل کے رہنے والے...... آج رنگ و روغن کے بعد یہ محل نما عمارت جگ مگ کرتی بالکل نئی معلوم دے رہی تھی...... لوگوں کا ہجوم تھا...... لمبی لمبی موٹروں کی قطاریں تھیں۔

میں کرونا کے ساتھ اندر گئی...... اس تصویر کو حیرانی سے ساکت دیکھتی رہ گئی جو پھولوں سے سجی تھی...... میں نے کرونا کو ٹھوکا مارا...... یہ تو وہی ہیں...... ہاں رانی...... یہ وہی غریب اور مسکین عورت ہے جو اس گھر کی مالکن تھی...... اسے تو بیٹوں نے محتاج بنا دیا تھا...... دماغ کی خرابی کی وجہ سے در در چائے مانگتی پھرتی تھیں......

تب ہی کسی کی کھردری سخت آواز آئی۔...... یہ نہیں ہو سکتا...... ہماری ماں کی دولت پر صرف میرا اور میرے بھائی امبر کا حق ہے...... یہ کرانتی اور گلشن کہاں سے ٹپک پڑے...... کس نے ان کو حق دیا کہ اس کوٹھی میں بھکاری بچوں کے لئے اسکول چلائیں...... وہ وکیل سے مخاطب تھا...... اسی انجانی کھردری آواز کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی...... وہ اب کبھی نہیں آئے گا...... میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی......

جنہیں خون دل دے کر پالا تھا وہ کتنے بے حس اور خود غرض اور مطلبی نکلے تھے...... اس ہانپتی...... کانپتی...... بھاگتی دوڑتی زندگی کے واسطے جو آج ہے اور شاید کل نہ ہو آخر کتنی دولت کی ضرورت ہوتی ہے...... دولت ہی ہوس...... اینٹ اور پتھروں کے بنے محلوں کی چاہت میں دونوں بیٹوں نے ماں اور ماں کی ممتا کو روند ڈالا تھا...... وہ ممتا جو ماں کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے...... اولاد کو تقویت...... خوشیاں اور سکون بخشتی ہے...... کیا دور آ گیا ہے...... اس زمانے میں انسان کی قیمت کچھ بھی نہیں رہی...... بس دولت کا بول بالا ہے...... میں فوراً وہاں سے باہر بھاگ گئی تھی......

☆☆☆

بس......اور......نہیں

یوں تو روز اول سے ہی مردوں نے عورتوں کو کمتر اور حقیر سمجھ کر ان کے اوپر ظلم وستم کی بارشیں کیں۔ قدم قدم پر عورت کو ستایا۔ اسے ذلیل وخوار کیا۔ ہواؤں کا رخ بدلتا رہا مگر عورت ہمیشہ تیز وگرم ہواؤں کی زد میں جھلستی رہی۔ جلتی رہی اور خاک ہوتی رہی۔ یگ بیتے۔ رتیں بدلیں مگر عورت کا مقدر ہی نہ بدلا۔ مردوں کے ہاتھوں پامال ہوتی رہی۔ سب کچھ سہتی رہی اور ہر حال میں عورت مرد پر نثار ہوتی رہی۔ مردوں نے عورت کو ہمیشہ اپنا دل بہلانے کا وسیلہ ہی سمجھا۔ اپنے دل کے مسکن پر بٹھایا اور جب جی چاہا بے دردی سے پاؤں تلے روند ڈالا۔ آج بھی مردوں کی نظروں میں عورت کی حیثیت مٹی کے ایک کھلونے جیسی ہی ہے۔

۱۸۴۸ء میں غدر کے بعد فرنگیوں نے مغل سلطنت کو پسپا کر کے ہاری ہوئی قوم کی جو درگت کی تھی اس کا ذکر مرزا غالب نے اپنے ایک دوست کو یوں بیان کیا۔ جو دردناک اور ہیبت ناک منظر دیکھ رہا ہوں وہ بیاں نہیں کیا جاسکتا۔ ہزاروں ہزار مرد۔ عورتیں اور بچے بڑی بے دردی سے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کیسے بتاؤں کس بری طرح عورتوں کو بے حرمت کیا گیا ہے۔ اگر تم ان چاند چہروں کو ان برے حال میں دلی کی سڑکوں پر پھرتے دیکھتے تو رورو پڑتے۔ انگنت معصوم لڑکیاں طوائف بننے پر مجبور کر دی گئی ہیں۔ دلی اب اجاڑ پڑی ہے۔ ویران ہوگئی دلی۔ سارا شہر صحرا ہوگیا ہے۔ زمین جل رہی ہے۔ خاک اڑ رہی ہے۔ آسماں پر دھواں ہی دھواں پھیلا ہے۔ مرزا غالب کو دلی سے والہانہ عشق تھا۔ دلی کی بربادی دیکھ کر ان کے سوختہ دل سے آہ نکلی۔ ہائے دلی۔ وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔ میرا حال نہ پوچھو۔

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

جنگ آزادی جاری رہی۔ فرنگی بے دردی سے وطن کے بہادروں کو شہید کرتے رہے اور بالآخر شہیدوں کا خون رنگ لایا۔ ۱۹۴۷ء میں دیس کے اوپر آزادی کا ترنگا لہرایا۔ مفلسی کے بوجھ میں ڈوبی مخلوق کو یقین آیا کہ گاندھی جی ۔ جواہر لال نہرو۔ اور لال بہادر شاستری جیسے سچے صادق وطن پر جان نثار کرنے والے نیتاؤں کے زیر نگرانی ہمارا دیس آگے بڑھے گا۔ ترقی کرے گا۔ سب کو برابر کا حق ملے گا۔ ہم غریبوں کو بھی روٹی۔ کپڑا اور مکان میسر ہوگا۔ وہ دن ضرور آئے گا کہ وطن سے غریبی اور جہالت مٹ جائے گی۔ عوام کی حکومت میں ہر شہری خوشحال ہوگا۔

آنکھوں میں نئے سپنے سجائے جہاں آزادی کے جشن منائے جارہے تھے وہاں بٹوارے کے نام پر انسانیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سارا دیس دہک اٹھا۔ ہر سو ہنگامے ہی ہنگامے۔ جس ظالمانہ طور سے سڑکوں پر قتل عام ہوا

اور وحشیانہ طور سے عورتوں کو بے حرمت کیا گیا اسے دیکھ کر دنیا والے دنگ رہے گئے تھے۔خاندان تباہ ہو گئے۔ بستیاں ویران ہو گئیں۔کوئی بھی کہیں بھی محفوظ نہ تھا۔میں اس وقت سترہ سال کی تھی۔اپنے وطن کو قہر اور نفرت کی آگ میں جلتا دیکھ کر دل و دماغ حیران و پریشان تھا۔بس ایک ہی سوال تھا۔آخر یہ ایسا کیوں۔کیوں اپنے ہی اپنوں پر وار کر رہے ہیں۔ہائے رے...... یہ کیسی آزادی...... یہ کیسا بٹوارہ...... یہ کیسی جدائی...... ہندو اور مسلمانوں کا صدیوں پرانا ساتھ۔ہم وطن ہیں۔ہم جولی ہیں۔کچھ تو ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں۔آپسی دوستی ہے۔دونوں قوموں نے برٹش راج کے ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں بے انتہا ظلم و ستم سہے ہیں۔اذیتیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں۔رسوائی اور ذلت گوارا کی ہے...... پھر...... یہ نفرت کی آگ کیوں اور کیسے بھڑک اٹھی...... ان کے درمیان راکھی کا رشتہ تھا...... بھائی تو اپنی بہن کا نگہبان ہوتا ہے۔محافظ ہوتا ہے۔اپنی بہن کی حفاظت کرتا ہے پھر اس آڑے وقت پر ان بھائیوں نے اپنی بہنوں کی عزت کیوں نہیں بچائی۔کیوں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو گئے۔......کیوں؟ آخر کیوں سارے رشتے بھول گئے۔؟

اس کیوں کا ایک ہی جواب ملا جس انسان کے اندر کی انسانیت کی موت یعنی انسان کے ضمیر کی موت۔بے ضمیر انسان کے اندر سوچنے سمجھنے کی قوت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔وہ انسانی سطح سے گزر کر جانور کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔اس کے کھوکھلے ذہن میں حسد۔جلن۔غصہ۔نفرت اور انتقام جیسے اونٹ کٹارے جنم لیتے ہیں۔یہی بے عقل اور بے ضمیر لوگ جنگلی درندوں کی طرح دندناتے پھرتے ہیں اور برسوں تباہی پھیلاتے۔

میں اپنی دو آسٹریلین دوستوں کے ساتھ بیٹھی bbc کی خبریں دیکھ رہی تھی۔آسٹریلیا کے رہنے والے ایک تعلیم یافتہ باپ نے اپنی بیٹی کو کئی سالوں زنجیروں میں جکڑ کر اپنے گھر کے تہہ خانے میں قید کر کے اس کو ریپ کیا تھا۔اس کی اپنی بیٹی اس کے کئی بچوں کی ماں بھی تھی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس لڑکی کی ماں کو گھر میں رہتے ہوئے اس شرمناک واقع کی مطلق خبر نہ لگی تھی۔ہم تینوں ایک دوسرے کا منھ تاکتے ہی رہ گئے تھے۔میں نے کہا عورت کے دشمن اس کے اپنے گھر والے ہی ہوتے ہیں وہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہوتی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد دل ہلکا کرنے کے لئے میں نے فوراً ہندوستانی چینل لگایا۔ایک پولس کی گاڑی کو بھیڑ نے گھیر رکھا تھا۔وہاں کھڑے ایک آدمی اور ایک عورت کو پبلک جوتیوں اور چپلوں سے بری طرح مار رہی تھی۔اور سب ان کے اوپر تھوک رہے تھے۔پاس کھڑے دونوں سپاہی چپ چاپ کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔وہ دونوں دو نابالغ لڑکیوں کے ماں باپ تھے۔اور ان کی اپنی بزنس تھی جسے بڑھانے کے لئے وہ لوگ فکر مند تھے۔تانترک نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر پہلے ان لڑکیوں کا باپ اور بعد میں تانترک ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ہم بستر ہونگے تو ان کی بزنس میں خوب ترقی ہوگی پھر دولت ہی دولت ہوگی۔دولت کی ہوس نے ماں باپ کو اندھا کر دیا۔ماں نے قطعی اعتراض نہیں کیا۔اپنی دونوں معصوم بچیوں کی حفاظت کرنے کے بجائے اپنے شیطان صفت شوہر کا ساتھ دیا۔نہ جانے یہ راز کیسے فاش ہوا۔

ہندوستان میں اکثر ایسے حادثوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔پولس بھی ایسی وارداتوں پر دھیان نہیں دیتی۔تھانے دار رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ان سب کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے روز بروز ریپ

کاریٹ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ پہلے ہر ۲۲ منٹ پر ایک ریپ ہوتا تھا۔ اب ہر بیس منٹ پر ایک لڑکی پر یہ بلا نازل ہوتی ہے۔ لڑکی کو بے موت مار کر اس کا قاتل دوسرے شکار کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے میں سوچتی رہی اگر یہ حال رہا اور اس بلا کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ وبا پلیگ کی طرح پھیلتی ہی جائے گی اور کوئی عورت آزادی سے بے خطر سڑک پر نکل نہ پائے گی۔

آزاد ہند کے نیتاؤں نے یقین دلایا تھا کہ جنتا کا راج ہوگا۔ جنتا خوشحال ہوگی۔ دیس میں پھیلی ساری بلاؤں کا خاتمہ ہوجائے گا مگر آج ۶۶ سال کے لمبے عرصے میں یہ بلائیں کئی گنا اور زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ہماری آدھی جنتا ان پڑھ گنوار ہے۔ بھوک اور جہالت سے جنتا پریشان ہے ہمارا دیس دنیا کے ایک تہائی غریبوں کا گھر ہے۔ بے روزگاری۔ دہشت گردی۔ بیماریوں اور رشوت کا بول بالا تو تھا ہی اب کرپشن نے زور پکڑ لیا ہے۔ کئی نیتا۔ دانشور۔ ڈاکٹر۔ وکیل۔ اور نچلے طبقے کے لوگ جیلوں میں بند ہیں جو کسی نہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہیں۔ جس ملک کے لیڈر ہی غلط کام کررہے ہیں وہاں کی جنتا کا گمراہ ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔ اس خود پرست اور خود پسندی کے دور میں انسان اپنے فرائض بھول گیا ہے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی خواہشات نے انسان کا چین چھین لیا ہے۔ دنیاوی چیزوں کی تلاش میں اپنی سطح سے گرتا جارہا ہے۔ نا ہی اسے قانون کا ڈر ہے اور نا ہی اپنے خدا کا۔ نا ہی رشتوں کا لحاظ رہا اور نا ہی اپنی جنم بھومی سے پیار۔

۱۶ دسمبر ۲۰۱۲ کے بے حد خوفناک اور شرمناک حادثے نے سارے ہندوستان کو ہلادیا۔ ساری دنیا نے ہماری طرف انگلیاں اٹھائیں۔ دہلی میں ایک چلتی بس میں ۶ مردوں نے ایک ۲۳ سال کی لڑکی کو ریپ کیا...... اس کی عزت لوٹنے کے بعد ان سنگدلوں کو اس پر رحم نہ آیا...... لڑکی کے جسم میں لوہے کی سلاخ بھونک کر اسکی آنتیں اور بچہ دانی چھید ڈالی۔ لڑکی کے ساتھ جو لڑکا تھا اسے بھی بے دردی سے مارا پیٹا پھر دونوں کو ننگا کر کے بس سے باہر پھینک کر رفو چکر ہوگئے۔ شاید یہ سوچکر کہ لڑکیاں تو روز ہی ریپ ہورہی ہیں نہ پہلے کوئی پکڑا گیا ہے اور نا ہی ہم پکڑے جائیں گے۔

دونوں کے سروں اور جسموں پر زخم تھے صفدر جنگ ہسپتال کے ڈاکٹر نے دیکھتے ہی لڑکی کی حالت نازک بتائی اور نا امیدی ظاہر کی۔ تین آپریشن ہونے کے بعد لڑکی کو دل کا دورہ پڑا۔ اس کے کئی انگوں نے کام کرنا بند کردیا۔ اس گمبھیر حالت میں لڑکی کو سنگاپور کے mount elizalath hap میں شفٹ کردیا۔

اس حادثے کی ہولناکی اور بربیت نے دہلی میں ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ جوانوں کا خون ابل پڑا دکھ اور غصے میں بھرے لاکھوں لوگ۔ مرد۔ عورتیں۔ بوڑھے جوان سڑکوں پر نکل آئے۔ دیس کے ہر چھوٹے بڑے شہر۔ اسکول۔ کالج میں نعرے لگائے۔ ہمیں انصاف چاہیئے۔ غم اور قہر میں ڈوبی دہلی کی جنتا نے جنتر منتر میں ڈیرا ڈال دیا۔ بلند آواز میں نیتاؤں کو للکارا۔ بس اور نہیں۔ ہم اور برداشت نہیں کرینگے۔ عورتوں پر جو ظلم ہورہے ہیں انہیں ایک دم روکو۔ ہمیں عورتوں کی سیفٹی چاہیئے۔ ہر مجرم جس پر ریپ۔ قتل اور کرپشن کا الزام ہے فوراً گرفتار کر کے قانون کے حوالے کرو۔ پولس کے لاپرواہ رویے کے خلاف نعرے سے لگائے۔ قانون بنانے والوں کو صدا دی۔ عورتوں کی سیفٹی کے لئے ٹھوس قانون بناؤ اور ہر مجرم کو سخت سے سخت سزا دو۔

جوں جوں لڑکی کی حالت بگڑ گئی جنتا کے تیور گرم ہوتے گئے۔ پبلک کا غصہ دیکھ کر نیتاؤں کے دل ہول اٹھے۔ انہیں اپنی سیفٹی کی فکر لاحق ہوئی تو فوراً انڈیا گیٹ تک پہنچنے کے سارے راستے بند کر دیئے۔ بس کی آمدورفت کم کر دی۔ میٹرو ریلوے کے ۱۰ اسٹیشن بند کر دیئے۔ جگہ جگہ پولس کے گھیرے مضبوط کر دیئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملٹری کی مدد محسوس کی۔ جنتا نے ہر زنا کار کے لئے سزائے موت مانگی کیوں کہ ریپ کے بعد کئی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں اور جو زندہ رہتی ہیں ان کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ دنیا والے انکا اور انکے ماں باپ کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔

وہ لڑکی سنگاپور میں بے ہوشی کے عالم میں موت سے لڑ رہی تھی۔ وہ جینا چاہتی تھی۔ اپنے ماں باپ اور اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے لئے۔ وہ ایک ایسے باپ کی بیٹی تھی جس نے اپنا سب کچھ بیچ کر اپنی بیٹی کو پڑھایا تھا وہ اپنے باپ کی ڈھال تھی۔ باپ کو امید تھی وہ کمائے گی اپنے پیروں پر کھڑی ہوگی اور ایک خوشحال زندگی بسر کرے گی۔ مگر ان درندوں نے اس لڑکی پر اس بری طرح حملہ کیا تھا کہ زندگی کی آس ہی نہ رہی تھی۔ گھاؤ بہت گہرے تھے۔ لڑکی کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹرز ہار چکے تھے۔ بس اب دعاؤں کا سہارا باقی تھا۔

دیس کے کونے کونے میں لوگ اسکی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ موم بتیاں جلائے سڑکوں اور میدانوں میں کھڑے اپنے اپنے خداؤں کو پکار رہے تھے۔ بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ غصے میں بے قابو جنتا کو دیکھ نیتاؤں کو خطرے کی گھنٹی بجتی نظر آئی تو ان کی نیند ٹوٹی۔ فوراً ٹی وی پر وطن کے رہنماؤں نے لڑکی کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا۔

(۱) پرتیبھا پاٹل جی نے کہا۔ یہ بہت ہی دردناک۔ شرمناک اور گھنونا حادثہ ہے۔ ان مجرموں کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہئے۔

(۲) پرنب مکرجی صاحب نے کہا۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے۔ انہوں نے انصاف کی مانگ کی۔

(۳) شبانہ اعظمی نے کہا یہ بہت دکھ کی بات ہے۔ یہ لمبی لڑائی ہے......لمبا سفر ہے۔

(۴) کویتا کرشنا نے کہا۔ ہمارے دیس کے لئے دکھ اور شرم کی گھڑی ہے۔ سماج کو بدلنے کی کوشش کرنا ہوگا۔ اب ہمیں لڑائی لڑنا ہوگی۔ یہ واقعہ بہت حیران اور پریشان کرنے والا ہے۔

(۵) کرن والیا نے کہا ہمیں اپنی بیٹیوں۔ بہنوں اور بہوؤں کو بچانے کے لئے آگے نئے راستے پر چلنا ہوگا

(۶) جیا بچن نے نم آنکھوں کے ساتھ دکھ بھری آواز میں کہا۔ ہمارے سسٹم میں بہت پرابلم ہے۔ بھارت کی ہر بیٹی۔ ماں اور بیوی کو اسکا حق ملنا چاہیئے۔

(۷) شیلا دکشٹ کا خیال ہے کہ ایسا لمحہ ہے کہ ہمیں شرم آتی ہے اور دکھ بھی ہو رہا ہے۔ اس لڑکی کے گھر والوں کو بھگوان ہمت دے کہ اس دکھ کو برداشت کر سکیں۔ اب آگے یہ سوچنا ہوگا کہ کیوں ایسی گھنونی حرکتیں ہو رہی ہیں۔ سوچنا پڑے گا آگے ایسے حادثے نہ ہوں جنتا غم اور غصے میں چیختی چلاتی رہی کہ یہ شرمناک حادثہ ہمارے سماج کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے سماج کو بدلو۔ کرپشن اور جہیز کو بند کرو۔ ہمیں ڈر اور دہشت سے آزادی چاہیئے۔ چھوٹے بڑے جواں۔ بوڑھے امیر غریب سب کا ایک ہی کہنا تھا۔ اٹھو اے ہندوستان کے لوگو۔ جاگو......بہت ہو چکا۔ بس

اب اور نہیں......ان کا جوش اور ولولہ قابل دید تھا۔

جس وقت جنتا کا غصہ اور دکھ عروج پر تھا شیلا دکشٹ جنتر منتر پہنچی تھیں۔ انہیں دیکھ کر جوان اور بگڑ گئے۔ بامشکل تمام انہوں نے موم بتی جلائی۔ کافی پریشانی کا سامنا کر کے پولس کے گھیرے کے اندر چل کر وہ باہر نکلتی تھیں......

آٹھ قابل ڈاکٹروں کے زہر علاج بے ہوشی کے عالم میں یہ لڑکی موت سے جنگ کر رہی تھی۔ مگر موت سے کون جیت پایا ہے۔ آخر ان ٦ درندوں کی ناپاک خواہشات نے ایک لڑکی کو خاک میں ملا دیا۔ دیس میں ہر لڑکی کے اوپر زبردست دہشت چھا گئی۔

اس مرگ ناگہانی کی اندوہناک خبر نے سارے دیس کو رلا دیا۔ دیس کی دھرتی اور آسمان پر سوگ طاری ہو گیا۔ ہوائیں سوگوار تھیں۔ فضائیں اداس۔ ہر آنکھ نم۔ ہر دل مغموم۔ ہر چہرہ اداس۔ ہر جگر شق۔ ہر لڑکی دہشت زدہ۔

ہائے......ہائے......ان شیطانوں نے کس بے دردی سے ایک ہرے بھرے چمن میں ایسی آگ لگائی ہے جو کچھ بھی تھا سب ہی جل کر راکھ ہو گیا۔ والدین کے لئے اولاد کی موت کا بھاری غم سہنا سوہان روح ہوتا ہے۔ سوائے صبر کرنے کے دوسرا چارہ بھی تو نہیں۔ اس لڑکی کے اوپر اسکی موت کی قیامت سے پہلے جو قیامتیں گذری تھیں اس عذاب کو سہنے کی شکتی اس کے ماں باپ کہاں سے لائیں۔ کیسے صبر کریں۔

سوز وغم کی شدت سے انکا رواں رواں پھنک رہا ہے۔ کسی کے لاکھ جتن کرنے سے تو کیا اگر خدا آسمان سے موسلا دھار مہینہ برسادے تب بھی یہ دہکتی آگ نہ بجھے گی اور ان دونوں کے تن من جلتے رہینگے۔ دونوں کے دل و جگر وخون ہو چکے ہیں اور اب ان میں جینے کا دم ہی نہیں رہا ہے۔ مر مر کے ہی سہی انہیں زندگی کے دن تو پورے کرنے ہی ہونگے۔

ان کی بیٹی خالی ہاتھ اس جہان فانی سے رخصت نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے دیس باسیوں کی دکھی انکھین کے ڈھیر سارے موتی سنگ لے گئی ہے۔ اس کے لہو کا ایک ایک قطرہ موتی بن کر جگ مگا اٹھا ہے جن کی جیوتی نے سب جوانوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ ذمے داری اور ترقی کی راہ۔ اس کے افسردہ باپ کے سوگوار دل سے ایک ہی صدا نکلی۔۔۔ شاید ہماری بچی کی موت کے بعد میرے دیش کی لڑکیوں کی حالت بہتر ہو جائے۔

بڑی بے فکری کے دن تھے۔ مگر ٦٦ سالوں کی تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی آبادی نے سب کچھ بدل ڈالا......دیس کے رہنما اپنے وعدے بھول گئے۔ گاؤں کے مفلسی میں ڈوبے بھوک سے بلبلاتے کسانوں نے خودکشی کر لی۔ جن جوانوں میں ذرا بل باقی تھا وہ اپنے کھیت کھلیان چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں شہروں کی طرف چل پڑے جہاں [illegible] نا روٹی نہ روزگار۔ شہر کے شریف گھرانوں کی بہو۔ بیٹیوں نے جب روزگار کی تلاش میں اپنے گھروں سے باہر قدم نکالے تو خاندانی نظام بگڑنے لگا۔ دولت اور دنیاوی چیزوں کی چاہت نے انسان کو گمراہ کر دیا۔ انسان در بدر بھٹکنے لگا۔ نہ دین رہا نہ دینداری۔ پرانی قدریں جاتی رہیں۔ اپنے بزرگوں کی دی ہوئی سیکھ بھی یاد نہ رہی کہ انسان دولت سے نہیں اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں رہی۔ انسان خود غرض اور خود پرست

ہوتا گیا اور انسانیت کا زوال ہوتا گیا۔ دیس کا نظام بکھر گیا دیس میں مصیبتیں آفتیں اور بلائیں بڑھتی گئیں۔

سب سے بڑی آفت بھوک کی۔ ایک مصیبت جہالت کی۔ ایک بلا رشوت کی اور اب یہ وہ بلائے عظیم کہ نہ ماں ماں رہی اور نا ہی بہن بہن رہی۔ سنتے آئے ہیں۔ ہر مرض کی دوا ہے مگر آفتوں۔ مصیبتوں بلاؤں اور وباؤں میں ڈوبے اس دیس میں کسی بھی بلا کا علاج نظر نہیں آتا کوئی سچا۔ صادق طبیب ہوتا تو علاج کرتا۔ عوام کو جہالت اور مفلسی کی دلدل سے باہر نکالتا۔ افسوس۔ ہمارے طبیب خود ہی ان بلاؤں کے جراثیم ملک میں پھیلانے کے ذمے دار ہیں۔ یہ بیمار کمزور حکمراں علاج کیا کرینگے۔

انہیں تو خود ہی علاج کی ضرورت ہے۔ انہیں صرف اپنی تجوریاں بھرنے سے مطلب ہے۔ ایسے لالچی۔ اور غیر ذمے دار حکمرانوں کو ان کے عہدوں پر برقرار نہیں رہنا چاہیئے۔

ہمارے دیس کی سب سے مہلک وبا جہالت ہے جو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ جاہل دیسوں میں بھوک پنپتی ہے۔ ہمارے سیاست دانوں حاکموں اور دانشوروں نے اپنے بچوں کو عمدہ انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے پردیس بھیجا مگر اپنے دیس کی ۵۰ پچاس فی صد جنتا کو کتاب اور قلم سے محروم رکھا۔ شاید یہ سوچکر کہ اگر جنتا دانشور ہوگئی تو اپنے حقوق کی مانگ کرے گی اور ان کے حکموں پر گھٹنے نہیں ٹیکے گی۔

ان پڑھ اور جاہل ماؤں کے بچوں کو نہ ہی گھروں میں کچھ تعلیم وتربیت ملتی ہے اور نا ہی گھر کے باہر بھلے آدمیوں کی توجہ نصیب ہوتی ہے۔ ان بھوکے ننگے نادار بچوں کو کوئی سیدھی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ انہیں کسی قسم کی خوشی اور آرام میسر نہیں ہوتا۔ بھوک اور مفلسی کے گھنے بیابان میں بھٹکتے یہ بچے کچھ بھی کرسکتے ہیں کیونکہ انہیں اچھے اور برے کی پہچان نہیں ہوتی۔

ایک زمانہ تھا سپاہی کو دیکھتے ہی لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے۔ جیل کے نام سے تھر تھر کانپ اٹھتے تھے۔ مگر اب نہ جیل کا ڈر رہا اور نا ہی سپاہی کے ڈنڈوں کا خوف۔ اپنے نامی گرامی باعزت عہدے داروں۔ نیتاؤں کو سپاہیوں کی حراست میں مسکراتے ہوئے جیل کے اندر باہر آتے جاتے دیکھ کر عوام کے دلوں سے جیل اور قانون کا خوف مٹ گیا ہے۔ ہر شخص سوچتا ہے اگر یہ اونچے طبقے کے لوگ سنگین جرم کرنے کے بعد جیل کے باہر آزادی سے زندگی کے سارے لطف اٹھا سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کرسکتے۔ جس دیس میں ہر عام اور خاص کے لئے یکساں قانون نہ ہو وہاں امن وچین کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔

انہیں دیکھ ان پڑھ اور بے روزگار جوان سرکش ہو جاتا ہے۔ بڑی دلیری سے کہتا ہے...... جب سے میرا نام ذرا ذرا سا بدنام ہوگیا ہے محلے میں میرا بڑا نام ہوگیا ہے۔ میری ٹولی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ آس پاس کے محلے والے بھی مجھے پہچاننے لگے ہیں۔ مجھ سے ڈرنے لگے ہیں۔ اب میں جگو نہیں رہا...... سب مجھے جگو دادا پکارتے ہیں۔ یار اب میری بھی عزت ہونے لگی ہے۔ دھندا بھی آسان سا کرتا ہوں۔ کسی کی جیب کاٹی تو کسی کو دھمکا کر لوٹ بٹورے۔ نا محنت نا کسی کی ماتحتی۔ نہ ڈر۔ بس رات کے اندھیرے میں چپکے سے سپاہی کی مٹھی گرم کی اور بس عیش ہی عیش......

یہی بے عقل۔آوارہ۔بے روزگار جوان غنڈہ گردی اور دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔اگر انہیں راہ راست پر نہیں لایا گیا تو مجرموں کی گنتی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور امن وسکون غارت ہوتا جائے گا۔

جنتر منتر میں ہر طبقے کے لوگوں نے اکٹھا ہو کر غم اور غصے کا اظہار کر کے ایکتا کا ثبوت دیا ہے کسی نے کہا یہاں بھی سعودی عرب کا قانون لاگو کرو۔ان خونخواروں کو کھلے عام سنگسار کرو تا کہ عوام کو عبرت حاصل ہو اور کوئی ایسی گھنونی حرکت کرنے کی جرات نہ کر سکے۔

پبلک نے ان چھ سنگدل مجرموں کے لئے پھانسی کی مانگ کی مگر غم اور غصے میں بھرے نوجوانوں نے کہا ان درندوں کے لئے پھانسی کی سزا کافی نہیں۔انہیں ہمیں سونپ دو ہم انہیں سزا دینگے۔یہ اسی طرح کی بھیانک موت کے حقدار ہیں جو انہوں نے اس بے بس لڑکی کو دی تھی۔ہم انہیں تڑپا تڑپا کے مارینگے۔ریپ اور قتل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ریپ کے بعد کئی لڑکیوں نے خودکشی کر لی ہے اور جو زندہ ہیں وہ موت سے بدتر زندگی جی رہی ہیں۔ دنیا والے ان بدبخت لڑکیوں کو بے حد حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اپنے بھی انہیں ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔سب ان سے اور ان کے خاندانوں سے ناتا توڑ لیتے ہیں۔

جوانوں نے نئے قانون بنانے کی مانگ کی۔کسی نے کہا ارے بھائی قانون تو شروع ہے۔مگر افسوس کہ قانون چلانے والے نہایت خودغرض اور لاپرواہ ہیں۔جب رشوت راستے میں آجائے تو قانون کیسے چلے۔ خون کے بدلے خون ازل سے بنے اس قانون سے سب واقف ہیں۔مگر قتل ہو رہے ہیں۔کیونکہ جن کے سروں پر شیطان سوار ہو جائے وہ قانون کی پرواہ نہیں کرتے۔دنیا بھر کی جیلوں میں قاتل اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔دیس میں اتنی زیادہ بلائیں پھیل چکی ہیں کہ اب کوئی قانون آنا فانا انہیں ختم نہیں کر سکتا حکومت کے پاس بڑی طاقت ہوتی ہے۔وہ چاہے تو سب کچھ کر سکتی ہے۔مگر ہمارے خود پرست اور خودغرض سیاست دان کہتے بہت کچھ ہیں کرتے کچھ نہیں۔اگر وہ صداقت اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتے تو آج ملک پر ظلمت کی گھٹائیں نہ چھائی ہوتیں۔

اس دردناک حادثے نے یہ بھید تو کھول ہی دیا کہ ہمارے دیس میں باپو جی جیسا سچا۔ایماندار وطن پرست لیڈر نہیں ہے۔جوان نسل کے غم اور غصے اور جوش اور خروش نے ظاہر کر دیا کہ وطن میں خودی رام اور بھگت سنگھ جیسے بہادر جوان ہیں جو دیس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔

کچھ نے کہا ہم نئے قانون کے قائل نہیں۔حالات اس بری طرح بگڑ گئے ہیں کہ اب کوئی قانون بدلاؤ نہیں لا سکتا۔اب ہمیں بدلنا ہوگا۔ہم سبھوں کو اپنی اپنی سوچیں بدلنی ہونگی۔سماج کے فرسودہ ریت رواجوں کو بدلنا ہوگا۔قانون سے اونچا انسانیت کا قانون ہے۔پہلے ہر آدمی کو انسان بننا ہوگا۔انہیں عزت سے جینے کا گن سکھانا ہوگا۔آزاد ملک میں صرف عورتوں کی ہی نہیں ہر شہری کی سیفٹی ضروری ہے۔یہ لمبی لڑائی ہے اور یہ لڑائی ہم سب کی ہے۔ہم سب مل کر لڑینگے اور فتح حاصل کریں گے۔

اٹھو......دیس کے جوانوں......اس سے پہلے تمہارا دیس جہالت اور مفلسی کے عمیق سمندر میں غرق ہو جائے اپنا مضبوط سہارا دے کر اسے جہالت اور مفلسی کے ساگر سے باہر کھینچ لاؤ۔اب سڑکوں پر نعرے لگانے اور ٹی

وی پر بھاشن دینے سے کام نہیں چلے گا۔اب جوانوں کو اپنے آرام دہ مکانوں۔ اسکولوں۔ کالجوں سے نکل کر سڑکوں۔گلیوں۔ بازاروں۔ کھیتوں۔کارخانوں مزدوروں اور بے گھر بے ٹھکانہ بے روزگاروں اور بھوک کے بیابان میں بھٹکتے غریبوں تک اپنا پیغام لے جانا ہوگا۔ ہر ایک کو آگاہ کرنا ہوگا کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ہم جہالت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اب ہم سب کو بھی آگے بڑھنا ہوگا ورنہ ہم سب سے پیچھے رہ جائیں گے۔

گاؤں میں جاکر غریب کسانوں کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ ہمارے ہیں۔ہم سب کی ایک ذات ہے۔وہ یہ کہ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ذات پات۔اونچ نیچ کا بھید بھاؤ مٹانا ہوگا۔انہیں یقین دلانا ہوگا کہ ان کے مفاد پرست نیتاؤں کی طرح ہم ان سے ووٹوں کی بھیک مانگنے نہیں بلکہ انہیں کچھ دینے آئے ہیں۔اگر آج تم انہیں یقین اور بھروسہ دے کر مضبوط بناؤ گے تو کل وہ بھی کسی گرے ہوئے شخص کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائینگے۔یاد رکھیئے خدا نے آپ کو دو ہاتھ دیئے ہیں۔ایک آپ کے لئے اور دوسرا کسی کمزور کو سہارا دینے کے لئے۔اپنے دونوں ہاتھ استعمال کیجئے۔

دیس میں بھوک کی آگ دہک رہی ہے۔اگر حالات نہ بدلے تو یہ آگ پورے دیس کو بھسم کر دے گی۔ جہالت سے بھوک کا جنم ہوتا ہے۔ جہالت ہٹانا کٹھن کام ہے مگر ہے سب سے ضروری۔٦٦ سال میں سرکار نے عوام کی تعلیم پر اتنا غور نہیں کیا جتنا کرنا چاہیئے تھا۔آج ہندوستان میں پچاس ہزار اسکولوں کی ضرورت ہے۔ہماری کمزور سرکار میں اتنا دم خم کہاں جو اتنے اسکول بنا سکے۔اگر یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو بے انتہا بچے علم کی دولت سے محروم رہ جائینگے۔اس پرابلم کو جوان ہی حل کرینگے۔نئے اسکول کھولنے کے پروگرام بنائینگے۔آج سے ستر سال پہلے کی بات ہے میری ماں گھر میں غریب بچوں کو پڑھاتی تھیں۔اس زمانے میں اسکول تھے ہی نہیں۔میری بڑی بہن بھی ٹیچر تھیں وہ بھی روز شام کو اسکول کے بعد اپنے کلاس کے بچوں کو فری ٹیوشن دیتی تھیں۔ایسا نہیں تھا کہ ان دنوں لوگوں کو پیسے کی ضرورت نہیں تھیں۔اپنے دیس کے بچوں کو آگے بڑھانے کی زیادہ ضرورت تھی۔٢٠٠ سال کے غلامی کے دور میں انگریزوں نے ہمارے وطن کو اتنا نہیں لوٹا جتنا ٦٦ سال میں آزادی کے دور میں اپنے ہی لوگوں نے اپنے وطن کو لوٹا پھر یہ غضب کہ ٥٠ فی صد جنتا کو قلم اور کتاب سے محروم کر کے دیس کو ناکارہ بنا دیا۔اپنی تجوریاں بھرتے رہے کسی کو وطن کی بہبودی کا خیال نہ آیا۔

سڑکوں پر آوارہ ڈولتے پھرتے بے روزگار بے گھر۔بے ٹھکانہ نوجوانوں کی خصلت بھی جنگل میں دندناتے پھرتے جانور جیسی ہی ہو جاتی ہے۔ان کے دماغوں میں غارت اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ہر وقت کمزوروں پر حملہ کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔یہ یوں ہی ایسے سخت دل نہیں ہو گئے۔ان کے ابتر حالات نے انہیں بے حد سنگدل اور بے رحم بنا دیا ہے۔کبھی کسی نے انہیں نیکی۔پارسائی۔ایمانداری اور شرافت کا درس نہیں دیا۔ کبھی کسی نے دو لفظ پیار کے نہیں کہے۔ہر انسان کی طرح یہ بھی ہر چیز حاصل کرنے کے سپنے دیکھتے ہیں۔ٹی وی پر مہین کپڑے اور کم کپڑے پہنے لڑکیوں کو مردوں کے ہاتھوں میں ناچتے کودتے دیکھ کر یہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ خواہشات بڑھتی جاتی ہیں اور یہ اپنے جذبات پر قابو نہیں کر پاتے۔جو چاہتے ہیں اسے زور زبردستی حاصل کر لیتے ہیں۔انجام وہی ہوتا ہے جو اس لڑکی کا ہوا۔یہ بھی ایک بیماری ہی ہے۔مگر اس بیماری کا علاج روگی کے ہاتھوں میں

ہے۔ جوانی کا نشہ تو ہر جوان پر چڑھتا ہے مگر خدا نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی عقل بھی دی ہے۔ محبت کے ہر لطیف جذبے سے عاری یہ اوباش لوگ قدرت کے بنائے اس عمل کی لذت سے بے بہرہ ہیں یہ ایک لطیف اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کا ذکر کرنا اسکولوں میں ضروری ہے تاکہ جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔ انہیں پیار اور عمل سے انسانیت کا درس دے کر ان کے اندر انسانیت کا احساس جگانا ہے۔ آپ کی محنت ضرور رنگ لائے گی۔ ایک دن یہ خود کہینگے جس انسان کے دل میں پیار نہیں وہ پتھر ہے انسان نہیں۔ اگر جوانوں کا جوش اور ولولہ قائم رہا تو ہر شہری عزت اور شان سے جی سکے گا۔

اور سمجھوتے نہ کرو۔ اپنے غدار نیتاؤں سے سوال کرو۔ یہ کیسی جمہوریت ہے۔ جس میں آدھی سے زیادہ جنتا مفلسی اور بھوک سے تڑپ رہی ہے۔ کیا ہوئے تمہارے وعدے۔ ہم آج بھی بھوکے بن کے در در بھٹک رہے ہیں۔ سڑکوں پر رہتے ہیں۔ نہ روپیہ ہے نہ سرکاری امداد۔ ہمیں امن۔ انصاف۔ اسکول۔ ہسپتال۔ بجلی۔ پانی۔ گھ کھانا اور کپڑا چاہیئے۔ یہ وطن عوام ہے۔ ہم بھوکے ہیں اور تم عیش کر رہے ہو۔ نہ بھولو کہ عوام میں بڑی طاقت ہوتی ہے ہمارے صبر کو زیادہ نہ آزماؤ۔ انقلاب تم جیسے بوڑھے نہیں جوان لاتے ہیں۔ اگر عوام بگڑ گئے تو تمہاری آفت آجائے گی۔ پلوں میں تمہارے تخت پلٹ دینگے۔ جو دیس سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ جس کی مٹی آج بھی سونا اگلتی ہے اس کی تم نے یہ درگت کر ڈالی تاکہ عوام سدا تمہیں سجدہ کرتے رہیں۔ تمہارے محتاج رہیں۔ جو کام تم ۶۶ سالوں میں نہ کر سکے اب ہم کرینگے۔ ہم سب مل کر اپنے وطن کو مفلسی اور جہالت سے آزادی دلوائیں گے۔

ہم جانتے ہیں کسی بھی قسم کی آزادی مفت نہیں ملتی۔ آزادی قربانی چاہتی ہے۔ اس دیس کے لوگ قربانی دیتے آئے ہیں اور آگے بھی دیتے رہینگے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمیں بہت بھاری قیمت چکانی ہوگی۔ ہم اپنا تن۔ من۔ دھن سارا اپنے دیس کی بہبودی اور ترقی کے لئے نثار کر دینگے۔ ہم مل کر ایک مستعد قوم تیار کرینگے۔ بغیر علم کے کوئی قوم مضبوط اور طاقتور نہیں ہو سکتی۔ علم انسان کی حفاظت کرتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہیں۔

ہم گھر گھر۔ کٹیا...... کٹیا...... جا کر علم کا دیا جلائینگے۔ اتنے دیئے جن کی روشنی سے سارے گاؤں اور ہمارا پورا ملک دمک اٹھے گا۔ سب بر سر روزگار ہونگے۔ ساری بلائیں آفتوں اور وباؤں کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔ کسی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوگا۔

دیس میں امن اور شانتی ہوگی تب ہی تو دیس ترقی کرے گا۔ دیس میں خوش حالی ہوگی۔ یہی تو ہر جوان کا سپنا ہے۔ ہر جوان کی منزل ہے۔ وطن کی ترقی اسی میں ہے۔

☆☆☆

باپو جی کا سپنا

آزادی کی ۶۳ ویں سال گرہ پر آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے مجھے بے انتہا خوشی اور فخر ہو رہا ہے کہ ہم آزاد ملک کے آزاد باشندے ہیں۔ دنیا میں سب سے قیمتی شے آزادی ہے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم اور قیمتی دن ہے کیونکہ یہ بھارت کی آزادی کا دن ہے۔ آیئے...... یہ تو معلوم کریں کہ کس طرح ہمارے کندھوں سے غلامی کا بھاری بوجھ سرکا۔ کیسے ہمیں آزادی ملی۔ بہت پرانی بات ہے۔

یہ تو ہندوستان کی آزادی سے برسوں پہلے کا ذکر ہے جب انگریز ہمارے حاکم تھے اور وہ ہر ہندوستانی کو کیڑے مکوڑوں کی طرح پاؤں تلے روندر ہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جلیان والے باغ میں باہر نکلنے کے سارے راستے بند کر کے ہمارے گورے ظالم حاکموں نے پبلک پر دھواں دھار فائرنگ کروائی۔ اس دن بہت سے ہندوستان کے پیاروں کا خون بہایا گیا۔ اس کے بعد انگریز متواتر ہندوستانیوں پر ظلم وستم ڈھاتے رہے۔ گاؤں کے گاؤں تہہ وبالا کرتے رہے۔ پورے ۹۰ سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں بہت خون خرابے کے بعد ہندوستان کے باسیوں نے اپنے آزاد ملک کی آزاد ہوا میں پہلی سانس لی تھی......

کسی گورے حاکم کے سامنے کسی کالے ہندوستانی غلام کو کھڑے ہونے تک کی جرات نہ تھی۔ ایک دن بڑی انہونی ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک ظالم گورے افسر نے ایک کالے ہندوستانی غلام کو ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا دیکھا تو فرنگی کا خون ابل گیا۔ گاندھی جی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ آسائش صرف گورے حاکموں کے لئے وقف تھی۔ گاندھی جی کی ہمت اور جرات دیکھ فرنگی کا غصہ بھڑ کا۔ غصے میں بلبلاتے فرنگی نے گاندھی جی کو بیحد بے عزت کیا اور انہیں فوراً گاڑی سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ کسی غلام میں حاکم کا حکم ٹالنے کی جرات نہ تھی۔ گاندھی جی ٹس سے مس نہیں ہوئے وہ بے خوف اپنی سیٹ پر براجمان رہے۔ غصے میں بھرا فرنگی دندناتا گاندھی جی کے پاس گیا انہیں اٹھا کر ریل کے ڈبے سے دھرتی پر پھینک دیا۔ اسی روز اسی پل جب غصے میں بے قابو ہو کر فرنگی تناور حاکم اپنے ہندوستانی غلام پر ظلم وستم ڈھار ہا تھا وہ ہندوستانی غلام اپنے ملک کی آزادی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ خوابوں کی تعبیریں کب پوری ہوئی ہیں۔ مگر گاندھی جی نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دشمن بے حد زور آور ہے کھلی آنکھوں سے یہ سپنا دیکھا تھا۔ گاندھی جی کے مصمم ارادے نے اس ناممکن کو ممکن بنادیا۔ ہماری آزادی ان کے ہی اس خواب کی تعبیر ہے۔ آیئے آج ہم سب مل کر اس مہان ہستی کو یاد کریں جس نے ہمارے ملک اور اس ملک کے ہر انسان کو اتنا قیمتی تحفہ دیا اور دنیا کے سارے کمزور غلاموں کو آزادی حاصل کرنے کا درس دیا...... نیلسن منڈیلا کا کہنا ہے انہوں نے گاندھی جی کو دیکھ کر ہی آگے قدم بڑھائے تھے۔

گاندھی جی کی موت کے دن سارا ہندوستان سوگ میں ڈوب گیا تھا۔ سب کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔ فضا اداس تھی۔ آسمان رو رہا تھا۔ زمین سسک رہی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ جب گاندھی کی استھیاں لے کر ٹرین

ٹونڈلہ اسٹیشن پہنچی تو میرے فادر Rev S. S. BUDDEN جو ایک عیسائی پادری تھے گاندھی جی کی آتما کی شانتی کے لئے دعا کرنے خاص طور سے بلائے گئے تھے۔

آج ہم آزاد ہیں۔ آزادی آسانی سے نہیں ملتی ۔آزادی قربانی چاہتی ہے۔ اپنے وطن کے پیاروں کی قربانی۔ گاندھی کی جرات اور ہمت اور ان کے جذبوں کی صداقت دیکھ وطن کے جاں نثاروں کے دلوں میں جو برسوں سے دبی چنگاری سلگ رہی تھی بھڑک اٹھی۔ پوری کی پوری قوم بوڑھے۔ جوان۔ آزادی کی اس جنگ میں مرنے کو تیار ہو گئے۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی سب نے مل کر نعرہ لگایا ہمیں آزادی چاہیئے۔ ان انگریز وطن کے دشمنوں کو اپنی سرزمین سے باہر نکالو۔ ہمیں آزادی چاہیئے۔

فرنگی حاکموں کے ایجنٹ اسکولوں سے جواں تندرست لڑکوں کو لے جا کر زبردستی فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی بھی ان بدنصیبوں میں سے ایک تھے۔ میرے بھائی کے فرنگی افسر نے ہندوستانیوں کو بلیڈی فول کہا تو میرے جوان بھائی کا خون ابل پڑا۔ انہوں نے آؤ نہ دیکھا نہ تاؤ اٹھایا فرنگی کا ہنٹر اور اسی پر برسا دیا۔ اور بھاگ گئے۔ حاکم اپنی اتنی زبردست توہین برداشت نہ کر سکا حکم صادر ہوا جہاں بھی اس باغی جواں کو دیکھو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزا دو۔

ہندوستانیوں نے اس باغی جوان کی خوب واہ واہ کی۔ ان کی بہادری دیکھ اور جوانوں نے جنگ آزادی میں جان دینے کی ٹھان لی۔ جب سپاہی گھروں کے سامنے کے دروازے پر میرے بھائی کو تلاش کرنے جاتے لوگ پیچھے کے دروازے سے میرے بھائی کو دوسرے گھر میں چھپا دیتے تھے۔ آخر سپاہی بھی تو اپنے ہی تھے۔ وہ بھی تو آزادی چاہتے تھے۔ مگر بیچارے پیٹ پالنے کے لئے ظالم افسروں کا حکم بجالاتے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ سپاہی خود ہی آنکھیں موند کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ میرے بھائی در در پھرتے رہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد ان کا کیس رفع دفع ہوا۔

ظالم حکمرانوں کے ظلم وستم کی بارش بڑھتی گئی۔ جیوں جیوں انگریز بے دردی سے ہندوستانی غلاموں کا خون مٹی میں ملاتے گئے۔ تیوں تیوں شہیدوں کے خون سے وطن کی دھرتی میں زرخیزی بڑھتی گئی۔ اس زمین کے ذرے ذرے سے بھگت سنگھ جیسے نڈر اور بہادر پودے اگنے لگے۔ باغی کونپلوں کی تعداد دیکھ کر حکمرانوں کے دل تھرا اٹھے۔ سارے ملک میں بغاوت کی ہوا لہرانے لگی۔ ہندوستان کے کونے کونے میں آزادی کے نعرے گونجنے لگے۔ شہیدوں کی گنتی بڑھنے لگی۔ پھر آزادی کو کون روک سکتا تھا۔ آج ان ہی شہیدوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں۔ اور ہم سب سے سوال کر رہی ہیں کہ جس آزادی کے پانے کیلئے ہمارے دیس کی دھرتی کا رنگ ہمارے خون سے رنگا گیا تھا کیا تم سب مل کر اس آزادی کی حفاظت کر رہے ہو۔ وہ ہر شہری سے کہہ رہے ہیں۔ اٹھو...... اے وطن کے رکھوالو۔ اٹھو...... جو آزادی ہم نے تمہیں سونپی ہے اس کی رکھوالی کرو۔ اپنے وطن کو سنبھالو۔ سنوارو اور سجاؤ ہماری طرح تم بھی وطن پر قربان ہو جانا اس پیارے وطن کو کبھی کوئی نقصان نہ پہچانا اور نا ہی کسی باہر والے کو نقصان پہچانے دینا۔ اپنی آخری سانس تک اپنے وطن کی حفاظت کرنا کیونکہ یہ وطن ہی تمہاری شان ہے تمہاری جان ہے۔

فرنگیوں کا نظام ختم ہوئے ۶۳ سال بیت گئے۔ ہندوستان میں پہلے عام چناؤ ۱۹۵۲ء میں ہوئے ہمارے آزاد وطن میں ہماری اپنی پہلی سرکار بنی۔ نئی سرکار نے نئی نئی پالیسیاں بنائیں۔ سیاست بدلی تو سماجی حالات بھی بدلے۔ آزاد ہندوستان کا سارا نظام بدلا۔ نظام تو بدلا لیکن آج بھی ملک کے کسی کسی حصے میں جنتا کی وہی بری حالت ہے جو

آزادی سے پہلے تھی۔

آج اس دیش کی جنتا سوالوں سے بھرا کاسہ لئے وطن کے رکھوالوں اور رہنماؤں کے سامنے تن کر کھڑی اپنے ہر سوال کا جواب چاہتی ہے۔ جاننا چاہتی ہے کہ کیا اس ملک کی جنتا کا ہر ایک شخص واقعی آزاد ہے۔ کیا ہم سب آزاد آب وہوا میں خوش باش ہیں۔ کیا ہر شہری کو اس کے بنیادی حقوق ملے ہیں۔ جن کا وہ حقدار ہے جیسے پینے کے لئے صاف پانی۔ پیٹ بھر کھانا۔ تن ڈھاکنے کے لئے کپڑا اور سر چھپانے کے لئے چھت۔ مریضوں کے لئے ہسپتال۔ بچوں کے لئے اسکول۔ اگر ہاں تو واقعی ہم آزاد ہیں۔ کیونکہ اس دنیا کے ہر آزاد ملک کا ہر آزاد شہری اپنے ان ہی حقوق کا حقدار ہے۔

حالات بدل رہے ہیں دنیا بدل رہی ہے۔ انسان چاند پر بسنے کی تمنا کر رہا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہندوستان بھی بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے آج بھی ہم جہالت اور غریبی کے جال میں پھنسے ہیں۔ آج بھی ہمارے دیس میں غریبوں کو دو وقت کی بھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ بے گھر لوگ پیڑوں اور پلوں تلے اور سڑکوں پر رات بسر کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں بچے پیدا کرنے کی آزادی ہے۔ بہت سے غریب بچوں کے ہاتھوں میں قلم اور کتابیں کبھی نہیں آتیں۔ ننگے بھوکے بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ ہر دیس کا مقدر ان کے ننھے منے بچوں کی مٹھیوں میں بند ہوتا ہے ہر بچے کا ایک سپنا ہوتا ہے کچھ کرنے اور کچھ کر دکھانے کا سپنا۔ اگر آج ان کمزور بچوں کو سہارا نہ ملا تو کل یہ جاہل غریب بچے اس وطن کی سلامتی اور شانتی کو بھنگ کر دینگے۔ انہیں ان کا بچپن نہ گنوانے دیجئے۔ ہوٹلوں میں برتن دھوتے دھوتے۔ کارخانوں میں صفائی کرتے کرتے اپنی جوان زندگیاں تباہ کر رہے ہیں کیونکہ یہ بے سہارا ہیں۔ کچھ خوش نصیب بچوں کو مواقع مل جاتے ہیں وہ محنت کر کے آگے بھی بڑھ جاتے ہیں بڑے بڑے سپنے دیکھنے لگتے ہیں مگر رشوت خور ان کے سارے سپنے چکنا چور کر دیتے ہیں۔ ان مجبور بچوں کو اپنے ٹوٹتے بکھرتے خواب دیکھنے کی آزادی تو ہے مگر کچھ کر دکھانے کی تمنا ان میں باقی نہیں رہ جاتی۔ مفلسی اور بے بسی ان کے آگے بڑھتے قدم روک لیتی ہے اور ایک لالچی کے ہاتھوں ایک قابل جوان کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ ہر ذمے دار شہری کا فرض ہے کہ ایسے غریب اور بے سہارا جوان کو سہارا دے۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر ان بچوں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے سہارا دیجئے تا کہ یہ بھی ایک خوشحال زندگی بسر کر سکیں......

جس ملک میں علم کی کمی کے ساتھ lourd ordr کی بھی کمی ہو وہ ملک کس طرح آگے بڑھے گا۔ اگر ایسے ہی حالات رہے تو امیروں کی تجوریاں بھرتی جائیں گی اور ہمارے جیل غریبوں سے بھرتے جائیں گے۔ اگر ہماری موجودہ نسل ہی نہ سنبھلی تو کل کون اس وطن کے رکھوالے ہونگے۔ آیئے ہم ان کو نئی زندگی نئی راہ دکھائیں تا کہ جب ہم اس دنیا سے رخصت ہو کر جائیں اور اپنے وطن کے شہیدوں سے ملیں تو سر اٹھا کر ان کے سوالوں کا جواب دے سکیں۔ ان کو بتا سکیں کہ جو آزادی انہوں نے اپنا خون بہا کر پائی تھی اور ہمیں سونپی تھی کیا ہم نے اپنی مقدور بھر اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے؟

آج کا دن ہر ہندوستانی کے لئے خوشیاں منانے کا دن تو ہے ہی ساتھ میں ان سارے کے سارے ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی شہیدوں کو بھی یاد کرنے کا دن ہے جنہوں نے اس چمن کو اپنے خون سے سینچا تھا اور ان کے خون کی

ہر بوند سے آزادی کے پھول کھل اٹھے تھے۔ رنگ برنگی مہکتے پھول جن کی خوشبو آج بھی آزاد ہندوستان کی فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔

آیئے آج ہم سب مل کر عہد کریں کہ ان مہان شہیدوں کی طرح ہم بھی ذات پات مذہب۔ حسب نسب۔ اونچ نیچ۔ سب کچھ بھلا کر ساتھ ساتھ مل کر آگے بڑھینگے۔ اگر اب بھی ہم نہیں سنبھلے تو ہماری غلطیوں کا خمیازہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھگتنا ہوگا۔ ہماری کمزور نسل اس وشال دیش کی ذمے داری کسطرح اٹھا پائے گی۔

قوم مضبوط اور طاقتور ہوگی تب ہی تو دیش ترقی کرے گا۔ اگر ہم دنیا کی ساری قوموں کے ساتھ مل کر آگے بڑھیں گے تو یقین کریئے نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی اور منزل قریب آتی جائے گی۔ جی ہاں...... ترقی کی منزل۔

انسان دنیا کے کسی کونے میں جا بسے اس کی اصل پہچان اس کے ملک سے ہی ہوتی ہے۔ وہ کہیں بھی ڈولتا پھرے اس کا اصلی گھر اپنے وطن ہی میں ہوتا ہے کیونکہ گھر وہی ہوتا ہے جہاں جڑیں ہوتی ہیں۔ جسم روح کا گھوارا ہوتا ہے۔ مگر گھر جسم وروح دونوں کا گہوارہ ہوتا ہے، جسم تو فانی ہے، ماٹی ہے ماٹی میں مل جائے گا۔ اصل تو روح ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

آیئے ہم اپنے گھر کو آفت اور مصیبت سے بچائیں تا کہ ہماری جڑیں ہمیشہ سلامت رہیں۔ ہمیشہ زندہ رہیں۔ اور ہمارے آزاد ملک کی آزاد دھرتی سدا سہاگن رہے۔ اس دھرتی پر کھلنے والا ہر پھول سدا تر وتازہ رہے۔ سدا ہنستا رہے اور ساری دنیا اس پر رشک کرے۔

یہی تو ہمارے باپو جی کا سپنا تھا۔ ہر شہری مکمل آزاد ہو۔ ہر بچہ مسکراتا رہے۔ آج صبح میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے فون پر پوچھا کہ دہلی میں یوم آزادی کا جشن کیسے منایا جائے گا۔ وہ بولے ہر سال کی طرح خوب دھوم دھام سے۔ ہنس کر کھنکتی آواز میں بولے۔

یوم آزادی پھر آیا دل ہمارے شاد ہیں
خانقائیں بند ہیں اور مے کدے آباد ہیں
دوست جتنے ہیں سبھی مسرور ہیں دل شاد ہیں
اور دشمن خانماں برباد ہیں، ناشاد ہیں
یوں ہی صدیوں تک یہ دن آئے ہمارے ملک میں
مانگتے بھگوان سے ہم یہ بڈن پرشاد ہیں

ہر انسان کو اپنی جنم بھومی ماں کی طرح پیاری ہوتی ہے۔ مجھے اپنے دیس کی پوتر دھرتی سے بہت لگاؤ ہے۔ بہت پیار ہے۔ بس ایک بار وہاں جانا چاہتی ہوں سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی آخری سانسیں اپنے آزاد ملک کی آزاد ہوا میں لینا چاہتی ہوں...... چاہتی ہوں جب میرا چولا بدلے تو میری ماٹی میرے پیارے آزاد وطن کی پوتر ماٹی میں مل کر امر ہو جائے۔

......جئے ہند......

☆☆☆